جملہ حقوق محفوظ
قیمت سالانہ للعہ
چار روپے پیشگی
بذریعہ وی پی للعہ

مخزن

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۰۹۷
ممالک غیر سے
۹ شلنگ
قیمت فی نمبر ۸

جلد ۳ | بابت ماہ جنوری ۱۹۳۰ء | نمبر ۱۱

فہرست مضامین

رفیق عام پریس لاہور میں باہتمام منظور الزمان پرنٹر چھپا۔ اور میاں ظہور الدین مالک و پبلشر نے دفتر مخزن بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں

مراکش کی ہنس مکھ لڑکی!

ہنسی کس قدر تیری معصوم ہے
یہ چہرہ بناوٹ سے محروم ہے

بہت ہنس رہی ہے بہت شاد ہے
چہکتی ہے چڑیا ہے، آزاد ہے

ابھی کیف و کم سے نہیں آشنا
کسی رنج و غم سے نہیں آشنا

اری بھولی بھالی سی ننھی سی جان!
نہ ہنستی اگر تو بھی ہوتی جوان

ابھی کم سمجھ ہے، تجھے کیا خبر!
کہ غمگیں ہیں کیوں تیرے مادر پدر

تجھے کیا خبر ہے کہ تیرا وطن
ہے کیوں غرقِ دریائے رنج و محن؟

تجھے کیا خبر ہے۔ تری زندہ قوم
ستاروں کی مانند تابندہ قوم

ہے کیسی بلاؤں میں آئی ہوئی؟
مصیبت ہے کیا اس پہ چھائی ہوئی!

مراکش، کہ ہے رشکِ باغِ نعیم
اُٹھا جس کی مٹّی سے عبدالکریم

مراکش، جہاں بس رہے ہیں وہ مرد
رہے ہیں جو مریخ سے ہم نبرد

مراکش، کہ ہے تند شیروں کا گھر
عرب کے بہادر دلیروں کا گھر

مُسلّط ہے اب اُس پہ گرگِ فرانس
نہیں اُس کی قسمت میں آزاد سانس

وہی غازیانِ تہوّر شعار　　غلامی کے جینے سے ہے جن کو عار
در یغا کہ وہ صف شکن تیغ زن　　ہوئے اب سزاوارِ دار و رسن
خطا یہ، کہ اُن کا خُدا ایک ہے　　زمانے کا حاجت روا ایک ہے
خطا یہ، کہ ہادی ہے اُن کا رسولؐ　　سراسر صداقت ہیں جس کے اُصول
خطا یہ، کہ دین اُن کا اسلام ہے　　سبق جس کا آزادیٔ عام ہے،
خطا یہ، کہ پابندِ قرآں ہیں وہ　　پرستارِ حق ہیں مُسلماں ہیں وہ
خطا یہ، کہ دل اُن کے آزاد ہیں　　یہی جرم ہے، جس سے برباد ہیں
ہے باطل کو ان کی سچائی سے خوف　　خموشی کی صبر آزمائی سے خوف
فرانس اور ہسپانیہ کو ہے ڈر　　کہیں جاگ اُٹھیں نہ یہ شیرانِ نر

مبادا اُٹھے پھر اذانوں کا شور
شکستہ ہو سرمایہ داری کا زور

تو ہنستی ہے، اے میری پیاری بہن　　کہ بے ربط سی ہے یہ طرزِ سخن
خدا تجھ کو ہنستی ہی رکھے مدام　　تری زندگانی رہے شادکام
دُعا ہے کہ وہ وقت آئے قریب　　تری قوم کو بھی خوشی ہو نصیب

وطن میں وہ شاد اور آباد ہو
غلامی کے پنجے سے آزاد ہو

(دیوان اثر حفیظ جالندھری)

دریا بہ حباب اندر

شاہنامہ اسلام کی دوسری جلد زیر تصنیف ہے یہ جلد بھی پہلی جلد کی طرح دو ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہوگی اس میں عہد نبوی کے مشہور غزوات مجاہدین اسلام کے لافانی کارناموں اور حق و باطل کے معرکوں کی تصویریں کھینچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جلد اول کی طرح جو حضرات اس جلد کی سرپرستی فرمانا چاہیں فی جلد ۲؎ پیشگی ارسال فرمائیں تاکہ مجھے اس کی تیاری میں آسانی رہے۔ اس روپے کی رسید فوراً مل جائے گی اور چھپنے پر کتاب بھی اسی طریق سے ارسال کر دی جائیگی جس طرح پہلی جلد ارسال کی گئی تھی۔ انشاء اللہ آپ کتاب کو اپنے اعتماد کے قابل پائیں گے۔ ترسیل صرف میرے نام سے ہونی چاہئیے۔

خاکسار:۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ صدر دفتر شاہنامہ اسلام۔ ماڈل ٹاؤن لاہور۔

ایک دوست کی امریکہ سے کامیاب مراجعت ۔ لاہور کے مشہور و معروف دندان ساز ڈاکٹر عطاء اللہ صاحب مخزن کے قدیم مربی اور مدیر مخزن کے دوست ہیں۔ انارکلی میں اکیس سال سے کامیاب پریکٹس کر رہے ہیں اور فن دندان سازی کے مستند ماہر گنے جاتے ہیں۔ انتہائی کامیابیوں کے باوجود کچھ عرصہ سے آپ ہندوستانی دندان سازی کو مغربی ممالک کی ترقیات کے مقابلے میں فرسودہ خیال کرنے لگے تھے۔ اس احساس نے آپکو تکمیل فن کے لئے امریکہ جانے پر آمادہ کیا۔ کیونکہ آجکل امریکہ سائنس میں دنیا بھر کے ممالک سے سبقت لے جا چکا ہے۔ امسال آپنے بصرف زر کثیر اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنایا۔ امریکہ گئے اور نیو یارک کے ایک کالج کی اعلےٰ جماعت میں داخل ہو گئے۔ امتحان میں اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ اور کالج نے آپ کو ایک طلائی تمغہ عطا کیا۔ اس شاندار کامیابی کو آپ اپنی اکیس سال کی عملی مہارت کا نتیجہ بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ جس شخص نے پہلے ایک مدت تک دندان سازی کے ضمن میں عملی طور پر کچھ نہ کیا ہو۔ مغربی کالجوں میں اس فن کی مبادیات سے بھی واقف نہیں ہو سکتا۔ لاہور کے کثیر التعداد معززین نے، جن میں ہمارے محترم سر عبدالقادر با لقابہٗ سر محمد شفیع، ڈاکٹر محمد شریف اور اکثر مدیران جرائد بھی تھے آپکی اس کامیاب مراجعت پر اظہار مسرت کے لئے ۱۵ دسمبر کو لاہور کے سٹیشن پر آپ کا شاندار استقبال کیا، ہم بھی ڈاکٹر صاحب کو ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر عطاء اللہ صاحب جواب دندان سازی کے نئے سائنٹفک اصولوں سے اور بھی زمانہ ماہر ہو گئے ہیں، خدمت خلق کے لئے اور زیادہ مستعد اور مفید ثابت ہوں گے +

حفیظ۔

از ملا رموزی
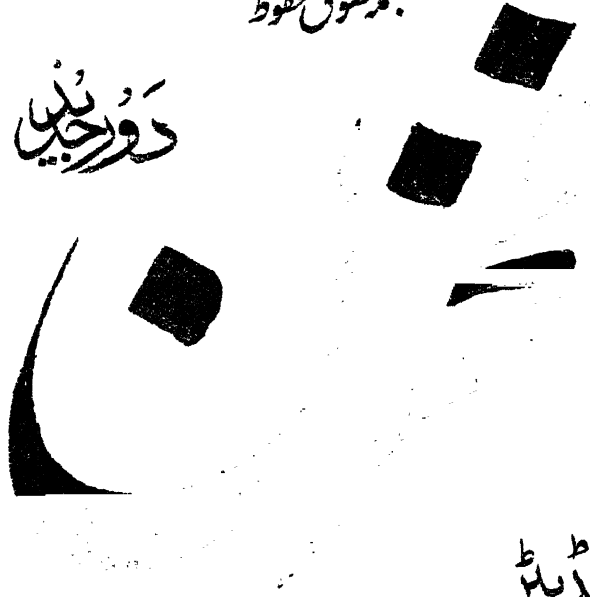
آج ملا رموزی صاحب کے "شذراتی مخزن" کا دوسرا سال شروع ہوتا ہے جو حقیقت میں خدائے جلال وجمال کی رحمت اور اس کے حبیب عالی مقام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کا صدقہ ہے۔ ورنہ ملا رموزی کی مایوسیوں اور پابندیوں سے لبریز زندگی کا یہ کمال کہاں تھا کہ "مخزن" میں مسلسل ایک سال تک "شذرات و اشارات" کا سلسلہ جاری رہتا پس ملا رموزی کے دماغ وقلم کی ساری قوتیں اسی کی حمد و مدحت اور اسی کے حبیب عالی جناب علیہ افضل الصلوٰۃ کے لئے درود و سلام میں ختم ہوں تو زندگی ملے جاودانی، اور عزت غیر فانی۔

ایسے موقع پر اڈیٹر لوگ اپنے لئے کچھ کہا کرتے ہیں۔ اس لئے ہم بغیر اڈیٹرپن ہی کے یہ کہتے ہیں
مزا تو آتا ہے یورپین اخبارات اور رسالوں میں کام کرنے سے کہ جہاں کسی اخبار، رسالے، یا مضمون نگار
کی سالگرہ پر اُس کے ناظرین اس کے ملک اس کے شہر اور اس کی حکومت کی طرف سے اُسے
ہدئے، تحفے، مبارک باد کے خطوط، تار، اور زرِ نقد کی " گاندھیانہ تھیلیاں " پیش کی جاتی ہیں،
مگر صحافتِ اردو میں آپ عمر بھر بھاڑ جھونکئے بیوی کا زیور فروخت کرکے کھا جایئے نوکری بھی پابندی سے
کیجئے اور مضامین بھی پابندی سے لکھئے لیکن جب سالگرہ ہو تو یہ بھی خبر نہ ہو کہ وہ آپ کا سارا لکھا لکھایا
انسانوں نے پڑھا یا بھوت اور چڑیلوں نے پسند کیا؟

لیکن یہ رسولِ اکرم علیہ السلام کی نسبت کا فیض کہ خدائے واحد و برتر نے ملا رموزی کے شذرات کو
"حسنِ قبول کی دولت سے مالا مال فرمایا اور " شذراتِ مخزن" نے خاص کامیابی حاصل کی، چنانچہ اس
ذیل میں ہمیں جو اطلاعات ملی ہیں وہ بہت زیادہ حوصلہ افزا اور مسرت بخش ہیں ان اطلاعات میں
سے بعض نہایت کارآمد اور بعض اصلاحِ ذوق اور زبانِ اردو سے متعلق ہیں جنھیں ہم آگے چل کر بیان
کرنے والے ہیں

آج سب سے پہلے یہ بتانا ہے کہ " شذرات و اشارات " کے عنوان کو کیوں ترک کیا؟

۱۔ اس لئے کہ یہ عنوان اسقدر " لم ڈھینگ " واقع ہوا ہے کہ " مخزن کی پوری ایک صف عرق ایک سطر گھیر لیتا ہے۔

۲۔ اس لئے کہ رسالہ " صوفی " پنڈی بھاؤالدین گجرات پنجاب میں بھی ہم اسی عنوان سے لکھتے ہیں،

۳۔ اس لئے کہ بیشمار پرچے اسی عنوان سے لکھتے ہیں پھر اس میں " نرالاپن " ہی کیا تھا؟

۴۔ اس لئے کہ " نکات " کا عنوان ہمیں نے سب سے پہلے اخبار " قوم دہلی " میں قایم فرمایا تھا گویا یہ لفظ ہماری ادبی جایئداد بھی ہوگیا ہے۔ اور اسی لئے ہماری ایک چھوڑ دو کتابوں کا نام بھی " نکات رموزی " ہے۔

۵۔ اس لئے کہ ہمارے ننھے میاں کی ان پڑھ والدہ کو ڈھائی منٹ تک شذرات کے معنی سمجھانا پڑتا تھا،

۶۔ اس لئے کہ اڈیٹر صاحب، مخزن، اور ان کے نائب صاحب کو ہمارے شذرات کی وجہ سے

اپنے شذرات کے لئے ایک ایسا عنوان مقرر کرنا پڑا جو فارسی زبان کی ایک آیت کے برابر ہے یعنی "دریا بہ حباب اندر" لہذا اب یہ دونوں اپنے سابقہ شذرات کے تحت ہی لکھا کریں گے (ہرگز نہیں حفیظ)۔

۷۔ اس لئے کہ "نکات" کی معنوی وسعت ہمیں بہت زیادہ پسند ہے اور یہ عنوان "دو نقطہ" بھی نہیں ہے، یہاں دو نقطہ شاعروں کے "دو غزلہ" اور "سہ غزلہ" کا توڑ ہے، اب یہ اور بات ہے کہ علی گڑھ کے غیر فارسی دان ڈپٹی کلکٹر لوگ اسے عمر بھر "نُکات" ہی پڑھیں گے اور کبھی کبھی کاتب صاحب بھی اس پر بجائے زیر کے پیش لگا دیا کریں گے جیسا کہ یوپی کے وہ دونوں "ادبی پلیٹ فارم" بولا کرتے ہیں کہ آتنا ہی آمدنامہ پڑھا ہے ان دونوں "ادبی علاّموں" نے۔

اب یہاں سے وہ اطلاعات اور حالات معلوم کیجئے جو پچھلے سال کے "شذراتی تاثرات" ہیں، ان میں سب سے پرلطف مگر معنی آفرین واقعہ ہمارے "گم شدہ قلم کی تلاش" کا ہے یعنی ہمنے "مخزن" بابت ماہ اکتوبر میں اپنے گم شدہ قلم کا حلیہ شائع کرکے تمام ناظرین سے درخواست کی تھی کہ جسے ملے وہ ہم تک پہونچا دے اس سے اصل میں ناظرین کے ذوقیات کا اندازہ مقصود تھا چنانچہ حسب توقع یہ "مخزن" یوں تو لاہور سے لیکر حیدرآباد اور حیدرآباد سے لیکر پشاور تک پہونچا مگر پڑھا گیا صرف ایک جگہ یعنے حضرت محترم مولوی عبدالغفور صاحب بی۔ اے علیگ نے ایک حکیمانہ ترکیب سے پہلے تو خود پڑھا اور پھر حضرتِ گرامی صاحبزادہ لفٹنٹ نعمت جلال کو یوں جا سُنایا گویا بس وہ اپنے ملاّ رموزی صاحب کا مضمون ہے، لیکن نکتہ شناس و نکتہ دان صاحبزادہ صاحب مدظلّہ نے ہمیں فی الفور ایک واٹرمین قلم ہدیہ بھیجا یا اب صاحبزادہ نعمت جلال مدظلہ کے اس جذبۂ قدردانی کے مقابل دوسرے تمام ناظرین کے لئے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ "مخزن" ہندوستان کے تمام علمی و ادبی حلقوں کے ساتھ اودھ کے تعلقہ داروں اور حیدرآباد کے جاگیرداروں تک میں پڑھا تو جاتا ہے خوب خوب مگر سمجھتے ہیں اسے فقط صاحبزادہ نعمت جلال، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ملاّ رموزی صاحب کا شگفتہ نگار اور بہار آفرین قلم کھو جائے لیکن ناظرین مخزن یوں چپ سادہ لیں گویا ملاّ رموزی کا یہ بھی ایک مذاق ہے! آہ نہ ہوئے آج کو ہم آگرے والے" ورنہ ناظرین "مخزن" کی وہ ہجو لکھتے کہ ہجو لکھنے اور کہنے کا حق ادا ہو جاتا، بہرکیف

ہم حضرت مکرم صاحبزادہ نعمت جلال مدظلہٗ کو شکریہ کے ساتھ یہ یقین دلاتے ہیں کہ آپ کی اس قدر افزائی سے دیکھ لینا یہ علی گڑھ کے تمام اقسام کے علیگ اور حیدر آباد کے جملہ جنگ بہادر اگر آج سے مخزن پڑھنا ہی ترک نہ کر دیں تو ہمارا ذمہ !!!

"شذرات و اشارات کی تعریف و توصیف میں یوں تو حضرت محترم" اپنے خواجہ حسن نظامی مدظلہٗ تک نے ۲۴ نومبر کو ہمیں خط لکھا ہے مگر اس قسم کے "قدر دان" بزرگوں کے "دو ٹکڑے" ہو گئے ہیں مثلاً ایک "ٹکڑے" کا خیال ہے کہ ان شذرات میں مُلا رموزی صاحب جس متین شائستہ اور بلند قسم کی ظرافت صرف فرما رہے ہیں زبان اُردو میں اسوقت اس کا جواب نہیں، اور دوسرا "ٹکڑا" کہہ رہا ہے کہ ملا رموزی صاحب کے شذرات لطافت نگاری کے حساب سے نہایت پھیکے اور خشک ہوتے ہیں اس لئے ملا صاحب کو چاہئے کہ وہ اسی قسم کے مضامین کو جاری رکھیں جنہیں پڑھ کر مارے ہنسی کے آدمی آدمی بن جائے اس قسم کے مضامین کے موئیدین میں صوبجات متحدہ کا نامور اور شہرہ آفاق ترجمان اخبار "مدینہ" بجنور سب سے آگے ہے چنانچہ اس مقتدر اخبار نے "مخزن" میں ہمارے شذرات کے "پھیکے پن" پر اپنی اشاعت مورخہ ۹ جنوری ۱۹۲۹ء میں لکھا ہے۔

"ملا رموزی کے طرز انشاء پر کچھ لکھنا ملا صاحب اور ان کے قارئین کی توہین ہے ان کے اس طرز نے ہر شخص کے دل و دماغ پر اپنا تسلط جما لیا ہے البتہ ہم اس قدر کہہ دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے ظرافت نگاری سے متانت نگاری کی طرف جو گریز فرمایا ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض لاغر کے بعد بدمزا غذا دیدی جائے"

اب ان مقتدر ارباب رائے کے خیالات کو جمع کر کے ہمارا فیصلہ ملاحظہ ہو۔ اور وہ یہ ہے کہ کثرت رائے اس طرف ہے کہ شذرات کی خشکی ملی ہوئی ظرافت بہت عمدہ ہے لہذا واضح ہو کہ ہم اس طرف ہیں جس طرف ایڈیٹر صاحب اخبار "مدینہ" ہیں یعنی اس سے ثابت ہوا کہ ابھی ہندوستانیوں میں کافی تعلیم و تربیت کے فقدان کے باعث ادبی ذوق مکمل نہیں اور نہ علمی مذاق میں نکتہ دانی کا وجود، ورنہ عام رائے ہماری اس تحریر کو زیادہ پسند کرتی جس میں ہنسانے کی قوت زیادہ ہوتی ہے لیکن ہے یہ کہ

ابھی ملک میں زندہ دلی خوش طبعی اور تفریحی مذاق کی جگہ خشکی بلغم اور افسردگی کا غلبہ ہے اور عوام تو عوام خواص تک پر سکون طلبی، خموشی اور افسردگی کی موت طاری ہے اور انہیں ہنسا دینے والی تفریحات وتحریکات سے نفرت ہے حالانکہ متانت اور سنجیدگی کے یہ معنی کبھی نہیں کہ آپ کسی شائستہ طریقہ سے دل کھول کر ایک وقت بھی قہقہہ نہ لگائیں یا قہقہہ لگانے والے کو غیر شائستہ سمجھیں جبکہ صحیح تفریح یا ظرافت وہ ہے جو مزاج کے صحیح اعتدال میں تغیر پیدا کر دے اور تغیر قہقہہ سے پیدا ہوتا ہے تبسم سے نہیں۔ پس اس معاملہ میں صحیح رائے والے وہ ہیں جو شذرات میں بے خود بنا دینے والی ظرافت چاہتے ہیں باقی کے سب بلغمی خشک مزاج اور علمی تحقیق کے معاملہ میں منشی تلوک چند ہی دھرے ہوئے ہیں۔
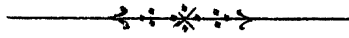
شذرات کے پڑھنے والوں میں زبان اردو کی خدمت اور اس کی حفاظت کا جو ولولہ پیدا ہو چکا ہے وہ ہماری ایک ایسی کامیابی ہے جو ہمارے انا اللہ ہو جانے کے بعد ہماری یادگار کے مزار پر "کتبہ" کا کام دیگی، چنانچہ ایسے ہی باعمل ناظرین میں سے ہمیں باشندگان اڈے پور علاقہ وسطی ہند نے اطلاع دی ہے کہ ہم نے یہاں ایک "انجمن حفاظت و اشاعت اردو" قایم کی ہے، اس انجمن کے ساتھ ایک خالص کتب خانہ اردو ہے، ایک ایسا دار المطالعہ ہے جس میں صرف زبان اردو کے رسالے اور اخبارات آتے ہیں اور "میاں پانیر اخبار" کا گزر بھی نہیں اس انجمن کی طرف سے علاوہ ماہوا مشاعرہ کے ہر ہفتہ ایک ایسا مذاکرہ علمیہ و ادبیہ ہوتا ہے جس میں تمام مضامین زبان اردو کی حفاظت و اشاعت سے متعلق پڑھے جاتے ہیں اسی مجلس کے بانی اور صدر نے ہمیں اپنی اس انجمن کے قواعد و ضوابط بھیجکر ہم سے درخواست کی تھی کہ ان کے اندر اصلاح فرمائی جائے چنانچہ ہم نے اس انجمن کے ارکان کے لئے چند فرائض لکھدئے تھے جنہیں دوسرے حامیان اردو کے لئے یہاں بھی نقل کئے دیتے ہیں۔
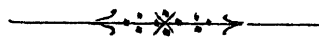
۱۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ خط و کتابت میں زبان انگریزی استعمال نہ کرے اور بغیر شدید ضرورت کے

ے ہماری لئے محفوظ سمجھی جائے۔ حقیظ

۔دو کی عبارت میں ایک حرف اور لفظ بھی انگریزی کا نہ آنے دے۔
۔ اپنا نام یا دستخط ہمیشہ اُردو میں کرے۔
۱۔ لفافے کارڈ، رجسٹری پارسل وی پی منی آرڈر وغیرہ پر اُردو میں پتہ لکھے کیونکہ قانوناً ڈاکخانے
مد ہیں کہ وہ اُردو کے پتے والی چیز کو پہونچا دیں۔
۔ جہاں تک ہو سکے انگریزی اخبارات کی خریداری ترک کر دے اور اُردو کے اخبارات
ھے، چاہے وہ کتنے ہی معمولی حیثیت کے ہوں اس لئے کہ قومی عصبیت اور قومی غیرت کا تقاضہ
ہے کہ اپنی ہر چیز کو پسند اور دوسرے کی ہر چیز کو ناپسند کرے۔
۔ خطوط کے کاغذات اور دکانوں کے تختوں پر نہ خود کبھی انگریزی لکھے نہ دوسرے دکانداروں
ریزی کے تختے لٹکانے دے۔
۔ ڈاکخانوں کے فارموں، شفاخانوں کے نسخوں، ریلوں کے ٹکٹوں اور عدالتی کاغذات میں اُردو
اج دینے کی کوشش میں مصروف رہے،
۔ سوائے شدید ضرورت کے نہ خود کبھی انگریزی میں گفتگو کرے نہ دوسروں کو رعایت دے۔
۔ اگر وہ تقریر یا وعظ یا لیکچر فرمائے تو چاہیئے کہ اپنے بیان کے خاتمہ پر حاضرین کو اردو کی
ت و اشاعت کی تاکید کرے اور ممکن ہو سکے تو اس تاکید میں وہ خود بھی رو پڑے اور تمام حاضرین
ر چھوڑے خواہ آنسو کسی کو نظر آئیں یا نہ آئیں،
۔ اپنے اپنے شہر، قصبے اور گانوں میں ایک "انجمن حفاظت و اشاعت اُردو" قایم کرے جس کے
مد و فرائض یہی ہوں جو ہم نے لکھے ہیں۔
۔ سکولوں کے ماسٹروں، کالج کے پروفیسروں اور دفاتر کے منشیوں کو ہر وقت اردو کی
ت ور ترقی کی طرف متوجہ کرتا رہے، کہ یہی لوگ اصل میں اردو کے بنیادی دشمن ہیں، اور انہی
نگریزی نے اتنا رواج پایا ہے،
۔ اگر کسی اخبار یا رسالے کا خریدار ہو تو ہر ماہ اس کے ایڈیٹر کو خط لکھ کر بتائے کہ آپ نے اس
میں نفس اردو یا زبان اُردو کی ترقی اور اشاعت کے متعلق کوئی مضمون نہیں لکھا کیونکہ فقط
کے رسم الخط میں کوئی اخبار یا رسالہ جاری کر دینا زبان اردو کی خدمت نہیں ہے نہ پچھلے

اساتذۂ اردو کے گزرے ہوئے واقعات کو عہد حاضر میں دہرا دینے سے موجود اُردو میں کوئی [illegible]
ہوتا ہے البتہ عہد حاضر کے اساتذۂ اُردو اور خدام اُردو کے تذکرے اور موازنے مفید ہیں۔

بس یہ وہ ایک اوپر دس فرائض ہیں جن پر ہر وقت نہ فقط عامل رہنا ضروری ہے بلکہ ان
کے خلاف اگر ضرورت ہو تو عدم تعاون، ترک موالات بھوک ہڑتال، خودکشی، اقدام قتل اور بغاوت
تک سے باز نہ رہے بشرطیکہ کسی سزا کا خوف نہ ہو، لیکن اگر گرفتاری کا خطرہ ہو تو پھر ایسی حمایتِ
اردو کو جانے دے بھاڑ میں اور اپنی جان کو بچالے کہ یہ تو طرز عمل ہے آج کل کے لیڈروں کا ؟
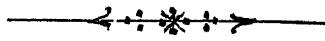
ہمارے "شذراتی حلقہ" سے ایک نہایت مسرت بخش اطلاع یہ ملی ہے کہ ہمارے نہایت
محترم اور جلیل القدر بزرگ میاں محمود علی خان مدظلہ العالی مالک موٹر کمپنی نے عہد فرمایا ہے
آئندہ تمام انگریزی ایجنٹوں اور کمپنیوں سے وہ اردو میں خط و کتابت کریں گے تاکہ اردو [illegible] پائے
اور انگریزی جہاں سے آئی ہے وہاں جائے اس عمل پر جہاں ہم حضرت گرامی قبلہ میاں محمود علی خان
صاحب مدظلہ العالی کو اُن کے اس قابل احترام قومی جذبہ پر مبارک دیتے ہیں کہ وہاں ممدوح
محترم کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ آپ کا یہ عمل کامیاب رہیگا اس لئے کہ انگریز لوگ بالآخر
ایک زندہ تعلیم اور فاتح قوم کے افراد ہیں اُن کی زندگی سرتاسر اصولی زندگی ہے لہذا وہ دوسری اقوام
کی خصوصیات کا احترام کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی مادری زبان اردو ہے اسی لئے وہ
اسے خود بھی سیکھتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی سکھاتے ہیں، اُن کی دکانوں پر اسی غرض کے لئے اردو
کے "منشی لوگ" ملازم ہیں جو اُردو کی خط و کتابت کے جوابات لکھتے ہیں۔ پس اگر ہندوستانی اس بات
کا عہد کرلیں تو نہ فقط یہ کہ اردو کو سارے ہندوستان میں فروغ ہو بلکہ اقتصادی اعتبار سے ایسے
بے شمار ہندوستانی انگریزی کمپنیوں میں ملازم ہو جائیں جو علی گڑھ سے بغیر ختم تعلیم" ٹورنامنٹ
پسندی" کی وجہ سے بھاگ نکلے ہیں اور آج آگرہ کی ٹکٹ کلکٹری تک سے محروم ہیں۔

اخبار "قوم دہلی" کا فایل موجود ہے آپ دیکھ لیجئے کہ ہم آج پانچ سال سے ایسے [illegible]
شاعروں" کے "پیچھے پڑے ہوئے ہیں" جو اپنی جہالت اور کج مج ذناعی کے اثر سے اوبیات اردو [illegible]

غلط تراکیب، مہمل اور بے معنی الفاظ اور بے مقصد شاعری سے زبان اردو کو تباہ کر رہے ہیں لیکن ایسے حضرات کے خلاف ہمارا یہ علمی و ادبی جہاد "مخزن" کے شذرات میں بھی باقی رہا تو پانچ سال کی مسلسل "جیر پھاڑ" سے بالآخر وہ دونوں چیخ اٹھے جو ہماری اس خالص علمی و ادبی تنقید و نکتہ چینی کی زد میں آرہے تھے مگر ان کے ناموں کو ہم نے جو کبھی تحریری وقعت نہ دی وہ اسی لئے کہ اس سے ان کی شہرت میں اضافہ ہوگا اور ہمارا تحریری وقار کم ہوگا۔
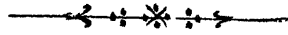
اب اگر ان دونوں کے متعلق اس سے سوا اور صاف صاف کچھ معلوم کرنا ہے تو اخبار "اودھ پنچ" لکھنو "انقلاب" لاہور "عصر جدید کلکتہ" پارس" لاہور" ٹٹو کانفرنس گزٹ" علی گڈھ "پیشوا دہلی" "چیپت دہلی" "مبصر لکھنو" اور اخبار "ہمدم لکھنو" کے فائل تلاش کر لیجئے اور پڑھ لیجئے کہ یہ کون ہیں اور کیا ہیں اگر ان اخباروں میں کچھ نہ نکلے تو ہمارا ذمہ پھر ان کے بعد بھوپال، لاہور۔ دہلی۔ شملہ۔ رام پور ٹونک، جموں۔ کپورتھلہ وغیرہ کو بھی شامل کر لیجئے کیونکہ یہاں بھی آپ کو پیسے دے کر رونے والے اور ملائے پیمانہ وائے پیمانہ کرنے والے مل جائیں گے۔ معاون مدیر مخزن ہیں پوری اور علی گڑھ کے لوگوں کو خط لکھکر دریافت فرما لیجئے کہ آپ کے شہروں میں ان دونوں نے کس طرح بسر کی، اور کچھ ایسے ہی خواص ہیں ان کے کہ اب وہ شذراتی تنقید کے ساتھ ہی ایک "خانگی وجہ سے" ہمارے علمی اعتراضات کے جواب میں ہمارے خلاف ذاتیات پر جو کچھ لکھ رہے ہیں اس سے ثابت ہے کہ ہو بہو ملا رموزی صاحب سے "نہیں ضرور" کوئی مخصوص صدمہ" پہونچا ہے اور اسی لئے وہ آج جو آوازے کس رہے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ادیب و دبیب اور شاعر و اعر تو کیا لیں" بازارتیں "ہیں اور وہ بھی نہ متھرا کی نہ لکھنو کی مگر ذہنیت کچھ اس بری طرح اوندھی کر دی گئی ہے کہ اس پر بھی دعوے ہیں وہی کونجڑے پن کے،

چنانچہ ہم اس سے سوا کچھ نہیں لکھ سکتے کہ ان کی "ادبی کمر" آج توڑ کر رکھدیں اور ثابت کر دیں کہ ان کا اردو کو تباہ کرنا محض اس جذبے کے تحت ہے کہ

یدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟

ورنہ یہ جو کچھ جانتے ہیں وہ اور اس پر ان کے افلاطونی دعوے ملاحظہ ہوں، مثلاً بنی اسرائیل اسٹریٹ اپنی اشاعت مورخہ ۹ نومبر ۱۹۲۹ء میں لکھتی ہیں اور اپنے اُن کے لئے لکھتی ہیں کہ۔

علامہ .... نے کسی بنئے کی گود میں بسر نہیں کی ہے بلکہ فاضلان علوم مشرقیہ کے سامنے زانوے ادب دطے، کرکے عربی فارسی میں سند فاضلیت حاصل کی ہے۔"

دیکھا یہ دعوے اور سند یافتہ زادے کی اُردو! میں لفظ دطے، کی بڑی طوئے کو اب ایمان سے کہئے کہ جس جاہل کی املا تک صحیح نہ ہو اور جو "تہہ" کرنے کو "طے" کرنا۔ لکھے پھر وہ ایک اخبار کا ایڈیٹر بھی ہو اور "الہامی" شاعر بھی، اب دیکھیں۔ یہ "لونڈا" اپنی اس بھونڈی غلطی پر اور آنے والی غلطیوں پر اپنے معاون اور سرپرستوں کے سامنے کیا بہانہ پیش کرتا ہے؟ اچھا اب اس جاہل شاگرد کے "فاضل علوم مشرقیہ اور سند یافتہ" اُستاد کی کوئی بڑی علمی و ادبی قابلیت تو رکھئے کسی طاق پر ملّا رموزی صاحب کی اس تلاش کی داد دیجے کہ اس "فاضل علوم مشرقیہ" کی جہالت کے ثبوت میں وہ اسی کی تحریر سے ایسی غلطیاں نکال لائے ہیں جن سے ان کی "سند فاضلیت" دس جگہ سے پھٹ کر رہ جائیگی چنانچہ یہ فاضل صاحب اپنی اشاعت مورخہ ۱۴ / نومبر ۱۹۲۹ء کے صفحہ نمبر ۹ پر ایک مطلع عرض کرتے ہیں۔ کہ بس

ہندو شر و فساد کا عادی ہے
مسلم کا غرور و غیض بنیادی ہے

لیجے اس جاہل شاگرد نے تو لفظ "تہہ" کو "طے" لکھدیا تھا اور اس فاضل علوم مشرقیہ اور سند یافتہ اُستاد نے لفظ "غیظ" کو "غیض" لکھکر اس تاریخی جہالت کا ثبوت دیا ہے جو اب مٹائے نہیں مٹ سکتا۔

اب پڑھے لکھے لوگوں میں علامہ سند یافتہ کے لئے لفظ "غیض" کی ایک تاویل رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ "کاتب کی غلطی تھی" لیکن آپ یورپ کے۔ انگریزی کاتبوں تک کو جمع کر لیجے وہ کہدیں کہ ہم لوگ کبھی لفظ "غیظ" کو "غیض" نہیں لکھ سکتے .... تہہ۔ کو طے، اور، غیظ، کو، غیض، لکھدینا کسی کاتب کا کام نہیں صرف انہی جاہلوں کا کام ہے اور اس لئے آج ملّا رموزی صاحب کی پانچ برس کی مسلسل نکتہ چینیوں اور اعتراضات

کا ایک جواب بھی ان دونوں سے نہ بن آیا،

اور چلئے علامہ سند یافتہ کی صحیح اردو کے اور نمونے ملاحظہ کیجیے جو آپ نے ۱۴ نومبر ۱۹۲۹ء کے اخبار "ٹوپی آگرہ" میں اپنے ذاتی قلم سے پیش کئے ہیں مثلاً صفحہ نمبر ۵ پر آپ نے نعش کو "لاش" لکھا ہے اور متعدد بار "لاش" لکھا ہے بے چارے کو کیا خبر کہ لفظ "لاش" غلط ہے وہ تو جاہلوں کی نقل کرتے ہیں اس لئے کہ علوم مشرقیہ کے فاضل اور سند یافتہ ہیں، اور چلئے اسی لفظ سے آگے چلکر آپ نے جامعہ از ہر مصر کی عربی یوں لکھی ہے کہ

"جس نے علم الدین کو فدایت کے جذبات سے معمور کر کے زندہ جاوید کر دیا"

اب اگر اس لفظ کو ابو الکلام آزاد نے لکھا ہو تو لکھا ہو ہم نے تو گاندھی صاحب تک کی اردو میں اس لفظ کو نہیں دیکھا،
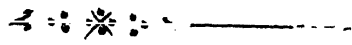
اب آپ کے شعری ٹپے کے دو چار ہاتھ ملاحظہ ہوں، ارشاد عالی ہے۔

ع۔ یہ اعراض اور یہ ضد جمعیتہ العلمار سے بے جا ہے
کہ جمعیت سے ہٹنا ہی بہک جانا ہے مولانا

اب فصاحت، بلاغت، بیان، عروض، اور انگریزی کی کتابوں تک سے آپ ثابت فرما دیجے کہ ایسی "شعری ضرورت" جائز ہے جس میں لفظ "علمار" "آل ما" ہو جائے۔ شعر ملاحظہ ہو۔ ع

تبصرہ ہے اولیّات زمانہ پر فضول
اے مصور واقعاتِ حال کی تصویر کھینچ

لفظ اولیّات، کے بعد اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ کوئی "آخریّات" اور لکھ دے۔

ایک جگہ آپ نے اپنی میزان منشعب کو یوں خراب کیا ہے کہ "لنڈن ٹائمز سے مقتبس کر کے" لکھ مارا ہے یہ مقتبس کر کے اقتباس کر کے کی فصاحت کی بلاغت ہے، (کیا سمجھے!) ایک جگہ بڑی سلیس اردو یوں لکھی ہے کہ "ان کی نعش ۱۴ دن تک زمین میں بے کفن دفن رہی" یہ زمین نعش کا بے کفن تو خیر مگر یہ بے دفن ہے نا آسان اردو؟

صفحہ نمبر ۵ کالم نمبر ۲ کی سطر نمبر ۷ میں پھر میزان منشعب شروع ہوئی ہے کہ "آج فی زمانہ نظم وسکون نہیں" اب لفظ فی زمانہ، کے سیدھے ہاتھ کی طرف لفظ آج کا اضافہ علامہ پن نہیں تو کیا "ابوجہل پن" ہے؟ صفحہ نمبر ۵ کالم نمبر ۳ سطر نمبر ۴ میں لکھا ہے کہ "تعلیم سے جو لاپروائی کیگئی" امان استغفر اللہ یہ لفظ "پروائی" کہاں کا صحیح تھا جو اس پر آپ نے لا اور ٹھونس مارا؟ اسقدر عربی کے بعد آپ نے "جدید فارسی" میں یوں طبع آزمائی فرمائی ہے کہ "لیکن تاہنوز کوئی فیصلہ نہ ہوا" ہنوز، پر یہ تا کا اضافہ زبان کی غلطی تو کیا وسعت ہی سمجھو! فصاحت بلاغت اور صحیح اردو کے چند جملے ملاحظہ ہوں،۔

بے جا نگاری،

غلط ایثاری،

صدرِ کانگریس،

یہ صدر کانگریس ترکیب کے لحاظ سے اردو میں ایک طرح کا ۔ اینگلو پرشین آئیل کمپنی کا اکبر آبادی ایجنٹ ہے۔ ۲۸ نومبر کی اشاعت میں لکھا ہے "علو ہمتی" بہبودی، اندیشناک تینوں کے تین غلط اور بالکل غلط الفاظ ہیں۔

یہاں تک تو تھی علامہ سند یافتہ فاضل علوم مشرقیہ کی صحیح اردو اب آپ کی وہ اردو ملاحظہ ہو جسے آپ رواج دیکر ادب اُردو میں نہ فقط مہمل نگاری اور غلط الفاظ کا ذخیرہ بہم پہونچا رہے ہیں۔ بلکہ رام پرشاد قسم کے ہندوستانیوں کے لئے زبان اردو کا بولنا اور لکھنا حرام کر رہے ہیں، ایسی طویل وعریض اردو آپ کے صفحہ نمبر ۸ پر یوں پھیلی پڑی ہے کہ

جیسے تم گناہ کہتے ہو اس کی صحبتوں میں بہت سی حسین سانسیں رنگینیاں برساتی ہیں۔

"گنار ساحل پر صبح کی بلیغ فضاؤں میں حسن کی عریانیوں کو بھیگا ہوا دیکھتا ہے اپنے منظر محمود کے علاوہ کہیں اور تلاش کرنا کفر نظارہ سمجھتا ہے، ایک خموش جوش کے ساتھ اُس کے رخسار"

کی ملاحت میں اپنے گرم گرم تنفس کو کھو کر اس نے عجز
مصلحت کے سادہ لہجہ میں کہا۔
تمہارا ہر لفظ حروف مقطعات کی طرح بغیر تفہیم معانی لائق تعظیم
اور میرے لئے مسجود اعتقاد ہے میرے دل میں جذبات گناہ
بنائے ہیں، تمہاری نوازشات سے شرمندہ مست ہو کر تمہارے
قدموں کی وسعت کو سجدۂ زار بنا دیتا ہوں"
اس عبارت کو بھی مسلم یونیورسٹی امتحان کے پرچوں میں نہ دے تو ہوگی نا یونیورسٹی جاہل؟

اب علامہ سند یافتہ کے بعد تھوڑی سی اردو" بنی اسرائیل اسٹریٹ" کی ملاحظہ ہو، چنانچہ بنی اسرائیل اسٹریٹ، آج کل جو اخبار نکال رہی ہیں اس میں خود تو بہت کم لکھتی ہیں البتہ آپ کی امداد پرچو" دوسرے علامے" ہیں وہ اس کے مضامین لکھ دیتے ہیں، لیکن جب کبھی آپ خود "قمطرازی کی مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں" تو سطر سطر سے آپ یوں پھوٹ پڑتی ہیں کہ الگ پہچان جائیے چنانچہ آپکی صحیح اور فصیح اردو کے چند جملے آپ کی اشاعت مورخہ ۹ر نومبر و ۲۱ر نومبر ۱۹۲۹ء سے ملاحظہ فرمائیے ارشاد عالی ہے،

تکان سفر،
نہائت خلوص اور عمق قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں،
اب آپ کے اس "عمق قلب" کا توڑ یہی ہوگا کہ کوئی لکھدے کہ فی الحال تو میں سطح قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں آئندہ "عمق قلب سے" شکریہ ادا کروں گا، پھر ارشاد ہوتا ہے۔
اپنی عدم تندرستی کا اظہار کیا،
غیر سعادت مندانہ،
اس کے بعد غیر متفرقہ طور پر۔
یہ "عدم تندرستی" اور "غیر متفرقہ طور پر" ہمارے استاد قبلہ مکرم مولانا محمود علی خان صاحب مولوی فاضل کا یہ ظریف فقرہ چست ہو سکتا ہے کہ ابھی تو آپ "عدم شادی ناکردہ شدہ ہیں"

یعنی ۔ ناکتخدا، اور سنئے ۔

برخلاف اس کے،

محبتانہ اقدام۔

کہئے لفظ محبتانہ سے الفتانہ، عنایتانہ راحتانہ، غرض آپ کا ہر قسم کا "تانا بانا" جائز ہوگیا نا؟ چنانچہ اسی وزن پر آپ نے ذرا آگے چلکر لکھا ہے "سیاسیات کو اپنی حکمرانہ سیاست سے دیا دیا"

پیشگی شکریہ کے موقع پر آپ نے لکھا ہے "شکریہ پیشین ادا کرتے ہیں" اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی عمر کے کس حصہ میں پہونچکر ہمارے ان اعتراضات کے جوابات عطا فرماتے ہیں؟ اور ان دونوں کے قدردان ان سے اب کیا کہیں گے اور یہ اپنے قدردان حضرات کو ان غلطیوں پر کیا عذرات پیش فرمائیں گے؟ پھر یہ بھی دیکھتے جائیے کہ ان کے اخبارات دنیا میں کے دن کے مہمان ہیں؟

افسوس کہ اصلاح زبان کی ذمہ واری اور حفاظت اُردو کی خدمت نے اس ناقابل اعتنا تنقید پر مجبور کردیا اس لئے اس مہینے کا تبصرہ اردو وضاحت سے اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ "زکات" کے جلسہ کا وقت بہت کم رہ گیا ہے اور ہمیں کہنا تھا بہت کچھ لہذا اس مرتبہ بغیر کسی اظہار رائے کے ان اطلاعات کو نقل کئے دیتے ہیں جو اس ماہ میں زبان اردو کے متعلق وصول ہوئی ہیں چنانچہ "ہر قسم کی زبان اردو والوں کے لئے" یہ اطلاع کس درجہ عبرت انگیز اور سبق آموز ہے کہ بقول اخبار "مہاجر" دیوبند مورخہ ۲۱ر نومبر سنہ ۱۹۲۹ء ۔

ا۔ "راجہ صاحب شاہ پور نے زبان ہندی کی ترقی و اشاعت کے لئے نصف لاکھ روپیہ کی رقم دی ہے"

۲۔ ۱۲ر نومبر سنہ ۱۹۲۹ء کا اخبار "مدینہ بجنور" لکھتا ہے کہ ای، آئی ۔ آر کمپنی نے اپنے ہاں کے ٹکٹوں پر سے زبان اردو کو اڑا دیا ہے صرف انگریزی اور ہندی کو باقی رکھا ہے ۔

۳۔ علاقہ برما میں زبان اردو کے خلاف کوشش شروع ہوگئی ہے جس کے رہنما حضرت ہاشم صاحب

شیو سے یو نے ۹ر اکتوبر کے اخبار "ڈیلی نیوز رنگون" میں ایک مضمون اردو اور برمی زبان کے مقابلہ پر لکھا ہے اسی اخبار میں کبھی اُردو کے موافق بھی مضامین شائع ہوئے ہیں اب دیکھیں فتح کس کی ہو؟ کلکتہ کے ایک ظریف اخبار معروف بہ "چونچ" نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء کے افتتاحیہ میں تمام اخباروں کو صاف سلیس اور دھلی ہوئی اُردو لکھنے کے لئے متوجہ کیا ہے اور خود بھی وہ اس پر عامل ہے۔ اگر "چونچ" کی یہ آواز سن لی گئی تو حقیقت میں یہ اردو کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ اور اسی لئے "چونچ" کی خریداری کے لئے ہم انگریزوں تک سے سفارش کرتے ہیں

مُلّا رموزی

اہل قلم حضرات سے گذارش

کلکتہ میں ایک لائبریری "مسلم لٹریری سوسائٹی" کے عنوان سے گذشتہ دس سال سے قائم ہے، جس کے سرپرست کلکتہ کے مشہور وکلا بیرسٹر پروفیسر ہیں۔ اگر ہمارے اہل قلم حضرات اپنی تصانیف تالیفات اور جرائد کو بنگال کے وسیع رقبہ ارضی میں ہر اہل نظر و اہل علم سے روشناس کرانا چاہتے ہیں تو مسلم لٹریری سوسائٹی کے نام ارسال فرمائیں۔

۱۔ مسلم لٹریری سوسائٹی انکی ترویج و اشاعت کی پوری کوشش کریگی - ۲- اور اگر ممکن ہوگا تو سوسائٹی کی طرف سے قیمت بھی ادا کر دیجائیگی - ۳- البتہ سوسائٹی کے پاس کوئی بڑا سرمایہ نہیں کہ ہر کتاب و اخبار پوری قیمت دیکر خرید سکے۔ اس لئے اہل قلم حضرات اس کے ساتھ کوئی رعائت فرما سکتے ہوں تو اس سے دریغ نہ کریں۔

سوسائٹی مذکور کا مقصد اردو زبان کی ترویج و اشاعت ہے اور ہمارے اہل قلم حضرات کا مقصد بھی یہی ہے اسلیئے سوسائٹی کے ارکان اور اہل قلم حضرات ایک برادرانہ رشتۂ اتحاد میں منسلک ہیں اس لئے سوسائٹی ... کی ہمدردی کے لئے آغوش کشادہ ہے، اگر آپ کو کوئی مضائقہ نہو تو اپنی تصنیف اخبار یا رسالہ ... جاری ... خط وکتابت کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ ہم اپنے فرض سے کبھی اغماض نہ کریں گے۔

سکرٹری مسلم لٹریری سوسائٹی ۱۳ چاندنی چوک سیکنڈ لین۔ کلکتہ۔

مسٹر عبد الغنی خانصاحب (علیگ) ٹیلیگراف بصرہ

چمڑے کی صنعت نے یورپ کے عروج میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ بہت کم لوگ اس امر سے واقف ہوں گے کہ لوہا اور چمڑا دو ایسی چیزیں ہیں کہ جن پر مہذب دنیا کے امن و جنگ کا دارومدار ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی اس قدر ترقی کے باوجود انسان ابھی تک چمڑے کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہوا بلکہ وہ اس کا روز بروز زیادہ محتاج ہوتا جاتا ہے۔

ہر انچہ کے بدلے ایک اشرفی

میں جانتی ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں چمڑے کی تجارت کافی ہے اور پنجاب کے مسلمانوں نے اس بارے میں خصوصیت کے ساتھ ترقی کی ہے لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ ہندوستان سے جس قدر خام چمڑا مغربی ممالک کو بھیجا جاتا ہے اگر اس سے وہ پوری خدمت لے تو ہر انچ کے بدلے ایک اشرفی حاصل ہو جس کو آج یورپ و امریکہ کے تاجران چرم حاصل کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ ہندوستان سے کس قدر خام چمڑا یورپ میں آتا ہے اور اس سے یہاں کیونکر روپیہ پیدا کیا جاتا ہے۔

سوا کروڑ کا ہندوستانی چمڑا۔

جرمنی میں جس قدر چمڑا جنگ یورپ سے پہلے آتا تھا اب پھر اُسی مقدار میں آنے لگا ہے۔ کیا آپ اس کو باور کریں گے اگر میں یہ کہوں کہ صرف میرے ملک میں ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے کی قیمت کا چمڑا ہر سال آتا ہے۔ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ انگلستان۔ فرانس اور اٹلی میں کس قدر چمڑا ہندوستان سے آتا ہو گا۔ امریکہ اس چیز کا ایک اور بڑا خریدار ہے۔ جس پر چمڑے کی تجارت کا بہت کچھ انحصار ہے۔

جرمنی میں چمڑے کی تعلیم

جرمنی میں چمڑے کی تعلیم کا خاص انتظام ہے جس سے میں چاہتی ہوں کہ میرے ہندوستانی مسلمان بھائی فائدہ اٹھائیں۔ مقام فرائی برگ میں چمڑے کی تعلیم کا ایک کالج ہے جس کے ساتھ ایک کارخانہ بھی ہے۔ اس درسگاہ میں چمڑا

طالب علم جوق جوق آتے ہیں اور اگر ان کو سائنس میں کچھ دسترس ہوتی ہے تو وہ تین ہی مہینے کی مدت قلیل میں یہاں سے ماہر فن ہوکر نکلتے ہیں۔ جرمنی میں ایک عظیم الشان انجمن ہے جو محض چمڑے کی صنعت کو فروغ دینے کیلئے قایم ہے۔ یہ انجمن اس درس گاہ کی سرپرست ہے جس کو حکومت جرمنی سے بھی کافی امداد ملتی ہے۔

جنگ میں ماہرین کی خدمت۔

جنگ یورپ سے پہلے یہ درس گاہ صرف کارخانوں کیلئے ماہر فن آدمی مہیا کرتی تھی۔ دوران جنگ میں فوجیوں کو بھی اس میں بھیجا گیا۔ اور اُنھوں نے صنعت چرم میں مہارت حاصل کرکے جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ حتیٰ کہ مصنوعی چمڑا بھی اُنھوں نے اس مدرسے کی بدولت بنالیا جو بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اس درس گاہ میں بارہ ماہر فن لکچرار ہیں۔ کورس ایک سال کا ہے۔ ۱۵- اپریل سے ۱۴- اپریل تک۔

اس درس گاہ میں کیا کیا سکھایا جاتا ہے۔

ہندوستانی طالب علم جو اس درس گاہ میں کام سیکھنا چاہیں اُن کو چاہئے کہ پہلے کسی ہندوستانی چمڑے کے کارخانہ میں چھ سات بلکہ دس بارہ مہینے کام سیکھیں یا کسی تاجر چرم کے پاس کام کریں تاکہ اُن کو اس فن سے کچھ واقفیت ہوجائے کیمسٹری جاننے والوں کو بہت آسانی ہوتی ہے اور اگر وہ اپنے ہمراہ کسی تاجر چرم یا کسی کارخانہ چرم کا سرٹیفکٹ لائیں تو داخلہ میں بہت سہولت ہوتی ہے۔

درس گاہ مذکور میں حسب ذیل کام سکھائے جاتے ہیں :-

چمڑے کی شناخت۔ جوتوں اور دستانوں کیلئے چمڑے کی تیاری مختلف کاموں کے چمڑے کا انتخاب اور ... ست۔ فوج کے لئے چمڑا تیار کرنا۔ پوشاک صندوق۔ بیٹ اور دیگر قسم کی ضروریات کیلئے چمڑا بنانا اور رنگنا۔

درس گاہ میں طلبا کو تمام کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے طلبا بہت جلد اس فن میں ماہر ہوجاتے ہیں۔ اُن کو چمڑے کی کیمسٹری۔ حساب کتاب۔ ڈرائنگ وغیرہ میں ماہر بنایا جاتا ہے۔ چمڑے کے متعلق ہر قسم کی مشینوں کے لگانے اور ... نے کا کام بھی سکھایا جاتا ہے اور دباغت اور رنگ سازی بھی ہر قسم کی سکھائی جاتی ہے۔

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو۔

دیگر ممالک سے طلبا جرمنی میں اس صنعت کے سیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ اس درس گاہ میں تقریباً ۸۵ فیصدی طلبا دیگر ممالک مثلاً امریکہ انگلستان۔ جاپان کے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان طلبا کیلئے بالخصوص یہاں اچھے

مواقع ہیں بشرطیکہ وہ اپنے گھر سے نکلنا اور اس نفع بخش صنعت کے ساتھ اپنے گھر میں آنا گوارا کریں۔ ایک سال کا خرچہ تقریباً ایک سو پونڈ ہے مسلمان اگر کوئی ایسی قومی انجمن بنالیں جو طلباء کو اپنے خرچ پر یا قرض دیکر یہاں بھیجے تو بڑی اچھی بات ہے۔

پنجاب میں ۵۰ - ۶۰ کارخانے کھل سکتے ہیں۔

مسلمان اگر چاہیں تو ہندوستان کے اندر چمڑے کے عظیم الشان کارخانے قائم کرسکتے ہیں میں کانپور اور بعض دیگر مقامات کے کارخانوں سے واقف ہوں کوئی وجہ نہیں کہ ہر جگہ مسلمان اس قسم کے کارخانے قائم کرکے حوصلہ مندی نہ دکھائیں۔ میرا اندازہ ہے کہ صرف پنجاب ہی میں پچاس ساٹھ کارخانے بآسانی قائم ہو سکتے ہیں کیونکہ ممالک یورپ اور امریکہ میں زیادہ تر چمڑا اسی صوبہ سے آتا ہے۔ جرمنی کے سیکھے ہوئے طلباء انتظام نگرانی اور بھرائی کا کام ان کارخانوں میں کریں۔ عام لوگوں سے ان میں مزدوروں کا کام لیں۔ اس ترکیب سے یہ کارخانے فروغ پا سکتے ہیں۔

بیوقوف داناؤں کیلئے روزی مہیا کرتے ہیں۔

میں چاہتی ہوں کہ مسلمان نوجوان اس اہم اور مفید فن کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور سرمایہ دار اپنا سرمایہ ان کارخانوں میں لگائیں۔ اس صنعت میں تیس چالیس بلکہ پچاس فیصدی اضافہ بآسانی ہوسکتا ہے۔ صرف ہمت۔ حوصلہ اور سرمایہ درکار ہے۔ چمڑا درحقیقت دولت اور عزت کا خزانہ ہے۔ اصل کیمیا اور سنگ پارس ہے۔ لیکن ہندوستان کے لوگ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ایک فرضی کیمیا کی دھن میں لگے ہوئے ہیں اور نہایت ارزاں داموں پر خالص چمڑا ممالک یورپ وغیرہ کو فروخت کر دیتے ہیں اور پھر اسی چمڑے کو نہایت گراں قیمت میں واپس خرید لیتے ہیں۔ جرمنی زبان کی ایک ضرب المثل ہے کہ "بیوقوف عقلمندوں کے لئے روزی مہیا کرتے ہیں"۔ یہ مثل ہندوستان والوں پر بالکل صادق آتی ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا بہترین سرمایہ عام چمڑے کی شکل میں غیر ممالک کو بھیجدیتے ہیں اور تھوڑے سے منافع پر قانع ہو جاتے ہیں پھر ایسا ملک ترقی کیونکر کرسکتا ہے۔ بے فائدہ شور و غل مچانے کی بجائے اگر ہندوستان کے مسلمان اس صنعت کی طرف توجہ کریں تو پھر پورے خزانوں کے مالک بن جائیں۔

مندرجہ بالا مضمون ایک جرمن مسلمان خاتون کا ہے۔ جو ۲۲۔ جولائی ۱۹۲۸ء کے "ہمدرد" میں شائع ہوا تھا۔ معلوم نہیں اس پر مسلمانانِ ہند نے اس وقت تک کیا توجہ کی اور عملاً کیا کیا۔ بہرحال اس کو پڑھ کر میرا دل بے اختیار تڑپ اُٹھا اور میں نے فوراً تحقیق حالات کیلئے مذکورہ درسگاہ سے براہِ راست خط و کتابت شروع کی جہاں سے ان تمام حالات کی تحقیق ہوگئی اور معلوم ہوا کہ:۔

(۱) اس ایک سال کے کورس کی فیس غیر ممالک کے طلباء سے ۳۳ ڈالر ہیں (تقریباً ۹۲۴ روپے)۔

(۲) وہاں کے قیام کے جملہ اخراجات جس میں کھانا پینا بورڈنگ کا قیام وغیرہ سب شامل ہیں تقریباً ۶ پونڈ سے ۱۲ پونڈ ماہوار تک .... (گویا اوسطاً ایک سو روپیہ ماہوار)

(۳) داخلہ کے لئے طلبار کی عمر کم از کم ۱۸ سال اور کسی چمڑے کے کارخانہ میں کم از کم ایک سال کی مدت کا عملی تجربہ ہونا لازمی ہے۔

(۴) تعلیم چونکہ جرمنی زبان میں دی جاتی ہے اس لئے طلبار کو وہاں پہنچنے تک کچھ جرمنی زبان بھی سیکھ لینا بہت مفید ہے۔ ہندوستانی طلبار کو انگریزی کی لیاقت کم از کم انٹرنس تک۔ کی ضرور ہو تاکہ جرمن زبان جلد سیکھی جاسکے اس لئے کہ جرمن زبان فرانسیسی اور انگریزی کا رسم الخط ایک ہی ہے محض الفاظ میں فرق ہے جس طرح فارسی اردو وغیرہ۔

(۵) جن طلبار کو کسی چمڑے کے کارخانہ میں کم از کم ایک سال کا عملی تجربہ نہ ہو اور نہ ہی جرمن زبان سے واقفیت ہو لیکن انگریزی کی لیاقت خاصی ہو اُن کو اُس درس گاہ میں داخلہ سے قبل ایک سال کی مدت مزید کیلئے فرائی برگ کے چمڑے کے کارخانہ میں جو اس درس گاہ سے ملحق ہے عملی تجربہ حاصل کرنے کیلئے داخلہ کی اجازت دی گئی ہے۔ اس ایک سال کی مزید مدت میں وہ وہاں رہ کر جرمنی زبان بھی بخوبی سیکھ سکتے ہیں۔ اس صورت میں ان کو محض دس ڈالر ماہوار کی فیس اس کارخانہ کو دینا ہو گی۔ گویا ایک سال کی فیس مزید۔ ۱۲۰ ڈالر (تقریباً ساڑھے تین سو روپے)

(۶) اس درس گاہ میں ہر سال ۱۴۔ جولائی سے ۱۵۔ اگست تک اور ۲۳۔ دسمبر سے ۳۔ جنوری تک کی تعطیلات ہوتی ہیں جن میں طلبار اگر چاہیں تو ملک جرمنی یا ملحقہ ممالک یورپ مثلاً فرانس انگلستان وغیرہ کی سیر بھی بآسانی اور کم خرچہ میں کر سکتے ہیں۔

(۷) مندرجہ بالا معلومات ... ہندوستان سے جرمنی کا سفر اگر براہِ خشکی یعنی براہِ بصرہ۔ بغداد۔ بیروت وغیرہ بذریعہ موٹر کیا جائے تو خرچہ بھی بہت کم اور تقریباً تمام بلاد اسلامیہ اور ممالک یورپ کی سیر بھی خود بخود ہو سکتی ہے۔ ایک طرف کے خرچہ کا تخمینہ اس راستہ سے چھ سو روپیہ ہیں۔

میرا ارادہ خود یہاں کی موجودہ چار سو روپے ماہوار کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل ہو جانے کے بعد جرمنی جا کر اور یہ صنعت سیکھ کر اپنے وطن ہندوستان آنے کا ہے لیکن یہ کام ... نہیں کہ محض ایک آدمی سیکھ کر آجائے اور کارخانہ جاری کر دے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے میری رائے میں ایک باقاعدہ رجسٹرڈ لمیٹڈ کمپنی یا ایسی انجمن بنانے کی ضرورت ہے جس کا سرمایہ کم از کم ایک لاکھ روپیہ ہو اور جو کم از کم چار یا چھ ہونہار اور ہوشیار طلبار کو اپنے خرچ سے یا قرضہ دیگر ان شرائط پر یہ صنعت حاصل کرنے کیلئے جرمنی بھیجے کہ وہ واپس آکر اس کمپنی کے قائم کردہ کارخانے یا کارخانوں میں ایک معینہ مدت تک ایک معینہ تنخواہ

تنخواہ پر کام کریں گے یا اُن کی اس تعلیم پر تمام خرچ شدہ رقم مع پانچ فیصدی سالانہ اضافہ کے اس کمپنی کو باقساط واپس کردیں گے۔

اس کمپنی کے ایک ایک سو روپے کے ایک ہزار حصے ہوں جن کی قیمت فی الحال پچاس فی صدی اس صورت میں وصول کی جائے کہ ۲۵ فی صدی فوراً درخواست کے ساتھ اور بقایا ۲۵ فی صدی فی حصہ ماہوار کے حساب سے ادا ہو کر یہ تمام رقم امپیریل بنک آف انڈیا یا کسی اور معتبر بنک میں جمع ہوتی رہے اور اس رقم میں سے فی الحال چار یا چھ طلبا جن کو اس کمپنی کے ڈائرکٹر منتخب کریں مندرجہ بالا شرائط پر جرمنی بھیجے جاویں۔ ان طلبا کی جرمنی سے واپسی پر بقایا پچاس فیصدی کی رقم خریداران حصص سے وصول کی جا کر اوّل ایک کارخانہ کھولا جائے اور پھر بتدریج اس کاروبار میں اضافہ کیا جائے۔ کم از کم دس حصص کا خریدار کمپنی کا ڈائرکٹر منتخب کیا جا سکے۔

آج کل مسلمانان ہند اپنے بچوں کو اس موہوم اُمید پر اعلےٰ تعلیم دلانے میں سرگرداں ہیں اور خود یہ نوجوان طلبا بھی ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد ایسی کوششوں میں محو ہیں کہ کسی طرح اعلےٰ تعلیم حاصل کر لیں تاکہ فوراً گورنمنٹ کے کسی محکمہ میں اعلیٰ عہدے کے حصول میں کامیابی حاصل ہو۔ کاش زمانہ کی موجودہ رفتار اور خود ان کا مبلغ علم اُن پر یہ حقیقت روشن کر سکتا کہ یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ سب کے سب مسلمان نوجوان اعلےٰ تعلیم پا کر اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہو سکیں۔ اعلیٰ تعلیم کی خوبیوں سے بشرطیکہ یہ تعلیم تعلیم کے لئے حاصل کی جائے نہ کہ حصول ملازمت کیلئے۔ آج دنیا میں کسی کو انکار نہیں لیکن مسلمانانِ ہند کو کیا افرادی اور کیا مجموعی قومی حیثیت سے ترقی کرنے اور موجودہ افلاس کو رفع کرنے کیلئے جس چیز کی اشد ضرورت ہے وہ مفلس اور متوسط درجہ کے محض لڑکوں کی اعلےٰ تعلیم نہیں بلکہ عام لڑکوں اور لڑکیوں کی خصوصاً ابتدائی اور ثانوی تعلیم صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف فوری توجہ کی ہے۔

آج جس قدر روپیہ اور قیمتی وقت مفلس اور متوسط طبقہ کے مسلمان محض اپنے لڑکوں کی اعلیٰ تعلیم کے حصول میں آنکھیں بند کئے ہوئے اور نتائج سے بے خبر صرف کر رہے ہیں کاش اسی کو وہ صحیح مصرف میں لگانے کی طرف متوجہ ہو جائیں تو چند ہی سال کی مدت میں وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس کا نتیجہ خود اُن کی ذات کے لئے۔ خود اُن کے خاندان کے لئے اور اُن کے ملک و قوم کے لئے کس درجہ مفید اور بااثر ثابت ہوا اور اُن کا روز افزوں افلاس اور بے روزگاری کس قدر جلد رفع ہو جائے۔ کاش اس پر اُن کا یقین اور ایمان ہو۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

میں بذاتِ خود اس کمپنی کے باقاعدہ رجسٹرڈ ہو جانے کی صورت میں حصص خریدنے اور جرمنی جانے کیلئے تیار رہوں اس لئے میں ان تمام بزرگانِ قوم اور محبان ملک حضرات سے جو میری اس تجویز رائے سے اصولاً متفق ہوں اور اس میں شریک ہونا پسند فرمائیں ملتجی ہوں کہ جلد از جلد اپنی قیمتی آرا اور مشوروں سے اس خاکسار کو مندرجہ ذیل پتہ پر مطلع فرماویں تاکہ اس معاملہ میں کوئی قدم بلا مزید تاخیر کے اُٹھایا جا سکے۔

جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا ہے اُس اسکیم کا محض ایک سطحی خاکہ ہے جو میرے دماغ میں ہے۔ جن حضرات کو اس سے واقعی دلچسپی ہو وہ اس کو مکمل کرنے کے لئے حسب ضرورت اور مفید مشورے اور اصلاحیں تجویز فرما سکتے ہیں۔

عبدالغنی۔ آفیسر انچارج ٹیلگراف۔ اسٹور

بصرہ۔ عراق۔

غزل

جناب حکیم فیروز الدین طغرائی

محفلِ اُنس میں پابندئ آداب نہیں
ہم کو بھی تاب نہیں آپکو بھی تاب نہیں

دل سے پیدا ہے مرے نغمۂ غم بے تحریک
یہ ہے وہ ساز کہ شرمندۂ مضراب نہیں

آہ لبریز عبارات الم ہے ہستی
اس صحیفے میں مسرت کا کوئی باب نہیں

غم بھی ہم کھاتے ہیں رہتی ہے غشی بھی طاری
کون کہتا ہے ہمیں میل خور و خواب نہیں

جب پھری آنکھ اُدھر سے نکل آئے آنسو
گردشِ چشم کم از گردشِ دولاب نہیں

نہ ملا پر نہ ملا دہر میں ہمدم کوئی
گرچہ ظاہر میں یہ وہ شے ہے کہ نایاب نہیں

ایبٹ آباد ہے سرسبز مقام اے فیروز
کونسی جا ہے جہاں سبزۂ شاداب نہیں

زمانۂ حاضر کے نو عجائبات

(غیر معروف جرنلسٹ کے قلم سے)

مصر کے مینار۔ بابل کے معلق باغات۔ اشیائے کوچک میں موسولس کا مقبرہ۔ ایفسس میں ڈائنا کا مندر۔ روڈس کا کولوسس۔ وادیٔ اولمپیا میں جوپیٹر کا مجسمہ۔ اسکندریہ میں روشنی کا مینار۔ عہد قدیم کی متمدن تہذیب کا مظہر متصور کئے گئے ہیں۔ ان میں وادیٔ نیل کے مینار ابھی تک فراعنۂ مصر کی ہیبتناک حکمرانی اور بے شمار غلاموں کی پیہم و متصل مشقت کا پتہ دیتے ہیں۔ اور ریت میں اسفنکس (ابوالہول) کی بڑی بڑی پراسرار آنکھیں پچاس صدیوں سے انسانی تہذیب کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ اگر کل مورخ ہیروڈوٹس نہیں دیکھ کر لرزہ براندام ہو گیا تھا۔ تو آج ایک ہانپتا ہوا امریکن سیاح اُن سے دوچار ہو کر تھوڑی دیر کے لئے مرعوب ہو جاتا ہے۔ ان میناروں اور ابوالہول کے سوا عہد کہن کے بقیہ عجائبات وقت کے تباہ کن ہاتھوں سے مٹ چکے ہیں۔ یہ عجائبات اپنی نوعیت میں قدیم فن تعمیر اور جمالیات کا بہترین نمونہ تھے۔ زمانہ حال کے عجائبات اُن سے مختلف واقع ہوئے ہیں۔ یہ عملی سائنس کی کامیابی کا نشان ہیں۔ اور قدرت کی طاقتوں پر انسانی تسلط کا مستم بالشان ثبوت۔ فراعنۂ مصر نے عظیم مینار بنائے لیکن ہندوستان کی تہذیب پر ان کا کچھ اثر نہ پڑا۔ بابل کے معلق باغات ایک مقامی حیثیت رکھتے تھے اسکندریہ میں روشنی کا مینار دوسرے ملکوں کیلئے شمع ہدایت نہ بن سکا۔ جزیرہ روڈس میں ہیکل کا بت کولوسس ہر آنے والے سیاح کو اپنی عظمت سے مرعوب کر سکتا تھا۔ یہ عملی طور پر ابنائی انسانی زندگی کا جزو نہ بن سکا۔ آج یہ حالت ہے کہ ایڈیسن اپنی تفریح کے لمحوں میں ٹائپ رائیٹر بناتا ہے۔ جو آناً فاناً ہماری کاروباری زندگی کا لازمی جزو بن جاتا ہے۔ آجکل ایڈیسن مصنوعی ربڑ بنانے میں مصروف ہے۔ اُس کے دارالتجارب میں مختلف قسم کے پندرہ ہزار درختوں کا کیمیاوی تجزیہ ہو چکا ہے۔ اور دنیا بھر میں ربڑ کا کوئی کارخانہ نہیں جس کے مالک کو ایک نئے صنعتی انقلاب کا مقابلہ کرنے کا فکر دامنگیر نہ ہو۔ گذشتہ دنوں امریکہ کے صیغۂ پرواز کا ایک ہوا باز مسلسل ایک ہفتہ تک اُڑتا رہا۔ اور دوران سیاحت میں اسے جب پٹرول بکسی اور سامان کی ضرورت پیش آئی تو اس نے لاسلکی کے ذریعے سٹیشن کو خبر کر دی اور جونہی طیارہ اُس کے قریب پہنچا ایک ہوائی جہاز وہاں سے اٹھا اور اس

طیارہ کے عین اوپر جا کر ایک رسی کے ذریعہ مسودہ بخیریت پہنچا کر واپس آ گیا۔ سات دن کی پرواز میں رسل و پیام کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس انقلاب انگیز مظاہرہ کے بعد ہر حکومت کے ماہرین خصوصی مسلسل پرواز کے متعلق نئے تجربے کر رہے ہیں۔ گویا سائنس کا ہر کامیاب تجربہ اپنی مقامی حدود سے نکل کر کل نوع انسانی کے لئے ایک چیلنج بن جاتا ہے۔ ایک جرمن فوٹوگرافر کے پاس ایک خاتون تصویر اُتروانے کی غرض سے آئی۔ فوٹوگرافر نے اُس کی رنگت کو مدنظر رکھ کر بازار سے خاص قسم کا کاغذ منگایا۔ اور ما بعد بنفشی شعاعوں میں اس کی عکسی تصویر اُتاری۔ دوسرے دن جب تصویر تیار ہوئی تو اُس پر جا بجا داغ تھے فوٹوگرافر نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دوکاندار نے ناقص کاغذ مہیا کیا ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا جب وہ خاتون قریباً ایک ماہ بعد تصویر لینے کے لئے دوبارہ آئی تو فوٹوگرافر یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ اس عورت کا چہرہ چیچک کے داغوں سے آلودہ ہے یہ واقعہ ظاہر میں کتنا معمولی ہے۔ لیکن آپ یہ سُنکر حیران ہوں گے کہ اس سے جعلی دستاویزات کی تشخیص کا ایک قطعی اور غیر مبہم ذریعہ ہم پہنچ گیا۔ اس عورت کی جلد کے اندر جو داغ پیدا ہو رہے تھے الٹراوایولیٹ شعاعوں نے ان کو تصویر پر بے نقاب کر دیا۔ اب بنک کے چیکوں یا کسی اور دستاویز میں ذرا سی تبدیلی کی جائے۔ تو ان کی عکسی تصویر انہی شعاعوں میں اُتاری جاتی ہے اور تبدیلی سے پیشتر جن حروف کی سیاہی کاغذ کی تہ کے نیچے سرایت کر چکی ہے وہ تصویر پر صاف نظر آنے لگتے ہیں۔

پیرس کے ایک باغ میں پولیس کو ایک گٹھڑی ملی جس میں ایک انسانی لاش بندھی ہوئی تھی۔ متوفی کے قمیض کو ایک خوردبین سے دیکھا گیا تو اس میں چند ایسے جراثیم نظر آئے جن کے آنکھیں نہ تھیں معاً یہ اندازہ لگایا گیا کہ یہ لاش کئی دنوں تک ایسی جگہ رکھی گئی ہے جہاں کامل تاریکی ہے۔ کیونکہ جہاں روشنی نہ ہوگی وہاں جراثیم کو آنکھوں کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد ایسے مکانوں کی تلاشی لی گئی جن میں سردخانے تھے۔ اور اس طرح قاتل کا سُراغ لگایا گیا۔ غرضکہ سائنس نے اقوامِ عالم کے گوناگوں مفاد اور مختلف تحریکوں کو ایک ہی زنجیر میں جکڑ ڈالا ہے۔ اس صورتِ حالات میں موجودہ زمانے کے عجائبات کو نو تک محدود کرنا ایک گمراہ کن کوشش ہے۔ صرف ایڈیسن ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اپنی بارہ سو سے زیادہ ایجادیں پیٹنٹ کرا چکے ہیں جن میں سے ہر ایک بذاتِ خود انقلاب انگیز ہے۔ حال میں ایک سائنٹیفک جریدہ نے لکھا تھا کہ دنیا کے مختلف دارالتجارب میں ایک منٹ کے اندر پانچ ایجادیں انسانی ترقی کی راہ نما بن جاتی ہیں ÷

امریکن ریاست میساچوسٹس ([illegible]) کی مشہور ٹکنیکل درس گاہ کے ناظم ڈاکٹر سیموئیل سٹریٹن سے درخواست کی گئی۔ کہ آپ عہد ماضی کے سات عجائبات کے مقابلہ میں زمانہ حال کے سات

عجائبات کی فہرست مرتب فرمائیں۔ تو آپ نے سر ہلایا اور کہا کہ یہ مطالبہ معقولیت سے سراسر بعید ہے۔ سائنس کی کہانی بہت لمبی ہے۔ اگر آپ سات کے بجائے ۷۷ عجائبات کا حال سننا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔ مزید اصرار پر آپ نے ایک فہرست تیار کی جو ایک حد تک موجودہ سائنس کے حیرت انگیز مظاہرات کا قدرِ مشترک بن سکتی ہے۔ اس فہرست میں کیمسٹری کے انکشافات کا بہت کم ذکر ہے۔ حالانکہ عہد حاضر کے سب سے پہلے اور نہایت وسیع الاثر کارنامے یعنی علم جراثیم کی بنیادیں ایک کیمسٹ نے رکھیں۔ جو ایک غریب فرانسیسی دباغ کا لڑکا تھا۔ لوئی پاسچر نے جاندار مخلوق پر اُن بے شمار اور برہنہ آنکھ سے نظر نہ آنے والے کیڑوں کے خواص معلوم کئے۔ اور دنیا جہالت اور توہم پرستی کی تاریکی سے نکل کر امراض کے سائنٹیفک تشخیص کی منزل تک آ پہنچی۔ چشم بینا کے لئے یہ حقیقت کس قدر عجیب و غریب ہے کہ انسانی درد و کرب کی دوا سب سے پہلے شراب کی بھٹی میں تیار کی گئی۔ پاسچر کو شراب اور بیئر کے کارخانہ میں عمل تبخیر کا مشاہدہ کرنے پر معلوم ہوا کہ تبخیر بے انتہا چھوٹے چھوٹے ایک خانہ والے کیڑوں کی سرگرمی کا نتیجہ ہے۔ اور ہوا اُن سے معمور ہے۔ اُن کی بے شمار اقسام ہیں۔ اور اُن میں بہت سے (organic) عضوی مادہ پر خواہ وہ انگور کا رس ہو یا حیوان کا خون حملہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ پاسچر نے انسان کو ان خوفناک دشمنوں کا مقابلہ کرنا سکھا دیا جنہیں چشم غیر مسلح دیکھ نہیں سکتی۔ اس وقت ہمیں بکٹیریا کی ایک ہزار اقسام کا علم ہے۔ ہزاروں لیبورٹریوں میں اُن کے متعلق تجربات ہو رہے ہیں۔ چیچک طاعون۔ تپ سُرخ۔ ہیضہ۔ تپ محرقہ۔ انفلوانزا۔ اسہال۔ خناق اور بہت سے امراض جن کے تصور سے انسان کی روح کانپتی تھی اب اُس کے قابو میں آ گئے ہیں۔ فادزہرا دویات نے جراحی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ آپ آرام سے اخبار پڑھ رہے ہیں اور ڈاکٹر آپ کے جگر پر اپریشن کر رہا ہے۔ حفظانِ صحت کے ترقی یافتہ طریقوں۔ صاف اور جراثیم سے پاک پانی اور اشیائے خوردنی کی بہم رسانی نے گنجان شہروں کی زندگی کو خوشگوار بنا دیا ہے۔ پاسچر کی دریافت کو ابھی ستر سال نہیں گذرے اور گذشتہ بیس سال میں امریکہ میں انسانی زندگی کی اوسط میعاد ۵۰ سے ۶۰ سال تک پہنچ گئی ہے۔ زمین کے لاانتہا جراثیم جس ترکیب سے عضوی مادہ کو توڑ کر نباتات کے نائٹریٹ مہیا کرتے ہیں۔ وہ معلوم ہو چکی ہے۔ اب مصنوعی کھاد کے ذریعے زرعی پیداوار میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ علم جراثیم اور طبیعات کی تحقیقات نے زمانہ حال کے دوسرے اعجوبہ کی بنیادیں استوار کر دیں یعنی مادہ کے نظامِ ترکیبی اور عمل انتشار کے متعلق انسانی علم میں ایک نہایت گراں قدر اضافہ کر دیا۔ قدیم یونان نے کائنات کی بنیاد ذروں پر رکھی تھی۔ انگلستان کے جان ڈالٹن نے اسی خیال کو نئی ہیئت کے ساتھ دوبارہ پیش کیا۔ اور جب ۱۸۹۱ء میں فرانسیسی ماہرین طبیعات پیر کری اور مادام کری نے

ریڈیم دریافت کی تو اس خیال نے ایک شاندار وسعت حاصل کرلی۔ ذرّہ کے نظام ترکیبی کا انکشاف انسانی دماغ کی عظمت کی مستقل یادگار ہے۔ قدیم فلاسفروں سے لیکر زمانۂ قریب کے ارباب سائنس سر پٹکتے رہے کہ جسے ہم ذرّہ کہتے ہیں۔ اس کی ماہیت کیا ہے۔ لیکن وہ آگ پانی ہوا۔ اور مٹی کے عناصر اربعہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اب ہمیں معلوم ہے کہ ذرّہ نظام شمسی کی طرح ایک مثبت مرکز رکھتا ہے۔ اور اس مرکز کی یا سیروں کے ذرّے منفی الیکٹرن نہایت تیزی سے گھومتے ہیں۔ اگر مؤخر الذکر میں سے کسی ایک الیکٹرن کو اس کے خط گردش سے منحرف کر دیا جائے۔ تو ذرّہ کی ترکیب بدل جائیگی۔ جاپان کے ایک سائنس داں نے پارہ سے سونا اسی اصول پر تیار کیا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت بیسویں صدی کے جادوگر کیمسٹ نے کوئلہ ایسی کثیف شے سے صدہا قسم کے عطریات اور خوشبویات اور ادویات اور رنگ اور روغن اور پالش تیار کئے ہیں۔ جو اپنی نوعیت میں قدرتی اشیا کا مقابلہ کرتے ہیں۔ عمل انتشار کی دریافت سے وہ ذروں کا بے جان تودہ نہیں رہا۔ بلکہ زندہ اور متحرک طاقتوں کا مخزن بن گیا ہے۔ ریڈیم ایکس ریز اور ماورائے بنفشی شعاعوں نے انسان کے لئے ترقی کی نئی راہ کھولدی ہے۔ حال میں ایک نئی شعاع دریافت ہوئی ہے۔ جسے کاسمک (Cosmic rays) شعاع کہتے ہیں۔ یہ اس فضا سے ہم تک پہنچی ہے۔ جو نظام شمسی کی حدود سے پرے واقع ہے۔ ان شعاعوں کی تشریح ایک جداگانہ مضمون کی محتاج ہے۔ اس کے مشاہدہ سے ہیئت دانوں کو کواکب کے متعلق نئی اور حیرت انگیز باتوں کا پتہ لگا ہے۔

زمانۂ حال کا تیسرا عجوبہ یہ ہے کہ روشنی حرارت ذرائع آمد و رفت اور میکینیکل طاقت کی بہم رسانی کے لئے برقی قوت سے کام لیا جاتا ہے۔ برقی طاقت نے انسان کو ادنیٰ اور غیر ضروری محنت سے آزاد کر دیا ہے۔ اور دنیا کے بہت سے کام جن کیلئے انسان نے غلامی کا ملعون دستور جاری کیا ہے اب بجلی کی مدد سے کئے جاتے ہیں۔ ٹیلیفون۔ برقی لیمپ۔ برقی بھٹی۔ وائرلیس ریڈیو اور ٹیلی وژن کے سامنے پرانی دنیا کے عجائبات کی کوئی حقیقت نہیں۔ گذشتہ نصف صدی میں برقی طاقت نے ہماری صنعتی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ہمارے کارخانے۔ ریلیں۔ ٹرموے اور موٹر کاریں اسکی مدد سے چلتی ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا غلام ہے جو رات دن کام کرتا ہے اور تھکتا نہیں۔ تیل سے چلنے والا گیس انجن زمانۂ حال کا چوتھا عجوبہ ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء کے خاتمہ پر دنیا میں کل موٹر کاروں کی تعداد ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ تھی جن میں سے ۲ کروڑ تیس لاکھ صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں چلتی ہیں۔ تاریخ عالم میں کوئی ایجاد ایسی ایجاد نہیں جس نے موٹر کار کے بالمقابل انسانی زندگی اور عادات میں اس قدر انقلاب انگیز تبدیلی پیدا کی ہو۔ فن پرواز کے حیرت انگیز مظاہرے اسی گیس انجن کے رہین منت ہیں۔ اس کی مدد سے

بحر اطلانطیک پانچ مرتبہ عبور کیا جا چکا ہے۔ وقت اور فاصلہ کی حدود مٹ رہی ہیں اور اقوام عالم ایک دوسرے سے قریب تر آ رہی ہیں۔ ڈاکٹر سٹرٹین کی فہرست عجائبات میں پانچویں نمبر پر تعمیرات کے وہ جدید طریقے ہیں جن میں دھاتوں اور سیمنٹ سے کام لیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ کوئی شاندار کارنامہ نہیں لیکن آپ موجودہ فن انجنیری کے کمالات پر سرسری نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ستر ستر منزلوں کی فلک نما عمارتیں۔ عظیم الشان پل۔ جہاز۔ نہریں۔ تحت الارض ریلیں۔ سرنگیں انجن اور مشینیں فولاد اور سیمنٹ کے اجتماع کا نتیجہ ہیں۔ جدید فن تعمیرات کی مدد سے مصر کا سب سے بڑا مینار جو ہزاروں مزدوروں کی جانکاہ محنت سے برسوں میں تیار ہوا تھا چند مہینوں میں تیار ہو سکتا ہے موجودہ عمارتوں میں جو فولاد لگایا جاتا ہے وہ لکڑی سے بیس گنا۔ پتھر سے دس گنا اور ڈھلے ہوئے لوہے سے دو گنا مضبوط ہوتا ہے اور نسبتاً سستا۔ مصر کے مینار جلے ہوئے چونے سے تیار کئے گئے۔ اہل روما آتش خیز پہاڑوں کی مٹی کو بجھے ہوئے چونے سے ملا کر استعمال کرتے تھے سنہ ۱۸۲۵ء میں پورٹ لینڈ نے سیمنٹ ایجاد کیا جو ہر سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی رائے میں نئی دنیا کا چھٹا اعجوبہ فن فلزیات ہے نئی قسم کی برقی بھٹیوں میں ۶ ہزار درجے کی حرارت پیدا ہو سکتی ہے جس میں ہر جداگانہ ضرورت کیلئے نئی نئی دھاتیں تیار کی جاتی ہیں۔ نکل فولاد جو پلوں اور موٹر کار کے خاص پرزوں کے کام آتی ہے معمولی فولاد سے ۵۰ فیصدی مضبوط ہوتا ہے۔ میگنیس فولاد پر جس کی پیٹیاں بنائی جاتی ہیں آگ کا اثر نہیں ہو سکتا۔ فولاد کی ایک نئی قسم کا نام وینیڈیم ہے۔ جس کی مضبوطی اور لچک کا یہ عالم ہے کہ اس کا ایک انچ مربع ٹکڑا ایک لاکھ سے ۲½ لاکھ پونڈ وزن اٹھا سکتا ہے۔ ہوائی جہازوں کیلئے ایک نئی دھات تیار کی گئی ہے جو ایلومینیم سے ہلکی اور فولاد سے مضبوط ہے۔ ڈاکٹر سٹرٹین کی معاملہ شناسی ملاحظہ ہو کہ آپ نے نئی دنیا کے عجائبات کی فہرست میں ساتویں نمبر پر ان جدید طریقوں کو جگہ دی ہے جن سے کھانے پینے کی چیزوں کو اصلی حالت میں عرصہ دراز تک قائم رکھا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشیائے خوردنی و نوشیدنی کی بہم رسانی کے بعد سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہیں کافی دیر تک برقرار رکھا جائے۔ موجودہ صنعتی دور میں ان طریقوں کی [illegible] کام نہیں ہو سکتا۔ جن کی مدد سے قطب شمالی یا صحرائے اعظم کے سیاح کو ہر وقت تازہ اور ایسی خوراک بہم پہنچ سکے جس کے وٹامن یعنی جوہر ضائع نہ ہوئے ہوں۔

نئی دنیا کا آٹھواں اعجوبہ ہوائی جہاز ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ کے نئے ہوائی جہاز اپنی نوعیت میں عظیم الشان ہوٹلوں سے کم نہیں۔ فن پرواز کی ترقی نے تہذیب و تمدن کا نقشہ بدل دیا ہے اور کرہ ارض جس کی وسعت اولوالعزم سیاحوں کو مرعوب کیا کرتی تھی اب بہت مختصر نظر آنے لگا ہے۔ بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل میں مختلف

مقامات پر ایسے ہوائی سٹیشن تیار ہو رہے ہیں جو آنے جانے والے طیاروں کے لئے بندرگاہ کا کام دے سکیں۔ ہوائی جہازوں کا موضوع فی نفسہ اس قدر دلچسپ ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن اس مضمون میں اس کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ زمانۂ حاضر کا نواں اعجوبہ ڈاکٹر موصوف کے نزدیک وہ بے شمار کلیں اور مشینیں ہیں جن سے انسانی زندگی غلامانہ مشقت سے آزاد ہو کر خوشگوار ہو گئی ہے۔ زمین کی آبپاشی کاشت اور فصلوں کی فراہمی پہلے کس قدر ہراز ماحتی اور اب کتنا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اب زندگی کے ہر شعبہ میں مشینیں کام کرتی ہیں۔ کپڑا سیتی ہیں۔ آٹا پیستی ہیں۔ حساب کتاب کا کام کرتی ہیں۔ کتابیں اور اخبار چھاپتی ہیں۔ بیسویں صدی مشینوں کی صدی ہے۔ اور اربابِ سائنس کی یہ کوشش ہے کہ دنیا کے کاموں میں انسان کا ہاتھ اور دماغ سے محنت لینے کی حتی الامکان ضرورت نہ رہے اور وہ اپنے جسمانی اور ذہنی قویٰ کو زیادہ سے زیادہ ارجمند مقاصد کی تکمیل کیلئے صرف کرے۔ موجودہ سائنس کی ہمہ گیر ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان نو عجائبات کی فہرست جن کا ذکر اجمالاً کیا گیا ہے ازبس مضحکہ خیز معلوم ہوگی۔ لیکن بہ تقاضائے حالات یہی مناسب سمجھا گیا کہ کسی خاص سائنٹیفک ایجاد پر علمی مضمون لکھنے کی بجائے سائنس کی عام روش پر غیر اصطلاحی طریق سے تبصرہ کیا جائے اب صرف یہ کہنا باقی ہے کہ پرانی دنیا کے اکثر عجائبات مٹ چکے ہیں اور جو باقی ہیں امتداد زمانہ سے مٹ جائیں گے لیکن نئی دنیا کے عجائبات کی تباہی انسانی تہذیب کی موت ہوگی۔ یہ عجائبات انسانی زندگی سے جُداگانہ حیثیت نہیں رکھتے بلکہ اُس کے پود و تار میں پیوست ہو کر اس کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ جب تک انسان قائم ہے۔ ان عجائبات کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔

دردمند دل

(صدر الدین صدر)
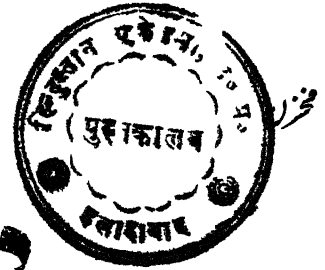
جمک کے کوچے پر مس مارتھا میجم کی ڈبل روٹی وغیرہ کی دوکان تھی، وہی پرانی قسم کی دوکان جس میں داخل ہونے کیلئے دو تین سیڑھیاں چڑھنا پڑتا ہے۔ اور دروازہ کھولتے وقت ٹلی کی آواز آتی ہے۔

مس مارتھا کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ بنک میں دو ہزار ڈالر اُس کے حساب میں جمع تھے۔ وہ دو نقلی دانتوں اور ایک دردمند دل کی مالک تھی۔ کئی لوگ جنہیں مس مارتھا کی نسبت بہت کم مواقع حاصل تھے کب کے شادی کر چکے تھے۔

ایک گاہک کا ہفتہ میں دو تین بار متواتر آنا جانا ہو گیا مس مارتھا اُس میں کچھ کچھ دلچسپی لینے لگی۔ وہ ایک اُدھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ آنکھوں پر چشمہ لگاتا۔ اُس کی داڑھی بھورے رنگ کی اور نوک دار تھی۔

وہ ایک کرخت جرمن لہجہ میں انگریزی بولتا۔ اُس کے کپڑے پرانے کہیں کہیں سے مرمت شدہ اور اکثر شکن آلودہ ہوتے۔ تاہم وہ صاف ستھرا نظر آتا۔ شائستگی اور خندہ پیشانی سے بات کرتا۔

وہ ہمیشہ دو سوکھی ڈبل روٹیاں خریدتا۔ تازہ کے دام پانچ سنٹ فی عدد تھے اور سوکھی پانچ سنٹ کی دو مل جاتی تھیں، وہ دو سوکھی ڈبل روٹیوں کے علاوہ کبھی کوئی چیز نہ خریدتا۔

ایک دفعہ مس مارتھا کو اُس کی اُنگلیوں پر سُرخ اور بھورے رنگ کے دو چھوٹے چھوٹے دھبے نظر آئے اُسے یقین آ گیا کہ وہ ایک غریب۔ بہت ہی غریب مصوّر ہے۔ کسی بالائی منزل پر رہتا ہے۔ جہاں وہ تصویریں بناتا ہے۔ سرد شمالی ہوا کے تھپیڑوں سے سکڑا رہتا ہے۔ سوکھی روٹی کھاتا ہے اور مس مارتھا کی دوکان کی نعمتوں کا خیال کر کے دل ہی دل میں کڑھتا ہے۔

کئی دفعہ جب مس مارتھا کھانا کھانے بیٹھتی اور اپنی میز پر چانپ، مربے چائے۔ انڈوں اور دوسری اچھی اچھی چیزوں کی طرف دیکھتی۔ تو اُس کے لبوں سے ایک سرد آہ نکل جاتی۔ وہ خواہش کرتی کہ کاش وہ خوش فہم مصوّر اپنی ذلیل کوٹھڑی میں بیٹھ کر سوکھا ٹکڑا کھانے کی بجائے اُس کے لذیذ کھانوں میں شریک ہو سکتا۔

تحریز،

جیسا کہ کہا جا چکا ہے مس مارتھا کے پہلو میں ایک نہایت ہی دردمند دل تھا۔

اُس کے پیشے کے متعلق اپنے خیال کی تصدیق کرنے کے لئے مس مارتھا اپنے کمرے سے ایک دستی تصویر جو اُس نے نیلام میں خریدی تھی اُٹھا لائی۔ اور ڈبل روٹیوں کی الماری کے پاس رکھدی۔

یہ شہر وینس کا ایک منظر تھا۔ لب آب ایک شاندار مرمریں محل کھڑا تھا۔ خوبصورت کشتیاں پانی میں تیر رہی تھیں۔ جن میں مہ وش خواتین پانی میں ہاتھ لٹکائے سیر میں مصروف تھیں۔ پیچھے نیلگوں آسمان پر سفید بادل عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ غرض کوئی مصور اسے نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔

دو دن بعد گاہک آیا۔

”دو سوکھی ڈبل روٹیاں دیجئے گا۔“

مس مارتھا ڈبل روٹیاں کاغذ میں لپیٹنے میں مشغول ہو گئی۔

گاہک نے پھر کہا ”یہ تصویر تو خوب ہے۔“

مس مارتھا اپنی چال کی کامیابی پر جی ہی جی میں خوش ہو کر بولی ”اچھا؟ مجھے مصوری اور (اس کے بعد وہ ”مصوروں“ کا لفظ استعمال کرنا چاہتی تھی۔ لیکن فی الحال اسے قبل از وقت خیال کرکے کہنے لگی) اور تصویروں سے بہت اُنس ہے۔ تو آپ کے خیال میں یہ تصویر اچھی ہے؟“

”اس محل کی ڈرائنگ ناقص ہے۔ علم المرایا کے اعتبار سے بھی اس میں بہت سے عیب ہیں۔ شب بخیر۔“

اُس نے ڈبل روٹی کا پارسل اُٹھایا۔ جھک کر آداب عرض کیا۔ اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

ہاں وہ ضرور مصور ہی ہوگا۔ مس مارتھا نے تصویر واپس لیجا کر کمرے میں رکھدی۔

اُس کی آنکھوں سے کس قدر متانت اور نیکدلی ٹپکتی تھی! اُس کی پیشانی کس قدر فراخ تھی! منظر کو ایک نگاہ میں جانچ لینا اور سوکھی روٹی پر گزارہ کرنا! مشہور و معروف ہونے سے پہلے عالی دماغ لوگوں کو کس قدر کشمکش کرنا پڑتی ہے۔

فنون لطیفہ کے لئے یہ امر کس قدر ترقی کا باعث ہو۔ اگر کسی اعلےٰ مصور کی پشت پر! بنک میں دو ہزار ڈالر ایک پُر منافع دوکان۔ اور ایک دردمند دل ہو جو ——— مگر مس مارتھا! یہ سب خیالی پلاؤ تھے۔

اب اکثر وہ مس مارتھا سے اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرلیا کرتا۔ معلوم ہوتا ہے وہ مس مارتھا کے میٹھے الفاظ سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

وہ بدستور سوکھی ڈبل روٹیاں خریدتا رہا۔ اُس نے کبھی کسی کیک۔ سموسے یا لذیذ پیسٹری کی طرف نگاہ تک نہ کی۔

مِس مارتھا نے خیال کیا کہ وہ روز بروز دُبلا اور مایوس ہوتا جا رہا ہے۔ اُس کا دل اندر ہی اندر کُڑھتا وہ چاہتی تھی اُس حقیر خوراک کے ساتھ کچھ اپنی طرف سے شامل کر دے مگر اُسے اس بات کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ اُس کی سُبکی کرنا نہ چاہتی تھی۔ وہ صناعوں کی خودداری سے واقف تھی۔

مِس مارتھا نے اب اپنا نیلے پھولوں والا ریشمی سایہ پہننا شروع کر دیا۔ پچھلے کمرہ میں وہ بہی دانہ اور سہاگے کی ملاوٹ سے ایک عجیب قسم کا اُبٹن بنایا کرتی۔ اکثر لوگ چہرے کی رنگت کے لئے اُس کا استعمال کرتے ہیں۔

حسبِ دستور ایک دن وہی گاہک دوکان میں آیا۔ اُس نے پیسے میز پر رکھے اور دو سوکھی ڈبل روٹیوں کے لئے کہا مِس مارتھا انہیں لانے کیلئے گئی تو بازار میں ٹن ٹن۔ اور گڑ گڑ گڑ کا شور بلند ہوا۔ ایک آگ بجھانے والا انجن طوفان اُٹھاتا ہوا۔ بازار سے گذرا۔

گاہک دیکھنے کیلئے جلدی سے دروازہ کی طرف لپکا۔ بجلی کی سُرعت کے ساتھ ایک تجویز مِس مارتھا کو سوجھی جس پر اُس نے فوراً عمل کیا۔

مکھن والا ابھی ابھی ایک پونڈ تازہ مکھن دے کر گیا تھا۔ جو سودے والی میز کی پچھلی طرف سب سے نچلے خانے میں پڑا تھا۔ مِس مارتھا نے چھری سے ڈبل روٹیوں کو درمیان میں سے خوب گہرا کاٹا۔ اور دونوں میں ایک خاصی مقدار مکھن کی ڈال کر اُن کو پھر دبا دیا۔

گاہک کے واپس آنے پر وہ ڈبل روٹیوں کو کاغذ میں لپیٹ رہی تھی۔ اُس روز اُس کی گفتگو معمول سے زیادہ دل خوش کن تھی۔ جب وہ چلا گیا تو مِس مارتھا آپ ہی آپ مسکرائی۔ مگر ساتھ ہی اُس کے دل نے ایک چٹکی لی۔

کیا اُس نے زیادہ جرأت سے تو کام نہیں لیا تھا؟ کیا وہ اُسے اپنی ہتک تو نہیں خیال کرے گا؟ اشیائے خوردنی کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ اور مکھن کسی طرح بھی غیر نسوانی اقدام کا مظہر نہ تھا۔

اُس روز بہت عرصہ تک اُس کے دل میں وہی خیال موجزن رہا۔ وہ دل ہی دل میں اُس نظارہ کا تصور کرتی رہی۔ جب اُسے اس چالاکی کا علم ہوا ہو گا۔

وہ اپنے موقلم اور رنگدان وغیرہ نیچے رکھ دے گا ایک طرف اُس کا تصویر کھینچنے کا ٹھاٹھ پڑا ہو گا۔

جس پر اُس کی تصویر جوکہ وہ بنا رہا ہے۔ اور جو علم المرایا کے اعتبار سے بالکل بے عیب دھری ہوگی۔
وہ سوکھی روٹی اور پانی کے ناشتے کیلئے تیاری کرے گا۔ اور چھری سے ڈبل روٹی کے ٹکڑے کاٹے گا اور۔۔"!
مس مارتھا کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ کیا وہ کھاتے وقت اُن ہاتھوں کا جنہوں نے وہاں مکھن رکھا ہے۔ خیال کریگا؟ کیا وہ ـــــــ

دوکان کے صدر دروازے کی گھنٹی زور سے ملی کوئی شخص شور مچاتا ہوا اندر داخل ہوا۔
مس مارتھا بھاگ کر آگے آئی۔ دو آدمی تھے۔ ایک تو نوجوان تھا اور پائپ پی رہا تھا مس مارتھا نے اُسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دوسرا اُس کا وہی مصوّر تھا۔
مصور کا چہرہ انگاروں کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ اُسکی ٹوپی پیچھے کو جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے بال بُری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اُس نے اپنی دونوں آستینیں چڑھالیں اور مس مارتھا پر گھونسا تاننے لگا ـــــ مس مارتھا پر ـــ!
وہ بہت بلند آواز سے جرمن زبان میں چیخا "شیطان کی خالہ" اور پھر "بھتنی" یا اسی قسم کا کوئی اور لفظ۔
نوجوان نے اُسے باہر لیجانے کی کوشش کی۔
مصوّر نے غصّے میں کہا "میں نہیں جاؤں گا۔ میں اُسے ابھی ٹھیک کرونگا"
اُس نے جوش کی حالت میں مس مارتھا کے میز پر اِس زور سے مُکّے مارے کہ سب چیزیں اُچھل کر نیچے آرہیں۔
اُس کی نیلگوں آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ وہ چلّا رہا تھا "تم نے میرا بیڑا غرق کردیا۔ ابھی ٹھیک کردوں گا تمہیں۔ چُڑیل کہیں کی!"
مس مارتھا نیم غشی کی حالت میں ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیکر کھڑی ہوگئی۔ دوسرا ہاتھ اُس نے نیلے رنگ کے پھولوں والے ریشمی سایہ پر رکھ لیا۔
نوجوان نے اپنے ساتھی کو کالر سے پکڑ لیا۔ اور کہا: "بس جانے بھی دو۔ بہت کچھ کہہ چکے ہو" اور وہ اُسے دھکیل کر دوکان سے باہر لے گیا۔ اور پھر اُسے گھر کی طرف روانہ کرکے دوکان کی طرف واپس لوٹا۔
دوکان میں آکر اُس نے مس مارتھا سے کہا۔
میرا خیال ہے آپ سے اس قضیئے کی وجہ بیان کردینی چاہیئے۔ اس کا نام بلمبر گر ہے۔ وہ ایک عمارتی نقشہ نویس ہے۔ میں اور وہ ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہیں۔

وہ تین ماہ سے ایک ٹاؤن ہال کا نقشہ بنانے میں مصروف تھا - بیچارے نے بہت کی - یہ ایک انعامی مقابلہ کیلئے تھا - اُس نے کل آخری مرتبہ خطوں کو سیاہی سے پختہ کیا - بات یہ ہے کہ نقشہ نویس ہمیشہ اپنے پہلے خط پنسل سے کھینچتے ہیں اور جب یہ اُن کی مرضی کے مطابق ہوجاتے ہیں - تو انہیں سیاہی سے پختہ کردیتے ہیں اور پنسل کے خطوں کو سوکھی ہوئی ڈبل روٹی سے مٹا دیتے ہیں - یہ ربڑ سے بہتر کام دیتی ہے -

"بلبر گر یہاں سے ڈبل روٹی خرید تا رہا ہے - اور آج ——— اور آپ جانتی ہیں کہ مکھن ——— بات یہ ہے کہ بے چارے کا نقشہ کوڑی کا نہیں رہا - سوائے اس کے کہ اُٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے "

مس مارتھا پچھلے کمرہ میں چلی گئی - اُس نے نیلے پھولوں والا ریشمی سایہ اُتار دیا - اور وہی پرانا بھورے سرج کا پہن لیا - جو وہ پہلے استعمال کیا کرتی تھی - پھر کھڑکی میں سے ابٹن کو خاکدان میں پھینک دیا -

(او - ہنری)

منازل اشک

(جناب اشک خلیلی - بی اے)

جنوں کا ساتھ دینا میری خودداری سے مشکل ہے
کہ ہر نقشِ قدم اس راہ میں تحصیل حاصل ہے

مجھے ہر اک ادائے روزگارِ سفلہ پرور سے
زیاں کاریٔ دل کے واسطے پاداش حاصل ہے

پریشانی کی یارب وسعتیں آخر کہاں تک ہیں
دلِ ایذا طلب بھی اب تو آسایش پہ مائل ہے

نگاہیں مضطرب، خاطر پریشاں، فکر پژمردہ
اگر جینا اسی کا نام ہے تو سخت مشکل ہے

لئے جاتا ہوں کشتی آپ ہی گرداب کی جانب
مری آنکھوں میں ہر موجِ بلا آغوشِ ساحل ہے

جہاں میں اک فسانہ رہ گیا ہے زعمِ باطل کا
اگر انصاف سے پوچھو تو لیلےٰ ہے نہ محمل ہے

طلب میں امتیازِ مدعا کا پھیر ہے ——— ورنہ
یہی دل بے طلب بھی ہو تو اک دنیا کا سائل ہے

تھکے ماندوں کی بھی اے اشک آخر کٹ ہی جائیگی
مسافت دور کی تھی - رہروی منزل بہ منزل ہے

جاڑے

جناب شیر محمد صاحب شیر

ایکی جاڑوں نے جھاڑ باندھا ہے ملکِ پنجاب بن گیا "کشمیر"
سب کو پالا پڑا ہے سردی سے سرد مہری سے تیری مہرِ منیر

دھوپ اول تو ہو گئی نایاب گر نکلتی بھی ہے تو بالکل ماند
وہ بھی کس وقت بارہ ایک بجے یعنی سورج ہوا ہے "عید کا چاند"

برف کے جم گئے ہیں دل بادل طرفہ پوشش ملی پہاڑوں کو
دھند میں چرخ تک بھی ہے روپوش آگ لگ جائے ایسے جاڑوں کو

ہر طرف ہے پکار جاڑوں کی جنگلوں بستوں حصاروں میں
سب لرز کر پناہ مانگتے ہیں ٹہنیوں جھاڑیوں میں غاروں میں

آہ بے حال ہیں نہال کمال حوصلہ سردیوں نے توڑ دیا
جھڑ گئے زرد ہو کے پتے بھی بیوفاؤں نے ساتھ چھوڑ دیا

تاپتے ہیں امیر بھی لیکن آگ میں جان ہے فقیروں کی
کانگڑی کو لئے ہیں گودی میں آگ لختِ جگر ہے پیروں کی

سردیوں سے ہے انقلاب عجیب برف ہے آب جم گیا خوں بھی
گھٹ گئی شب تو روز بڑھ نکلا یعنی پلٹا ہے دورِ گردوں بھی

وقت کی رمز شیر کچھ پہچان وقت دنیا میں کس کے بس کا ہے
سرد ہر چیز ہے زمانے کی گرم اجلاس کانگرس کا ہے

افلاس

(مترجمہ ایم۔ اے قدوائی)

یہ بھی عجیب بات ہے۔ آج میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کسی بے حد دانشمندانہ موضوع پر کچھ لکھوں گا مگر جیسی کہئے قسم کھالوں اس وقت میرا دماغ دانشمندانہ تخیل سے کوسوں دور ہے۔ خیال کو ہر سمت دوڑاتا ہوں مگر ہر پھر کے افلاس ہی دماغ میں آتا ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس وقت میرا ہاتھ میری جیب میں پڑا ہے۔ یہ میری عادت ہے اور میں ہمیشہ جیب ہی میں ہاتھ ڈالکر بیٹھتا ہوں۔ مگر جب کبھی میری بہنیں، چچی اور صنف لطیف کے دوسرے افراد مجھے اس طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے دیکھتے ہیں تو یقین کیجئے ہنگامۂ کارزار گرم ہو جاتا ہے۔ اور یہ کلیہ ہے کہ جب کوئی ہنگامہ عورتوں کے ذریعہ سے گرم ہوتا ہے۔ اس کے سرد کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہوتی ہے ——— میں بھی مجبوراً اُن کی خواہشات کے مطابق اپنی جیبوں سے ہاتھ نکالنے پر مجبور ہو جاتا ہوں ——— عورتوں کے خیال میں ہر وقت دست درکیسہ ہونا شایانِ شرافت نہیں۔

حیران ہوں کہ اس معمولی سی بات کو اہمیت کیوں کر دوں۔ یہ بات تو میں سمجھتا ہوں کہ دوسروں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنا اور بالخصوص "دوسروں کا میری جیبوں میں ہاتھ ڈالنا خلاف شرافت ہے"۔ لیکن اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالنا بھی شرافت میں خلل انداز ہوتا ہے۔ بخدا یہ کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اچھا اگر یہ سچ بھی ہے۔ تو پھر جیبوں کے بنانے کا مقصد کیا ہے؟

عورتوں کے اس اعتراض کو بالکل بے بنیاد تو میں بھی نہیں کہتا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایسے اشخاص بھی میری نظروں سے گذرے ہیں جو اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر برافروختہ سے ہو جاتے ہیں۔ مگر ان میں اکثر ضعیف العمر لوگ ہوتے ہیں ——— یہ کیونکر ممکن ہے کہ آدمی جوان ہو اور اپنی جیبوں میں ہاتھ نہ ڈالے۔ یہ عمل ایک تو خاص طور پر تشفی بخش ہوتا ہے اور جب تک ہاتھ اور جیب میں بُعد رہتا ہے کچھ اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے۔

اچھا اب آپ تھوڑی دیر تک یہ صورت پیش نظر رکھیں کہ میں اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوں۔ داہنی جیب میں تھوڑی سی ریزگاری ہے اور بائیں میں چابیوں کا گچھا۔ اور انگلیوں کی ہر حرکت کے ساتھ اُن کی سُریلی آواز کانوں تک پہنچتی ہے۔ ان اسلحہ سے آراستہ ہو کر ایک انسان ہر کہیں بے کھٹکے جا سکتا ہے۔

جب جیبوں میں کوئی بولنے والی چیز نہ ہو تو ایسے وقت اُن میں ہاتھ ڈالنا اور یہ سوچنا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے بے حد دشوار امر ہے۔

برسوں ہوئے میری یہ حالت ہو جاتی تھی کہ میری کل جائداد ایک روپے کی صورت اختیار کر لیا کرتی تھی۔ اُس وقت میں بے حد بے فکری سے اس میں سے ایک پیسہ خرچ کر دیا کرتا تھا۔ اور مقصد بس اتنا ہوتا تھا کہ میری جیب میں ایک روپے کی بجائے کچھ ریزگاری پڑی ہو۔ کیونکہ اُن کی آواز اور اُن کا وزن ایک روپے کے مقابلہ میں زیادہ فرحت آگین ہوتا تھا۔ جب جیب میں پندرہ آنے ہوں تو افلاس کا احساس اس قدر نہیں ہوتا جتنا اُس وقت جب صرف ایک روپیہ ہو۔ اور شاید تعداد کی افزونی اس کا باعث ہوتی ہے۔

جب میں نوجوانوں کے اُس گروہ میں ہوتا تھا جس پر مالدار لوگ طعنہ زن ہوتے ہیں تو میں اپنی آخری اکنی کو بھی تین پیسوں سے بدل لیا کرتا تھا۔ اور پھر بھی میں افلاس پر بے حد محققانہ بحث کر سکتا تھا۔ اب اگر دلائل اور وجوہ کی ضرورت ہو تو سُنئے کہ میں سفری تھیٹروں میں ایکٹر بھی رہ چکا ہوں اور باقاعدہ پریسوں سے تعلق بھی رکھ چکا ہوں۔

ایک وقت ایسا تھا کہ مجھے تین روپے چودہ آنے فی ہفتہ بطور مشاہرہ ملتا تھا۔ اور میں نے دس روپے فی ہفتہ پر بھی کام کیا ہے۔ مگر چار روپے فی ہفتہ کا مقروض رہ کر۔ اور سچ پوچھئے تو پندرہ دن تک تو بجز ایک اُدر کوٹ کے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اخراجات خانہ داری میں کفایت شعاری کا تجربہ افلاس کی حالت سے بہتر کبھی ممکن ہی نہیں۔ اگر کسی کو روپے کی قدر نہیں تو تین روپے چودہ آنے پر کام کرے اور پھر دیکھے کہ تفریح اور لباس میں کتنا خرچ کر سکتا ہے۔ اگر ایک میل پیدل چل کر وہ ایک پیسہ بھی بچا سکے گا تو اُسے اس تکلیف کے اُٹھانے میں اعتراض نہ ہوگا۔ اُسے معلوم ہو جائے گا کہ گڑ کا "ٹھنڈے ٹھار" شربت کا گلاس بھی کافی قیمت میں آتا ہے اور کالر واقعی چار دن استعمال کر کے بھی اتنا میلا نہیں ہوتا کہ دھوبی کے یہاں ڈال دیا جائے۔

ہر انسان کو چاہیئے کہ اپنی شادی سے پہلے افلاس کی زندگی کا عادی ہو جائے کیونکہ یہ عادت آخر کار بیحد مفید ثابت ہوتی ہے۔ کوشش کیجئے کہ آپ کا لڑکا زمانہ طالب علمی میں بہ تنگی بسر کرنے کا خوگر ہو اور اس کا موقع دیجئے کہ یہ عادت بخوبی پڑ جائے پھر آپ ملاحظہ کریں گے کہ وہ کم سے کم جیب خرچ کو بہ شکر قبول کرے گا۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے اکثر بڑے آدمی افلاس کا شکار ہو گئے۔ مگر اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ

وہ اُن تکالیف کا تحمل نہ کر سکے جوان کو بے زری کے ہاتھوں پہنچیں دنیا میں کون ایسا انسان ہے جو کبھی مصائب سے آشنا نہ ہوا ہو۔

رابنسن کروسو کو اس بات کا کیا غم تھا کہ اُس کی پتلون میں پیوند تھے (اوّل تو یہ بھی قابل اعتماد نہیں کہ وہ پتلون پہنا بھی کرتا تھا) اس کو اس کی فکر کیوں ہوتی کہ اُس کا جوتا پھٹا ہوا ہے۔ یا اس کی چھتری سوتی کپڑے کی ہے اور وہ بھی از قسم غربال۔ کیونکہ اُس کے نزدیک اُس کا کوئی دوست اُس پر مضحکہ اُڑانے کو تو موجود تھا ہی نہیں۔

خود غریب ہونا کوئی مصیبت نہیں مگر اس کی تشہیر بے شک ایذا رساں ہے۔ اگر کوئی آدمی کڑاکے کے جاڑوں میں اور کوٹ پہنے بغیر دوڑتا چلا جاتا ہو تو اس سے یہ مقصد تو نہیں کہ اُسے سردی لگ رہی ہے۔ پھر یہ کیوں نہیں سمجھ لیا جاتا کہ غربت کوئی گناہ نہیں۔ اگر یہ واقعی گناہ ہوتا تو انسان اُس کو ہرگز نہ چھپاتا۔

تمام دنیا ایک غریب انسان سے بے غرض رہنا پسند کرتی ہے اور تمام دانشمندانہ تقریریں ایک مفلس کو ذی عزت بنانے سے قاصر ہیں۔ انسان ظاہری صفائی کا گرویدہ ہے۔ لندن میں آپ کو ایسے اشخاص بہ کثرت ملیں گے جو بے حد عمدہ پوشاک پہنتے ہیں لیکن اُن کے دل بے حد تاریک ہیں۔ پھر بھی اُن سے کوئی اظہار بے تکلفی کرتے شرماتا نہیں۔

برخلاف اس کے اگر کوئی غریب شریف انسان اُدھر گذر جائے تو یہی بدمعاش اس علم کے باوجود کہ ہمارا ضمیر صاف نہیں علانیہ اس سے ہم کلام ہونا پسند نہ کریں گے۔ اور اسی لئے غریب اس کا متمنی ہوتا ہے کہ دنیا اس کو بھول جائے۔

کچھ عرصے بعد انسان افلاس کا بھی اُسی قدر عادی ہو جاتا ہے جتنا کہ سانس لینے کا۔ پھر بھی مبتدی اور پختہ کار مفلس کا فرق فوراً ایک نظر میں معلوم ہو جاتا ہے۔

افلاس کے بھی مدارج ہیں۔ اور دنیا میں ہر شخص مفلس ہوتا ہے کسی کو ہزاروں کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی کو دس پنسل کی۔ فی الحال تو میں بھی مفلس ہوں اور مجھے بھی چند سیکڑوں کی ضرورت ہے بس صرف چند یوم کے لئے یہ رقم بطور قرض چاہتا ہوں۔ اگر میرے مہربان ناظرین میں سے کوئی میری امداد پر آمادہ ہو جائے تو معرفت ایڈیٹر مخزن بھاٹی گیٹ لاہور مجھے یہ رقم بھیج دے۔ میں روپیہ وصول کرتے ہی رسید دے دوں گا۔

(ترجمہ)

غزلیات

آبر انصاری حسنی گنوری

جب سے رخ مشق تصور نے کیا ہے سوئے دوست
دیکھتا ہوں ذرہ ذرہ میں جمال روئے دوست

یہ ہوا حاصل ہلال عید قرباں دیکھکر
چل گئی دل پر چھری یاد آگئی ابروے دوست

یاد ہے ابتک مجھے فرقت میں یوں دم توڑنا
منہ تھا کعبہ کی طرف آنکھیں لگی تھیں سوئے دوست

کچھ بڑھا دے اور جنت کی فضا کو اے خدا
ہو رہے ہیں اس میں داخل ساکنان کوئے دوست

نزع کی دشوار یہ ہو جاؤ آسانی سے حل
دوست ہے بالیں پہ اور نازک بہت ہے خوئے دوست

کھنچ لیگا عشق کو حسن اپنے مرکز کی طرف
دل بھی ہو جائیگا محشر میں ہمارا سوئے دوست

توڑ ڈالا موت نے میری طلسم نازِ حسن
خود بخود میت پر آ کر کھل گئے گیسوئے دوست

ملگیا ہوں مٹ کے ذاتِ یار میں کچھ اسطرح
اپنی ہی سانسوں میں اب آتی ہے مجھ کو بوئے دوست

چھ رہے ہیں آبر نشتر سے دلِ بیتاب میں
کام اپنا کر رہی ہے بزم میں ابروئے دوست

سید خادم حسین صاحب خادم انبالوی

ساغرِ بادۂ گلرنگ پلایا جاتا
لطف تھا شیخ کو مخمور بنایا جاتا

زخم پر زخم اگر دِل پہ لگایا جاتا
غنچۂ گلشن امید کھلایا جاتا

نہ اُٹھا بیٹھ کے میرا دل مایوس کبھی
کاش میت کی طرح اُس کو اُٹھایا جاتا

شیخ جی بھول کے کرتے نہ مذمت مے کی
مغربی رنگ اگر اُن پہ چڑھایا جاتا

سوزِ اُلفت کا مدوا نہ کیا خوب کیا
یہ بھڑکتا ہوا شعلہ نہ دبایا جاتا

کون ہے مونس و غمخوار سوا ناصح کے
ایک ہمدرد ہے دنیا میں یہ پایا جاتا

اس نزاکت پہ مرے قتل کا دم بھرتے ہیں
نیمچہ تک نہیں ہاتھوں سے اُٹھایا جاتا

میں بگڑ کر جو چلا طعن سے اس بُت نے کہا
جاؤ روٹھے کو نہیں ہم سے منایا جاتا

منفعل اپنے گنا ہوں سے ہوں اے ربِّ غفور
سر نہیں بارِ ندامت سے اُٹھایا جاتا

سب تیری بزم میں موجود تھے خادم کے سوا
خوب ہوتا اگر اس کو بھی بلایا جاتا

مونا وانا

ایک ڈراما

(مصنفہ بلجین ڈرامہ نگار مارس میٹرلنگ ۔۔۔ مترجمہ بلبل احمد قدوائی بی۔اے (علیگ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

۔بس ! آپ کہہ چکے۔اب دل خوش کن الفاظ کا وقت نہیں رہا۔نہ یہاں آج کوئی ہے جسے فریب دیا جاسکے .... میں نے بڑی طرح انتظار کیا' میں ٹھیرا رہا کہ دیکھوں آپ کا دل و دماغ' آپ کا تجربہ اُس زندگی کے عوض میں جو برباد ہوئی ہے مجھے کیا بخشتا ہے.. ...... دیکھئے مجھے اُس نے کیا بخشا؛ انتظار کرنا۔ صبر و سکون کے سررشتہ کو ہاتھ سے نہ جانے دینا' غلط کو صحیح سمجھنا اور اُسے روا رکھنا' فراموش کرنا' معافی دینا اور رونا! .... آہ! نہیں! یہ کافی نہیں! .... کاش میں عقل سے پشیمان ہی رہوں اور شرم کا داغ مٹا سکوں! الفاظ سے مجھے یہ حاصل نہیں ہو سکتا...... رہا میرے ارادے وہ بالکل سادہ ہیں ـــــ میں وہی کروں گا جو کچھ دنوں پہلے آپ مجھے مشورہ دیتے ۔ایک آدمی نے مجھ سے وانا کو چھین لیا! جبتک یہ آدمی زندہ ہے وانا میری نہیں ہے کیونکہ آپ دیکھتے ہیں میں اُن قواعد کا پابند نہیں ہوں جو گرامر کی کتاب میں ہوتے ہیں یا جن کے تابع ضمیر یا اسم صفت ہوتے ہیں۔میں اُس بڑے قانون کا ماتحت ہوں جس کے سامنے ہر انسان کا جس کا دل سرد نہیں ہو گیا ہے سر جھکتا ہے .... پیسا کے پاس زندگی کی خوراک اور لڑائی کو ہتھیار ہیں۔وہ کھا سکتا ہے اور لڑ سکتا ہے۔میں اپنا حصہ مانگتا ہوں۔آج کے دن سے پیسا کے سپاہی میرے ہیں یا کم از کم اُن میں سے جو بہترین ہیں وہ میرے ہیں جنہیں میں نے خود بھرتی کیا ہے' جنہیں میں نے اپنی جیب سے خرچ دیا ہے۔میں نے پیسا کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اپنا حق طلب کرتا ہوں ۔ یہ لوگ اس کے پاس نہیں جائیں گے۔جبتک یہ وہ نہ کریں جو مجھے حق ہے کہ اُن سے کراؤں ....یہی وہ ـــــ یعنی وانا

—میں اُسے معاف کرتا ہوں۔ یا اُس وقت معاف کردوں گا جبکہ یہ آدمی نہ رہیگا ....
اُسے دھوکا دیا گیا۔ اُسے غلط راستہ پر لگایا گیا۔ لیکن جو کچھ اُس نے کیا اُس میں کم از کم ایک شانِ تفاخر
... تھی ... اس کی نیکی، اس کا رحم، اُس کی عظمتِ روح سے ناجائز سے ناجائز فائدہ
اٹھایا گیا.. ...... خیر......... جو ہوا سو ہوا.......... بھول جانا شاید ممکن ہو لیکن کم از کم
اُس کا یہ فعل اس قدر دور جا کے پردۂ ماضی میں چھپ سکتا ہے کہ جو محبت، ندھی محبت اس کے اس فعل
کی بنیاد ہے اُس کی نظر سے یہ پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ .. لیکن دنیا میں ایک انسان سے
... نفرت ... نہیں دیکھوں گا۔ ایک انسان سے جس کی زندگی کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ وہ
... ایک صحیح ... سچی خوشی کی منزل کا راستہ دکھائے، وہ انسان اس کا دشمن ہو گیا ہے، اور
تم سب لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ایک واقعہ رونما ہوگا، جو خوفناک ہے۔ مگر جائز.......... تم دیکھو گے
کہ اس دنیا میں ... جو ... باپ کو جانچتا ہے۔ اُس کے افعال پر اُنگلی اُٹھاتا ہے، اُس کا منکر
ہو جاتا ... ہے ... دوسروں کے سامنے سے ہٹا دیتا ہے۔ اُسے کوستا ہے، اُس سے
نفرت کرتا ہے۔ ......

و... بڑا ... میرے بیٹے لیکن اُسے معاف کردو... ...... اگر اس بہادرانہ، عالی اور پُرحوصلہ فعل
... کے سامنے اور جس نے اتنے انسانوں کی جان بچائی ایک غلطی سے جو معاف نہیں کی جا سکتی
... تمام غلطی میری ہے لیکن بہادری، علویت اور پُرحوصلگی اُس کی ہے... ...... میرا مشورہ،
میری نصیحت ... تھی لیکن میرے لئے جس کا اس قربانی میں کوئی حصہ نہ تھا نصیحت آسان تھی اور
اس وقت بلکہ یہ مجھے اُس چیز سے جسے میں دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا ہوں جُدا کرتی ہے، محروم کئے
دیتی ہے یہ مجھے پہلے سے زیادہ بہتر، نیک اور صائب نصیحت معلوم ہوتی ہے ... . مجھے
کوئی حق نہیں کہ تمہارے فیصلہ سے اختلاف کروں، جب میں چھوٹا تھا میں نے بھی ایسا ہی فیصلہ
کیا ہوتا . ...میں جانتا ہوں میرے بیٹے، اور اب تم مجھے کبھی نہ دیکھو گے، میں خوب سمجھ
سکتا ہوں، میری موجودگی تمہیں بُری معلوم ہوتی ہے میری موجودگی سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے
میں کوشش کروں گا کہ بغیر تمہارے دیکھے ہوئے میں تمہیں دیکھتا رہوں .... اور چونکہ میں
... ہو رہا ہوں اور بمشکل یہ اُمید کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میں اس وقت زندہ ہوں گا

جب تم میری غلطی معاف کرو گے ——— کیونکہ میرا اپنا تجربہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ عفو اور درگذر کا جذبہ
نوعمری میں، دیر سے، امتداد وقت کے ساتھ آتا ہے ——— ایسی حالت میں، مجھے کم از کم یہ یقین دلاؤ
کہ میں ہی تمہاری تمام ملامت، تمام نفرت، تمام غصہ کا نشانہ ہوں اور یہ کہ اُس واپس آنے والی
کے لئے ان میں سے کچھ نہیں ہاے .... اس کے علاوہ میری ایک عرض اور ہے ...
مجھے ایک مرتبہ اور آخری مرتبہ اُسے اپنی آغوش میں دکھا دو .... بس، بس .. .. اور میں
خوش خوش جاؤں گا، تمہیں انصاف پسند سمجھوں گا . .. یہ اچھا ہے کہ غم انسانی کا اپنے کاندھ
پر وہ انسان لے جو عمر میں سب سے زیادہ ہو کیونکہ اُسے تھوڑے ہی دن اور زندہ رہنا ہے جس کے بعد
وہ بار دوسرے شانوں پر ڈالا جا سکتا ہے ....

[مارکو بولتا ہی ہوتا ہے کہ باہر ایک مبہم شور سنائی دینے لگتا ہے مارکو چپ ہو جاتا ہے تو
خاموشی میں یہ شور بڑھتا ہے، قریب تر آتا جاتا ہے۔ زیادہ صاف ہوتا جاتا ہے، پہلے آہٹ، اس
کے بعد مجمع کے بڑھنے کا زیادہ صاف اور واضح شور، پھر اور غل غپاڑہ۔ یہاں تک کہ شور صاف
سنائی دینے لگتا ہے، آوازیں سمجھ میں آتی ہیں، اور بار بار، ہزاروں ہزاروں زبان سے،
" وانا وانا، ہماری مونا وانا، وانا، وانا، وانا، کا شور ہوتا ہے]

مارکو: (سائبان کے پاس دوڑ کر جاتا ہے) ارے کون؟ . . . وانا واپس آگئی؟ . . . ہاں ہاں
.. .. بے شک وہ ہے! .... اُس کا استقبال کر رہے ہیں، اُس کا استقبال کر رہے
ہیں! سنو، سنو:

[پورسو اور پورمیو اس کے پیچھے سائبان تک جاتے ہیں گیڈو اکیلا رہتا ہے۔ وہ ایک
کھمبے سے لگا سامنے کو نظر جمائے دیکھتا ہے۔ اس عرصہ میں شور بڑھتا جاتا ہے۔ اور زیادہ
قریب ہوتا جاتا ہے۔]

مارکو: ۔ (سائبان ہی پر کھڑے کھڑے) وہ دیکھو! سڑکیں، بازار، کھڑکیاں، درخت، سب آدمیوں کے ہجوم اور
اُن کے ہلتے ہوئے ہاتھوں اور سروں سے سیاہ نظر آتے ہیں! چھتیں، کھڑکیاں، پتلیاں یہ سب
معلوم ہوتا ہے زندہ اور جاندار چیزیں ہیں، سب انسان بن گئے ہیں! . .. مگر وانا ہے کہاں؟
.... مجھے تو صرف ایک بادل سا نظر آتا ہے جو جھومتا ہے اور بڑھتا ہے . . . . پورسو میری

ضعیف آنکھیں مجھے دھوکا دیتی ہیں اور میری محبت بہ رہی ہے .... بڑھاپا اور آنسو میری آنکھوں کو اندھا کر رہے ہیں ...... وہ اس ایک ہستی کو نہیں دیکھ رہی ہیں جسے دیکھنے کے لئے وہ تڑپ رہی ہیں .... وہ کہاں ہے؟ وہ کہاں ہے؟ .... میں اُس سے ملنے کس راستہ پر جاؤں؟

...... وہ کدھر ملے گی؟ ....

بورسو:۔ (اُسے روکتے ہوئے) نہیں نہیں، نیچے نہ جائیے۔ لوگ پاگل ہو رہے ہیں! اُن کی عقل خوشی نے سلب کر دی ہے، اُن کا جوش دیوانگی اُنہیں بے قابو کر رہا ہے! عورتیں غش کھا کے گر رہی ہیں مرد پیروں کے نیچے روندے جا رہے ہیں! .... اس کے علاوہ آپ کا جانا بالکل بیکار ہی ہے۔ وہ آتی ہے وہ دیکھئے، وہ آئی، وہ آئی! .... دیکھئے، وہ سر اُٹھا رہی ہے۔ ...... وہ ہمیں دیکھ رہی ہے .... وہ یہاں پہنچنے کے لئے بیتاب ہے، ...... وہ، وہ دیکھئے، وہ ہمیں دیکھ کر مسکراتی ہے ......

مارکو:۔ کہاں، کہاں؟ .... تم اُسے دیکھ رہے ہو مگر میری نظر کام نہیں کرتی! .... یہ مُردہ یا اندھی آنکھیں کسی چیز میں امتیاز نہیں کرتیں! .... آج پہلی دفعہ میں بوڑھاپے کو کوستا ہوں جس نے مجھے اس قدر تجربہ، اس قدر عقل، اس قدر ریختہ کاری بخشی اگر جو آج مجھ سے ایک چیز کو چھپائے دیتا ہے جو مجھے عزیز ہے! .... لیکن تم جو اُسے دیکھ رہے ہو ذرا مجھے بتاؤ تو وہ کیسی معلوم ہو رہی ہے؟ .... تمہیں اُس کا چہرہ نظر آ رہا ہے؟ ....

بورسو:۔ وہ فتح کی مسرت میں لوٹ رہی ہے ...... وہ اس تمام مجمع پر جھک رہی ہے ....

ٹوریلو:۔ مگر یہ مرد کون اُس کے ساتھ ہے؟

بورسو:۔ معلوم نہیں .... میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا، اُس کا چہرہ چھپا ہوا ہے ......

مارکو:۔ ذرا سننا، کتنا چلا رہے ہیں! .... سارا محل گونج اٹھا، کانپ اٹھا: زینہ کے گملوں سے پھول جھڑ رہے ہیں ...... فرش کے پتھر تک ایسا معلوم ہوتا ہے ہمارے قدموں کے نیچے سے اُکھڑ رہے ہیں کہ اس خوشی کے طوفان میں بہ جائیں اور ہمیں بہائے جائیں .... آہ! اب مجھ کو کچھ نظر پڑا ...... وہ تو پھاٹک کے قریب آ گئے! ...... مجمع ہٹ رہا ہے، اُنہیں رستہ دے رہا ہے ......

بورسو:۔ اں دانا کو۔ وہ اُس کے لئے ایک راستہ بنا رہے ہیں، فتح کا راستہ محبت کا راستہ .... اُس کی راہ میں پھول ...... بیاں ...... دی جھاڑ ...... ہیں ...... مائیں اپنی گودوں سے بچوں کو باہر نکال

رہی ہیں کہ وانا انہیں چھو لے۔ آدمی جھک رہے ہیں کہ جن پتھروں پر اس کے قدم پڑ رہے ہیں انہیں چوم لیں........ ہوشیار، وہ آ گئے۔ خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں......... اگر کہیں ان کے پیرو پر وہ آ جائیں تو ہم سب بہ جائیں گے.......... اچھا، یہ ٹھیک ہوا! پہرہ دار راستہ کی روک کیلئے آ گئے!........ میں حکم دوں گا کہ اگر وقت ہو تو پھاٹک بند کر دیئے جائیں اور مجمع باہر ہی روک دیا جائے........

مارکو:۔ نہیں، نہیں! جس طرح دلوں میں خوشی کھیل رہی ہے اس جگہ بھی اُسے کھیلنے دو! یہ اُن کی وسیع اور بے پایاں محبت بول رہی ہے ـــــ محبّت کا مظاہرہ ہونے دو، محبّت جو چاہے کرے! اُنہیں کافی تکلیفیں پہنچی ہیں!......... اب کہ اُس کا نور ہو چکا، اُن کی خوشی کے رستہ میں کوئی رُکاوٹ نہ پیدا کرو! آہ، میرے بے چارہ بہادر آدمی! میں بھی اُن کی طرح خوشی سے بدست ہوں، میں بھی اُن کا ہم آواز ہوں!.........آہ، وانا، میری وانا! کیا میں تجھے زینہ پر دیکھ رہا ہوں؟.......

[وہ وانا سے ملنے کے لئے ایک بیقراری کے ساتھ جانا چاہتا ہے مگر بوسو اور ٹوریلو اُسے روکتے ہیں]

آ، وانا آ! دیکھ مجھے روک رہے ہیں! وہ اس زبردست خوشی سے ڈرنے لگے ہیں! آ، وانا آ! جو ڈیتھ سے زیادہ حسین، اکریس سے زیادہ پاک!.........آ!.........یہاں، ان پھلوں کے درمیان!

[وہ مرمر کے گملوں کے پاس جاتا ہے اور مٹھی بھر پھول توڑتا ہے اور زینہ پر پھینکتا ہے] میرے پاس بھی روشنی کے استقبال کے لئے پھول ہیں: میرے پاس بھی لالے، گلاب، اور نرگس ہیں جنہیں فتح پر نثار کروں!

[شور دیوانگی کی حد سے بھی بڑھتا جاتا ہے وانا، پرنزوال کو ساتھ لئے زینہ کی چوٹی پر نمودار ہوتی ہے اور اپنے کو مارکو کی آغوش میں گرا دیتی ہے۔ مجمع محل کے زینوں اور چار دیواری کے اندر تک آ جاتا ہے مگر اُس مجمع سے دُور ہی رہتا ہے جو وانا، پرنزوال، مارکو بوسو اور ٹوریلو سے بنا ہے

وانا:۔ میرے ابا جان، میں خوش ہوں ......

مارکو:۔ (اُسے اپنے کاندھے سے لگا کر) اور میں بھی، میری بچی کہ میں تجھے پھر دیکھ رہا ہوں!...... ذرا تجھے بہتے ہوئے آنسوؤں کے اندر سے دیکھ لوں......... تم آسمان کی گہرائیوں سے اُتر کر آ رہی ہو

جتنی منور، جتنی حسین ہوتیں اُس سے زیادہ منور اور حسین معلوم ہوتی ہو! خوفناک دشمن تمہاری آنکھوں سے نور نہیں بجھا سکا، تمہارے لبوں کا تبسم نہیں چُرا سکا، تمہاری نظروں میں نور کے جو ہیرے جڑے تھے، تمہارے ہونٹوں پر تبسم کے جو لعل ٹنکے تھے دشمن اُن میں کا ایک ہیرا ایک لعل نہیں چھڑا سکا! ....

وانا :- ابا جان، مجھے آپ سے بتانا ہے .... مگر گیڈو کہاں ہے؟ .... سب سے پہلے اُنہیں کو سُنانا چاہیے ـــــ اُنہیں کے دل کو تسکین دینا چاہیئے کیونکہ اُنہیں نہیں معلوم ....

مارکو :- وانا، وانا، وہ وہاں ہے .... آؤ .... مجھ سے وہ بیزار ہے، شاید یہ بیزاری ٹھیک ہے مگر تمہیں معافی مل چکی، تمہاری شاندار غلطی بخش دی گئی اور میں بیتاب ہوں کہ تمہیں اس کی آغوش میں دیکھوں، کہ میری آخری نظر میں تم دونوں کی محبت دیکھیں ....

[گیڈو، وانا کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ بولنے کو ہوتی ہے --- اپنے کو اس کی آغوش میں گرانے کو ہوتی ہے۔ مگر گیڈو اُسے بُری طرح روکتا ہے اور مجمع کی طرف مخاطب ہوتا ہے]

گیڈو :- (ایک سخت اور زوردار لہجہ سے) تم سب یہاں سے چلے جاؤ! .... فوراً ....

وانا :- نہیں، نہیں! سب یہیں رہیں گے! .... گیڈو مجھے تمہیں بتانا ہے! مجھے ان سب کو بتانا ہے .... گیڈو، سُنو!

گیڈو :- (اُسے روکتے ہوئے اور پیچھے کو دھکا دیتے ہوئے زوردار غصہ کے لہجہ میں) میرے قریب مت آؤ، مجھے نہ چھوؤ! (وہ مجمع کی طرف بڑھتا ہے جو ہال کے اندر تک آ گیا ہے لیکن اُسے دیکھ کر مجمع پیچھے ہٹنے لگتا ہے) کیا تم نے میرا حکم نہیں سُنا؟ میں نے تم سے جانے کو کہا تھا! ہمارے سامنے سے ہٹ جاؤ اپنے اپنے گھروں میں تم بادشاہ ہو لیکن یہ میرا گھر ہے! بورسو، ٹورنیو، پولیس کو بُلاؤ! اچھا میں سمجھا ان سب کا مطلب کیا ہے! تم اپنی شکم پروری کر چکے، اور اب اس خوش آیند منظر سے نظریں سیراب کرنا چاہتے ہو! .. نہیں، نہیں، تمہارے لئے گوشت اور شراب موجود ہے، میں نے تم سب کی طرف سے قیمت ادا کر دی، کیا وہ کافی نہیں ہے؟ میں تم سے کہتا ہوں جاؤ! [مجمع میں آہستہ آہستہ حرکت ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ مجمع غائب ہو جاتا ہے] کوئی نہ رہنے پائے! [وہ اپنے باپ کا شانہ جھنجھوڑتا ہے] آپ بھی! ان سب سے پہلے آپ! آپ ہی کا یہ سب کیا دھرا ہے! آپ کو میرے آنسو دیکھنے کا حق نہیں! میں تنہائی چاہتا ہوں۔ قبر کی تنہائی سے زیادہ خاموش تنہائی تاکہ جو کچھ مجھ پر گذرتا ہے تنہائی میں

گذرے! [پرنزوال کو دیکھ کر جو اپنی جگہ پر قائم ہے] اور تم؟ .... یہ تم کون نقاب پوش پتھر کی مورت کی طرح کھڑے ہو؟ .... موت یا شرم کا مجسمہ؟ کیا تم نے نہیں سنا کہ میں نے سب کو یہاں سے نکلنے کا حکم دیا ہے؟ .... [ایک پہرہ دار کے ہاتھ سے نیزہ لیکر] کیا یہ چھری تمہارے سر پر رکھوں؟ ... ... اچھا آپ بھی تلوار پر ہاتھ رکھتے ہیں؟ .... میرے پاس بھی تلوار ہے لیکن اُس کا دوسرا مصرف ہے ... . آج سے وہ صرف ایک آدمی پر چلے گی .... چہرے پر یہ پٹیاں کیوں نقاب کی طرح ڈالی ہیں؟ .... یہ رقص خانہ نہیں ہے نہیں اس وقت آپ کا ناچ دیکھنا چاہتا ہوں .... کوئی جواب نہیں؟ .... میں پوچھتا ہوں تو کون ہے؟ . ... ٹھیرو ـــــ

[وہ اُس کی طرف بڑھتا ہے اور پٹیاں نوچ ڈالنے ہی کو ہوتا ہے کہ وانا بیچ میں آجاتی ہے اور اُسے روکتی ہے]

وانا: ـ اُس کے قریب نہ آنا' اُسے نہ چھونا! ....

گیڈو: ـ [حیرت میں] وانا' یہ کیا' وانا؟ یہ نوری طاقت' یہ جوش کیسا؟ ....

وانا: ـ اُس نے مجھے بچا لیا ....

گیڈو: ـ [قہقہہ لگاکر] اُس نے تمہیں بچایا .... لیکن بعد از وقت .... بے شک ایک بہادرانہ فعل ... . . یہ بہتر ہوتا ....

وانا: ـ [ایسے جیسے بخار چڑھ رہا ہو] لیکن تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں' گیڈو مجھے کہنے تو دو ایک لفظ صرف ایک لفظ! .. .. اس نے مجھے بچایا' اُس نے مجھے چھوڑ دیا' میری عزت کی! .... یہ یہاں میری محافظت میں آیا ہے ... ... میں نے اس سے قول ہارا ہے' اپنی طرف سے' آپ کی طرف سے اپنی سب کی طرف سے میں نے اُسے زبان دی ہے! .... تم اس وقت غصہ میں ہو لیکن میری بات سنو' صرف ایک بات! ....

گیڈو: ـ یہ کون آدمی ہے؟

وانا: ـ پرنزوال ....

گیڈو: ـ کون؟ .... کیا؟ .. . . یہ وہ آدمی؟ ... . یہ پرنزوال

ہے!

وانا:- ہاں، ہاں! یہ آپ کا مہمان ہے! یہ خود سے آپ کے ہاں چلا آیا ہے! اس نے مجھے بچا لیا، گیدو

....

گیڈو:-[تھوڑے غور کے بعد ایک ایسی خوشی اور جوش و مسرت کے ساتھ کہ وانا کو اُسے روکنے کی ہمت نہیں ہوتی]
آہ، یہ، میری وانا، یہ بات؟ .... آہ، اس وقت میری روح پر گویا ساتویں آسمان سے شبنم افشانی ہو رہی ہے! .... اری وانا میری وانا! .... ہاں، تم نے بالکل ٹھیک کیا، یہ کرنا ہی تھا تو اس سے بہتر طریقہ اور کوئی ناممکن تھا! آہ، میں تمہاری ترکیب اب سمجھا! بے شک میں اب بالکل سمجھ گیا! ..... لیکن مجھے نہیں معلوم تھا، مجھے گمان نہیں تھا! .... ایسی عورتیں بھی ہیں جو اُسے مار ڈالتیں، اُسے فنا کے گھاٹ اُتار دیتیں۔ جیسے جوڈتھ نے ہولوفرنیس کو مار ڈالا لیکن اُس کا جرم ہولوفرنیس سے زیادہ سنگین ہے، اور اس لئے اس سے زیادہ سنگین سزا چاہتا ہے! .... اس لئے تم اسے یہاں لے آئیں اس لئے تم اسے اُس کے صیدوں کے درمیان لے آئیں جواب اُس کے صیاد بنیں گے! ...... آہ، ایسی شاندار فتح؟ .... یہ احمق تمہارے ساتھ چپ چاپ چلا آیا، اور یہ نہ سمجھا کہ جو بوسے تم نے اُسے دیے وہ نفرت کے بوسے تھے .... اب پکڑے گئے، جال میں پھنس گئے، اب بچ کر کہاں جاؤ گے؟ .... ہاں، وانا، تم نے بالکل ٹھیک کیا! اسے وہاں مار ڈالنا، اس کے ایسے سنگین جرم کے بعد اس کے خیمے کے گوشہ میں چپ چاپ اُسے ختم کر دینا ــــــ یہ کافی نہیں تھا! .... ایک شبہ رہ جاتا، ہم اُسے نہ دیکھ پاتے .... گندے اور ناپاک معاہدہ کی سب کو خبر تھی اس لئے ضروری تھا کہ اس فریب کی پاداش کی بھی سب کو خبر ہو! لیکن یہ تم نے کیسے کیا؟ .... یہ بلند ترین کامیاب ترین فتح ہے جو کوئی عورت ....اے ہاں، تم اپنی زبان سے سب کو قصہ سناؤ![وہ سائبان کی طرف بڑھتا ہے اور چیخ کر پکارتا ہے] پرنزوال! پرنزوال! دشمن! ہمارا دشمن! پکڑا گیا! پکڑا گیا۔

وانا:-[اُس سے لپٹ کر اُسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے] نہیں، نہیں! سنو! سنو گیڈو، میں تم سے التجا کرتی ہوں! گیڈو، گیڈو، تم غلط سمجھے ہو!

(باقی آئندہ)

ممی[1] کی باتیں

(ظفر قریشی دہلوی)

میرے سر میں سخت اور ناقابل برداشت درد ہو رہا تھا نیز غنودگی بھی طاری ہونی شروع ہوگئی تھی اس وجہ سے ارادہ کرلیا تھا کہ رات کا کھانا خوب ڈٹ کر کھاؤں اور بہت جلد سو جاؤں چنانچہ ایسا ہی ہوا جلد جلد لقمے کھا کر خواب کا لباس پہنا اور پلنگ پر جا لیٹا۔ چونکہ دوسرا دن اتوار تھا اس وجہ سے دن کو نو بجے تک سونے کا ارادہ تھا اس لئے تکیہ پر سر رکھدیا اور سو گیا۔

مجھے سوئے ہوئے ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ یکایک صدر دروازہ کی اطلاعی گھنٹی بجنے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی اور میں ابھی اپنی آنکھیں مل ہی رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے میرے آگے ایک کاغذ بڑھا دیا جو غالباً کوئی پیغام معلوم ہوتا تھا۔ پیغام میرے پرانے دوست ڈاکٹر نوروجی کے پاس سے آیا تھا جو یہ تھا:

"جونہی آپ کو یہ رقعہ ملے فوراً تشریف لے آئیے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی ہماری تفریح میں شرکت کریں کیونکہ میں نے بہت عرصہ انتظار کرنے کے بعد شہر کے عجائب خانہ کے نگران اعلیٰ سے اس بات کی اجازت حاصل کرلی ہے کہ ممی پر اپنے تجربات کرنے شروع کردوں (غالباً تم جانتے ہوگے کہ میں کس ممی کا ذکر کر رہا ہوں) مجھے اجازت دیدی گئی ہے کہ ممی کی لپیٹی بند شبیں کھول لوں اور اسکی چیر پھاڑ کروں مگر اس موقعہ پر صرف چند مخصوص احباب شریک ہونگے جنمیں سے آپ یقیناً ایک ہیں اسوقت ممی میرے مکان پر ہے اور تجربہ ٹھیک گیارہ بجے شروع کردیا جائیگا۔

تمہارا منتظر ڈاکٹر نوروجی"

ممی کے نام سے میری نیند کافور ہوچکی تھی اس لئے گھبرا کر اُٹھا سرعت کیساتھ کپڑے پہنے اور عجلت کیساتھ ڈاکٹر کے مکان کی جانب روانہ ہوگیا۔

---

[1] ممی اصل میں قدیم مصریوں کے مردے ہوا کرتے تھے جنہیں مصالحے لگا کر ہزارہا سال تک صحیح و سالم رکھا جاتا تھا ۱۲

۲

ڈاکٹر کے مکان پر میرے انتظار میں ایک بیچین مختصر مجمع بیٹھا تھا۔ جس نے میری آمد پر اپنی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ ایک لمبی میز پر ممی کا صندوق رکھا ہوا تھا جو ڈاکٹر نوروجی کے چچازاد بھائی دارآجی مصر سے لائے تھے۔ داراجی کو یہ ممی ایک اور ممی کے ساتھ دریائے نیل کی وادی کے قریب کوہستان لبنین کے قدیم مقبروں اور کھنڈرات میں سے دستیاب ہوئی تھی۔ یہ ممی شہر کے سرکاری عجائب خانہ میں رکھدی گئی تھی مگر اسے کھولا نہیں گیا تھا۔ صرف دور سے نمائش ہوتی تھی۔ کوہستان لبنین کے ان کھنڈرات سے قدیم مصری تہذیب وتمدن وآثار عتیقہ کے بیش قیمت تاریخی نمونے دستیاب ہوئے تھے جن سے مصریوں کی نجی زندگی پر بہت کافی روشنی پڑتی تھی مقبرہ کے جس خاص کمرہ سے یہ دونوں ممیاں برآمد ہوئی تھیں اس میں نقاشی، مصوری، مجسمہ سازی اور قدیم مصری تصویر کشی کے ایسے ایسے نادر ونایاب نمونے نکلے تھے کہ موجودہ زمانے کا سیاح حیرت واستعجاب میں غرق ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ دیواروں کے پلستر پر تصویر کشی کا کام، بیل بوٹے، طرح طرح کے مجسمے، برتن، قیمتی ساز وسامان غرض اس قسم کی دیگر اشیا پائی گئی تھیں جو متوفی کی دولت امارت کا اظہار کرتی تھیں۔

میں میز کے قریب پہنچا تو ایک لمبا صندوق رکھا ہوا دیکھا جو سات فٹ لمبا۔ تین فٹ چوڑا اور ڈھائی فٹ گہرا تھا یہ بظاہر چیڑ کی لکڑی کا معلوم ہوتا تھا مگر ایک جگہ چاقو سے تراشنے پر معلوم ہوا کہ وہ کارڈ بورڈ یا گتے کا بنا ہوا ہے جو اصل میں موٹا "پے پیرس" تھا "پے پیرس" اصل میں قدیم مصریوں کا وہ ایجاد کردہ کاغذ تھا جو دریائے نیل کے کنارہ پر اگنے والی گھاس سے تیار کیا جاتا تھا۔ اس صندوق پر ماتمی تصاویر، موت کے وقت کے مناظر کی شکلیں بکثرت بنی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں یا شکلوں کے درمیان کہیں کہیں "تصویری زبان" (Hieroglyphics) میں عبارت بھی درج تھی جو جنتر منتر، جادو، جفر، رمل اور اسی قسم کی دوسری باتوں سے تعلق رکھتی تھی۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس مختصر صحبت میں "مصریات" کے دو مشہور عالم شریک تھے پروفیسر گیلانی قدیم مصری دستاویزوں کی ناقابل فہم صوتی زبان کو پڑھنے اور بولنے کی کامل دستگاہ رکھتے تھے چنانچہ صندوق پر لکھی ہوئی عبارت کو پڑھنے کے بعد ان کا فیصلہ ہوا کہ یہ ممی کسی ایسے شخص کی تھی جس کا نام یہ تھا:۔

"مخالا سطاقیو"

ہم نے بدقت تمام صندوق کو نقصان پہنچائے بغیر کھول لیا اس میں ایک اور چھوٹا سا صندوق نکلا جو بیرونی صندوق سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بیرونی واندرونی صندوقوں کے درمیان ایک حدِ فاصل یا خلا پیدا کرتا تھا جس میں راکھ بھر دی گئی تھی جس کی وجہ سے اندرونی صندوق خراب ہوگیا تھا۔

اس صندوق کو بھی آسانی کے ساتھ کھول لیا گیا مگر اندر ایک اور صندوق نکلا جو بالکل تابوت کی مانند تھا اور دیودار لکڑی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا کیونکہ ایک خوشبو آرہی تھی۔ دوسرے اور تیسرے صندوق کے درمیان کوئی خلا نہ تھا یعنی دونوں ایک دوسرے سے بالکل متصل تھے۔

۳

تیسرا صندوق کھلتے ہی ایک لاش رکھی ہوئی نظر پڑی جسے ہم نے باہر نکال لیا ہمیں توقع تھی کہ حسب معمول ایک لاش نکلے گی جس پر ریشمیں دھجیاں فیتے اور بندشیں یکے بعد دیگرے لپٹی ہوئی ہونگی مگر نہیں یہاں ایسا نہ تھا لاش پر بجائے سبز ریشمی دھجیوں اور پٹیوں کے "پے پیرس" یا قدیم مصری کاغذ کی دھجیاں پلستر کے ذریعہ سے لپٹی گئی تھیں جن پر سونے کے پانی سے شکلیں کھینچی گئی تھیں۔ یہ شکلیں متوفی کے رشتہ داروں کی تھیں "صوتی تصویری زبان" (Phonetic Hieroglyphics) میں ایک عمودی عبارت تحریر تھی جسے پڑھنے پر معلوم ہوا کہ یہ متوفی کے رشتہ داروں کے نام اور القاب ہیں یا خود ممی کے سرکاری خطابات اور شہری اعزازات کے الفاظ۔

ممی کے گلے میں کاغذ کی دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے گرد بلور کے دانوں کی ایک لڑی یا گلوبند بندھا ہوا تھا جس میں طرح طرح کے رنگ برنگ دانے روشنی میں جھلمل جھلمل کر رہے تھے اسی قسم کی ایک اور مالا یا کنگھنی ہاتھ میں بھی بندھی ہوئی تھی، کمر کی پیٹی پر بھی ایسے ہی دانے جڑے ہوئے تھے جن پر مختلف دیوی دیوتاؤں کی شکلیں سحر، اور عقائد سے متعلق شکلیں کھنچی ہوئی تھیں۔

ممی کے جسم پر سے آہستہ آہستہ کاغذ اتارا گیا تو اندر سے صحیح وسالم جسم نکل آیا جو حیرت انگیز طور پر اپنی اصلی ہیئت پر قائم تھا۔ سڑاند یا بساند مطلق نہ تھی، جلد سرخی مائل صاف اور چکنی تھی، دانت اور بال بھی بالکل محفوظ تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں نکال کر ان کی جگہ کانچ کی خوبصورت آنکھیں لگا دی گئی ہیں جو بالکل جاندار معلوم ہو رہی تھیں گو مسلسل ٹکٹکی بندھے

کی وجہ سے انہیں بحیس سمجھا جا سکتا تھا۔ انگلیاں اور ناخون روشن و منور سونے کے پانی سے منقش کئے گئے تھے۔ سرخ جلد کی وجہ سے پروفیسر گیلانی نے خیال ظاہر کیا کہ ممی تیار کرنے کا عمل جسے "معطر پارچہ بندی" (Embalment) کہتے ہیں تمام تر رال کے ذریعے کی گئی تھی لیکن ایک نوکدار اوزار سے جلد کھرچنے پر جو سفوف جھاڑا گیا تو آگ پر جلنے سے اس کی اصلیت معلوم ہو گئی یعنی کافور اور دیگر خوشبودار عطر و مصالحے سے تھے رال نہ تھی۔

لاش کو بہت ہوشیاری کے ساتھ دیکھا گیا تاکہ حسب معمول آنتیں نکالنے کی جگہ یا چھید جو ہر ممی میں ہوتا ہے نظر پڑ جائے مگر ہماری توقع کے خلاف ہمیں کوئی چھید نہ ملا بڑا تعجب ہوا کیونکہ ہمیں یہ نقطہ معلوم نہ تھا کہ کبھی کبھی (گو شاذ و نادر ہی) بے چھید کی صحیح و سالم ممیاں بھی دستیاب ہو جاتی ہیں۔

قدیم مصریوں میں قاعدہ تھا کہ مردہ کا دماغ اور آنتیں نکال کر اور پہلو میں چھید کر کے پیٹ کی آلائش صاف کر کے اسے ہفتوں یونہی چھوڑ دیا جاتا تھا حجامت بنا دیتے اور نمک کی مالش کی جس سے جسم پھٹنے اور سڑنے سے بچ جاتا تھا یہ عرصہ گذر جانے پر "معطر پارچہ بندی" کا اصل عمل جسے ممی بنانا کہتے تھے شروع ہوتا تھا۔

ڈاکٹر توروجی نے یہ دیکھ کر ممی میں کہیں سوراخ نہ تھا اپنے آلات جراحی نکالے اور انہیں درست کرنا شروع کیا لیکن چونکہ دو بج چکے تھے اس لئے تجویز کی کہ تجربہ کا بقیہ حصہ کل کے لئے ملتوی کر دیا جائے مگر جماعت میں سے کسی فرد نے اتفاقاً تجویز کر دی کہ ممی پر برقی تار کی رو دوڑانے کا عمل کیا جائے۔

تین چار ہزار برس کی ممی پر بجلی کا استعمال گو ایک غیر سنجیدہ خیال سہی مگر ایک انوکھی جدت ضرور تھی اس وجہ سے ہم فوراً رضامند ہو گئے کہ تجربہ شروع کر دیا جائے۔ دس میں سے ایک سنجیدگی کے ساتھ اور نو محض تفریح طبع کے طور پر کام میں مصروف ہو گئے یعنی ڈاکٹر کے مطالعہ کے کمرہ میں ایک برقی بیٹری کا انتظام کیا گیا اور وہیں مصری ممی پہنچا دی گئی۔

۴

بڑی مشکل سے ممی کے اعصاب کھولے گئے۔ انپر بجلی کے تار کا اثر دوڑایا گیا مگر جیسی کہ توقع تھی اس کا کوئی اثر مرتب نہ ہوا۔ کہربائی طاقت سے اثر پذیری کی کوئی علامت نہ پائی گئی اور ہم

ایک دوسرے کی حماقت پر ہنس ہنس کر اور مجوّز کی کم سمجھی کا مذاق اڑا کر ایک دوسرے کو شب بخیر کہنے ہی والے تھے کہ یکایک میری آنکھ ممی کی آنکھ پر جا پڑی اور میں حیرت سے واستعجاب کا مجسمہ بنکر کھڑا کا کھڑا رہگیا کیونکہ میں نے ایک ہی نگاہ میں تاڑ لیا تھا کہ ہم جن آنکھوں کو کانچ کی سمجھ رہے تھے اصل میں گولیاں نہ تھیں بلکہ حقیقتاً اصلی آنکھیں تھیں اور انپر پپوٹے پڑے ہونے کی وجہ سے اچھی طرح اندازہ نہ ہوسکتا تھا - مگر اب آنکھ کی سفیدی یا ڈھیلا بالکل عیاں اور متحرک تھا -

میں نے چلاکر سب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور سب نے بجلی کے معجزہ کو سراہا لیکن شاید آپ یہ سمجھ رہے ہونگے کہ میں اس نظارہ سے ڈر گیا ہونگا' نہیں "ڈر" (کم از کم میرے لئے) ایک بے معنی لفظ ہے ہاں کسی قدر مضطرب و پریشان ضرور ہوا تھا - پارٹی کے دیگر لوگوں کی حالت دیکھنے کے قابل تھی عزیب ڈاکٹر کی حالت [illegible] تھی - مسٹر گوبند کسی نہ معلوم ترکیب سے فوراً کہیں غائب ہو چکے تھے - مسٹر گلاب سنگھ کو آج اس واقعہ سے انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی - کہ وہ میز کے نیچے جا چھپے تھے -

خوف و دہشت کے اس کم و بیش حملہ سے نجات پاکر ہم نے سوچنا شروع کیا کہ اب آگے کیا کیا جائے؟ چنانچہ تجویز ہوئی کہ وا بئں پیر کے پنجہ پر عمل جرّاحی شروع کیا جائے اور اس زخمی جگہ پر بیٹری کا تار لگاکر اثر نفوذ کیا جائے - چنانچہ اس عمل کے کرنے پر ممی نے زندگی کے آثار نمایاں کرنے شروع کر دئے یعنی سب سے پہلے اپنا دایاں پاؤں آہستہ آہستہ اُٹھایا اور پھر زبردست جھٹکے کے ساتھ زور سے ڈاکٹر نوروجی پر لات ماری کیونکہ وہی اس سے قریب تر کھڑے تھے دھکے کے زور سے ڈاکٹر صاحب گر پڑے مگر ہم نے سہارا دیکر جلد اُٹھا لیا اور پھر نئے شوق و جذبہ کے ساتھ تجربہ جاری رکھا -

ڈاکٹر نوروجی کے مشورے سے ممی کی ناک پر زخم بنایا گیا اور برقی رو دوڑائی گئی جسکا نتیجہ بھی لفظاً اور معناً "برقی" ہوا - یعنے سب سے پہلے لاش نے آنکھیں کھولیں چند منٹ تک جھپکائیں اور پھر اِدھر اُدھر دیکھکر ایک چھینک لی اور اُٹھ بیٹھی - ڈاکٹر نوروجی (جو شامت اعمال سے اب بھی قریب ہی کھڑے تھے) کے چہرہ پر زور سے مکا مارا اور پروفیسر گلاب سنگھ و مسٹر گیلاتی کی طرف مخاطب ہوکر موٹے موٹے تلفظ کیساتھ قدیم مصری زبان میں مندرجہ ذیل جملے

کہے جنکے مترادف یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

"صاحبان! میں آپ کی اس وحشیانہ حرکت پر کہ مجھے خواب آرام سے جگا دیا سخت غم وغصہ کا اظہار کرتا ہوں! یہ صاحب (ڈاکٹر نوروجی) تو ایک ڈاکٹر ہیں اور اتفاق سے بیوقوف اسوجہ سے انکی خطا تو معاف کی جاتی ہے مگر اے تم دونوں انسانوں! (گلاب اور گیلانی) مجھے تو تم پر غصہ آتا ہے کہ تم اتنے عرصہ تک مصر میں رہے ہو کہ وہاں کے باشندے معلوم ہوتے ہو اور پھر اس روانی کے ساتھ قدیم مصری زبان بول سکتے ہو کہ اہل زبان ہونے کا شبہ ہوتا ہے مگر ان تمام معلومات کے باوجود جو تمہیں کوہستان "نھی لبس" کے غاروں میں ممیاں تلاش کرتے ہوئے حاصل ہوئیں آج ایسی غلطی کا ارتکاب کرتے ہو تم پر خدا کی لعنت ہو! کیا تم سے اسی بات کی توقع تھی؟ چپ چاپ کھڑے میرا منہ کیوں تک رہے ہو؟ تم نے "ایرا غیرا نتھو خیرا" غرض سب کو اجازت دیدی کہ اس سردی کے موسم میں میرے تن پر سے کپڑے جدا کر دیں۔ بتاؤ اس گستاخی کی کیا سزا ملے؟ بھلا ڈاکٹر نوروجی کی یہ ہمت ان کی یہ جرأت کہ میری ناک پکڑ کر کھینچ لیں!!!"

۵

غالباً یہ سمجھا جائے گا کہ ہم ان جملوں کو سن کر یا تو دروازہ کی جانب دوڑے ہونگے یا وحشیانہ تندی کے ساتھ گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخنا شروع کر دیا ہوگا ورنہ بیہوش تو ضرور ہی ہو گئے ہونگے مگر نہیں ان میں سے کوئی سی حالت بھی طاری نہ ہوئی اور اس کی کوئی ظاہری وجہ سمجھ میں نہیں آتی پارٹی کا ہر فرد جس جگہ کھڑا تھا یونہی بے حس و حرکت کھڑا رہا گویا کوئی سنجیدہ واقعہ نہ ہوا تھا۔

ہم سب جیبوں میں ہاتھ دیئے ممی کی جانب دیکھ رہے تھے کہ یکا یک اس نے چلا کر کہا، "گلاب سنگھ تم دانتوں میں انگلیاں دیئے کیوں کھڑے ہو؟ انگلی باہر نکال لو!" چنانچہ گلاب نے ایسا ہی کیا مگر اب ممی پروفیسر گیلانی کی طرف متوجہ ہوئی اور ان کی وساطت سے پوچھا کہ اس ہنگامہ کا کیا مقصد ہے۔

پروفیسر صاحب "صوتی زبان" میں ارشادوں اور آوازوں کے ذریعہ ممی سے گفتگو کر رہے تھے لیکن چونکہ اردو کی کم مائیگی کی وجہ سے ان آوازوں کا صحیح صحیح انداز پیدا کر کے دکھانا محال ہے

اس لئے یہاں صرف ان کے مترادفات درج کئے جاتے ہیں۔ نیز یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اس کہانی کے اگلے حصہ میں ہمارے اور ممی کے درمیان جتنی بھی گفتگو ہوئی تھی اس کا مترادف پیش کیا جائیگا کیونکہ گفتگو قدیم مصری زبان میں ہوئی تھی جو ایک ترجمان کے ذریعے عمل میں آئی۔ پروفیسر گیلانی مصری آثار عتیقہ کی مہم پر جا چکے تھے گلاب سنگھ ان کے رفیق تھے اور سالہا سال مصر میں رہے تھے۔ یہ دونوں صاحب" تعویذی زبان" کو خوب پڑھ سکتے تھے چنانچہ "طوطخ آمن" اور دیگر فراعنۂ مصر کے مقبروں کے کتبے پڑھنے میں یہ ہندوستانی علما کافی مشہور ہو چکے تھے اور علمی صحبتوں میں ممتاز جگہ پاتے تھے۔

گو یہ دونوں حضرات ترجمانی کا پورا پورا حق ادا کر رہے تھے مگر بعض اوقات کسی بات کے سمجھانے میں بڑی دقت ہوتی تھی کیونکہ وہ خیالات ممی کے لئے بالکل انوکھے اور عجیب ہوتے تھے۔ مثلاً دوران گفتگو میں پروفیسر گیلانی ممی کو لفظ" سیاست" نہ سمجھا سکے جس کی دقت کو دور کرنے کی غرض سے ایک کوئلے سے دیوار پر ایک آدمی کی شکل کھینچی جو لکڑی کے ایک کندے پر کھڑا ہوا تھا۔ ایک ایک ٹانگ پیچھے اُٹھی ہوئی تھی۔ سیدھا ہاتھ آگے بڑھا ہوا آنکھیں آسمان کی طرف اور منہ نوّے درجہ کے زاویہ پر کھلا ہوا تھا۔ ممی نے یہ شکل دیکھ کر" سیاست" کا مفہوم سمجھکر اپنے چہرہ سے معاملہ فہمی کا اظہار کیا۔ بالکل اسی طرح مسٹر گلاب سنگھ ممی کو" ہوائی جہاز" "چرخہ" "ٹیلیفون" وغیرہ کا کچھ مطلب نہ سمجھا سکے۔

مسٹر گیلانی مصری کو سمجھا رہے تھے کہ ممیوں کی چیر پھاڑ اصل میں سائنٹفک تحقیقات و انکشافات کے سلسلہ میں ہوتی ہے اس لئے اگر مقصد کے حصول میں آج اسے (یعنی ممی کو) کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا ہو یا اس کے ساتھ کچھ گستاخی کی گئی ہو تو اسے نادانستہ غلطی سمجھ کر معاف کر دیا جائے اور آئندہ تجربہ کی اجازت دی جائے۔

محالاسطاقیو" یعنی مصری نے اس تجویز کی اجازت عطا کر دی۔ ڈاکٹر نوروجی نے اپنے اوزار سنبھالنے شروع کئے اور مصری میز پر سے کود کر نیچے آ کھڑا ہوا۔ اور ہر ایک سے مصافحہ کرنا شروع کیا۔ جب یہ رسمی ملاقات ختم ہو گئی تو ہم نے ان کے زخموں کے ٹانکے لگا دئے۔ پیر کا زخم ناک کا زخم بند کر دیا گیا پیشانی کے چھید پر بھی کالا مرہم لگا دیا گیا۔ اس وقت نواب (یعنی محالاسطاقیو) نے

اپنا یہی خطاب بتایا تھا نے ایک جھرجھری لی گویا ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سردی لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر یہ دیکھ کر سیدھا اپنے کمرہ میں گیا اور ایک کوٹ، واسکٹ پاجامہ اور موٹی قمیض لا کر مصری کی حوالہ کی جسے اس کے جسم پر پہنا دیا گیا سر پہ پگڑی باندھی گئی جوتا پہنا کر ایک چھڑی ہاتھ میں دیدی گئی اور آنکھوں کی زینت کے لیے عینک بھی چڑھا دی۔ سب نے سہارا دیکر مصری کو آتشدان کے قریب ایک کرسی پر لا کر بیٹھا یا ہم بھی اس کے اردگرد بیٹھ گئے ڈاکٹر نے سگرٹوں کا ڈبہ کھول کر ترچیناپلی سگرٹ سے سب کی تواضع کی۔

۶

بہت دیر تک سرگرم بحث و مباحثہ ہوتا رہا اور دوران گفتگو میں مسٹر گلاب نے سب کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے ممی سے دریافت کیا کہ "جناب آپ اس وقت تک زندہ کیوں ہیں آخر یہ کیا اسرار ہے؟"

مصری نواب نے بہت متحیر ہو کر جواب دیا "کیوں آخر اس کی وجہ؟ میں تو ابھی سات سو برس کا ہوا ہوں! میرے والد کی عمر تو پورے ہزار سال کی تھی اور گو اس وقت انکا انتقال ہو گیا تھا۔ مگر ابھی تک عمر طبعی تک نہ پہنچے تھے۔"

اتنی بڑی عمر پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا گیا اور متعدد سوالات کی بھرمار کی گئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ ممی کی قدامت کے متعلق غلط رائے قائم کی گئی ہے اصل میں وہ پانچ ساڑھے پانچ ہزار سال سے کسی طرح کم نہ تھی۔ بہرحال مسٹر گلاب نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے مصری کو مخاطب کیا "میرا مطلب آپ کی عمر پر نظر لگانا نہ تھا! میرا مدعا یہ تھا رال کو چاہیے تھا کہ اتنے عرصہ میں آپکا کام تمام کردے"

"کس چیز کو چاہیئے تھا؟"

"رال"

"آہ اچھا" ہاں ٹھیک ہے! آپ جس چیز کا ذکر کر رہے ہیں میں اس کا مطلب کسی قدر سمجھ گیا ہوں۔ مگر میرے زمانہ میں ممی بنانے کے وقت یہ چیز ہرگز استعمال نہ ہوتی تھی بلکہ "بائی کلورائڈ آف مرکری" یا جوہر سیماب" استعمال ہوتا تھا۔"

ڈاکٹر نوروجی نے بے صبر ہو کر پھر سوال کیا کہ" ہمیں تو اسپر تعجب ہوتا ہے کہ جب آپ پانچہزار برس پہلے مرکر ممی بنائے گئے تھے تو آج زندہ کیونکر نکل آئے ؟"

"نواب نے جواب دیا، ہرگز نہیں! میں ہرگز نہ مرا تھا! کون کہتا ہے میں مرگیا تھا میں تو زندہ بیٹھا ہوں۔ اصل میں آپ کو پوری معلومات نہیں حاصل ہیں۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ مجھپر مرگی کا دورہ طاری ہوا اور اس شدت کے ساتھ کہ رشتہ داروں نے سمجھا میں مرگیا چنانچہ یہ تصوّر کرکے مجھے "پارچہ بند" کردیا گیا غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ ممیاں بنانے کا کیا طریقہ تھا ؟"

پارٹی میں سے کوئی بولا:" تفصیلی طور پر معلوم نہیں۔"

" میرا خیال ہے کہ میں اس وقت پوری پوری کیفیت بیان کرنے سے قاصر ہوں ہاں مختصراً بیان کرتا ہوں۔ عام طور پر ممی بنانے کا یہ طریقہ تھا کہ جس کی ممی بنانی ہوتی تھی اسے غسل دیکر عطریات سے معطر کیا جاتا تھا پھر حجامت بنانے کے بعد نمک لگاکر کئی ہفتے تک یونہی چھوڑ دیا جاتا تھا پھر اصل ممی بنانے کا عمل شروع ہوتا تھا۔" پارچہ بندی" کا مفہوم یہ ہوتا تھا کہ انسان کی تمام" قوائے حیوانیہ" کو سلب یا منجمد کردیا جائے یعنی جو انسان جس ہیئت میں بھی" معطر پارچہ بند" ہوجاتا تھا وہ ہزار ہا سال تک اپنی اسی حالت پر قایم رہتا تھا چنانچہ مجھے بھی **زندہ** پارچہ بند کردیا گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ آج آپکے سامنے صحیح و سالم بیٹھا ہوں۔ اس وقت بھی میری رگوں میں سقارا باعیس کا خون چکر لگا رہا ہے۔"

" سقارا باعیس"! ڈاکٹر نوروجی نے اس عجیب لفظ پر حیرت کا اظہار کیا۔

" ہاں، سقارا باعیس قدیم مصری امرا اور نوابوں کی ایک نسل تھی اور میں اسی نسل کی ایک شاخ کا مرد ہوں۔"

" لیکن اس کا آپ کی زندگی سے کیا علاقہ ہے ؟"

" آپ کو معلوم ہے کہ مصری ممی بنانے سے پہلے اس شخص کی آنتیں، دماغ، اور دیگر آلائشیں نکال لیا کرتے تھے مگر یہ فخر صرف سقارا باعین کی نسل کے افراد ہی کو حاصل ہے کہ انہیں بدستور رکھا جاتا تھا اور پارچہ بندی کے وقت ان میں کوئی مداخلت نہ کی جاتی تھی اگر میں بھی سقارا باعیس کی نسل سے نہ ہوتا تو رواج کے موافق میری آنتیں اور دماغ بھی نکال لیا جاتا اور آج اس طرح زندہ نہ ہوتا۔"

پروفیسر گبلانی نے سوال کیا "کیا سقارا یا عیس قدیم مصریوں کا کوئی خدا تھا؟"

مصری اپنی کرسی پر سے [illegible] اٹھا اور پوچھا "کیا تھا؟"

"جناب کوئی خدا"

"پروفیسر صاحب آپ جیسے عالم سے ایسی نادانی کی بات سن کر بڑا تعجب ہوتا ہے روئے زمین کی کسی قوم نے ایک خدا کے سوا کسی کی پرستش ہی نہیں کی سقارا یا عیس" ابلیس، طاغوت خنط البس، ہبل اور اسی قسم کے دیگر دیوتا محض ہیں خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھے جاتے تھے مگر خدا تو ایک ہی ہے گو ہر قوم میں اس تک پہنچنے کے دیوتاؤں کے نام اور شکلیں مختلف ہیں"۔

ـــ

چند لمحے تک خاموشی رہی اور ڈاکٹر نوروجی نے پھر سلسلہ گفتگو جاری کیا "لہذا آپ کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وادی نیل کے گرد و نواح میں قدیم کھنڈرات سے نیم زندہ ممیاں دستیاب ہو سکتی ہیں"۔

مصری نے جواب دیا: "بیشک اور نہ صرف میری نسل کے وہ لوگ جو اتفاقیہ حوادث کی وجہ سے زندہ پارچہ بند کر دیئے گئے بلکہ وہ بھی جو اپنی مرضی سے پارچہ بند ہو جاتے تھے اور جنہیں اُن کے احکام کے بموجب کسی نہ کسی غفلت کی وجہ سے مقبروں سے نہ نکالا گیا" "کیا اپنی مرضی سے پارچہ بند ہونے کی تشریح فرما سکتے ہیں؟" مس [illegible] نے سب سے پہلا براہ راست سوال کیا۔ مصری نے [illegible] ٹھورتے ہوئے جواب دیا کہ [illegible] خوشی سے سنئے میرے زمانہ میں انسان کی طبعی عمر [illegible] اوسطاً آٹھ سو برس [illegible] تھی [illegible] اوسط درجے کی طبعی عمر تھی یعنی جو چھ سو برس کی عمر میں مر جاتا تھا وہ ایک اتفاقی حادثہ سمجھا جاتا تھا جو ہزار برس تک زندہ رہتا تھا وہ بہت خوش قسمت خیال کیا جاتا تھا۔ بہرحال آٹھ سو برس اوسط درجے کے لوگوں کی طبعی عمر تھی جب ہمارے فلسفی حکیموں اور ساحروں کو معطر پارچہ بندی کا اصول معلوم ہوا تو انہوں نے سوچا کہ انسان کی عمر کا یہ طویل حصہ اگر مختلف قسطوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس سے فنی حکیم بڑے بڑے امرا اور رؤسا ایک کافی طویل عرصہ تک زندہ رکھے جا سکیں گے اور اس وجہ سے سائنس کو محیر العقول کاملانِ فن کی مساعی سے عرصہ دراز تک مستفید ہونے کا موقع مل سکے گا اور ان کے علم و فضل سے

ہزارہا بندگان خدا سینکڑوں برس اور سالہا [illegible] زندوں میں فائدہ اُٹھاتے رہیں گے۔ فرض کیجیے کہ
ایک مورّخ بڑی محنت و مشقت سے ایک تاریخی کتاب تحریر کرکے جب اس کی عمر پچیس برس
تک پہنچی تھی اپنے آپ کو زندہ پارچہ بند کرکے مقبرہ میں محبوس ہوجاتا تھا اور اپنے ممی سازوں کے لیے
ہدایت چھوڑ جاتا تھا کہ ایک مقررہ وقفہ گذرنے کے بعد (فرض کر لیجیے سات سو برس) کے بعد اُسے
پھر زندہ کر دیا جائے یعنی جسم سے پارچے علیحدہ کر دیے جائیں [illegible] مصالحے لگا کر جسم میں مصنوعی حرارت
پیدا کی جائے اور رفتہ رفتہ مختلف ادویات کے [illegible] سے قوت حیات عود کرائی جائے۔ جب وہ
مورخ دوبارہ صحیح و سالم ہو جاتا تھا تو اپنی کتاب پر نظر ڈالتا تھا تنقید و تبصرہ کرتا تھا جس زمانہ میں کہ
"حیات ثانیہ" واقع ہوتی تھی اس زمانہ میں وہ اپنی پہلی حیات کی تاریخ دوبارہ لکھنی شروع کرتا تھا جو باتیں
غلط سلط مشہور ہو جاتی تھیں انہیں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کے ثبوت سے عوام کی غلط فہمیوں
کا ازالہ کرتا تھا اور اس زمانہ میں اس کی پہلی زندگی کے متعلق اس کی رائے صائب اور مستند سمجھی جاتی تھی
غرض اس طرح ہماری تاریخ ہزارہا سال تک مسلّم الثبوت و مستند روایات پر مبنی رہتی تھی حالانکہ کرۂ ارض
کی دیگر اقوام کی تاریخ کا بیشتر حصہ قصوں، دیوی دیوتاؤں کے افسانوں، رزمیہ شاعری اور علم الاصنام
(Mythology) کی بے سروپا داستان پر مشتمل ہوتی تھی۔

۹

تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی اور میں نے پھر ایک براہ راست سوال کیا قدیم مصر
کو دوربین، خوردبین، عکسی شیشہ [illegible] اور پھر شیشہ سازی کا علم تھا یا نہیں۔ اسپرمی نے لہجہ
میں جواب دیا کہ نہ صرف یہ بلکہ اس سے بھی [illegible] چیزیں ہمارے احاطہ علم میں آچکی ہیں علم و حکمت
کی کوئی شاخ نہ تھی جس میں ہمیں دسترس نہ ہو [illegible] الٰہیات، ہیئت، جفر، رمل، سحر، علم الابدان، کیمیا،
ادویہ وغیرہ وغیرہ علوم میں مہارت [illegible] کانچ سے مصنوعی جواہرات بنانے کا ایک
طریقہ معلوم تھا کہ اس وقت مقابر سے جتنے جواہرات برآمد ہوئے ہیں ان میں سے نصف [illegible]
یا کانچ ہیں لیکن عہد موجودہ کا [illegible] شیشہ ساز یا جوہری ذرہ برابر تمیز نہیں کرسکتا فرق [illegible]
بات ہے کیا عہد موجودہ [illegible] پیش کرسکتا ہے۔ جراحی میں اگرچہ مذہباً مکروہ فعل تھا کیا [illegible]
مثال پیش کی جاسکتی ہے [illegible] باریک بال کے ساتھ [illegible] کو علیحدہ علیحدہ کرسکتا تھا۔

مصری اپنی مبالغہ آمیز گفتگو کو طویل کئے جاتا تھا کہ ڈاکٹر نوروجی کو ایک اور بات سوجھی اور کہا "عہد موجودہ کی عظیم الشان عمارتوں، کارخانوں بڑے بڑے شہروں ہسپتالوں کالجوں وغیرہ کو دیکھنے فن تعمیر ختم کردیا ہے، تاج جیسی عمارت روے زمین پر نہیں کتنی خوبصورت ہے! دیوار چین جیسی مستحکم چیز کسی زمانہ میں ہوئی تھی؟"

خود ہمیں ڈاکٹر کی اس جرءت پر تبسم آیا کیونکہ سوال کے جواب میں اگر مصری صرف اہرام مصری کی مثال پیش کردیتا تو وہ ڈاکٹر کو مسکت کرنے کے لئے کافی تھا چنانچہ یہی ہوا مصری نے بیان کیا کہ اس کے زمانہ میں بیسوں شہر ایسے آباد تھے جنکی آبادی نیویارک لندن اور پیرس سے بڑھی ہوئی تھی عمارتیں اس سے زیادہ پائدار اور شاندار ہوا کرتی تھیں کچھ عظیم الشان عمارتوں ہی پر موقوف نہ تھا معمولی معمولی مکانات آجکل کے محلوں کے برابر وسعت رکھتے تھے چنانچہ ایک مکان کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو مصر کے ایک نواب کا تھا اور دریائے نیل سے دو میل کے فاصلہ پر واقع تھا اس مکان میں اسی دروازے چالیس ستون ہیں ایوان لمبے بلند، دس فوارے اور حوض، گیلریاں غرض فن تعمیر کی ہر چیز موجود تھی یہ مکان عاقہ قارنق کا ایک معمولی مکان تھا سب سے بڑھکر اہرام مصری، فینکس وغیرہ قارنق کے عمار ایسی ایسی چیزیں ہیں کہ آج اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔"

۹

جب فن تعمیر میں عہد موجودہ کو شکست ہوتی دکھائی دی تو میں نے جھٹ سوال کیا کہ "آپ ہماری ریلوں کے متعلق کیا فرماتے ہیں" نواب نے ریل کی حقیقت معلوم کرکے کہا "ہاں بیشک یہ چیزیں عہد موجودہ کی پیداوار ہیں مگر ہمارے زمانہ میں بھی آلات جر ثقیل ایسے ایسے ایجاد ہوگئے تھے کہ دس دس ٹن کے پتھر پر کاہ کی مانند سینکڑوں فیٹ کی بلندی پر بآسانی لیجا سکتے تھے کیا عہد موجودہ کی انجینیری ایسی زنجیر صعود (Crane) بناسکی ہے کیا اہرام مصری جیسی عمارت بنانے کے کوئی پی ڈبلیو ڈی تیار ہے؟"

ہم اپنے عہد کی کم مائیگی آلات اور کلوں کی محتاجی کا خیال کرکے چپ ہو رہے مگر پروفیسر گیلانی نے کچھ سوچکر پوچھا "کیا مصریوں میں نپولین جیسا مدبر جرنیل، اناطول فرانس جیسا انشا پرداز، نیوٹن جیسا ریاضی داں ڈارون جیسا مفکر سعدی جیسا شاعر کالیداس جیسا ناٹک نویس بدھ جیسا مہاتما اور گاندھی جیسا سیاسی لیڈر پیدا ہوا تھا؟"

مصری نے ان فخریہ ناموں کو سنا اور کچھ دیر توقف کے بعد کہنا شروع کیا "بیشک یہ انسان برگزیدہ

ہستیاں ہیں لیکن عہد موجودہ کے معیار سے ہمارا زمانہ بھی ان جیسے لوگوں اور بعض اوقات ان سے بڑے بڑے، لوگوں سے خالی نہ تھا مثلاً طاعوت جیسا جرنیل پھر پیدا نہ ہوا۔ غوطالیس جیسا مورخ بزم علم کی جلوہ افروزی کے لئے کبھی پیدا نہ ہوگا۔ قاقیط مفکر جس نے معطر پارچہ بندی کا طریق معلوم کیا اب موجود نہیں اور نہ ہونے کی امید، ہم نے موضوع گفتگو سیاست کی طرف منتقل کر دیا۔ چنانچہ اس میدان میں بولنے کے لئے کافی مواد موجود تھا اشتراکیت، غرض ہر چیز پر تبصرہ کر ڈالا لیکن بعض چیزوں کو مصری نہ سمجھ سکتا تھا مثلاً پارلیمنٹ کا مفہوم بہت مشکل سے سمجھایا گیا۔ اخبارات کا خیال بھی مصری کی حیرت بڑھانے کے لئے کچھ کم نہ تھا۔

۱۰

میں نے سوال کیا کہ کیا مصریوں کو بھاپ بھی معلوم تھی؟"

نواب نے مسکرا کر جواب دیا کہ "ہمارے زمانہ کا ہر طبیب قرابہ یا بھبکا کھینچنا جانتا تھا اور اس زمانہ سے لیکر آجتک مصریوں ہی سے عرق کشید کرنے اور بھاپ بنانے کا رواج چلا آرہا ہے جیسے عربوں نے ایک سائنٹیفک شکل میں تبدیل کر دیا مگر اس کی ابتدا ہمارے ہی زمانہ میں ہوئی تھی جب زہریلی بوٹیوں کے تیل نکالنے کا طریق ایجاد ہوا"

ڈاکٹر نوروجی نے متبسم ہو کر سوال کیا "کیا مصری عہد موجودہ کے لوگوں پر لباس کے معاملہ میں بھی فوقیت رکھتے تھے؟" مصری نے یہ سن کر اپنے پاجامہ قمیص کوٹ اور پگڑی کو کئی دفعہ دیکھا چھڑی میز پر رکھکر پگڑی کا ایک کونہ ہاتھ میں لیکر گھورا اور پھر منہ کھول کر قہقہہ مار کر ہنسا مگر مجھے یاد نہیں کہ اس نے کچھ جواب بھی دیا تھا یا نہیں؟"

ڈاکٹر نے پھر تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا "کیا مصریوں کو کونین، ایکس ریز اور ریڈیم معلوم تھا؟ کیا تھرمامیٹر ایجاد کیا گیا تھا؟"

ہم بہت بے چینی کے ساتھ ممی کی طرف دیکھ رہے تھے مگر اس وقت تک کوئی جواب موصول نہ ہوا تھا۔ کہ یکایک اس کے ہاتھ سے چھڑی گر پڑی گردن ایک طرف کو جھک گئی اور چہرہ پر مردنی کے آثار پیدا ہونے لگے اور ہمارے دیکھتے ہی نامعلوم طریق پر موت نے اپنا قبضہ جما لیا۔

میں نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور ممی پر آخری نظر ڈال کر گھر روانہ ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو دیکھا چار بج چکے تھے مگر میں اتنے وقت ہی کو غنیمت سمجھ کر سو گیا اور صبح سات بجے اٹھا اور اس وقت سے لیکر

برابر لکھ رہا ہوں اب دس بج چکے ہیں اور اس واقعہ کو اپنے خاندان اور بنی نوع انسان کی معلومات کے لئے قلمبند کر رہا ہوں۔

یہ عمر ہو گئی ہے مگر افکار و حوادث کے تھپیڑے پنپنے نہیں دیتے اس وقت مجھے یہ فکر دامنگیر ہے کہ ہندوستان کو اگر مستقبل قریب میں "نیم سوراج" مل گیا تو ۲۰۲۹ء میں "صدر جمہوریہ ہند" کون ہوگا نیز ہندوستان دوسرا گاندھی پیدا کر سکے گا یا نہیں۔

مسودہ ختم ہو چکا ہے اب حجامت بنا کر چار کی ایک پیالی پیونگا پھر ڈاکٹر نور دین کے پاس جاؤنگا کہ مجھے زندہ پارچہ بند کر دو تاکہ دو سو برس کے بعد دوبارہ "زندہ" ہو جاؤں اور اگر یہ مسودہ ایڈیٹروں کے ہتھے نہ چڑھا ہو تو اسے دوبارہ لکھوں اور حسب ضرورت ترمیم و تنسیخ کر کے کسی حق ناشناس کاتب کے سپرد کر دوں۔

نغمۂ قدسی

ماخوذ از گوئٹے

میاں محمد رفیق خاور۔ بی۔ اے آنرز

جبریل

افلاک پہ آفتابِ تاباں   ہے روزِ ازل سے جلوہ ساماں
ہے خلدِ نظر جمال اُس کا   ہے اُس کا جلال راحتِ جاں
اک بزم ہے کائنات ساری   اور مہرِ منیر شمعِ سوزاں
انوارِ لطیف سے ہیں اُس کے   سرشارِ طرب تمام ذی جاں
محوِ جمال ہیں ملائک   مخمورِ تجلیات انساں
کیا خوبیِ مہر ہے کہ اب تک
حسن اس کا نہیں زوال ساماں

میکائیل

گردش میں زمیں ہے کبھی کی   ہے ظلمت و نور سے گذرتی
فردوسِ نظر ہے اک جہاں کو   ہنگام سحر کی خوشگواری
شبہائے سیاہ شام کے بعد   ہو جاتی ہیں بحر و بر پہ طاری
ہوتا ہے غروب مہرِ تاباں   ظلمت ہے جہان پر بکھرتی
دریاؤں میں بیقرار موجیں   پہلو میں اِدہر اُدھر بدلتی
رہتی ہیں مدام گرمِ جولاں
اللہ رے ان کا جوششِ مستی

اسرافیل

اک ابر پدید ہے فلک پر   اک ابرِ بسیط و کوہ پیکر
جس کے دلِ برق جوش میں ہے   اک محشرِ سوز و ساز مضمر

ہے رعد کہ شورشِ مجسم | ہے برق کہ آتشِ مصوّر
اللہ یہ شورش وتب وتاب | جس سے ہیں تمام لوگ مضطر
لیکن ترے ظلِّ عاطفت میں | اے ایزدِ ذوالجلال و برتر

ہم کو نہیں خوف کچھ بھی اس کا
ہم کو ہے سکونِ دلِ میسّر

سب فرشتے مِل کر

ہے خلد نظر جمالِ یزداں | ہے اُس کا جلال راحتِ جاں
ہے اس سے نظامِ دہر قایم | ہے اس سے بجا جہانِ امکاں
اک بزم ہے کائنات ساری | اور اُس کا وجود شمعِ خنداں
انوارِ لطیف سے ہیں اس کے | سرشارِ طرب تمام ذی جاں
مسحورِ جمال ہیں ملائک | مخمورِ تصوّراتِ انساں

کیا خوبیِ حُسنِ ایزدی ہے
اصلا نہیں جو زوال ساماں

واردات قلب

ازجناب ماسٹر محمد حسین - اسلامیہ کالج - لاہور۔

وہی زندہ رہے جو عشق کے مارے نکلے | اس سمندر میں جو ڈوبے وہ کنارے نکلے
تجھ کو چھوڑا تھا کہ ارباب وفا ملتے ہیں | وہ کسی کے نہ ہمارے نہ تمہارے نکلے
اس سے کیا جان سے جاتا رہا کوئی بیکس | تُو تو خوش ہے۔ ترے ارماں تو بارے نکلے
وہ نہ آئے۔ مری قسمت! مگر اے جذبۂ عشق، | ترے دعوے جو تھے وہ جھوٹے ہی سارے نکلے

اُن سے نفرت جنھیں آنکھوں پہ بٹھائے دنیا
جن کو کوئی بھی نہ چاہے ترے پیارے نکلے

قوم گاتھ کی آ[illegible]ت

مولانا ذوالفقار علی خاں گوہر رامپوری ثم قادیانی

گاتھ (عربی قوط) کی اصلیت کی بابت یورپین مورخ لکھتے ہیں کہ یورپ کی تاریخ میں ان کا ذکر تیسری صدی عیسوی کے وسطی حصے سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن یونانی مورخ ہراڈوٹس نے لکھا ہے کہ یہ ایک پرانی قوم ہے جو جیٹے کہلاتی تھی۔ رومی مورخوں نے بھی تصدیق کی ہے کہ گاتھ اور جیٹے ایک ہی قوم ہے۔ گبن نے لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ ہندوستانی جاٹ اور جیٹے ایک ہی نسل سے ہوں۔ یونانی مورخ لکھتے ہیں کہ جیٹے (گاتھ) اصل میں سیتھین ہیں (Scythian) ہیں گبن کا خیال محض خیال نہیں ہے بلکہ اگر وہ تحقیقات کو زمانہ گذشتہ کی پرانی سے پرانی تاریخ تک لیجانے کی کوشش کرتا تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ یہ حقیقت مثبتہ ہے۔ ہم نے اس موضوع پر اس لئے قلم اُٹھایا ہے کہ ہمارے ملک پنجاب میں خصوصًا یہ قوم اپنے اصلی نام جاٹ سے یا جٹ سے ہنوز موسوم ہے۔ پہلے خط وخال کو اور پچھلی قومی شجاعت کو انہوں نے ابتک ایک حد تک پنجاب میں قائم رکھا ہے اگرچہ جمنا کے پار یہ حالت گھٹتے گھٹتے تقریبًا ناپید ہو جاتی ہے۔ رومی مورخ لکھتے ہیں کہ جیٹے قوم شاہ اگسٹن (رومی) کے زمانہ میں ڈینوب دریا کے کنارے آباد تھی اور بحر اسود تک اس کی آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ رومی مورخ ٹیسی ٹس نے ایک صدی کے بعد یعنی سن عیسوی سے تقریبًا پچاس ساٹھ سال پہلے جیٹی قوم کا مسکن بحر بالٹک کے کنارے لکھا ہے اور گاتھونیز نام سے ان کو نامزد کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ یہ جرمنی قوم ہے۔ لیکن جنوبی جرمنی میں جو قوم گاتھنی رہتی تھی اُسے وہ سیلٹ یا گال کہتا ہے۔ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ گاتھ قوم بھی اصلیت ناروے کے ساتھ منسوب کرتی ہے یعنی وہ اپنے آپ کو اسکنڈی نیوین کہتے ہیں (Scandinavian)

میں سمجھتا ہوں کہ سب سے مضبوط اصل کسی نسل کی تاریخ میں اُس کا اپنا دعویٰ نسلی ہے وہی مقدم ہوتا ہے اور ہونا چاہئے۔ ہاں اگر اس دعوے کے مقابلہ میں زبردست تاریخی ثبوت موجود ہوں تو ہم اُسے رد کر سکتے ہیں۔ گاتھ قوم اپنے آپ کو شمالی یورپ کا متوطن بتاتی ہے یونانی مورخ ہراڈوٹس نے قوم گاتھ کو سیتھیا کا رہنے والا بتایا ہے اور اگرچہ ہراڈوٹس کی بتائی ہوئی سیتھیا کا پتہ لگانا گونہ دشوار ہے مگر بہرحال اس قدر مانا جا سکتا ہے کہ وہ حصہ یورپ جو جنوب مشرق کی جانب مابین جبل کارپتھیاین اور دریائے ڈان (روس) واقع ہے لیکن جدید تحقیقات ثابت کرتی ہے کہ سیتھین

ان تمام خانہ بدوش قوموں کو کہا جاتا تھا جو ایشیا اور یورپ دونوں کے شمال میں رہتی تھیں۔ ہراڈوٹس کا بیان بھی یہی ہے کہ یہ قوم ایشیا سے آئی ہے (ہراڈوٹس جلد ۴ صفحہ ۱۰۱) شمالی ایشیا سے یورپ میں اس قوم کا جانا تاریخی طور پر معلوم ہو سکتا ہے۔ غالباً سیتھین قوم سے شکست کھا کر فوراً ہی سائمیرین (Cimerean) قوم نے بزمانہ شاہ آرڈس سنہ ۶۴۰ قبل عیسوی لیڈیا پر حملہ کیا تھا۔ لیڈیا کی حدود تقریباً وہی تھیں جو اب ایشیائے کوچک کی ہیں۔ گو یہ واقعہ صحیح ہے تو پھر یہ وہ زمانہ ہے کہ سائمرین سے شکست کھا کر سیتھین یورپ سے ایشیائے کوچک کی طرف سے گئے ہیں۔ اور اس لئے یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ دریائے ڈینوب کی وادیوں میں بحر اسود کے کنارے کنارے آباد ہوئے ہیں۔ ایشیائے کوچک میں اُن کا سنہ ۶۴۰ قبل عیسوی میں موجود ہونا اور سائمیرین کا ان پر سائبیریا کی طرف جنوبی حملہ کرنا بتاتا ہے کہ سائبیریا تک اُن کی تاخت و تاراج ہوتی رہی ہے۔ سیتھین کے متعلق صرف دو اور تاریخی واقعات جو اہم ہیں ہراڈوٹس نے بیان کئے ہیں۔ اوّل اُن کا میڈیا پر حملہ کرنا۔ یہ ایرانی سلطنت کیانی سلاطین کی تھی یہ حملہ کیخسرو کے زمانہ میں ہوا تھا جس کا عہد حکومت سنہ ۶۳۵ قبل سن عیسوی سے سنہ ۵۹۵ قبل عیسوی تک رہا اس حملہ میں وہ میڈیا پر غالب آئے اور ایشیا میں اُن کی حکومت مضبوط ہوئی۔ مصر تک اُن کو تسلّط حاصل ہوا۔ دوسرا واقعہ اُن کی بابت یہ بیان کیا گیا ہے کہ داراسپ ثانی نے اُن پر حملہ کیا مگر ناکام رہا۔ یہاں پر ایک بات یہ ضروری قابلِ بیان ہے کہ سائمیرین حملہ کے زمانہ میں ہی یا اس کے قریب ہی چین کی تاریخ میں ایک بہت مشہور واقعہ ہوا ہے۔ اور وہ دیوارِ چین کا بنایا جانا ہے۔ ذی القرنین کا قرآن شریف میں ذکر آیا ہے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ سکندر تھا جو مقدونیہ کا بادشاہ تھا۔ یہ حصّہ ملک تھا جو تھریس اور تھسلی وغیرہ پر مشتمل تھا۔ پس وہ سکندر جو سکندر ثانی ولد امنتاس اول (Amyntus I) ہو سکتا ہے جس کا عہد حکومت سنہ ۵۰۶ قبل عیسوی سے شروع ہوا ہے اس سے پہلے کوئی سکندر نام کا بادشاہ تاریخ میں نہیں ہے۔ اسی کے عہد میں ایرانیوں نے یونان پر حملہ کیا تھا اس لئے ذی القرنین اُسے نہیں کہہ سکتے کیونکہ ذی القرنین نے اُس قوم کا سدباب کیا ہے اور اُس کے حملہ کے روکنے کے لئے دیوار بنائی تھی جو بحر اسود اور یورال پہاڑ کے درمیان میں آباد تھی اور وہ ایشیا پر حملے کرتی تھی جنوبی ایشیا تک اُس نے حملے کئے ہیں اور اسی لئے ذوالقرنین نے مغرب میں اُسی دریا تک سفر کیا جو سیاہ مٹی کے رنگ کا تھا اور اس میں سورج ڈوبتا تھا (بحر اسود "عین حمئۃ") اور جب مشرق کی طرف گیا تو ایسے میدانوں میں پہنچا جن میں سورج کی تیزی سے بچنے کے لئے ان میدانی قوموں کے لئے سایہ نہ تھا اور وہ صحرائے بلوچستان سید تار، مالکران کوسٹ ہے (دیکھو قرآن شریف سورۂ کہف "یسئلونک عن ذی القرنین الخ")

پھر اُس کے سفر کے حال میں یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہ ایسی قوم کے پاس بھی پہنچا ہے جس نے خواہش کی ہے کہ ایک دیوار بنا دے جو ہمیں یاجوج ماجوج جیسی مفسد قوموں کی خونریزیوں سے بچاوے اور یہ قوم بین السدین رہتی تھی۔ یہ وہی سیتھین قوم تھی جو بحر اسود اور جبل یورال یا قاف کے درمیان آباد تھی۔ ایک طرف پہاڑ اُس کے محافظ تھے دوسری طرف بحر اسود تھا۔ جنوبی ایشیا میں اُن کے حملے اور چین کی دیوار کا موجود ہونا اور یاجوج ماجوج کا ذکر ان تینوں کو ملا کر دیکھا جائے تو صاف عیاں ہوتا ہے کہ کیخسرو کے زمانہ میں جیسا ہرڈوٹس نے لکھا ہے کہ سیتھین غالب آ گئے تھے لیکن یہ بھی ہراڈوٹس کے ہی بیان سے ثابت ہے کہ شاہ میڈیا یعنی کیخسرو نے پھر سیتھین پر حملہ کیا اور اُن کے ۲۸ سالہ حکومت ایشیا کو تباہ کر دیا اور بحر اسود تک اُن پر چھاپا مارا ہے۔ پس ذی القرنین کیخسرو ہو سکتا ہے اور سیتھین اور یاجوج ماجوج ایک ہی قوم ہے جو ایشیا کے شمال یعنی سائبیریا اور منگولیا سے نکل کر ایشیائے کوچک میں ٹھیری اور پھر فارس یعنی میڈیا کے بادشاہ کیخسرو نے اُسے مغلوب کیا۔ سیتھین کو ٹیوٹانک قوم بھی کہا ہے اور ٹیوٹانک قوم میں جرمنی اور سیکسن بھی شامل ہیں۔ جوج کا ذکر بائبل میں آتا ہے اُسے توبالسک اور ماسکو کا حاکم کہا گیا ہے یہی وہ علاقہ ہے جو بحر اسود اور یورال کے پہاڑوں کے درمیان ہے اور یہیں سیتھین آباد تھے۔ پس سیتھین اور جوج و ماجوج اور ٹیوٹانک او جیٹی ایک ہیں۔

باجات سیتھین قوم کی بابتہ آخری بات قابل تحریر یہ ہے کہ بحیثیت قوم وہ پلینی کے زمانہ میں جس کا عہد ستہ قبل از عیسوی تھا معدوم ہو چکے تھے پلینی روم کا رہنے والا تھا اور مؤرخ ٹیسی ٹس کا دوست تھا۔ روم کے مصنفین میں اُس کا بھی شمار ہے۔ اُن کی جگہ اب جرمنی اور سارمیٹیا کے رہنے والوں نے لے لی تھی۔ سارمیٹیا اُس حصہ ملک کا نام تھا جو دریائے وسیچولہ (جرمنی) اور بحیرۂ خضر (کیسپین) کے درمیان واقع ہے یہ وہی حصہ ہے جو سیتھین قوم کی آبادی کے پھیلاؤ میں آ چکا تھا۔ یہ زمانہ پلینی کا وہی زمانہ ہے جس کی بابتہ اُس کے دوست ٹیسی ٹس نے لکھا ہے کہ سن مسیحی سے ۵۰ یا ۶۰ سال قبل گاتھونیز ایک قوم بحر بالٹک کے کنارے جرمنی میں رہتی تھی۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ سیتھین نابود ہو چکے تھے بلکہ لفظ سیتھین صرف شمالی ایشیا کے لئے باقی رہ گیا تھا اور یورپ میں اب گاتھونیز یا گاتھے یا گال رہ گیا تھا۔ قوم ایک ہی تھی مقدونیہ میں سکندر اعظم کی فتوحات نے دوسری جنگجو قوموں کے واقعات کو پھیکا کر دیا تھا۔ یہ خانہ بدوش قوم اگرچہ اب آباد تھی مگر فارسی اور مقدونیا کی سلطنتیں عرصہ سے دست و گریبان ہو رہی تھیں اس لئے مورخ نے سیتھین کا ذکر نہیں کیا ہے اور سمجھا ہے کہ وہ قوم بحیثیت قوم فنا ہو چکی ہے۔ پس یہ گاتھ قوم جو کسی زمانہ میں جیٹی یا سیتھین کہلاتی تھی اپنی جنگجوئی کی بدولت دنیا کے لئے ہیبتناک اور زلزلہ افگن ہی۔

ان تمام خانہ بدوش قوموں کو کہا جاتا تھا جو ایشیا اور یورپ دونوں کے شمال میں رہتی تھیں۔ ہراڈوٹس کا بیان بھی یہی ہے کہ یہ قوم ایشیا سے آئی ہے (ہراڈوٹس جلد ۴ صفحہ ۱۰۱) شمالی ایشیا سے یورپ میں اس قوم کا جانا تاریخی طور پر معلوم ہو سکتا ہے۔ غالباً سیتھین قوم سے شکست کھا کر فوراً ہی سائمیرین (Cimerean) قوم نے بزمانہ شاہ آرڈس سنہ ۶۴۰ قبل عیسوی لیڈیا پر حملہ کیا تھا۔ لیڈیا کی حدود تقریباً وہی تھیں جو اب ایشیائے کوچک کی ہیں۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو پھر یہ وہ زمانہ ہے کہ سائمرین سے شکست کھا کر سیتھین یورپ سے ایشیائے کوچک کی طرف سے گئے ہیں۔ اور اس لئے یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ دریائے ڈینوب کی وادیوں میں بحر اسود کے کنارے کنارے آباد ہوئے ہیں۔ ایشیائے کوچک میں اُن کا سنہ ۶۴۰ قبل عیسوی میں موجود ہونا اور سائمیرین کا ان پر سائبیریا کی طرف جنوبی حملہ کرنا بتاتا ہے کہ سائبیریا تک اُن کی تاخت و تاراج ہوتی رہی ہے۔ سیتھین کے متعلق صرف دو اور تاریخی واقعات جو اہم ہیں ہراڈوٹس نے بیان کئے ہیں۔ اوّل اُن کا میڈیا پر حملہ کرنا۔ یہ ایرانی سلطنت کیانی سلاطین کی تھی یہ حملہ کیخسرو کے زمانہ میں ہوا تھا جس کا عہد حکومت سنہ ۶۳۵ قبل سن عیسوی سے سنہ ۵۹۵ قبل عیسوی تک رہا اس حملہ میں وہ میڈیا پر غالب آئے اور ایشیا میں اُن کی حکومت مضبوط ہوئی۔ مصر تک اُن کو تسلّط حاصل ہوا۔ دوسرا واقعہ اُن کی بابت یہ بیان کیا گیا ہے کہ داراسپ ثانی نے اُن پر حملہ کیا مگر ناکام رہا۔ یہاں پر ایک بات یہ ضروری قابل بیان ہے کہ سائمیرین حملہ کے زمانہ میں ہی یا اس کے قریب ہی چین کی تاریخ میں ایک بہت مشہور واقعہ ہوا ہے۔ اور وہ دیوار چین کا بنایا جانا ہے۔ ذی القرنین کا قرآن شریف میں ذکر آیا ہے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ سکندر تھا جو مقدونیہ کا بادشاہ تھا۔ یہ حصہ ملک تھا جو تھریس اور تھسلی وغیرہ پر مشتمل تھا۔ پس وہ سکندر جو سکندر اوّل ولد امنتاس اول (Amyntas I) ہو سکتا ہے جس کا عہد حکومت سنہ ۵۰۶ قبل عیسوی سے شروع ہوا ہے اس سے پہلے کوئی سکندر نام کا بادشاہ تاریخ میں نہیں ہے۔ اسی کے عہد میں ایرانیوں نے یونان پر حملہ کیا ہے اس لئے ذی القرنین اُسے نہیں کہہ سکتے کیونکہ ذی القرنین نے اُس قوم کا سد باب کیا ہے اور اُس کے حملے کے روکنے کے لئے دیوار بنائی تھی جو بحر اسود اور یورال پہاڑ کے درمیان میں آباد تھی اور وہ ایشیا پر حملے کرتی تھی جنوبی ایشیا تک اُس نے حملے کئے ہیں اور اسی لئے ذوالقرنین نے مغرب میں اُسی دریا تک سفر کیا جو سیاہ مٹی کے رنگ کا تھا اور اس میں سورج ڈوبتا تھا (بحر اسود "میں حمئۃ") اور جب مشرق کی طرف گیا تو ایسے میدانوں میں پہنچا جن میں سورج کی تیزی سے بچنے کے لئے ان میدانی قوموں کے لئے سایہ نہ تھا اور وہ صحرائے بلوچستان سیستان یا مکران کوسٹ ہے (دیکھو قرآن شریف سورۂ کہف "لیسئلونک عن ذی القرنین الخ")

پھر اُس کے سفر کے حال میں یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہ ایسی قوم کے پاس بھی پہنچا ہے جس نے خواہش کی ہے
کہ ایک دیوار بنا دے جو ہمیں یاجوج ماجوج جیسی مفسد قوموں کی خونریزیوں سے بچاوے اور یہ قوم بین السدین
رہتی تھی۔ یہ وہی سیتھین قوم تھی جو بحر اسود اور جبل یورال یا قاف کے درمیان آباد تھی۔ ایک طرف پہاڑ اُس کے
محافظ تھے دوسری طرف بحر اسود تھا۔ جنوبی ایشیا میں اُن کے حملے اور چین کی دیوار کا موجود ہونا اور یاجوج ماجوج
کا ذکر ان تینوں کو ملا کر دیکھا جائے تو صاف عیاں ہوتا ہے کہ کیخسرو کے زمانہ میں جیسا ہرڈوٹس نے لکھا ہے کہ
سیتھین غالب آگئے تھے لیکن یہ بھی ہراڈوٹس کے ہی بیان سے ثابت ہے کہ شاہ میڈیا یعنی کیخسرو نے پھر
سیتھین پر حملہ کیا اور اُن کے ۲۸ سالہ حکومت ایشیا کو تباہ کر دیا اور بحر اسود تک اُن پر چھاپا مارا ہے۔ پس
ذی القرنین کیخسرو ہو سکتا ہے اور سیتھین اور یاجوج ماجوج ایک ہی قوم ہے جو ایشیا کے شمال یعنی سائبیریا
اور منگولیا سے نکل کر ایشیائے کوچک میں ٹھیری اور پھر فارس یعنی میڈیا کے بادشاہ کیخسرو نے اُسے مغلوب
کیا۔ سیتھین کو ٹیوٹانک قوم بھی کہا ہے اور ٹیوٹانک قوم میں جرمنی اور سیکسن بھی شامل ہیں۔ جوج کا ذکر بائبل
میں آتا ہے اُسے تو بالسک اور ماسکو کا حاکم کہا گیا ہے یہی وہ علاقہ ہے جو بحر اسود اور یورال کے پہاڑوں کے درمیان
ہے اور یہیں سیتھین آباد تھے۔ پس سیتھین اور جوج و ماجوج اور ٹیوٹانک اور جیٹی ایک ہیں۔

باجات۔ سیتھین قوم کی بابتہ آخری بات قابل تحریر یہ ہے کہ بحیثیت قوم وہ پلینی کے زمانہ میں جو عہد مسیح
قبل از عیسوی تھا معدوم ہو چکے تھے پلینی روم کا رہنے والا تھا اور مؤرخ ٹیسی ٹس کا دوست تھا۔ روم کے مصنفین
میں اُس کا بھی شمار ہے۔ اُن کی جگہ اب جرمنی اور سارمیٹیا کے رہنے والوں نے لے لی تھی۔ سارمیٹیا اُس حصہ
ملک کا نام تھا جو دریائے وسچولہ (جرمنی) اور بحیرہ خضر (کیسپین) کے درمیان واقع ہے یہ وہی حصہ ہے جو سیتھین
قوم کی آبادی کے پھیلاؤ میں آچکا تھا۔ یہ زمانہ پلینی کا وہی زمانہ ہے جس کی بابتہ اُس کے دوست ٹیسی ٹس نے لکھا
ہے کہ سن مسیحی سے ۵۰ یا ۶۰ سال قبل گاتھونیز ایک قوم بحر بالٹک کے کنارے جرمنی میں رہتی تھی۔ پس یہ کہنا غلط
ہے کہ سیتھین نابود ہو چکے تھے بلکہ لفظ سیتھین صرف شمالی ایشیا کے لئے باقی رہ گیا تھا اور یورپ میں اب گاتھونیز
یا گاتھے یا گال رہ گیا تھا۔ قوم ایک ہی تھی مقدونیہ میں سکندر اعظم کی فتوحات نے دوسری جنگجو قوموں کے واقعات
کو پھیکا کر دیا تھا۔ یہ خانہ بدوش قوم اگرچہ اب آباد تھی مگر فارسی اور مقدونیا کی سلطنتیں عرصہ سے دست و گریبان
ہو رہی تھیں اس لئے مورخ نے سیتھین کا ذکر نہیں کیا ہے اور سمجھا ہے کہ وہ قوم بحیثیت قوم فنا ہو چکی ہے۔ پس
یہ گاتھ قوم جو کسی زمانہ میں جیٹی یا سیتھین کہلاتی تھی اپنی جنگجوئی کی بدولت دنیا کے لئے ہیبتناک اور زلزلہ افگن ہے۔

رہی ہے جنوبی ایشیا (چین - بلوچستان - افغانستان سیستان) ایران - آرمینا - ترکستان - آذربائجان - ایشیائے کوچک سب اس کی حملہ آوریوں کی بدولت تنگ رہے - بیڈین کی سلطنت سے یہ لڑتے رہے - روس - فن لینڈ - ناروے - سویڈن - جرمنی شمال وجنوبی میں اُس نے ڈیرا جمایا - پھر جرمنی سے اُس نے مشرقی روم تک میدان جنگ کو گرم رکھا - اور آخر کار سلطنت روم تباہ کردی - گذشتہ جنگ جرمنی میں ترکوں - بلگیرین اور آسٹریا اور جرمن نے ایک نسل ہونے کے باعث اتحاد کرلیا تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو ایک ہی نسل سمجھتے ہیں - گاتھ کی دو شاخیں تھیں ایک وزی گاتھ دوسری آسٹرو گاتھ جن کے تفصیلی حالات کسی اگلے پرچے میں پیش کئے جائیں گے - پس جرمنی اور آسٹریا وہی دونوں شاخیں تھیں اس لئے بلگیرین اور ترکوں سے مل گئے تھے - ترکوں کا اُن کی نسل میں شریک ہونا بھی یقینی ثبوت تک پہنچ چکا ہے -

ترکوں کی نسل مغلیہ ہے اور اصل میں منگولیا کے رہنے والے ہیں - منگولیا شمالی حصہ میں ہے یہ نسل سائبیریا سے لیکر ایشیائے کوچک تک فاتح ہو چکی تھی - یہ لوگ اُسی سیتھین قوم کی اولاد تھے - یہ آخری زمانہ سلطنت روما میں ایشیائے کوچک سے یورپ میں داخل ہوئے اور قسطنطنیہ کو فتح کیا - پس اُن کے پیشرو آبا و اجداد پہلے یورپ میں داخل ہو چکے تھے - یہ تازہ نسل بعد میں آئی اور اُس نے مذہب کے اختلاف کے باعث فتوحات کو ضروری سمجھا - اگر قاری مصطفےٰ کی وزارت میں شروع سترھویں صدی عیسوی میں وائنا کے سامنے عثمانی فوج کو شکست نہ ہوئی ہوتی تو اس تازہ دم گاتھ نے پھر یورپ کی بساط حکومت کو پلٹ دیا ہوتا - مگر نادان ناتجربہ کار سولین نے جرنیلی کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور مشیروں سے جو آزمودہ کار سپاہی تھے مشورہ نہ کیا اور ایک لاکھ فوج جرار لیکر قسطنطنیہ سے نکل کھڑا ہوا - فتوحات کے جوش میں سلسلہ رسل و رسائل کا انتظام نہیں کیا - مفتوحہ ملکوں سے جب فوج آگے بڑھ گئی اور انہیں خالی کردیا پھر تو قوموں نے بغاوت کی اور آخر کار یہ مہم پولینڈ کی بدولت تباہ ہوگئی - اس سے اچھی طرح واضح ہے کہ یورپ کے گاتھ اور ہندوستان میں پنجاب کی ان دانا زمینوں کے مالک اور زراعت کے صحیح منتظم جاٹ یا جٹ ایک ہی نسل ہے - اب بھی یہ چین سے نہیں بیٹھتے اور خونریزیاں کرتے رہتے ہیں - اب حکومت نہ سہی تو آپس میں لڑتے ہیں - پڑوسیوں کے ساتھ حکومت کے ساتھ اُن کی جنگ جاری رہتی ہے - اکالی تحریک میں جو کچھ کیا انہیں جٹوں نے کیا ہے - جس طرح روسیوں اور جرمنوں کی بدولت فرانس - بلجیم اور انگلستان کو ڈر لگا رہتا ہے - اسی طرح ہندوستان کے سرمایہ دار ساہوکاروں کو فکر لگی رہتی ہے کہ اس قوم کا خون چوستے رہیں اور ان کی زمینیں سود میں لیتے چلے جائیں -

(باقی آئندہ)

(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایم۔اے)

دیوان عزیز۔ حضرت مرزا عزیز اللہ صاحب عزیز معروف بہ منشی ولایت علی خاں اودھ کے ایک قدیم عالی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اُن کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ محمد عثمان ہارونی تک پہنچتا ہے جو حضرت شاہ معین الدین صاحب اجمیری علیہ الرحمۃ کے پیر تھے۔ اُن کے آبا واجداد عرصہ تک دولت اودھ کے ممتاز عہدہ داروں میں رہے یہاں تک کہ وہ سلطنت مٹ گئی اور ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا۔ آپ کو عربی اور فارسی میں مہارت تامہ حاصل ہے آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بعض ابھی تک قلمی نسخوں کی حالت میں ہیں۔ شاعری میں اپنے آپ کو غالب مرحوم کا شاگرد بتاتے ہیں۔ اُن کا دیوان فارسی یعنی دیوان عزیز اس وقت ہمارے پاس بغرض ریویو بھیجا گیا ہے۔

بعض غزلوں میں عراقی کا سا رنگ پایا جاتا ہے۔ کلام میں پختگی اور انداز بیان میں زور ہے۔ زبان صاف ہے اور بامحاورہ۔

ہم ذیل میں چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں:۔

ما گدایان کج کلاہی مے کنیم — در لباس دلق شاہی مے کنیم
ہرچہ گوئی از ادا مے شنویم — آنچہ دانی از نوا ہی مے کنیم
بے صبوحی نزد ما مقبول نیست — گر نماز صبح گاہی مے کنیم
چوں گناہِ ما پسند یار نیست — اجتناب بے گناہی مے کنیم

مائیم کہ ساغر بہ خرابات زدیم — وز مستی مے لاف کرامات زدیم
اے شیخ مگو فسانۂ دیر و حرم — بگذار کہ ما ترک خرافات زدیم

اس خیال کو کہ دنیا ہمارے ہی خیال کا آئینہ ہے اور کچھ نہیں ہست وہی ہے۔ ذات اور باقی سب نیست ہیں اس طرح ظاہر کیا ہے:۔

این جہاں چوں حباب مے بینیم | عین موج سراب مے بینیم
ہستی اندر حجاب پنہانست | نیستی بے حجاب مے بینیم
گر تو پنداری اصل بیداری | خواب یا مثل خواب مے بینیم

بعض اشعار عاشقانہ رنگ میں خوب ہیں۔ اور قدیم اساتذہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس قحط الرجال کے زمانہ میں ایسے فارسی شاعر کا وجود مغتنمات سے ہے۔

رندم و از کمال چالاکی | دل ز خوباں ربودہ ام ہمہ عمر
بجرم کے روم پیشانی | بر در یار سودہ ام ہمہ عمر
در خرابات از غزل خوانی | جوش مستاں فزودہ ام ہمہ عمر

غزلیات کے علاوہ مستزاد رباعیات اور مخمس بھی ہیں۔ کل ۲۱۱ غزلیں ہیں۔ دو چار مثنویاں بھی شامل ہیں۔ لکھائی اچھی ہے۔ بعض کتابت کی غلطیاں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ کاغذ وہی دقیانوسی حنائی ہے۔ کتاب کی قیمت ۱۲ ڈاکٹر محمد احسان علی انصاری صوبیدار میجر بلنشیر صفی پور ضلع اناؤ سے مل سکتی ہے۔

نثرہ۔ حضرت شاہ موصوف کے چند فارسی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں متعدد تقریظیں اور دیباچے شامل ہیں۔ نثر کا رنگ مرزا غالب مرحوم سے ملتا جلتا ہے۔ زبان کلاسیکل ہے مگر لذیذ۔ پرانے لٹریچر کے دلدادگان کو ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ قیمت ۸ر۔ مذکورہ بالا پتہ سے طلب کیجئے۔

رسالہ کیمیکل سوسائٹی۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

ایک سال سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ماتحت کیمیکل سوسائٹی قائم ہے جس کی غرض و غائت علم کیمیا کی ترویج و اشاعت ہے اسی سلسلے میں اس سوسائٹی کے کارکنوں نے مختلف مجالس کے انعقاد کا انتظام بھی کیا ہے جہاں اہل الرائے اصحاب کو اپنے قیمتی خیالات کے اظہار کا موقع دیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی قابل ستائش یہ بات ہے کہ ان لوگوں کا ارادہ سال بھر میں علم کیمیا پر ایک مستقل اردو تصنیف شائع کرنا ہے جس سے اردو زبان میں ایک گراں قدر اضافہ کی توقع کی جاتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک سہ ماہی رسالہ جاری رکھا ہے جس میں انگریزی اردو دونوں زبانوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں رسالے کا چوتھا نمبر زیر تبصرہ ہے مضامین کی وسعت و تنوع، اور عام علمی دلچسپی کو مدِ نظر رکھ کر

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس رسالے کا اجرا ملک و قوم کی بہت بڑی خدمت ہے مضمون نگاروں کی فہرست میں بعض مستند ہستیوں کے نام نظر آتے ہیں جو مضامین طلبا کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہیں وہ بھی کسی لحاظ سے کم دلچسپ نہیں۔ ہم کارکنان انجمن کو اس شاندار علمی خدمت پر ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں اور اصحاب علم سے امید کرتے ہیں کہ وہ ان کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔

رسالے کی سالانہ قیمت صرف ؏ روپیہ ہے جو موجودہ ضخامت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی حالت میں بھی زیادہ نہیں کتابت و طباعت بہت عمدہ ہے یونیورسٹی پریس علیگڑھ سے مل سکتا ہے۔

پیام اتحاد ۔ مرزا فہیم بیگ فہیم چغتائی بڑے مشاق شاعر ہیں اُنکی اکثر نظمیں چھوٹے چھوٹے رسالوں کی صورت میں پبلک کے ہاتھوں میں پہنچتی رہتی ہیں۔ پیام اتحاد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ شاعر موصوف نے اس نظم میں قومی جذبات کا اظہار بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے اور ہندو مسلمان کے اتحاد پر زور دیا ہے جو بڑا مبارک خیال ہے نظم میں سادہ مگر پر زور الفاظ کے علاوہ محاورے کی چاشنی بھی ہے۔ **قیمت** ۲ر

ملنے کا پتہ: منیجر مکتب تاج متعلقہ نمبر ۱ لاہور سے طلب کیجئے۔

اللہ :۔ انجمن خدام الدین کے شعبہ تالیف و اشاعت کی طرف سے مختلف رسالہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ رسالہ جو اسی سلسلے کا اٹھارھواں نمبر ہے شرح لفظ اللہ پر ہے۔ جس کو مولوی احمد علی صاحب نے تالیف کیا ہے اس میں انہوں نے خدائے پاک کے اسمائے مبارک کی شرح میں امام غزالی مولانا عبدالحق دہلوی کے اقوال نقل کئے ہیں کہیں کہیں احادیث اور دیگر بزرگوں کے اقوال سے اضافہ بھی کیا ہے سب سے پہلے اسمار کی تشریح ہے پھر انسان کو ان صفات الٰہیہ سے متخلق ہونے اور اسی سلسلے میں فرائض عبودیت ادا کرنے کا طریقہ سمجھایا گیا ہے۔ غرضیکہ یہ نداق کی کتاب ہے جو لوگ اس چیز سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے یہ رسالہ ۲ر کے ٹکٹ بھیجنے پر انجمن خدام الدین لاہور سے مل سکتا ہے۔

راول گزٹ ۔ یہ رسالہ سنٹرل راول بورڈ جالندھر شہر کی سرپرستی میں شائع ہوا ہے رسالے کا مقصد اولین راول بورڈ کے اغراض و مقاصد کی توسیع و اشاعت ہے۔ بعض ادبی مضامین بھی درج ہیں۔ ایڈیٹر عبدالحق صاحب عباس ہیں سالانہ قیمت ؏ فی پرچہ ۲ر۔ بورڈ مذکورہ سے طلب کریں۔

دور آزاد لکھنؤ:۔ اردو زبان کا ایک ادبی ماہوار رسالہ ابوالکمال صاحب لطف قریشی لکھنوی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ بعض مضامین خوب ہیں۔ اگر موجودہ کتابت و طباعت کی خرابیاں دور کردی جائیں تو رسالہ دلچسپ ہوسکتا ہے۔ **قیمت:**۔ سالانہ عہ جناب مدیر موصوف سے مل سکتا ہے:۔

تبسم

اسرار شریانیہ۔ مولانا حافظ حکیم محمد عبدالوہاب صاحب انصاری مدظلہ معروف بہ حکیم نابینا سابق طبیب خاص اعلیٰحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے چالیس سالہ کاوشوں اور تجربوں کا لب لباب ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی اعلیٰ شخصیت محتاج تعارف نہیں ان کو اگر زمانہ حاضر کے اطباء کا سرتاج کہا جائے تو بالکل بجا و درست ہے۔

علامہ موصوف متعدد ضخیم کتب طبیہ کے مصنف ہیں۔ اُن تصانیف کی پہلی قسط یہ کتاب "اسرار شریانیہ" اسوقت زیر تبصرہ ہے جسمیں نبض کے متعلق وہ حیرت انگیز معلومات ہیں جو دنیائے طب میں نادر الوجود ہیں۔ نبض کے متعلق حضرت حکیم صاحب موصوف کے مجتہدانہ مقالات اور ارشادات جس پیرایہ میں اس کتاب میں جمع کئے گئے ہیں شاید ان سے دنیائے طب آج تک ناآشنا تھی۔ طب یونانی کا دامن جن بیش بہا موتیوں سے علامہ موصوف نے بھر دیا ہے ان کو بہ نظر انصاف اگر دیکھا جائے تو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ حضرت حکیم صاحب موصوف نے طب یونانی پر احسان عظیم فرمایا ہے جس کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں کیا جا سکتا۔

نبض کے متعلق ارشادات اور بصیرت افروز مجتہدانہ مقالات بذات خود ایک کافی سے زائد ذخیرہ معلومات ہیں لیکن علامہ موصوف نے صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنے مجربات خاص بھی افادہ عام کے لئے پیش کردئے ہیں اور یہ ایک ایسی بے غرضانہ اور مخلصانہ خدمت ہے جس کی نظیر شائد ہی دنیائے طب پیش کرسکے۔ چند مجربات جو اطبائے حاضرہ کے معلومات ہوتے ہیں بالعموم ان کے اخفا کا جو اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کو پبلک میں پیش کرنے سے جو بخل برتا جاتا ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن حکیم صاحب موصوف کی شخصیت ان سب امور سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔

خدا کرے اطبائے زمانہ اور دیگر شائقین اس بیش بہا خزانہ کی کماحقہ قدر کریں اور اس سے استفادہ حاصل کریں۔ اور اس کتاب کو میدان علم و عمل میں اپنا حقیقی راہبر بنائیں۔ اگر اس تصنیف کی خاطر خواہ قدر افزائی کی گئی۔ تو ہمیں حکیم صاحب قبلہ کے فرزند اکبر حکیم محمد عبدالحق انصاری نے امید دلائی ہے کہ علامہ موصوف کی اور تصانیف بھی عالم نشر و اشاعت میں آجائیں گی اور اہل علم و کمال کو موقعہ دیا جائے گا کہ وہ ان حیرت انگیز کارناموں کے مطالعہ سے حضرت حکیم صاحب قبلہ کے تبحر علمی اور فضیلت کا اندازہ کرسکیں۔ **ملنے کا پتہ**۔ انصاریہ دارالشفاء متصل جامع مسجد دہلی۔

مدیر معاون

دورِ جدید

مخزن

کا

چوتھا سالگرہ نمبر

انشاء اللہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا

مخزن کے سرپرست اربابِ قلم حضرات سے التماس ہے کہ اس کے لئے
ابھی سے اہتمام فرمائیں۔ تاکہ کتابت اطمینان سے ہو۔

علمی مضامین۔ تاریخ فلسفہ مدن۔ سائنس۔ تائید مذہب اور اشاعت
اخلاقیات سے متعلق ہونے چاہئیں۔

نظموں۔ غزلوں اور افسانوں میں بھی اخلاق کا خاص خیال ضروری

(معاون مدیر)

(اُردو ایڈیشن)

عروج "چاند" لاثانی ہے، محتاج بیان نہیں، ہندوستان میں کوئی رسالہ بزبان انگریزی، اردو، ہندی، بنگالی، تامل، تلگو، گجراتی خواہ مرہٹی نہیں شائع ہوا جس کی اشاعت اب تک زیر سند گورنمنٹ آڈیٹر ہند، ۵ ہزار ہوئی ہو۔ منتظمان تعلیم یافتہ لوگوں کی ترغیب و اتفاق و نیز طلب ہزارہا اردو خوانوں سے مؤثر ہو کر مژدہ دہ ہیں کہ یہ امر طے ہو گیا ہے کہ ایک باتصویر اردو ایڈیشن، اس مشہور خلائق "چاند" کا شائع کریں پہلا نمبر جس کی تاریخ اشاعت یکم جنوری ۱۹۳۰ء ہوگی زیر طبع ہے اور بالیقین ۱۵ دسمبر کو شائع ہو جائیگا۔ منجملہ دیگر تحریرات مضامین میں نظم و نثر پیغامات حسب ذیل حضرات میں مشمول ہونگے:-

پنڈت موتی لال نہرو	مسٹر ایف۔ ڈبلو۔ ولسن
سر عبد القادر	آنریبل مسٹر نرین پرشاد استھانا
مسٹر سی۔ وائی۔ چنتامنی	خواجہ حسن نظامی
منشی ایشر سرن	مولینا ضامن علی
میجر بخیت سنگھ	سر تیج بہادر سپرو
لالہ گھسا سی رام	ڈاکٹر اعظم کریوی
منشی مہیش پرشاد	خواجہ عبد الرؤف عشرت
پنڈت کرشن پرشاد کول	مسٹر جی۔ بی۔ سریواستو
لالہ نانک چند "ناز"	حضرت نوح"، "بسمل"، "برق"، "مہر" وغیرہ وغیرہ

ایڈیٹر۔ منشی کنھیا لال۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈوکیٹ

چیف ایڈیٹر۔ مسٹر۔ آر۔ سہگل۔

چندہ سالانہ	آٹھ روپیہ	کاپی نمونہ بلا قیمت نہ اجرا ہوگی۔
ششماہی	پانچ روپیہ	
فی جلد	ایک روپیہ	

نام نامی مندرج فہرست خریداراں بلا توقف کرو لیجیے

"چاند" اردو کی اشاعت کثیر کا یقین واثق ہے، اشتہارات کے ذریعہ سے اعلان کا وسیلہ معقول ہے۔

انکشاف مفصل کیفیت۔ مینجر دفتر "چاند" (اردو ایڈیشن) چندرلوک، الہ آباد ٹیلیفون۔ ۲۰۵۔ تار کا پتہ:- "چاند"

توجہ مزید۔ مضامین نظم و نثر و دیگر ایڈیٹوریل کے بابت مراسلات بنام ایڈیٹر "چاند" (اردو) ہونا چاہیئے۔

ایک کارڈ

لکھ کر مخزن بک ایجنسی لاہور کی فہرست کتب

مفت

حاصل کریں

ڈاکٹر ایشری پرشاد اناڈ کی مشہور و معروف ایجاد

صندل سکھیا

خوشبودار ہونے کے علاوہ جلد کو ملائم اور سفید کرتا ہے چہرے کے اور چھائیاں دور کرتا ہے۔ بدن سے پسینہ کی بدبو کو بالکل دور کر دیتا ہے اور پت وغیرہ کا جانی دشمن ہے۔ جلد کی تمام بیماریوں کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ بالوں کو گرنے سے بچاتا ہے۔

ڈاکٹری اوزاروں کے اور بستر کی چادروں کے دھونے کے لئے بہترین ہے۔ اس کے استعمال کے بعد جوئیں۔ کھٹمل۔ پسو۔ مچھر وغیرہ پاس نہیں پھٹکتے بلکہ یہ ان چیزوں کو فنا کر دیتا ہے

قیمت:۔ تین ٹکیوں کا بکس ڈیڑھ روپیہ (عہ)

ڈاکٹر ایشری پرشاد کا تیار کردہ

جرمیائڈل سوپ

پھوڑے پھنسی اور زخموں کو صاف کرنے کے لئے بہترین صابن ہے۔ ہر بیماری کے کیڑوں کو فوراً تباہ کر دیتا ہے۔ قیمت:۔ تین ٹکیوں کا بکس ڈیڑھ روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ

ڈاکٹر ایشری پرشاد اینڈ اناڈ برادرس انارکلی لاہور

تصنیفات علّامہ راشد الخیری

آفتاب دمشق ۔ یہ دل آویز تاریخی ناول دورِ جدید کے درد نگار علّامہ راشد الخیری دہلوی ایڈیٹر عصمت کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں تثلیث و توحید کی آویزش صلیب و ہلال کے مقابلے اسلام و نصرانیت کے معرکے دائے دمشق کیلوث کی شور شید نقالڑکی "سلمونیہ" کے حسن و عشق کے دلگداز افسانے اس کی اسلامی خدمات عصمی اولوالعزمی قیصرِ رُوم کی عبرت ناک شکست کا نقشہ نہایت دلکش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے علّامہ راشد الخیری کا نام لینے کے بعد کسی تصنیف کی عمدگی و نفاست [illegible] پر دلیل لانے کی ضرورت نہیں رہتی علّامہ موصوف کی غم نگاری سنگدل سے سنگدل انسان کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا خراج وصول کر لیتی ہے ٭ حجم تقریباً ۱۵۰ صفحہ قیمت صرف (عہ) ایک روپیہ ٭

جوہرِ قدامت دو بھولی [illegible] صف کہانی دو لڑکیوں کی مفصل زندگی اور دو عورتوں کی جگر خراش داستان جن میں سے ایک دورِ جہالت کی درخشندہ تصویر اور دُوسری طرزِ جدید کی شیدا اور دلدادہ اِس کتاب [illegible] کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ کہ عالمِ نسوان آج سے پچاس سال پہلے کیا جوہر رکھتا تھا مسلمان گھروں میں اس وقت کیسے کیسے لال گودڑیوں میں چمکتے تھے اور مغربی رو ان کو کس سمت لے جا رہا ہے۔ قیمت مجلد (عہ)

بنت الوقت ۔ ہماری مستورات کی موجودہ تعلیم [illegible] کا بے مثل مرقع اور آج کل کی مہذب بیبیوں کی لاثانی تصویر ہے ٭ قیمت مجلد (عہ)

الزہرا [illegible] فاطمۃ الزہرا [illegible] ۔ قیمت مجلد (۱۲)

موؤدہ ۔ نہایت [illegible] ناول قیمت مجلد (۸)

سات روحوں کے اعمال نامے عالم [illegible] پردۂ موت [illegible] ہو ۔ تو سات رُوحوں کے اعمال نامے ملاحظہ فرمائیے ۔ یہ وُہ معرکتہ الآرا مضمون ہے ۔ جس کو پڑھ کر ہر ناظر کی اِدھر ہچکی بندھی اُدھر مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ گئے ٭ قیمت صرف (۶) ٭

ملنے کا پتہ: منیجر مخزن بک ایجنسی بھاٹی دروازہ لاہور

تصنیفات ملّا رموزی

نام کتاب	قیمت	موضوع	ملنے کا پتہ
انتخاب گلابی اُردو	۸ر	سیاسیات عالم پر بے نظیر تبصرہ اور زبان اردو میں ایک مخصوص اور ظریف طرز تحریر کا اچھوتا نمونہ	الناظر بک ایجنسی لکھنؤ
مقالاب گلابی اُردو	"	"	مدینہ بک ایجنسی بجنور
خواتین انگورہ	عہ	مارشل مصطفےٰ کمال کے ہمراہ میدان جنگ - اور سیاسیات میں کام کرنیوالی عورتوں کے تاریخی کارنامے	منیجر صاحب دائرہ ادبیہ لکھنؤ
سوانح ملّا رموزی	۱۲ر	ملّا رموزی کے خود نوشتہ سوانح جن میں ظرافت اور زندہ دلی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے	ملّا رموزی بھوپال
نکات رموزی حصہ اوّل	عہ	روزمرہ اور مروجہ اردو طرز تحریر میں مذہب معاشرت اور اخلاقیات پر ملّا رموزی کا وجد آفریں مجموعہ مضامین	منیجر دفتر کتابستان مزنگ - لاہور
نکات رموزی حصہ دوم	۸عہ	"	دارالاشاعت ریلوے روڈ لاہور
صبح لطافت	۲ع	ادب اُردو میں فصاحت نگاری اور لطیف طرز تحریر کا بہار آفریں نمونہ جو اخلاق تمدن اور سیاسیات پر مشتمل ہے ٭	منیجر صاحب عالمگیر بک ایجنسی بازار سید مٹھا - لاہور
شادی	۸ع	ملّا رموزی کی تقریب شادی پر اُن کی خود نوشتہ کتاب جس میں تقریب شادی کو نہایت عالمانہ اور محققانہ طریق سے تفصیلاً لکھا گیا ہے خود ملّا رموزی کی تقریب شادی اور پھر انہی کے قلم سے اس کے واقعات لکھا ہوا ذخیرہ جس قدر بھی لطیف اور فصیح ہو سکتا ہے وہ اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا ٭	منیجر صاحب عالمگیر بک ایجنسی بازار سید مٹھا لاہور
اقطاب مشرق	۸	ملّا رموزی کی موزخانہ و متین طرز تحریر کا آتش زیر نمونہ جس میں مشرق کی بیداری اور مشرقی بزرگوں کے تازہ اور تاریخی حالات فراہم ہیں ٭	ملّا رموزی بھوپال
غازی اعظم	۸ر	ترکی قوم کے فاتح اعظم اور ترکی شاہی حکمرانی کے بعد جمہوری حکومت قائم کرنیوالے مصطفےٰ کمال پاشا کے حالات زندگی اور اُن کی جنگی کارناموں کو لڑکوں اور لڑکیوں کے پڑھنے کے لئے بیحد سلیس زبان میں مرتب کیا گیا ہے اور جو قومی مدارس میں بچوں کی تعلیم کے لئے لکھے گئے ہیں ٭	ملّا رموزی بھوپال

قیمت سالانہ چار روپے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۰۹۷

مخزن
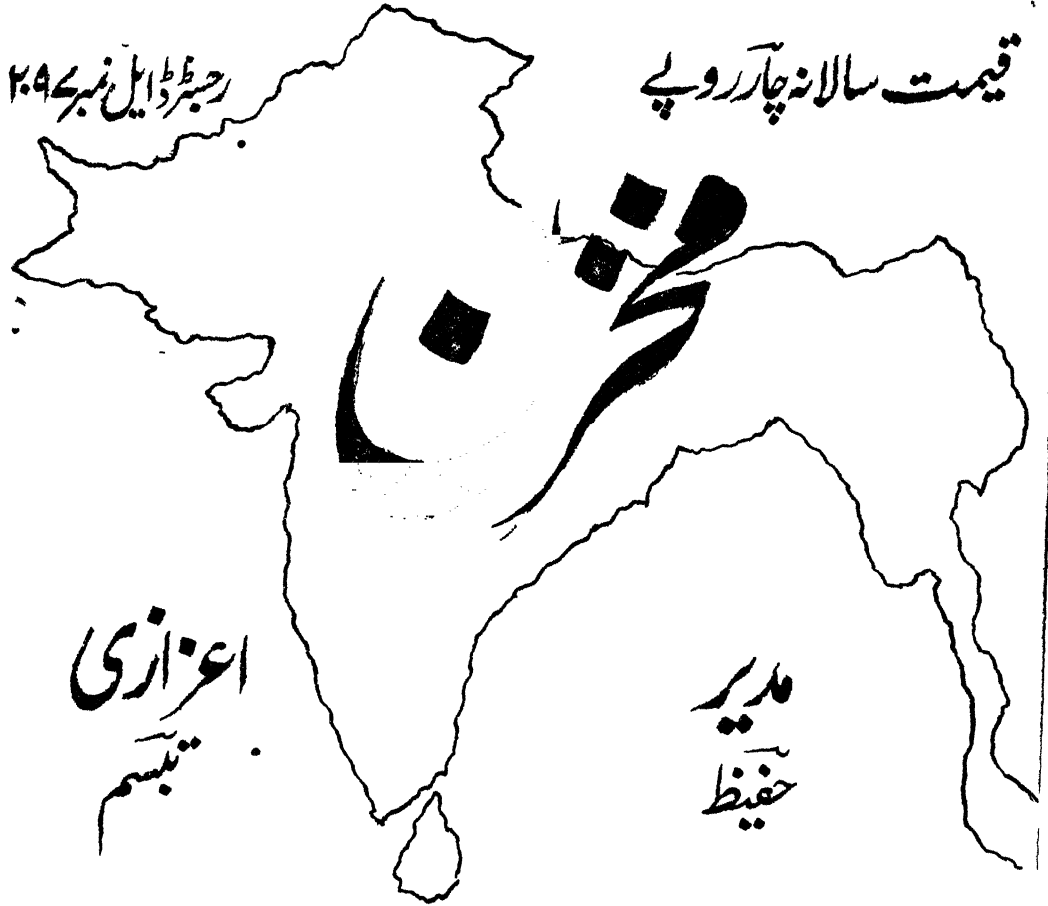
اعزازی

تبسم

مدیر

حفیظ

سالگرہ پارچہ سنہ ۱۹۳۰ء

ایک تصویر از دیوان غالب - مرقع چغتائی

نمبر سلسلہ	فہرست مضامین اور مختصر تقریب از مدیر		صفحہ
۱	صفحۂ ادارت	چند ضروری باتیں ہیں از حفیظ	۳
۲	نکات	اردو کی موجودہ رفتار پر تبصرہ ہے	۵
۳	مولوی اسمٰعیل میرٹھی	مرحوم کی شاعری پر تنقیدی نظر از تبسم - ایم اے	۱۵
۴	ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال	ایک لمحہ فکریہ از حضرت عرشی امرتسری	۲۹
۵	مغربی چین میں ہلال کی بغاوت	تاریخ حریت کا ایک باب ترجمہ از محمد ابراہیم صاحب	۳۵
۶	مادر ہند کا پیغام	درس حب وطن، کپوتوں کو سپوت بنانے کے لئے، ترجمہ عبدالعزیز فطرت	۳۸

(کاتب رسالہ قاضی محمد عبدالحکیم عفی عنہ صدیقی۔ دفتر خوشنویسان لاہور)

صفحۂ ادارت

مبارکباد ۔ کہ مخزن کا تیسواں اور مخزنِ دورِ جدید کا چوتھا سال شروع ہوتا ہے ۔ میں نہیں کہہ سکتا ۔ کہ گذشتہ تین سال میں اس نے ادبِ اُردو کی کوئی نمایاں خدمت کی ہے یا نہیں ۔ اتنا جانتا ہوں ۔ کہ میں نے اپنے وقت عزیز کا بہترین حصہ اسکے لئے صرف کیا ہے ۔

مجھے کئی مرتبہ یہ لکھنا پڑتا ہے ۔ کہ مخزن ان حضرات کی دلچسپی کے لئے مواد مہیا کرنے سے یکسر قاصر ہے ۔ جو رسائل کو صرف اس لئے خریدتے ہیں کہ اُن میں جذبات سفلی کی تسکین کا سامان ہوتا ہے ۔

بلا سے مخزن کے خریداروں کا حلقہ کتنا ہی محدود ہو جائے ، لیکن یہ فخر کیا کم ہے کہ اسے اُن شرفا کی سرپرستی حاصل ہے جو "نئی روشنی" کے کالے دیو کے چنگل سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں ۔ خدا کا شکر ہے کہ [illegible] شریف گھرانوں میں بے تامل پڑھا جاتا ہے تعلیمی ادارے اسے خریدتے ہیں اور پسند کرتے ہیں ۔ میں شرفا مشرق کے اعتماد [illegible] زائل کرنا مخزن کی ادبی موت سمجھتا ہوں مجھے تہذیب نو کے شیدائیوں کی ذرہ بھر پروا نہیں ۔ اور آج پھر اپنے قدیم دعوے کا اعلان کرتا ہوں کہ

مخزن مکتب ہے ۔ تھئیٹر نہیں ۔

مخزن کا گذشتہ سال انتظامی امور کے لحاظ سے کسی حد تک پُرآشوب گذرا ہے بعض حضرات کو اس کے وقت پر نہ پہنچنے کی شکایات ہیں بعض حضرات اس کا سبب یہ سمجھتے ہیں کہ ان فروگذاشتوں کا سبب حفیظ کی عدم توجہی ہے ۔

اس لئے میں نہایت ادب سے یہ واضح کرنے پر مجبور ہوں کہ شاہنامۂ اسلام کی تصنیف و تدوین تو ایک طرف اپنی بچی کی ناگہانی موت سے پیدا شدہ دماغی پراگندگی کے باوجود میں مخزن کو پورا وقت دیتا رہا ہوں ۔ لیکن یاد رہے ۔ کہ میرا کام مخزن کی معنوی خدمت ہے ۔ مالیات کے ذمہ دار میرے شریک کار میاں ظہور الدین صاحب قبلہ مالک مخزن ہیں ۔ مخزن کے اشتراک میں میری فی الحال فرائض ادارت پر بس کرتی ہیں اس لئے میں صرف حضرات کے سامنے صرف مضامین وغیرہ کے معاملات میں جوابدہ ہوں ۔

اس کے یہ معنی نہیں ۔ کہ میں انتظامی امور سے بے پروا ہوں ۔ میں نے انتظامات کو درست کرانے کی انتہائی کوشش

کی ہیں، اور مجھے شرِاکت مالیہ کی طرف سے یقین دلایا گیا ہے ۔ کہ آئندہ تمام شکایات رفع ہو جائیں گی ۔

سال گذشتہ میں میرے دوست بدرالدین صاحب بدر نے کچھ عرصہ ادارت میں میرا ہاتھ بٹایا ۔ جس کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں ۔ اب موصوف اپنی دوسری مصروفیات کے سبب ادارۂ مخزن سے بمجبوری الگ ہو گئے ہیں ۔ اس مشکل کا حل اِس طرح ہوا ہے کہ میرے لائق اور فاضل دوست صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسّم ایم اے لکچرار ٹریننگ کالج لاہور نے اعزازی طور پر ادارت مخزن میں میرا معاون ہونا قبول فرمایا ہے ۔ اس سالگرہ نمبر کی تدوین کا بیشتر حصہ ان کی مدد کا شرمندۂ احسان ہے مجھے یقین ہے کہ حضرت تبسّم کا علم و فضل مخزن کے دَورِ جدید میں مزید ترقیات کا باعث ہوگا ۔

میرے سادہ سالگرہ نمبر کی حیثیت ملک کے دوسرے رنگین و جمیل خاص نمبروں کے مقابلے میں کیا ہے ۔ اِس کا اندازہ بالغ نظر حضرات پر چھوڑتا ہوں، اور صرف اپنے احباب کا شکریہ ادا کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جنھوں نے میرے معیارِ ادب کو ملحوظ رکھ کر مخزن کو ایک معیاری رسالہ بنانے میں نہائت خلوص کے ساتھ میری امداد فرمائی ۔

آج میں اپنے مُلّا رموزی کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں، جنھوں نے گذشتہ ڈیڑھ سال سے اُردو کی رفتار ترقی و تنزل پر مسلسل تبصرہ فرما کر مخزن میں خادمان اُردو کی توجّہ کے لئے ایک نیا باب کھول رکھا ہے ۔

شاہکار کے عنوان سے ایک ہی افسانے کو دو صاحبوں نے ترجمہ کر کے سالگرہ نمبر کے لئے بھیجا ہے ۔ ہم نے دونوں ترجمے اس نمبر میں شائع کر دیئے ہیں تاکہ کسی ایک کو شکائت کا موقع نہ رہے اور پڑھنے والوں کو ترجمے میں امتیاز کا موقع ملے ۔

ہمارے بزرگ شیخ سر عبدالقادر صاحب بانئ مخزن ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے ہیں ۔ حکومت پنجاب اور سر شادی لال چیف جسٹس پنجاب نے شیخ صاحب کا اس عہدے کے لئے انتخاب کر کے رعایا کے تمام طبقوں کو مطمئن کر دیا ہے ادارۂ مخزن اپنے "شیخ" کو ہر بڑے سے بڑے کام کا اہل جانتا ہے، اِسلئے اس تقرر کو اس عہدے کی عزت سمجھتا ہے ۔

حفیظ

نکات

از۔ مُلا رموزی

جن حضرات نے "مخزن" کے گذشتہ سال کے تمام نمبر ملاحظہ فرمائے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا کہ ہندوؤں کے مقتدر لیڈر خصوصاً گاندھی جی، موتی جی، جمنا لال بجاج جی، سوبھاش چند بوس جی، اور مدن موہن مالوی جی کس طرح زبان ہندی کی ترقی و اشاعت میں مصروف ہیں حالانکہ ایک طرف ان لیڈروں کو یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ ہندوستان کے بین الاقوامی لیڈر ہیں اور انہیں کسی جماعتی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے، مگر قومی عصبیت کے فطری اثر سے وہ جس آزادی سے اپنی روایات کی حفاظت کر رہے ہیں اُس کے مقابل ہمارے لیڈروں کے ذیل کے حالات ملاحظہ فرمایئے جو بجائے اُردو کے انگریزی کو رواج دینے اور اختیار کر لینے میں مصروف و منہمک ہیں +

سب جانتے ہیں کہ حضرت ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال صاحب مدظلہ العالی ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، بار ایٹ لاء "امیدواران" ہیں "عالمانہ" و "شاعرانہ" عظمت و برتری کے لحاظ سے فخر ہندوستان ہیں، اسلئے ممدوح محترم کو اپنی قومی روایات کا جس درجہ ملحوظ خاطر ہو سکتا ہے مُلا رموزی کو نہیں ہو سکتا، مگر افسوس کہ اُردو کے معاملہ میں حضرت علامہ سے اس صورت میں کیا کہا جائے کہ جب محترم مدراس تشریف لیگئے تو وہاں آپنے اپنے تمام حکمت آموز بیانات کے لئے زبان انگریزی کو اختیار فرمایا، اور اُردو کے مادری اور ملکی حق کو یک لخت فراموش فرمادیا، اسی طرح حیدر آباد دکن کے خالص ہندوستانی اجتماعات میں بھی آپ نے انگریزی ہی اظہار خیال کا ذریعہ بنایا، اور اب جو ممدوح گرامی علیگڈھ یونیورسٹی میں تشریف لیگئے تو وہاں بھی آپنے اردو کو بالائے طاق رکھ کر

انگریزی ہی کو خطاب کا ذریعہ قرار دیا حالانکہ علیگڈھ یونیورسٹی کی میزبانی تک کی مادری زبان اُردو تھی، اب جو ڈاکٹر صاحب بالوصف "قومی شاعر" کہلانے کے علیگڈھ میں مادری زبان کے حق کو فراموش فرما دیا تو پھر پروفیسروں میں یہ ضبط کہاں کہ وہ انگریزی نہ بولتے، لہذا جس قدر پروفیسر اور دوسرے "فی سر" تھے، سب نے مل کر وہ وہ "انگریزیاں بولیں" کہ بیچاری اُردو منہ دیکھتے ہی رہ گئی۔

اچھا اب ڈاکٹر صاحب کو جانے دیجیئے اور لے لیجیئے ذرا حضرت رئیس الاحرار قبلہ مولٰنا محمد علی مدظلہ العالی کو چنانچہ ممدوح مکرم میں وہ کونسی صفت اور برگزیدگی نہیں جو قومی اصلاح و تنقید، اور رشد و رہبری سے متعلق ہو مگر اُردو کے حق کو فراموش فرما دینے میں ممدوح نے جس سہو سے کام لیا اُسکے لئے اخبار "انقلاب لاہور" مورخہ ۸- دسمبر سنہ ۲۹ء کے صفحہ نمبر ۴ کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔-

"کل شام کے سات بجے مولٰنا محمد علی نے اسلامیہ کالج لاہور کے ہال میں مذہب اسلام پر ایک دلکش انگریزی لیکچر دیا- طلباء بہ تعداد کثیر جمع تھے"

اب فرمایئے کہ اسلامیہ کالج اور مذہب اسلام کے معاملہ میں انگریزی کا استعمال اور پھر وہ بھی پنجابی طلباء کے سامنے جس درجہ موزوں ہو سکتا ہے وہی پنجابی طلباء جواب میں جو اُردو کو اپنی مادری زبان ثابت کرنے میں مولٰنا محمود شیرانی مدظلہ سے "پنجاب میں اُردو" ایسی کتاب لکھوا چکے ہیں۔

اچھا اب مولٰنا محمد علی صاحب قبلہ کو بھی جانے دیجیئے اور لے لیجیئے ذرا مولٰنا محمد شفیع داؤدی صدر مجلس خلافت کو، پھر خلافت ایجی ٹیشن ایسے مقدس اور خالص دینی اور قومی مسئلہ میں ممدوح محترم کی مصلحانہ سرگرمیوں سے کون ہے جو انکار کرے لیکن مصلحانہ صلاحیت اور قومی ولولے کے اس مسلمہ سرمایہ دار لیڈر کو جب مدراس میں ایک مسلم کانفرنس کا صدر بنایا جاتا ہے تو موصوف محترم بیک لمحہ اپنی مادری یا قومی زبان اُردو فراموش فرما کر انگریزی میں ان بیشمار ہندوستانیوں کو مخاطب فرماتے ہیں جو اس مجلس میں شریک تھے اور نہیں ملاحظہ فرماتے کہ اس مجلس کے نائب عرف صدر استقبالیہ کمیٹی ہیں کہ خالص اُردو میں اپنا خطبہ ارشاد فرماتے ہیں، چنانچہ اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۸، دسمبر سنہ ۲۹ء کے صفحہ نمبر ۲ کی یہ سطریں ملاحظہ ہوں:-

"آج سہ پہر کو مدراس پریذیڈنسی مسلم کانفرنس کا اجلاس بصدارت مولٰنا شفیع داؤدی گوکھلے ہال میں شروع ہوا مولٰنا سید مرتضےٰ بہادر ایم، ایل، اے، صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنا خطبہ اُردو میں اور مسلم کانفرنس کے صدر مولٰنا شفیع داؤدی نے اپنا خطبہ انگریزی میں ارشاد فرمایا، جو کہ تین گھنٹہ پہلے تیار کیا گیا تھا"

اب پُر لطف بات یہ ہے کہ مجمع تھا ایک، حاضرین بھی تھے ایک، پھر اسی ایک مجمع کیلئے صدر مجلس استقبالیہ کا اُردو میں خطبہ پڑھنا - اگر اصول کے موافق تھا، تو اس کانفرنس کے صدر کا انگریزی میں خطبہ پڑھنا خلاف اصول ٹھیرتا ہے اور جو صدر جلسے کا انگریزی خطبہ پڑھنا اصول کے موافق تھا تو پھر صدر استقبالیہ کا اُردو میں خطبہ پڑھنا تو نا خلاف ضابطہ لیکن لطف یہ کہ اعتراض دونوں پر ہوا تو ملاحظہ فرمایئے اُردو کی یہ منطقی حق تلفی ہے

اچھا اب مولٰنا شفیع داؤدی کو بھی جانے دیجیئے اور لے لیجیئے ذرا حضرت ... عبد المتین ... بی اے، بار ایٹ لا، سابق ایڈیٹر "مسلم اسٹنڈرڈ لنڈن" کو، پھر کون نہیں جانتا کہ ... صاحب کی ان عظیم الشان اسلامی خدمات کو جو ممدوح محترم نے جنگ ترکی و یونان، اور جنگ ریف و اسپین، کے سلسلہ میں مسلمانوں کی اصلاح و اعانت اور ہمدردی کے لئے انجام دیں لیکن

اس وقت ممدوح کا مقصد خدمت مغربی باشندوں کو مسلمانوں کی ہمدردی میں مخاطب کرنا تھا، اس لئے اگر لنڈن میں بیٹھ کر انگریزی کو اختیار کیا گیا تو یہ قرین مصلحت اور حصول کے عین موافق فعل تھا، لیکن ان ہی ملک صاحب کے متعلق شہر لاہور کی ایک اطلاع اخبار "زمیندار لاہور" اور "انقلاب لاہور" مورخہ ۲۰ - دسمبر ۱۹۲۹ء میں یوں درج ہے کہ :-

"ساڑھے چھ بجے شام مسٹر عبدالقیوم ملک بی اے - بیرسٹر ایٹ لا، "اکبر ناظم اور اُس کا سیاسی خواب"، کے عنوان پر وائی، ایم، سی، اے، ہال میں، بزبان انگریزی، ایک دلچسپ تقریر فرمائیں گے"

اب معلوم نہیں ملک صاحب نے لاہور کو لنڈن کیوں سمجھ لیا؟

مسلمانوں کے نامور جرائد' مدینہ بجنور، مورخہ ۱۷ - دسمبر ۱۹۲۹ء اور روزنامہ انقلاب لاہور، مورخہ ۲۰ - دسمبر ۱۹۲۹ء نے انگریزی کو اظہار خیال اور گفتگو، کا ذریعہ بنانے والے ہندوستانیوں کے متعلق اور اُردو کی حمایت میں جو طویل اور پر مغز مضامین لکھے ہیں اُن کی تلخی اور شدت کو کم کر کے ہم ذیل میں اُن اخبارات کے ایسے فقرے نقل کرتے ہیں، جو مذکورہ بالا بزرگوں کے "انگریزی پن" پر توجہ دلانے والے ہیں، چنانچہ "مدینہ" کے الفاظ یہ ہیں :-

"اِس کی وجہ ذہنی غلامی، حب وطن کا فقدان، اور مادری زبان سے بے پروائی ہے"

انقلاب کے الفاظ یہ ہیں :- کہ

"ہمارے نزدیک انگریزی بولنے کی ضرورت صرف اُس وقت ہے جب مخاطب انگریز ہو یا وہ جو اُردو قطعاً نہ جانتا ہو"

تو دیکھا آپ نے اُن لوگوں کا برتاؤ اُردو سے جن کی قومی، مذہبی، معاشرتی اور بین الاقوامی روایات کا ذخیرہ اردو میں محفوظ اور مکمل ہو چکا ہے مگر وہ اُس کی زندگی سے بے خبر ہیں۔

حضرت سیماب اکبر آبادی اور میاں ساغر علی گڑھی کے مقابل آج پورے پانچ سال سے ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں ان دونوں کی "ادبی عبا" کے ہم نے جس طرح بخیئے اُدھیڑے ہیں، اور جس خالص علمی و ادبی نقطۂ عمل کے تحت ان کی تحریروں کو دیکھا ہے اُس سے ہمارا نہایت شریفانہ مقصد یہ تھا کہ زبان اُردو اِن کی غلط تحریروں اور فحش نگاری سے محفوظ رہے اور ادب اردو میں کوئی ایسا ذخیرہ جمع نہ ہو جو اغلاط، ذاتیات اور ہرزہ نگاری کا گندا انبار ہو، اور اسی لئے اپنی اس نکتہ چینی کو ہم "مخزن" میں اہتمام سے جاری رکھا۔

بارے اس مسلسل نقد و نکتہ چینی کے اثرات دو صورتوں میں ظاہر ہو کر رہے پہلی صورت یہ کہ "دونوں" ہماری علمی اور صرفی نحوی گرفت کا جواب دینے سے آج تک عاجز رہے اور عمر بھر اس کا جواب دے ہی نہیں سکتے، اس لئے ہمارے اوپر بازاری حملے شروع کر دیئے۔

دوسری صورت یہ کہ اپنے اندر بہت کافی اصلاح کی اور اب ان کے مضامین میں وہ پہلی سی اکڑ فوں نہ رہی جیسے وہ غلطی سے اپنا امتیاز بنانے چلے تھے، اس لئے امید ہے کہ اگر ہم ان پر مسلسل لکھتے رہے تو اب یہ بہت جلد سیدھے رستہ پر آ جائیں گے اور یہی ہماری آخری کامیابی ہوگی۔ اُردو کی خدمت کے سلسلہ سے۔

وہ جو فارسی زبان میں کہا ہے کہ ع چاہ کن را چاہ در پیش، سو اس کے موافق ایک لطیفہ حضرت سیماب سے متعلق سُن لیجئے، یعنی آپ نے کچھ دن پہلے پنجاب کے ایک مقتدر و مشہور خادم اُردو پر اعتراض فرمایا تھا کہ وہ زبان اُردو نہیں جانتے، اس لئے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے اُنہیں اپنے ہاں بی اے کا ممتحن کیوں بنایا ہے؟

اب خدا کی شان کہ خود سیماب صاحب کو یہ خیال ہوا کہ میں دُنیا میں کچھ بہت ہی زیادہ اُردو جانتا ہوں اسلئے کیوں نہیں مجھے مسلم یونیورسٹی والے "اُردو ریڈر" کی جگہ مقرر فرما دیتے؟ لہذا آپ نے یہ کوشش شروع فرمائی، اس لئے آج ہم مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ذمہ دار عہدہ داران اور طلبا کو بتانا چاہتے ہیں کہ جو سیماب صاحب اُردو دانی کے اعتماد پر آپکے استاد بننا چاہتے ہیں ان کی پرانی اُردو کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے تو تازہ اُردو ہی کس قدر غلط اور مہمل ہے اور جو پرانی اُردو بھی دیکھنا ہو تو براہ کرم دسمبر سنہ ۲۹ ۱۹ء کا مخزن لاہور، ہیشوا دہلی، مبصر لکھنؤ، اخبار انقلاب لاہور، اخبار پارس لاہور، اخبار عصر جدید کلکتہ، اخبار ہمدم لکھنؤ، اخبار اودھ پنچ لکھنؤ، اخبار قوم دہلی، اور خود ان کے رسالے پیمانے کے پرانے فائل طلب کر کے اُن میں سیماب صاحب کی املا و انشا تک کی غلطیاں ملاحظہ فرما لیجئے۔

فی الحال اُنہی کے اخبار "تاج" مورخہ ۷۔ دسمبر و ۱۴ دسمبر و دسمبر سنہ ۲۹ ۱۹ء سے ذیل کی اغلاط ملاحظہ ہوں:-

نمبر ۱۔ اُن کی آوازیں "ناشنوائی" اور "عدم پذیرائی" کی ٹھوکر سے ٹھکرائی گئیں۔

۲۔ سہولیت بہم پہنچائی۔

ایک ڈبل سائز معنی کا فقرہ ہے کہ "گوناگون نئے فتنوں کا باعث"۔

دیکھا یہ گوناگون کے بعد "نئے" کا اضافہ؟

دسمبر ۲۹ ۱۹ء کے "مخزن" میں ہم نے بتایا تھا کہ سیماب صاحب کو تمیز نہیں کہ لفظ "علماء" کی صحت کیوں کر ہے اسلئے کہ آپ نے ایک شعر میں بجائے "عُلَمَاء" کے "اُل ما" باندھا ہے، چنانچہ اس مرتبہ بجائے ایک شعر کے آپ نے دو اشعار میں پھر "اُل ما" ہی لکھا ہے اشعار یہ ہیں :-

جمعیّتِ علماء سے بغاوت نہ کریں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں امامت نہ کریں

سُنا ہے آپ کو جمعیۃ العلماء سے نفرت ہے الگ اک موتمر تیار کرنے کی ضرورت ہے

اِن اشعار میں آپ "ء" کا بیجئے، بجا لیجئے اور جس طرح چاہیں دیکھ لیں کہ لفظ "علماء" خاصا "اُل ما" ہوکر رہ گیا ہے۔

۳- تیسرا فقرہ ملاحظہ ہو، اگر ہم انجام سے لاپرواہ، ہوکر، ایک تو پرواہ پھر اس پر لا کا داخلہ بھی ایسا ہے جیسے کوئی حلف کے ساتھ کہدے کہ سیماب صاحب اور ساغر صاحب بغیر اذن کے اکثر مشاعروں میں داخل ہوجاتے ہیں،

۴- ایک مضمون کا عنوان ہے "سرمایہ تنظیم کا جمود" یہاں سرمایہ کے بیکار پڑے رہنے کے معنی میں لفظ "جمود" استعمال فرمایا گیا ہے، کل کلاں کو کسی ریل گاڑی کے لیٹ ہوجانے کے لئے عنوان لکھدیں گے، "پنجاب میل کا فلاں اسٹیشن پر جمود"

۵- ذیل کے شعر میں پیچھے والے مصرعہ کو برابر فرمادیجے

وقت آگیا نزدیک ہونے کو ہے تیرا امتحان اک سعی ایسی کر کہ منزل پر پہونچ جائے وطن

۶- ایک شعر میں لفظ "علو" کی صحت ملاحظہ ہو-

جہانِ علم کی چیتوں جلا لی ہوتی جاتی ہے جماعت کے علو کی پائمالی ہوتی جاتی ہے

۷- مولٰنا محمّد علی کی - ناراضگی"

۸- مُسلمانوں کو متسلّی کرسکے گی،

۹- ذمہ دارانِ کانگریس،

اِن کے بعد آپ جس صحیح اور فصیح اُردو کو اپنے اخبار "تاج" میں رواج دے رہے ہیں وہ ملاحظہ ہو -

۱- اس کی عصمتِ اندوگہین کو مخلوطِ رسوائی کردینا چاہیئے،

۲- وعدہ گاہِ شبی پر پہنچے،

۳- کوئی شعاعِ عفیف آنکھوں میں پہونچے،

۴- تبسم چشم کی شعاعوں سے منافعت کر رہا تھا،

۵- شروعاتِ تکلم دشوار ہوتی ہے،

۶۔ رفعتِ نوازش کا شکریہ،

۷۔ رفعتِ نوازش نہیں مداراتِ مغلوب کہیئے،

تو یہ حالت ہے حضرت سیماب کی روزانہ غلطیوں کی اب فرمایئے ایسی حالت میں حضرت سیماب کی درخواست کا جواب نہ دینے والے حق بجانب ہیں یا نہیں*

اب ذرا حضرت ساغر کو بھی ساتھ ہی لیتے چلیئے۔ چنانچہ اس بیچارے نے تو ہماری آئے دن کی تنقیدوں سے تنگ کر یہ کیا ہے کہ اپنا اخبار "استقلال" ہی دوسروں کے ہاتھ میں دے دیا ہے، اور خود لکھنا ہی ترک کر دیا، لیکن غلط نگاری کی یہ ساغرانہ تاثیر تو ملاحظہ ہو کہ اس اخبار میں جو لکھتا ہے وہ غلط ہی لکھتا ہے۔ چنانچہ ان کے اخبار کی اشاعت مورخہ ۲۸ نومبر و ۷ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کے حسب ذیل فقرے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ آج تمام بسط و کشادِ ہند میں،

۲۔ بسط و کشادِ ہند میں ذرا صفت اور موصوف کی تلاش کیجیئے تو؟

۳۔ صدر کانگریس،

۴۔ ادائیگی،

۵۔ لائق جیل،

۶۔ ایجنٹ اخبارات،

۷۔ فلاسفی سوسائٹی،

۸۔ دہوتی پرشادانِ ہند اور پاجامہ خانانِ ہند کا تدبر،

آخری فقرہ میں گویا آپ نے ظرافت کے دریا بہائے ہیں، تو یہ ہے اِن دونوں "شاعراعظموں" کا حال اسی لیئے تو اردو بلند مرتبہ اخبارات اور رسالے اِن غریبوں کے تذکرے سے خالی نظر آتے ہیں۔ اور ایک اپنے "ملا" رموزی صاحب بھی ہیں جو ماشاءاللہ اُردو کے بلند سے بلند اخبار اور رسالے میں یُوں ڈٹے ہوئے ہیں کہ جس طرح حضرت رشید احمد صدیقی علیگڈھ میں اور قاضی جلال مدظلہ اپنے گھر میں*

ان لوگوں کے مقابل جنہوں نے اُردو کے حق کو فراموش کر کے انگریزی کو اختیار کیا ہے ایسے ذی ہوش اور محب وطن بھی ہیں جنہوں نے ہندوستان کی اس قومی زبان کو ہر جگہ اور ہر حال میں محفوظ اور یاد رکھا ہے چنانچہ ایسے حضرات میں سب سے بلند و برتر مرتبہ ہے اعلحضرت قدر قدرت تاجدار دکن کا چنانچہ بندگان ہمایوں جالے ایک ایسے موقع پر اُردو کی عظمت اور برتری کو ثابت فرمایا ہے جہاں دوسرے ہندوستانیوں کو جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ ایک حرف بھی اس سلسلہ سے کہہ سکیں۔ اور یہ موقع تھا وائسرائے بہادر کی سرکاری ضیافت کا جو حال بندگان گرامی پائیگاہ کی طرف سے وائسرائے بہادر کو قصر شاہی حیدرآباد میں دی گئی*

اعلیحضرت سلیمان مرتبت تاجدار دکن نے اس موقع پر وائسرائے بہادر کو مخاطب کرتے ہوئے اُردو کیلئے جو کچھ ارشاد فرمایا" زمیندار لاہور" نے اُسے اپنی اشاعت مورخہ ۲۲۔ دسمبر ۲۹ء کے صفحہ نمبر ۶ پر یوں درج کیا ہے:۔

" جامعہ عثمانیہ میں میری حکومت نے اردو کو تعلیمی زبان قرار دیا ہے اور جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلباء نے اپنی ذکاوت و ذہانت سے یہ ثابت کردیا ہے کہ تعلیم کا صحیح طریقہ یہی تھا جو حکومت آصفیہ نے اختیار کیا"

اعلیحضرت ذاتِ شاہانہ کے ان خیالات کی تصدیق میں وائسرائے بہادر نے جو جواب دیا اسے اخبار" الجمعیۃ" دہلی نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۴۔ دسمبر ۲۹ء کے صفحہ نمبر ۷ پر ان الفاظ میں شائع کیا ہے:۔

" وائسرائے بہادر نے اعلیحضرت خسرو دکن کے جواب میں فرمایا:۔

" آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے استحکام پر بھی اظہار خیال فرمایا ہے چنانچہ اعلیحضرت نے اس یونیورسٹی کے متعلق جو طریق کار اختیار فرمایا ہے وہ تدبر کی ایک مثال ہے کہ اس کا نتیجہ حضور کی ہندو مسلم رعایا کیلئے بیحد مفید ہے"

تو دیکھا آپ نے یُوں منوا لیتے ہیں اُردو کے منوانے والے!!!

اب جبکہ خود ہندوستانیوں کے قائم مقام بادشاہ نے تسلیم کرلیا کہ اُردو ہندو اور مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے تو اس سے پولیس کے قانون میں بھی یہ بات داخل ہو جائیگی کہ کل کلاں کو اگر کوئی شخص ہندی زبان کی ترقی چاہے گا۔ اور اُردو کی برائی کریگا تو وہ بے تامل پہونچایا جائیگا" کوتوالی"؟

ہم نے بارہا اس امر پر زور دیا ہے کہ یہ فقط اردو کے رسم الخط میں اخبارات اور رسالے جاری کر دینا ہی اُردو کی خدمت نہیں بلکہ اصل خدمت یہ ہے کہ اس زبان کی وسعت، ترقی اور حفاظت پر یہ اخبارات اور رسالے خود ہی لکھیں۔ پس غنیمت ہے کہ اب بعض اخبارات اور رسالے اس طرف متوجہ ہوئے ہیں، چنانچہ اخبار زمیندار لاہور نے اپنی اشاعت مورخہ ۳۔ دسمبر میں بقائے اُردو کیلئے ایک نہایت عالمانہ متین" اور" مولوی عبدالحق نا فہم کا" مضمون شائع کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُردو ہی سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے اور اسی میں وہ ساری صلاحیتیں جمع ہیں، جو کسی متمدن ملک کی زبان کیلئے درکار ہوا کرتی ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس زبان کی ترقی اور حفاظت کیلئے ایک مرکزی انجمن اُردو بنائی جائے کہ بغیر کسی مرکزیت کے زبان کا مسئلہ آسانی سے طے نہیں ہوسکتا۔ اور جو ایسا ہوگیا تو پھر زبان اُردو کا متحدہ ہند کی مشترکہ زبان ہو جانا ممکن ہے۔

اِس قسم کی تحریک خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی ہزار بار تو ہوئی ہوگی لیکن ہندوستانیوں کی مسلمہ غلامی یا مسلمہ بے علمی نے یہ ثابت کردیا ہے کہ یہ تجویز کامیاب نہ ہوگی، لیکن علم کی مصیبت ناک ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ نزع کی آخرسے آخر ساعت میں بھی سُورۂ یٰس تو نہ سُناؤ، بلکہ ڈاکٹر انصاری صاحب کو بلاؤ کہ مایوسی ہر حالت میں لعنت ہے اور امید نعمت اس لئے اس ضروری تجویز کے ساتھ اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ اس کیلئے مولٰنا محمد علی، مولانا حسرت موہانی، مُلا رموزی اور ابوالکلام آزاد وغیرہ میں سے ایک کو پکڑ کر پہلے کسی بڑی سی جامع مسجد میں لے جایئے اور پھر وہاں ایک بڑا سا حلف دے کر با قرار صالح ان سے وعدہ لیجئے کہ اب وہ بجز اس کے کوئی دوسرا کام نہ کریں گے کہ انجمن ترقی حفاظت اُردو کیلئے کام کرتے پھریں، اور بس،

پس اگر کوئی ایک صاحب اثر و اقتدار لیڈر اس تحریک کو اپنا مقصد زندگی بنالیں اور ساری دنیا میں گاندھی جی کے کھدر اور چرخے کی طرح یہی کہتے پھریں کہ سوراج اسی وقت ملیگا جب آپ انجمن ترقی اردو کے رکن بن جائیں گے، اور اسکے لئے "نذر کی تھیلی" دیں اسوقت تک اس تحریک کی کامیابی بس اتنی ہی رہے گی کہ آپنے "زمیندار" میں لکھدیا، اور ہم نے "مخزن" میں +

جس طرح انسانوں میں ہر قسم کا انسان ہوا کرتا ہے، اسی طرح اخبارات میں بھی ہر قسم کا اخبار ہوتا ہے چنانچہ ایسے اخبارات میں ایک اخبار "مشرق گورکھپور" بھی ہے اس کی اشاعت مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۲۹ء کے نمبر ۱۰۱ پر اردو کی حمایت میں دو مراسلے شائع ہوئے ہیں ایک ہے حضرت "صدر سلونوی" وی، پی، سی، کا جس میں اردو سے عام بے اعتنائی کی شکایت کیگئی ہے، دوسرا مراسلہ ہے حضرت "رشید صدیقی" کا خدا کرے یہ رشید صدیقی، ملا رموزی والے رشید احمد صدیقی" نہوں جو علیگڈھ میں ایک دل کشا طرز تحریر کے مالک بنے بیٹھے ہیں اور جو یہی علیگڈھ والے رشید صاحب اب چلے ہیں اخبار "مشرق" میں مراسلے اسلئے شائع کرانے تو انہیں چاہیئے کہ وہ پہلے ہم سے خط و کتابت بند کردیں پھر وہ چاہیں تو اخبار "دبدبۂ سکندری رام پور" اور وہ اخبار لکھنؤ، فوجی اخبار شملہ اور سپیہ اخبار لاہور، تک میں لکھیں ہمیں کوئی صدمہ نہ ہوگا +

بارے حضرت "رشید صدیقی گورکھپوری" نے اس مراسلے میں بتایا ہے کہ گورکھپور ایسے شہر میں اردو خوب بگیڑی جارہی ہے اور ہندی کی ترقی میں محکمہ تعلیمات خوب خوب کام کررہا ہے چنانچہ مدرسوں کے رجسٹر اور احکام تک ہندی زبان میں جاری کیئے جاتے ہیں، طلبہ کے والدین کو ہندی پڑھانے پر آمادہ کیا جاتا ہے، اردو کے مدرسین بھی خال خال نظر آتے ہیں۔ غرض بچوں کی ایک ضرب المثل کے موافق گورکھپور میں "ہندی کی چندی" کے عوض "اردو کی چندی" ہو رہی ہے +

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مراسلوں کا وہی اثر ہوگا، جو حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ کے ہاں لوگوں پر قوالی کا ہوا کرتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ جب تک اردو کے لئے کوئی مستقل اور عملی کام کرنے والی جماعت نہ ہو۔ پھر اس میں بھی، ہڑتال، مقاطعہ، عمی ترک سوالات اور جتھے بھیجنے والے والنٹیر نہ ہوں، اس وقت تک کون ہے جو اردو کی فریاد کو پہنچے، وہ حیدر آباد کے مولوی عبدالحق رہ گئے تھے جن سے یہ توقع تھی کہ وہ چل پھر کر سارے ہندوستان میں اردو کے لئے کچھ کرینگے یا عثمانیہ اردو یونیورسٹی اپنی حدود سے باہر بھی اردو کے لئے بحیثیت مرکز کچھ کرے گی تو مولوی صاحب قبلہ تو بن کراہ گئے، اردو کے بہ وفیسہ اور عثمانیہ یونیورسٹی تو پہلے ہی حیدر آباد میں تھی اور اب بھی وہیں رہتی ہے +

اب رہے گورکھپور میں اردو کی حفاظت کے لئے یہ "صوبہ واللہ چنانچہ" کے باشندے تو انہیں جو کچھ ہمدردی ہے، وہ محاوراتی، ٹکسالی اور بیگماتی اردو سے نہ گورکھپور کی اردو سے، اسلئے اب گورکھپور میں اگر حضرت رشید صدیقی ہی لوگوں کو بغاوت، جلوس، جلسوں اور بھوک ہڑتال پر آمادہ کرلیں تو شائد کوئی کامیابی ہو جائے +

لیجئے وہ ایک اور "صدیقی" اخبار "مدینہ بجنور مورخہ ۱۳- دسمبر ۱۹۲۹ء کے صفحہ نمبر ۲ پر لکھتے ہیں کہ شہر بھاگلپور اور نواح میں مومن حضرات کی آبادی کوئی دس ہزار سے زیادہ ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ مگر جہل و جہالت کی وجہ سے یہ حضرات اردو کی

طرف سے یوں بے پروا ہیں کہ اب اُردو" چند دن کی بات" ہوکر رہ گئی ہے، اِس لئے ہم مدینہ کے صدیقی صاحب سے بھی عرض کریں گے کہ آپ اُردو کی حمایت میں صرف ایک مراسلہ چھپوا کر نہ بیٹھ جایئے کیونکہ یہ حضرات ہیں پھر مومن، اور مومنوں میں کوئی "اردووانی بیداری" پیدا کر دینا ایک دن کا کام نہیں، بلکہ ضرورت ہے کہ آپ دس بجے دن سے عشاء کی نماز کے وقت تک ہر مسجد میں جا کر اردو پر وعظ فرمایا کیجئے، اور اردو کی شرعی ضرورت کو ہر نماز کے بعد اُن پر ثابت کیجئے، پھر دیکھئے یہ لوگ اُردو پر کس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں، کیونکہ مومن تو وعظ پر مرتا ہے اور اسکی جگہ مسجد ہے، اخبار "مدینہ" نہیں، اِس سلسلہ میں یہ زحمت آپ کو ضرور برداشت کرنا پڑے گی، کہ آپ کچھ دن ان لوگوں کے ساتھ نماز بھی پڑھ لیا کریں کہ مصلحت کیلئے تو مضر نہیں +

اُردو کیلئے ہم آپ تو باوجود "مادری ہونے کے" کچھ نہیں کرتے، لیکن وہ جو اُردو کے حق میں نرے "غیر مادری" ہیں وہ بیچارے ہیں کہ اردو کے ہر ضابطے اور ہر قاعدہ کا احترام کرتے پھرتے ہیں، چنانچہ اَلسنۂ عالم کا اصول ہے کہ جب تم کسی غیر ملکی باشندے سے مخاطب ہو تو اُسی کی ملکی زبان میں گفتگو کرو، پس اس قاعدے کے تحت جب حضرت بادشاہ افغانستان نادرخان یہاں سے گزرے اور سردار مرحوم علی احمد جان گورنر جلال آباد دہلی اور تشریف لائے تو ممدوحین محترم نے تمام تقریریں اُردو میں کیں، اور اس مرتبہ جب سردار شاہ ولی خان فاتح کابل لندن تشریف لے جاتے ہوئے لاہور پہونچے تو ممدوح گرامی نے یہاں جو تقریر فرمائی، اُس کے لئے اخبار زمیندار مورخہ ۶۔دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کے صفحہ نمبر ۶ پر یہ فقرے ملاحظہ فرمایئے:۔

"سردار شاہ ولی خان فاتح کابل نہایت صاف اُردو بولتے ہیں اور اسی زبان میں آپ نے تقریر بھی فرمائی"

سردار شاہ ولی خان فاتح کابل کے اُردو میں تقریر کرنے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہندوستان سے باہر کی تمام قومیں ہندوستانیوں کی عام اور قومی زبان اُردو کو سمجھتی ہیں، ہندی کو نہیں +

لاہور کانگریس کے اجلاس کے موقع پر وہاں بیشمار منعقد ہونے والی انجمنوں کے نظام اوقات اور اعلانات شائع ہوئے تھے، مگر ان میں کوئی ایک اطلاع بھی ایسی نہ تھی جس میں اُردو کے لئے کسی کانفرنس یا انجمن کے قیام کی کوئی تحریک ہوتی، حالانکہ لاہور یا صوبۂ پنجاب کو اب عرصہ سے "اہلِ زبان" ہونے کا دعویٰ ہوگیا ہے اور جب سے یہ ٹونک کے مولانا محمود شیرانی مدظلہ نے کتاب "پنجاب میں اُردو" لکھدی ہے۔ اس وقت سے تو ہر پنجابی زبان کے معاملہ میں "لکھنؤ" ہوگیا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کے اس قدر عظیم القدر اور عظیم الاثر اجتماع کے موقع پر پنجابی بھائیوں کا اُردو کے لئے کچھ نہ کرنا اگر کوئی مضائقہ کی بات نہیں تو پھر اسی زمانے اور اسی موقع پر زبان ہندی کو ہندوستان بھر کی سرکاری زبان بنانے والوں کی کوشش ملاحظہ فرمایئے"

چنانچہ اخبار ملاپ لاہور مورخہ ۱۱۔ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کے صفحہ ۱۱ پر ہندی زبان کی ترقی کے سلسلہ سے ذیل کی اطلاع شائع ہوئی کہ

۵۔ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کی شام کو ½ ۷ بجے شام لالہ لاجپت رائے جی کی کوٹھی پر پنجاب پرانتیہ ہندی ساہتیہ

سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں قرار پایا کہ ڈاکٹر خان چند دیو استقبالیہ کمیٹی کے قیام تک صدر کا کام کریں اور اُن کے معاون پنڈت بھیم سین ہوں، آل انڈیا راشٹر بھاشا سمیلن کا اجلاس ۲۲ دسمبر ۱۹۲۹ء کو بعد دوپہر منعقد کیا جائے گا۔

اب اس کارروائی اور مستعدی کے مقابل آپ اردو کا ایک ہی خانچند دیو اور آدھا بھیم سین ہی بتا دیجئے جس نے ان ایام میں اُردو کے لئے کچھ کیا ہو؟ حالانکہ حمایت اردو کے لحاظ سے اُردو میں ایسے لاکھوں خانچند دیو اور بھیم سین ملیں گے جو اُردو کے لئے اپنا زبانی خان چندپن، اور بھیم بنا، دکھانے کے دعوےٰ کرتے پھرتے۔ مگر لاہور میں انڈین نیشنل کا ایسے عظیم الشان اجتماع کے موقعہ پر اُن کی اردو کی ریل گاڑی آخر کار لیٹ ہو ہی گئی۔

اپنے خواجہ حسن نظامی دہلی والوں کے اخبار "منادی دہلی" مورخہ ۲۰ - دسمبر ۱۹۲۹ء کے صفحہ نمبر ۲ کی یہ سطریں ملاحظہ فرمایئے :-

"ہندو آج سے نہیں بلکہ چوتھائی صدی سے ہندی زبان کو ملک کی قومی زبان کیلئے سرگرم مساعی ہیں۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ پنجاب سے لیکر میسور تک ہر ہندو کی زبان پر ہندی پرچار کے الفاظ ہیں صوبہ متحدہ اس تحریک کا مرکز بن گیا ہے، اور کئی ریاستوں کے دفاتر ہندی میں منتقل ہو چکے ہیں، پنڈت مدن موہن مالوی اس تحریک کے ابوالآبا ہیں"۔

واضح ہو کہ مالوی جی انہیں کہتے ہیں جو اس قابلیت کے آدمی ہیں کہ اگر کل ہندوستان سے یہ گورے گورے رنگ کے انگریز بھاگ جائیں اور ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم ہو جائے تو مالوی جی اس کے صدر بنائے جا سکتے ہیں۔ پھر اگر مالوی جی صدر جمہوریہ ہند ہو گئے تو کیا وہ اسوقت اُردو کے ساتھ وہ کچھ نہ کر سکیں گے جو ترکی میں مصطفےٰ کمال پاشا نے صدر ہو کر ترکی رسم الخط کے ساتھ کیا؟

کلکتے کے ظریف اخبار "چونچ" مورخہ ۱۵- دسمبر ۱۹۲۹ء کے صفحہ نمبر ۵ کی یہ اطلاع ملاحظہ ہو:-

"ڈالی گنج، سر گنیش سنگھ نے مقامی ہندی سبھا کا افتتاح کیا، ایک سال قبل سر فخر الدین مسلمان وزیر تعلیمات نے اس کی بنیاد رکھی تھی"۔

یہ اطلاع مزید برآں ہے ان بیشمار انجمنوں کے مقابل جو اس سے قبل گاندھی جی، اور سوبھاش چند بوس صوبہ بنگال میں ہندی کی اشاعت کے لئے قائم فرما رہے ہیں۔ خدا حافظ۔

مولوی اسمٰعیل میرٹھی مرحوم

(از "تبسم" ایم اے)

ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا، جب میں نے ایک مقامی سالے میں "اردو شاعری کی موجودہ روش اور اُس کے چند سیاسی اسباب" کے عنوان پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں میں نے اِس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اُردو شاعری کا موجودہ دَور اُس سیاسی انقلاب کے بعد شروع ہوا جسکو مغربی مصنفین "غدر" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، اِسی ضمن میں ان اکابر قوم کی شاعری کا تذکرہ بھی آ گیا تھا جنھوں نے ملک و قوم کے سیاسی و معاشرتی انحطاط کو محسوس کرتے ہوئے ان کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا تھا، اور اپنے زور قلم سے اپنی قدیم شاندار روایات کے احیاء کی سر توڑ کوشش کی تھی۔ ان بزرگان قوم کی جماعت اگرچہ بہت قلیل تھی۔ تاہم ان کی مساعی کی کامیابی کا راز اِن کا خلوص تھا، اِن سب کا نصب العین ایک تھا اختلافات کے باوجود وہ قومی مفاد کی خاطر بھائیوں کی طرح نہایت خلوص سے مل بیٹھتے تھے، روزی کے حصول کے لئے ملک کے مختلف گوشوں میں پڑے تھے مگر ان کی تمام علمی کوششوں کا منتہا ایک ہی تھا، قدرت نے اُن میں مختلف قابلیتیں ودیعت کی تھیں۔ مگر اُن کی گوناگون ذہنی کاوشوں کا لب لباب اپنے ابنائے قوم کی خدمت تھی، اور بس +

اِن میں بعض شعرا تھے بعض محض نثر نگار، بعض سیاسیات سے دلچسپی رکھتے تھے، بعض مذہب سے، اِن سب کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کے لئے ایک صحیح لائحہ عمل تیار ہو گیا، اور آئندہ نسل کے لئے میدانِ عمل میں ایک نئی شاہراہ کی بنیاد پڑ گئی، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ ملک و قوم کی اصلاح کی جائے لیکن اس اجتماعی جدو جہد کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اُردو شاعری میں وسعت پیدا ہوئی اور اُس کی آئندہ ترقی کے لئے ایک سبیل نکل آئی +

: **مولٰنا اسمٰعیل میرٹھی** ان ہی بہی خواہان ملک سے تھے، اگرچہ اُردو شعرا کے جدید تذکروں میں اُن کا حال درج ہے، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے جو کچھ اُن کے بارے میں لکھا ہے وہ اِس

سے کہیں زیادہ کے مستحق تھے، یہ چند صفحات صرف اسی غرض سے لکھتا ہوں تاکہ ہمارے نوجوانوں میں ان کی ادبی خدمات کا صحیح تصور پیدا ہو جائے، اور وہ اردو و ادب کی تاریخ کے مطالعہ کے وقت اردو کے اس جلیل القدر محسن کو فراموش نہ کر دیں *

مولوی صاحب کو براہ راست سرسید اور اُن کے ہم مسلک لوگوں کی صحبت نصیب نہ ہوئی تھی، مگر وہ اُن کے خیالات سے متاثر ہوئے تھے، اور انہی کے پیش کردہ پروگرام کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنایا تھا، وہ مسلمانوں کے ہمدرد تھے، ان کی کوتاہیوں کا احساس اُنہیں بے چین رکھتا تھا۔ چونکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں صرف ہوا۔ اِس لئے بچوں کے اخلاق کی اصلاح اُن کا خاص شیوہ ہو گیا یہ کام انہوں نے اپنی شاعر مزاجی سے لیا، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اِس میں بہت کامیاب ہوئے *

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ملک میں شعر و شاعری سے مفید کام لئے جانے پر غور ہو رہا ہو، اور مستعد ہستیاں اس بارے میں سبقت کر رہی تھیں۔ مولانا نے بھی اسی کو اپنا نصب العین قرار دیا اور تا زیست اُس پر قائم رہے، اُن کے حالات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، مذہب سے انہیں بے حد شغف تھا تصوّف کے دلدادہ تھے، اِس لئے یہ رنگ اُن کی تمام اصنافِ شاعری میں نمایاں ہے، غرض اخلاق و موعظت اور تصوّف ان کی شاعری کی روح رواں ہیں۔ اور یہی شے ہے جس نے اُنہیں دوسرے ہمعصر شعرا میں جداگانہ حیثیت دی ہے'

مولوی صاحب کے کلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام مضامین کو لے کر ان پر رنگ چڑھاتے ہیں مثلاً فطرت کے معمولی واقعات بارش، گرمی، سردی، سایہ، دھوپ، صبح و شام، ہوا، آگ، پانی، روزمرہ استعمال اور مشاہدہ میں آنے والی اشیاء، دال، چپاتی، انگوٹھی، ادنیٰ جانور کتا، بلی، گائے، اونٹ، خرگوش، عام پرندے فاختہ، چڑیا، وغیرہ وغیرہ سب کو لیتے ہیں، اور اُن سے فرضی افسانے وضع کر کے اہم نتائج نکالتے ہیں

کون ہے جو انکی نظم "**ملمع کی انگوٹھی**" کو نہیں جانتا، کون ہے جس نے "**بارش کا پہلا قطرہ**" کی نظم کو نہ پڑھا ہو، بچپن میں درسی کتابوں کے خشک مضامین پڑھتے پڑھتے جب طبیعت اکتا جاتی تھی تو یہ نظمیں ذہنی تفریح کا کام دیتی تھیں، اگرچہ اس وقت ان کے شعری محاسن کو کماحقہ سمجھنے کی قابلیت نہ تھی۔ تاہم اُن کا سادہ انداز بیان سلاست الفاظ اور موزون ترنم مزا دے جاتا تھا، لبِ دہن کے ساتھ دل بھی وجد کرتا تھا، ایک لطیف جذبہ غیر محسوس انداز میں روح پر طاری ہو جاتا تھا *

مولانا بچوں کے فطری رجحانات سے باخبر تھے، اس کا باعث غالباً یہ تھا کہ وہ مدرس تھے، اور اپنے تجربات

آخر قطروں کا بندھ گیا تار بارش لگی ہونے موسلادار

اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ زمین کا ہر گوشہ سیراب ہوگیا۔ سوکھے کھیت لہلہانے لگے۔ باغ وچمن کی افسردہ روح تازہ ہوگئی*

پانی پانی ہُوا بیاباں سیراب ہوئے چمن نیابان

ننھی قطرے سے اعمال خلقت اس مینہ سے ہوئی نہال خلقت

جرأت قطرے کی رنگ لائی کام باقی ہے جہاں میں آجتک نام

اِس نظم سے جب پڑھنے والے کے دل ودماغ پر پورا کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو شاعر گریز کرتا ہے کس قدر بلیغ انداز ہے!

اے صاحبو قوم کی خبر لو قطروں کا سا اتفاق کر لو

پہلا مصرعہ قومی زوال کا آئینہ اور دوسرا اس کی اصلاح کا بہترین نسخہ ہے۔

مولوی صاحب کا یہ رنگ نہ صرف مثنویوں اور طویل نظموں بلکہ غزلوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے اشعار کثرت سے پیش کئے جا سکتے ہیں، جن میں سراسر نصیحت و موعظت ہے۔ سُنیئے

نتیجہ کیوں کر اچھا ہو، نہ ہو جب تک عمل اچھا نہیں بویا ہے تخم اچھا تو کب پاؤگے پھل اچھا

جو ہو جائے خطا کوئی، کہ آخر آدمی ہو تم تو جتنا جلد ممکن ہو کرو اُس کا بدل اچھا

ایک نہایت شگفتہ اور مقبول عام زمین میں طبع آزمائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا کہ جو کوئی تم سے کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

مٹا ڈالئے اُسے دل سے خدارا کسی سے خطا بھی اگر ہوگئی

براہِ کرم اس کو طے کیجئے جو ان بن کسی بات پر ہوگئی

مولوی صاحب اُن لوگوں میں سے نہیں جو قوم کی زوال پذیر حالت سے مایوس ہو جائیں بلکہ وہ اس مرثیہ خوانی سے بہت دُور ہیں، اگر کبھی انھیں اس بات کی ضرورت پڑی بھی تو انہیں نے زبونی حالت کے احساس کے بعد فوراً

اشارہ ہے۔ اور دوسرے پانی سے کہ اسی نے کو ظاہر کرتا ہے جس سے تیراک کے لئے دریا آسان ہو جاتا ہے نہ کہ خوف سے میں پنہا اور اخلاقی اشعار درج کرکے اس بحث کو ختم کرتا ہوں:-

اچھی بات

جو بات کہو صاف ہو، ستھری ہو، بھلی ہو ۔۔۔ کڑوی نہ ہو، کھٹی نہ ہو، مصری کی ڈلی ہو

بُری صحبت

بد کی صحبت میں مت بیٹھو اس کا ہے انجام بُرا ۔۔۔ بد نہ بنے تو بد کہلائے، بد اچھا بدنام بُرا

اِستقلال

تیزی نہیں منجملۂ اوصافِ کمال ۔۔۔ کچھ عیب نہیں اگر چلو دھیمی چال
خرگوش سے لے گیا ہے کچھوا بازی ۔۔۔ ہاں راہِ طلب میں شرط ہے استقلال

مولانا کے کلام کی دوسری خصوصیت اُن کا تصوف ہے، وہ حضرت غوث علی شاہ صاحب پانی پتی کے مرید تھے اور وحدت الوجود کے قائل۔ اُن کے کلام میں تصوف کا پہلو غالب ہے، اور اُن کی نمایاں خصوصیت ہے لکھتے ہیں

نقاش سے ممکن ہے کہ ہو نقش خلاف ۔۔۔ ہیں نقش میں جلوہ گر اُسی کے اوصاف
ہر شئے میں عیاں ہے آفتاب وحدت ۔۔۔ گر وہم دوئی نہ ہو تو ہے مطلع صاف

وحدت کے کثرت کے رنگ میں جلوہ گر ہونے کی علت بیان فرماتے ہیں یہ خوب انداز بیان ہے:-

ہے عشق سے حسن کی صفائی ظاہر ۔۔۔ رندی سے ہے پارسائی ظاہر
وحدت کا ثبوت ہے ظہور کثرت ۔۔۔ ہندسے سے ہے اکائی ظاہر

ذات باری تعالےٰ ہر رنگ میں جلوہ گر ہے، ہر ہر شے سے آشکار ہے، اس کی شانیں ہر جگہ نمایاں ہیں، لیکن وہ حسن وحدت میں پنہاں ہے۔ وہ ظاہر ہے چشم حقیقت بین کے لئے، وہ پنہاں ہے ان نامحرم آنکھوں سے، لوگ اس کے چھپنے پر ناحق شور پکار کر رہے ہیں — ع یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز ہے

مولوی صاحب روزمرہ محاورات کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ جہاں کہیں انہوں نے سید[1] صاحب کے انداز تحریر کو نبھایا ہے ان کے بیان میں بہت زیادہ روانی آگئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ زبان پر انہیں نظیر اکبر آبادی کی طرح کافی عبور تھا۔

چاندی کی انگوٹھی ملمع کی انگوٹھی کی بے جا فخر کا جواب یوں دیتی ہے :۔

یہ سنتے ہی چاندی کی انگوٹھی بھی گئی جل	اللہ رے ملمع کی انگوٹھی ترے چھل بل
سونے کے ملمع پر نہ اترا مری پیاری	دو دن میں بھڑک اس کی اتر جائے گی ساری
مت بھول کبھی اصل کو اپنے اری احمق	جب تاؤ دیا جائے گا ہو جائیگا رنگ فق
سچے کی تو عزت ہے بڑھیگی جو کریں جانچ	مشہور مثل ہے کہ نہیں سانچ کو کچھ آنچ
کچھ دیر حقیقت کو چھپایا بھی تو پھر کیا	جھوٹوں نے جو سچوں کو چڑایا بھی تو پھر کیا

ماں کی مامتا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

دشمنوں کا نہیں ہے جی اچھا	ماں کو اک ہول ہو گیا بیٹا
پھر تو سیا جہان کی ہے دوا	تو مرے چھیڑے کا منہ ذرا نہ لب

ہوت ان ہوت کا نہیں کچھ غم
رہے بچے کی خیریت جم جم

دال کی فریاد، دال چپاتی، بارش کا پہلا قطرہ، دو مکھیاں، خشک سالی یہ نظمیں روزمرہ کے استعمال کی بہترین مثالیں ہیں۔

افسوس ہے کہ مولوی صاحب کے بعض اشعار فصاحت کے اعلیٰ معیار سے گرے ہوئے ہیں، مثال کے طور پر اس شعر کو لیجئے :۔

تن بے سر کی طرح قوم پڑی تھی بیجاں	سر جو پایا تو اٹھی پھر قیام اور قعود

قیام اور قعود کے درمیان "واو" فارسی کی جگہ "اور" کا استعمال غیر فصیح ہے۔

---

[1] یہاں سرسید مرحوم سے مراد ہے۔

مولنا حالی کی طرح مولوی صاحب کے کلام میں قدیم و جدید طرز شاعری کے نمونے کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن مولنا حالی اور ان کے رنگ شاعری میں ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ مولانا حالی کی شاعری میں جذبات کا عنصر غالب ہے، قدیم غزلیات اور جدید طرز کی نظمیں سب اِس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مسدس کو لیجئے، ان کا یہ شاہکار محض موزونی کلام، زور بیان اور الفاظ و تراکیب کی چست بندشوں ہی کا نمونہ نہیں بلکہ نظم کی تہ میں جذبات کا سمندر موجزن ہے یہ جذبات دل و دماغ پر اِس طرح طاری ہوجاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو خود اس بات کا علم نہیں ہوتا۔ حافظؔ کے کلام میں یہی خوبی ہے خیالات کو دیکھیئے تو وہی عام ہیں، لیکن انداز بیان ایسا مؤثر ہے کہ ہر شعر دل میں چبھتا جاتا ہے، ہمارے مولوی صاحب میں یہ بات نہیں وہ انسانی جذبات کو خطاب نہیں کرتے، بلکہ ان کی مخاطب عقل انسانی ہے، وہ ایک کہن سال ناصح کی طرح کھری کھری باتیں کہتے ہیں اور نہایت وثوق اور پورے اعتماد سے کہتے ہیں، ایک محقق تاریخ کی طرح واقعات کو من و عن بیان کر دینا ان کا خاص شیوہ ہے +

ان کی یہ سادگی، ان کا یہ خلوص بیان، اُن کے حقائق کے پیش کرنے کا دیانت دارانہ انداز بذات خود مؤثر ہے، اور معقول طبائع کو غور و تفکر کی طرف رہنمائی کرتا ہے +

انہوں نے ایک طویل نظم قصیدہ کے طرز پر لکھی ہے، جس کا عنوان "جریدۂ عبرت" ہے، اِس میں انہوں نے اپنے عہد کے مسلمانوں کی اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی حالتِ زبون کا نقشہ کھینچا ہے۔ میں ذیل میں چند اشعار لکھتا ہوں جس سے ناظرین کو اُن کے طرز بیان کا صحیح اندازہ ہوسکے گا +

دنیا پرست دینداروں کا خاکہ یوں اُڑاتے ہیں:-

ہر ایک علم و عمل میں پڑی یہ پٹکی — ہر ایک طرز و روش پڑی ہے یہ پھٹکار

امام و حافظ و واعظ، مؤذّن و مفتی — نہ کوئی دین میں پورا نہ ٹھیک دنیادار

زبس کہ دعوت و نذر و نیاز پر ہے معاش — ہوئے ہیں قوم میں پیدا بہت سے پنشن خوار

. . . .

ان کا بیجا غرور

وہ پھولتے ہیں اپھرتے ہیں فخر کرتے ہیں — فقط اسی پہ کہ ہم ہیں بڑے نماز گذار

نہ خلق نیک، نہ ہمت بجا، نہ عزم درست — نہ حبِّ قوم، نہ حبِّ وطن، نہ حبِّ تبار

لکھیں گے ٹھیک وہی ان کا دفترِ اعمال — یہ دو فرشتے مقرر جو ہیں یمین و یسار

فروعی اختلافات پر فتنہ انگیزی

مدارِ دین ہے اس پر کہ جھٹ کتر ڈالیں جو پائیں ٹخنے سے نیچی ذرا کسی کی ازار

فقط مسائلِ غسل و وضو و استنجا یہی ہیں وحیِ الٰہی کے آج کل اسرار

کہیں تو ضاد کی قرأت پہ غل غپاڑا ہے کہیں ہے جہر پہ آمین کے جوتی اور پیزار

. . . .

یہ مولوی ہیں کہ بغض و نفاق کے جرنیل کہ جاہلوں کو لڑاتے ہیں یہ سپہ سالار

اِسی طرح مسلمانوں کے تمام فرقوں کا حال بیان کیا ہے، کھری کھری باتیں کی ہیں، دِل مانتا ہے، عقل تسلیم کرتی ہے، سلیم الطبع انسان سر جھکا دیتا ہے، انکار کرے تو کون، واقعات کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے؟

اب میں مولوی صاحب کی غزلوں کا مختصر سا تذکرہ کر کے اِس بحث کو ختم کر دوں گا، اُن کی غزلیں حالی کی قدیم غزلوں سی رنگین تو نہیں، لیکن پھر بھی اکثر اشعار خوب ہیں، اُن میں زورِ بیان ہے، روانی ہے، پختگی ہے، معشوق کے حسن کے عالمگیر اثر کو یوں بیان فرماتے ہیں:-

تمہارے تیر میں انداز تھا نظر کا سا ہر ایک دِل میں ہے نقشہ مرے جگر کا سا

ایک اور جگہ کہتے ہیں:-

ایک عالم پڑا ہے چکر میں گردشِ چشم فتنہ گر دیکھو

اِسی غزل کے دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں، کیا زورِ بیان ہے:-

پائے غیر اور میرا سر دیکھو ٹوٹ جائے نہ سنگِ در دیکھو

میں نظر بند، غیر مدِّ نظر اپنا دِل اور مرا جگر دیکھو

غیر جلتے ہیں اب اُنہیں تکنا اثرِ آہِ پُر شرر دیکھو

ہے دگرگوں مریضِ غم کا حال
ہو سکے تو دَوا بھی کر دیکھو

عشق کی واقعہ نگاری کے چند اشعار سنیئے

تھی یہ چھیڑ اسی طرف سے ورنہ میں اور مجال آرزو کی

اُس کی طلب اور مقام و منزل　　احباب کی ہائے بدسلوکی

"احباب کی ہائے بدسلوکی" سے مصائب منزل کے پورا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے "ہائے" کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔

اِس انجمن میں جائیے اب کس اُمید پر　　ہم بیٹھنے نہ پائے کہ وہ بدگماں اُٹھا

آخر یہ حسن چھپ نہ سکے گا نقاب میں　　شرماؤ گے تمہیں تہ کرو صد حجاب میں

ساقی اِدھر تو دیکھ کہ ہم دیر مست ہیں　　کچھ مستیٔ نگہ بھی ملادے شراب میں

دِل کی گرہ نہ وا ہوئی در دِ شبِ وصال　　گزری تمام بست و کشاد نقاب میں

پیغام بر اشارۂ ابرو سے مرگیا　　پھر جی اُٹھے گا لب بھی ہلا دو جواب میں

پامال شوخیوں میں کرو تم زمین کو
ڈالوں فلک پہ زلزلہ میں اضطراب میں

مولوی صاحب نے اخلاق کے مسائل کو غزل میں خوب کھپایا ہے، اِس خیال کو کہ انسان اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کی بے حد قدر کرتا ہے، یوں بیان کرتے ہیں:-

جان کاہیوں کے بعد جنہیں ملتی ہے دولت　　وہ مفت میں دولت کو لٹایا نہیں کرتے

ذرا غم زدوں کے بھی غمخوار رہنا　　کریں ناز تو ناز بردار رہنا

فراخی و عسرت میں، شادی و غم میں　　بہر حال یاروں کے تم یار رہنا

سمجھ نرد بان اپنی ناکامیوں کو　　کہ ہے شرطِ ہمت طلبگار رہنا

کرو شکر ہے یہ عنایت خدا کی　　بلاؤں میں اکثر گرفتار رہنا

سمجھتے ہیں شیروں کو بھی نرم چارہ
غزالانِ شہری سے ہشیار رہنا

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں　　ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں

دوستی اور کسی غرض کے لئے　　وہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں

یا وفا ہی نہ تھی زمانے میں یا مگر دوستوں نے کی ہی نہیں
بندگی کا شعور ہے جب تک بندہ پروردہ بندگی ہی نہیں

شوخیٔ کلام اور نازک بیانی کی ایک آدھ مثال لکھتا ہوں :۔

نامرد کے ہاتھ میں پہنچکر شمشیر نیام ہو گئی ہے

تلوار کے جوہر مرد کے ہاتھ میں آکر کھلتے ہیں پست ہمتوں کے ہاتھ میں اگر تلوار بھی آجائے تو بے سود ہے۔ واللہ کیا شعر کہا ہے +

خدائے کریم کی غیر محدود عنائتوں کا ذکر کس خوبی سے کرتے ہیں :۔

تری عطا ہے مری احتیاج سے سابق کبھی سوال کی نوبت نہ تو نے آنے دی

واعظ کی تو بکواس سمجھ میں نہیں آتی یا حضرتِ دل تم بھی کچھ ارشاد کرو گے ؟

مختصر نویسی کے باوجود مضمون بہت طویل ہو گیا، اور ابھی بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ تاہم جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے معلوم ہو گیا ہوگا، کہ مولوی صاحب کا رنگ سخن کیا تھا، اور وہ کس پایہ کے شاعر تھے، اس مضمون کے لکھنے سے یہ غرض نہیں کہ میں مولانا حالی کے مقابلے میں لاکر انہیں ترجیح دینا چاہتا ہوں، نہیں ہرگز نہیں، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ حالی کی شہرت سے جو پردہ ان کی شاعری پر پڑ گیا ہے اُسے کسی قدر اُٹھا دوں تا کہ لوگوں کو اُن کی صحیح عظمت کا پتہ چل جائے، اور وہ اُس سے کما حقہٗ مستفیض ہو سکیں، ہمارے بچوں اور نوجوانوں کے لئے انکی شاعری بیحد مفید ہے، کیا اچھا ہو اگر ان کے کلام کا ایک ضروری انتخاب ملک کی اس ہونہار جماعت کے سامنے پیش کیا جائے اگر اس مضمون کے مطالعہ کے بعد چند طلباء نے بھی مولوی ممدوح کے کلام کو اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا کی، تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی +

آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

(عرشی امرتسری)

وہ صفحۂ سادہ جسے دماغ کہتے ہیں، قدرت نے اپنے قابل ترین شاگرد، حضرت انسان کو امتحان گاہ ہستی میں بھیجتے وقت سپرد کیا۔ اس میں ہر قسم کی تحریر کے تحمل کی استعداد رکھ دی، اس کے تمام حصص کا کل وزن اوسطاً ۴۹ ½ اونس سے زیادہ نہیں، جو عمر کے چالیسویں سال مکمل ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد ہر ۱۰ سال میں قریباً نصف چھٹانک گھٹتا جاتا ہے، اس کا حصہ بیشتر جو تلفیفات (بلندیوں) سے معمور ہے۔ محل حواس باطنیہ و قوائے عقلیہ ہے، اس کے اعمال و افکار پر نظر کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ہمارے نظام شمسی کی مخلوقات میں قدرت نے اس سے زیادہ عظیم الشان معجزہ پیش نہیں کیا۔

تنوعِ میلان اور اختلاف رجحان کی رُو سے اقسام دماغ کی تحدید ناممکن ہے، مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ جتنے انسان گذر چکے، اور موجود ہیں، اور آئندہ ہوں گے اتنی ہی قسمیں دماغ کی ہو سکتی ہیں۔ اشکال کی طرح کوئی دو دماغ باہم مناسبت تام نہیں رکھتے، یہ وحدانیت صانع کی وحدت پر ایک بیّن دلیل ہے، کسی ایک اوسط علم کے دماغ کے منقوشات و معلومات کا احاطہ خود صاحبِ دماغ کے امکان سے باہر ہے، بے شعور مادہ سے اتنے عظیم طوفانِ شعور کا صدور مادیئیں کے لئے طوفان عبرت ہے اور اہل دِل کے لئے سرمایۂ وجد و حال۔

آئیے۔ انجمن کدہ عالم سے نکل کر چند لمحے دماغ کی دنیائے خموش کی خلوت میں بسر کریں اور دیکھیں کہ اس مراقبہ کے سکوت میں کتنی شورشوں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور ایک مقدس ہادی، ایک مصلح انسانیت کے دماغ میں گھس جائیے۔ وہ دنیا کو تسکین دینے آیا

لہ علمائے تشریح جسم انسانی کا بیان ہے کہ حجامت دماغ اور تعداد تلفیفات اور بناوٹ کے تناسب سے عقل کم و بیش ہوتی ہے، انسانی دماغ تمام حیوانوں کے دماغوں سے بھاری ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر جسمانی تناسب کو ملحوظ رکھا جائے تو مگرمچھ اور ہاتھی سے بھی گراں سنگ ہو جاتا ہے اور ایسی تلفیفات (کن دوئیوشنیں) کسی اور حیوان کے دماغ میں نہیں ہوتیں۔

سے اکتا چکے ہیں، اور شاعر کی خواب نما دنیا میں ذرا ستانا چاہتے ہیں، عروس شفق اپنی رنگینیوں کو ایک طشت میں بھر کر شاعر کے دروازے پر کھڑی ہے۔ اور اندر داخل ہونے کی اجازت چاہتی ہے، الہام کے فرشتے اسکو اپنے حلقہ میں گھیرے ہوئے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اُسے اپنے پروں پر اٹھا کر کسی دوسری دنیا میں لے جائیں، کیوں کہ وہ فردوس بقا کا طائر لغزش پرواز سے اس قفس فانی میں آ پھنسا ہے، صبح کہسار کے پرند اپنے داؤدی لحنوں کا ایک مرکب تیار کر کے لائے ہیں جو اس کے کانوں میں انڈیل دینا چاہتے ہیں، اگر وہ پسند کرے چشموں اور آبشاروں کے فطرتی ترنم اس کو اپنی طرف کھینچ لینا چاہتے ہیں، اگر وہ چاہے، وہ ہر حسن کے لئے مجذوب اور ہر جمال سے یکساں متاثر نظر آتا ہے۔ اُف یہ تنہائی ہے یا ہجوم، خلوت ہے یا جلوت، شاعر ہاں شاعر وہ اس کے لب حرکت کرنے لگے، آنکھیں کھلنے لگیں، سنو، اس آسمانی نطق نے نہائت عظمت و وقار کے ساتھ اپنا فیصلہ صادر فرما دیا:۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

مغربی چین میں ہلال کی بغاوت

ازرابرٹ بی ایکول

"رابرٹ بی ایکول" ایک مقالہ "ہلال کی بغاوت مغربی چین میں" کے عنوان سے "ایشیا" کے دسمبر نمبر میں شائع کیا تھا۔ ہمارے محترم دوست شیخ محمد ابراہیم صاحب ایم اے رکن اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ لاہور نہائت ضروری اقتباس ہمارے پاس بغرض اشاعت بھیجا ہے جسے ہم نہائت شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں ۔ (ایڈیٹر)

کنسو کے صوبے میں ایک عجیب اور اجنبی قوم رہتی ہے ۔ عرب ۔ ایغور ۔ منگول اور سایسب نسلاً ایک دوسرے سے ممتاز ہیں ۔ لیکن اسلام نے ان کو ایسے رشتۂ اتحاد میں مربوط کیا ہے جو محض نسلی رشتے سے کہیں زیادہ مضبوط ہے ۔ آٹھویں صدی کے آخری حصے میں چار ہزار جفاکش عرب سوار چینی شہنشاہ کی حمائت کے لئے قدیم چانگ آن (حال سیانفو) میں بحیثیت تنخواہ دار فوجی ملازموں کے آئے اور پھر واپس نہ لوٹے ۔ وہ اپنی زبان بھول بیٹھے ۔ اور باہمی بیاہ شادی کے ذریعے سے چینی بن گئے ۔ لیکن بارہ صدیاں بھی ان کے امتیازی عرب خصائص کو مٹانے میں ناکام رہی ہیں ۔ کاردانی مستعدی ۔ جرأت ۔ گھوڑوں کی محبت اور اسلامی عصبیت میں یہ چینی بولنے والے عرب مسلمان عام چینیوں سے ممتاز ہیں ۔ تینوں نسلی گروہوں میں سے یہ سب سے زیادہ پھیلے ہوئے ہیں ۔ کنسو کے ہر بڑے شہر میں ایک اسلامی محلہ ہے ، جہاں مسجد کے مینار درختوں میں سے گزر کر آسمان سے سرگوشیاں کرتے ہیں ۔ صوبے کے بعض حصے دوسروں سے زیادہ اسلامی ہیں ۔ ان میں سے ہوچاؤ (Hochow) اسلامی فکر اور مسلم آبادی کا مرکز ہے ۔ یہاں عمدہ عمدہ مسجدیں بنائی گئیں ، اور اذان بڑے زور سے گونجتی ۔ یہاں مسلمانوں نے جو کہ اکثریت میں تھے چینیوں کو پیچھے پھینک دیا اور ہر کام میں سبقت لے گئے ۔

ایغور منگول گروہ کی اصلیت بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ۔ ایغور تاتاری اصل میں کاشغر کے باشندے تھے ۔ یہ شرق کی طرف منتقل ہو گئے اور آخر کار بعض منگولوں سے مل گئے ۔ آج بھی ان کے اخلاف کے چہرے تاتاری ہوتے ہیں اور وہ منگولین زبان بولتے ہیں ۔ وہ ایک مثلث نما پہاڑی علاقے میں رہتے ہیں ۔ اور چینی حکومت کے نفوذ واقتدار سے کم وبیش آزاد ہیں ۔ کنسو کے اکثر چھوٹے اور بڑے راہزن اسی علاقے کے ہیں جفاکش ۔ جری اور رحم وانصاف کے

تمام خیالوں سے بے نیاز ہونے کے باعث وہ اپنے پیشے میں بہت کامیاب ہیں +

سالار اصل میں سمرقند کے باشندے تھے۔ لیکن وہ اپنے ہمسایوں کے امن کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوئے اس لئے جلاوطن کئے گئے، ان کو وداعی تحفہ ایک سفید اونٹ۔ پانی کی بوتل اور مٹی کا تھیلا ملا۔ "یہ اونٹ تمہیں تمہارے دور دراز مسکن میں لے جائے گا۔ اور اس دور دراز مقام کا پانی اور مٹی اُن سے مشابہ ہوگا" ان کے ہمسایوں نے ان کو اُس لمبے اور خطرناک سفر پر ڈال دیا جو آخرکار صوبۂ کنسو میں سنہوا (Sunhwa) میں ختم ہوا۔ وہاں پہنچنے کے بعد دوسری صبح اُٹھ کر وہ کیا دیکھتے ہیں کہ اونٹ پتھر بن گیا ہے۔ اور اس علاقے کی مٹی اور پانی ان نمونوں سے ملتے جلتے ہیں جن کو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ کم از کم چھ سو سال کا واقعہ ہے۔ لیکن آج تک ایک پرانی طرز کی ترکی بولتے ہیں۔ اُن کی عورتیں بڑے بڑے سُرخ پائجامے پہنتی ہیں۔ اور نسلاً وہ تنبوں گروہوں میں سب سے زیادہ صحیح النسل ہیں اور ساتھ ہی سب سے زیادہ خونخوار اور ظالم ہوتے ہیں +

صدیوں تک عرب چینی۔ ایغور۔ منگول اور سالار جن کی مجموعی تعداد تیس لاکھ تک پہنچتی ہے چینی حکومت کے ماتحت رہے ہیں۔ ظالم اور مظلوم اور بت پرستوں کے ساتھ غیر روادار ہونے کی حالت میں انہوں نے ترقی کی ہے اور بڑھے ہیں۔ ٹنگ چہ کے عہد تک ہر سال ان کی سرکشی بڑھتی گئی ۱۸۶۲ سے لے کر ۱۸۷۷ تک کی اسلامی بغاوت کے ہولناک مصائب کا مختصر سا تذکرہ دیا جاتا ہے تاکہ اندازہ لگ سکے کہ کنسو کے چینی باشندے مسلمانوں کی بغاوت سے کسی درجہ خائف اور دہشت زدہ ہیں +

یہ بغاوت پندرہ سال تک جاری رہی اور آٹھ سال تک کھیتی باڑی کا کام کھٹائی میں پڑا رہا۔ اس ہنگامۂ کارزار کے علاوہ جس میں دونوں طرف سے شہری آبادی ناقابل بیان طریقے پر ذبح کی گئی۔ اتنا ہولناک قحط بپا ہوا کہ مردم خواری اور انسانی جانوں کا تلف کرنا عام ہوگیا، کنسو کی آبادی ایک کروڑ دس لاکھ سے صرف تیس لاکھ رہ گئی۔ آج تک تباہ شدہ دیہات اور ویران کھیت اس حقیقت کے خاموش شاہد ہیں کہ صوبہ اپنی اصلی حالت پر نہیں آسکا۔ آخر مسلمانوں کے قائدِ عظیم ماچان آؤ (Ma Chan Ao) نے محسوس کیا کہ اس ہنگامے کو ختم کر دینا چاہیئے، اور چینی شاہی فوج پر ایک عظیم الشان فتح حاصل کرنے کے بعد موقع کو غنیمت جان کر گفت و شنید شروع کی۔ امن بحال ہوگیا، شاہی حکومت کے ماتحت وہ جرنیل کے عہدے پر فائز ہوا اور مسلم آبادی پر غیر محدود حکومت کرتا رہا +

اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا ماآن لیانگ (Ma An - Liang) جانشین ہوا۔ ماآن لیانگ کے مدبرانہ طرزِ عمل کے باعث ۱۸۹۵ء کی اسلامی بغاوت صرف ایک دو ضلعوں تک محدود رہی اور دو سال تک جاری رہ سکی

مسلمانوں کے بے تاج حاکم اور شہنشاہ کی جانب سے بہت سے اعزازات حاصل کرنے والے ما نے اور چاؤ کے نواح میں ایک، ایک خوبصورت محل تعمیر کروایا، اور جب تک وہ زندہ رہا مسلمان اور چینی دونوں اُمن کی زندگی بسر کرتے رہے ۱۹۱۸ء میں اس کی موت کے ساتھ ہی خوف و ہراس اور باہمی بے اعتمادی کا دور دورہ ہوا۔ اس کے دونوں بیٹوں یعنے تیسرے اور چوتھے شاہزادے میں اپنے جلیل القدر باپ کا تدبر بالکل مفقود تھا۔ اگرچہ بہت حد تک اُس کا اقتدار رکھتے تھے جنگ عظیم کے دوران میں ایک آزاد سلطنت کا تصور جڑھ پکڑنے لگا، اور اتحاد اسلامی کے پروپاگنڈے نے جو کہ جرمنی اور ٹرکی سے آ رہا تھا۔ ایک ہنگامۂ بغاوت بپا کر دیا۔ ما آن لیانگ کی موت کے بعد ان عوامل کا اثر اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگا، متعدد مسلمان لیڈر آہستہ آہستہ لڑائی کی تیاری کرنے لگے، روس سے بندوقیں اور اسلحہ کے ذخیرے اکٹھے کئے گئے۔ مسلمانوں کے ہاتھ میں پہلے ہی سے کافی فوجی طاقت موجود تھی، بلاشبہ بعض کھلم کھلا لڑائی کے بغیر اپنا مقصد حاصل کرنے کی امید رکھتے تھے۔ لیکن دوسرے ہر چیز کر گذرنے کے لئے تیار تھے، ۱۹۲۵ء میں یہ صورت حالات تھی۔ جب مارشل فنگ یو سیانگ کو کنسو کی عنان حکومت حوالے کی گئی اور اس کے ساتھ ہی کومنچن یعنی جمہور کی فوج وارد ہوئی۔

ان کا طرزِ عمل نہائت عجیب تھا۔ قبضہ کرنے کے بعد ابتدا میں انہوں نے مسلمانوں کو اپنا حلیف ظاہر کرتے ہوئے راضی کرنا چاہا، لیکن دوسرے معاملات یعنی چانک سولن اور صوبجاتی گروہوں کے ساتھ لڑائی کی گتھی سلجھانے کے بعد انصاف اور بے لاگ تقسیم گران محصولات کا بار مسلمانوں اور چینیوں پر یکساں ڈالا۔ چونکہ مسلمان آج تک ایک ممتاز جماعت رہے تھے، اس لئے ناراضگی پھیلنی شروع ہوئی۔ لیکن لیڈروں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ بغاوت کا اصلی وقت گذر چکا ہے پوری طرح سے اُس کا مقابلہ کیا۔ اور چینیوں نے اسلام کے غیور فرزندوں کی تذلیل پر خوشیاں منائیں۔

۱۹۲۵ء میں یہ صورتِ حالات تھی۔ جب ایک اٹھارہ سالہ نوجوان مسلم افسر ماچونگ۔انگ (Ma Chung-ying) جو سب سے زیادہ طاقتور مسلمان فوجی افسر کا دوسرا عم زادہ بھائی تھا۔ ایک جابر خاندان کی جوان بہو کے سلسلے میں گرفتار مصیبت ہوا۔ اور چند ہم مشربوں کے ساتھ پہاڑیوں میں جا نکلا۔ پولیس کی امداد طلب کی گئی۔ لیکن نوجوان تبتی سرحد کے مسلمان حاکمِ اعلےٰ ماچی (Ma Chi) کے قلعے سننگفو (Sining Fu) میں پناہ گزین ہوگئے۔ ماچی نے سرکاری طور پر کچھ نہ کیا۔ لیکن خفیہ طور پر ان کو ہر قسم کی امداد مورخہ ۱۲۔اپریل کو نزدیک کے ایک مقام نان شانسو (Nam-Shan-Cau) میں آٹھ نوجوان مسلمانوں نے جاتے نوشی کی۔ وہاں اُنہوں نے

آپس میں لیڈر اور علم بغاوت کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا - ہلال اور تین ستارے اپنا نشان مقرر کیا، اور تین بندوقیں لے کر شاہی فوج کے خلاف ایک ہنگامہ بپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے *

وہ بغیر کسی تنبیہ کے سالار مسلمانوں کے قدیم مرکز کسی کونگ (Keh-Tze-Kong) میں نمودار ہوئے - اُنھوں نے شہر سنوا (Sanhwa) کے ہیڈ کوارٹر کو لوٹا اور شہر پر قبضہ کر لیا، اُن کی تعداد چودہ تک پہنچ گئی تھی - پھر اُنھوں نے بندوقوں اور اسلحہ کے قافلے پر چھاپہ مارا، اور تھوڑی دیر کے بعد اُن کی فوج تین سو تک پہنچ گئی اور یہ تعداد دوسروں کی توجہ مبذول کرانے کے لئے کافی تھی - حکومت کی جانب سے ایک مسلمان افسر اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے مقرر ہوا - اتفاقی طور پر اُس نے باربرداری کی خچروں پر خالی ٹوکریوں کے لادنے کا حکم دیا جن میں وہ تین سو سر لانا چاہتا تھا - سخت لڑائی کے بعد اس کے بہت سے آدمی باغیوں سے جا ملے اور وہ بمشکل بچ سکا - اُس کی خچریں ٹوکریوں سمیت غنیم کے ہاتھ میں آگئیں - اب مسلمان فوجوں میں نوکری چھوڑنے کا سودا پیدا ہوا - دس دس - پچاس پچاس اور سو سو کی ٹولی اپنے ہتھیار لے کر بھاگی - اور باغی لشکر میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا - ماآن لیانگ کا بیٹا یعنی تیسرا شہزادہ" مسلمان سپاہ کو لے کر بغاوت فرو کرنے کے لئے میدان جنگ میں آیا اور کچھ شدید لڑائی بھی ہوئی - مگر آخر کار تیسرا شہزادہ شکست کھا کر لیانگ چو کی طرف بھاگ گیا *

بغاوت اب مذہبی جنگ کی شکل اختیار کر چکی تھی - دُعائیں مانگتے ہوئے چالیس پچاس ہزار مجاہد مذہبی جوش کے ساتھ لڑائی کے لئے نکلے اور ہوچاؤ کے ضلع کو تباہ و برباد کرتے ہوئے کسی کو نہ چھوڑا - ۵ مئی کو ہوچاؤ کا محاصرہ کیا گیا - شہر چینی پناہ گزینوں سے بھرا پڑا تھا - اور اس میں حکومت کی فوج مقابلۃً بہت تھوڑی تھی - لیکن وہ مقابلہ کرتی رہی - حتےٰ کہ کمک کی فوج نے پندرہ روز کے بعد آکر محاصرہ اُٹھایا اس فوج نے تین متصل راستوں سے لڑتے ہوئے مسلمانوں کو قتلِ عظیم کے بعد شکست دی - ایک دو دن تک ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ بغاوت ختم ہو گئی *

چینی سپاہ ہوچاؤ کا محاصرہ اُٹھانے کے بعد پوری طرح مطمئن نظر آتی تھی اور باغیوں کا تعاقب کرنے کی بجائے اُس نے ان کو اپنے قلعے میں اکٹھا ہونے کا موقع دیا - مسلمانوں نے اس تاخیر کو خوف پر محمول کرتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ یعنی اسی ہزار کے قریب لشکر فراہم کیا اور دوبارہ ہوچاؤ کو محاصرے میں لے لیا - اسلامی آبادی میں ماآن لیانگ کے محل میں ہزار سے کچھ زیادہ سپاہی تھے - حملہ آور مسلمانوں نے محل کو جلا دیا ایک سپاہی کو بھی

بھاگنے نہ دیا، اور شہر کی فصیل تک لڑتے گئے۔ نوجوان باغی لیڈر ماچونگ انگ ساحرانہ دل آویز زندگی بسر کرتا دکھائی دیتا تھا، اور اپنے تہور اور شجاعت کے ساتھ اُس نے سپاہیوں کو پوری طرح مطیع و منقاد بنا لیا تھا۔ مسلمانوں کی جانبازانہ جرأت نے چینیوں کو دہشت زدہ کر دیا۔ لیکن آخر کار کلدار توپوں اور آتشین اسلحہ کی مدد سے چینی برتر نکلے۔ باغیوں نے سرنگ لگانے کی کوشش کی، مگر وہ قبل از وقت پھٹ گئی۔ جس سے اُن کے اپنے چند آدمی ہلاک ہو گئے، وہ دیوار کے معمولی سوراخ سے اندر نہ جا سکے۔ اس لئے اپنے وطن کی طرف واپس چل دیئے۔ تب چینی سپاہ نے مقامی فوج کی امداد کے ساتھ مسلمان محلّے کو تباہ و برباد کر دیا۔ تمام مسجدیں اور اولیاء کے مزار مسمار کئے گئے، اور ایک دیوار تک نہ چھوڑی گئی۔

اسی اثناء میں تیسرے شہزادے" اور اُس کے بھائی" چوتھے شہزادے" نے حکومت کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور ایک لشکر فراہم کر کے دو بار شہر لیانگ چو پر قبضہ کیا مگر دونوں دفعہ ان کے قبضے سے نکل گیا، دوسری دفعہ جب شہر ان کے ہاتھ سے نکلا تو شہر میں ایک دیوار کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیانگ چو بالکل تباہ و برباد ہو چکا تھا اور وہاں ایک متنفس بھی باقی نہ رہا تھا۔ نومبر کے آخر میں شاہی فوج نے کافی کمک بہم پہنچا کر ایک کثیر تعداد کے ساتھ لڑائی کے لئے نکلی۔ رات کو کوچ کرتے ہوئے اُس نے مسلمانوں پر شبخون مارا۔ مسلمانوں نے شکست کھائی، اور بڑے نقصانات کے بعد تتر بتر ہو گئے۔ باقی ماندہ سپاہی اپنے ہیرو چھوٹے جرنیل کے ماتحت پی لنگ کے پہاڑوں کی طرف لوٹے اور تبت کی سرحد کو عبور کر کے زیچوان کی طرف چل دی۔

(ایشیا دسمبر ۲۹ ۱۹ء۔ مقالہ نگار کی ملاقات جرنیل سے اور اُس کے ذاتی تاثرات)

جُدائی کی گھڑیاں

میری آنکھوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ جو کچھ دیکھا دِل نے دیکھا۔ اُلفت کے زرّیں تاروں سے جکڑے ہوئے دو دِل کبھی جُدا نہیں ہو سکتے۔ دِل اَب بھی مطمئن ہے، کہ دِل دیکھتا ہے۔

خواجہ حافظ

مادرِ ہند کا پیغام

مُترجمہ

(ایم۔ عبدالعزیز۔ فطرت۔ راولپنڈی)

اے میری اولاد۔ اے میرے بیٹو۔ اے فرزندانِ مادرِ ہند آؤ۔ سنو میں۔ بھارت ماتا۔ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میرے بچو۔ یقیناً تم مجھے اسی احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہو، جو ہر ایک سعید اولاد کے حصہ میں آیا ہے۔ تمہیں مجھ سے ویسی ہی محبت ہے جیسی اجودھیا کی پرجا کو رامچندر اور سیتا رانی سے تھی +

میرا محل جہاں رہ کر میں تمہیں اور تمہارے کاموں کو دیکھتی ہوں ایک عالیشان اور پُرعظمت مقام ہے تمہارا ہمالیہ میرے اس محل کی شمالی دیوار ہے، اور میرے محل کے مشرق و مغرب کو صبح و شام بحرِ ہند اور بحیرۂ عرب کی لہریں چومتی رہتی ہیں +

میرا ہمالیہ بڑی وجاہت کے ساتھ اپنی سر بفلک چوٹیوں پر برفانی تاج سنبھالے ہر وقت آسمان سے محوِ گفتگو ہے۔ میں نے اُس کی گھاٹیوں اور چوٹیوں کو سدا بہار پھولوں اور پودوں کا رنگین لباس پہنا رکھا ہے اُس کی وادیوں کے آغوشِ شفقت میں جھیل اور دیودار جیسے بلند بالا درخت پرورش پاتے ہیں۔ میں اس میں بل کھاتی ہوئی نہروں کی لہروں کو بلند چٹانوں سے اس طرح نیچے گراتی ہوں کہ وہ اس ارفع بلندی سے بستی کی طرف لپکتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور میرے خوبصورت رنگین ادا کبوتر اور دوسرے خوش نوا پرندے ان سنسان فضاؤں میں اپنی نغمہ پاشیوں سے زندگی کے ثبوت مہیا کرتے رہتے ہیں +

میں نے تمہارے لئے اپنا طویل و عریض دامن ایک میدان کی صورت پھیلا دیا ہے، جس میں ایک طرف سندھ اور دوسری طرف گنگا اور جمنا اپنی شاہراہوں پر پریم کے گیت گاتے ہوئے دن رات گذرتے رہتے ہیں۔ یہی وہ دودھ اور شہد کی ندیاں ہیں۔ جو کیلاش اور برہمپتر کے متبرک پہاڑوں سے نکل کر ان میدانوں اور ان کے قرب و جوار میں رہنے والوں کی تشنگی کو رفع کرتی ہیں +

میں نے تمہارے لئے وسیع دکن بنایا۔ اُس کی چٹانوں اور پہاڑیوں کے سانچے میں ڈھال کر اُس کی وادیوں

اور میدانوں کو باافراط گھنے جنگلوں سے سرسبز کردیا ۔ وہ یہی جنوبی علاقے ہیں، جہاں پرانے وقتوں میں جب میں ابھی نوخیز ہی تھی میرے گونگے بچے بندر اور ریچھ تمہاری طرح میرے خدمت گزار ہوئے جن کی وفاداری کے فسانے تمہیں کبھی فراموش نہیں کرنے چاہئیں ۔ کیا میں کبھی ان شاندار خدمات کا اعتراف کرنے سے رک سکتی ہوں جو میرے فرزند رامچندر کے لئے میرے ایک اور فرزند ہنومان نے سرانجام دیں ۔ تم میری تصویر دیکھو ۔ اب بھی میں لنکا کی طرف اشارہ کر رہی ہوں ۔ کیا اس سے تم کو وہ وقت یاد نہیں آتا، جب ہنومان اور اس کے ساتھیوں نے میری عزیز بیٹی سیتا کو راون کے ظالمانہ پنجہ سے رہائی دلائی، اور رامچندر کی یہ گمشدہ دولت لاکر اس کے قدموں میں ڈالدی *

میری محبت کے مظہر تحائف تمہارے لئے ہمالیہ سے لے کر آدم کی چوٹی تک اور ہندوکش کی بلندیوں سے ساحل سمندر تک میرے دامن کے طول و عرض میں بکھرے پڑے ہیں ۔ کون ان انواع و اقسام کے قیمتی بیجوں کو گن سکتا ہے ۔ جن میں تمہارے بدن کی جلد کو ملائم رکھنے کے لئے اور تمہارے غریب طبقوں کے کھانے کے تیل نکلتے ہیں میرے شاندار باغات میں تمہاری خوراک کے لئے طرح طرح کی سبزیاں ۔ کچالو گوبھی ۔ پیاز وغیرہ موجود رہتی ہیں اور شائد تم کو معلوم نہ ہو ۔ کہ جب مغربی ممالک کے سیاحوں نے خاسی کی پہاڑیوں پر پہلے پہل آلو کا پودا لگایا تو میں نے کیوں اس نووارد کو فوراً قبول کرلیا ؟ پیارے بچو! یہ تمہاری ہی خوراک کے خیال سے تو تھا *

کون ان لاتعداد نعمتوں کو شمار کرے جو میرے درخت تمہارے لئے اٹھائے کھڑے ہیں ۔ آم ۔ سیب آڑو ۔ انار ۔ کیلے ۔ سنگترے وغیرہ کی لذت سے کس کا کام و دہن ناآشنا ہے ؟

کون ان خوشبودار مصالحوں ۔ ہلدی ۔ مرچ ۔ ادرک (سونٹھ) دھنیا ۔ السی ۔ پودینہ ۔ الائچی وغیرہ کو نہیں جانتا ؟

میرے درختوں میں تمہارے لئے کھجورا ور ناریل لگتے ہیں اور نیشکر مجھی سے مٹھاس لیکر تمہیں دیتا ہے ۔ تمہارے افسردہ اور تھکے ہوئے دماغوں کو معطر کرنے کے لئے میرے ہی گلشن پھول مہیا کرتے ہیں ۔ گلاب ۔ چنبیلی ۔ موتیا صد برگ ۔ گیندا ۔ تم کبھی نہیں بھول سکتے ۔ یہی تمہاری محفلوں کی زینت ہیں ۔ یہی تمہاری شام جان کو معطر کرنے کے ذمہ دار ہیں اور انہی کے عرق تمہاری بیماریوں کی شفا ہیں ۔ تم میرے جیوٹ کے رسّے ۔ اور میری روئی کے سوت سے بنے ہوئے کپڑے زیب تن کرنے پر فخر کرسکتے ہو ۔ اور میرے بچو میرا نیل تمہارے لئے اور کئی طرح مفید ہونے کے علاوہ تمہاری طبی ضروریات کا بھی ایک حصہ ہے *

میرے قہوے کے پودے اور پلپیاں میرے محل کے جنوبی حصہ کی رونق ہیں ۔ میں نے آسام کی پہاڑیوں

پرچائے کی پیداوار کا انتظام بھی کیا جسے ایک طرف تمہارے شمال مشرقی ہمسائے چینی اور دوسری طرف تمہارے شمال مغربی ہمسائے افغان استعمال میں لاتے ہیں *

اے پیارے بچو۔ تم تمام دنیا کے لئے چائے کی لذیذ اور فرحت افزا پیالیاں مہیا کرنے کے لئے ان پودوں کی کاشت کرتے ہو *

میں نے امریکہ سے سنکونا لیا۔ اور اسے اپنی تپ زدہ اولاد کے لئے پرورش کیا *

میں صدیوں تک شہتوت اور ریشم کے کیڑے کو اپنی آغوش شفقت میں پالتی رہی اور دنیا بھر کے ممالک میرے پرورده کیڑوں کے ریشم کی نظیر لانے سے قاصر رہے اور اب تک اُس کی نفیس بناوٹ اور دلکش رنگوں سے سبقت لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے *

لیکن کیا میرے پیارے فرزندو! میں نے سب کچھ کہدیا؟ نہیں! تم یہ نہیں جانتے۔ کہ تم پر میرے اور کس قدر احسان ہیں۔ کیا تم زمین کی سطحی اور اندرونی خزائن کے لئے میرے ممنون نہیں ہو؟ کیا میں نے تمہارے لئے عمدہ اور اعلےٰ قسم کے جواہرات اور دوسری قیمتی دھاتیں زیر زمین اس طرح نہیں چھپا رکھیں جس طرح کوئی اپنی املاک کو چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ رکھے *

اے میری آنکھ کے تارو! تلاش کرو۔ اور اپنی تمام کوششیں ڈھونڈنے میں صرف کردو۔ میں اپنے سینے کے شگافوں سے ہمیشہ تم پر یہ انعام نچھاور کرتی رہوں گی۔ دنیا بھر کی کانوں سے اعلےٰ لوہا، اور سیاہ ترین کوئلہ میں تمہیں دیتی ہوں۔ نمک میرے پانی اور پہاڑیوں میں بافراط موجود ہے، اور سفید شورے سے میری زمینیں برف کی طرح پٹی پڑی ہیں۔ اور گو کہ میں تمہیں چاندی بکثرت دینے سے معذور ہوں۔ تم میرے سونے اور تانبے سے جس قدر فوائد چاہو حاصل کر سکتے ہو *

میری بادشاہت آثار حیات سے لبریز ہے اور اس کے جانور خوب صورتی میں یکتا۔ ان میں بعض خوفناک بھی ہیں مثلاً چیتا، شیر وغیرہ۔ لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ میں انہیں تمہارے دوش بدوش تمہاری مضرت کے لئے پال رہی ہوں؟ ہرگز نہیں! بلکہ ان کی پرورش اس لئے ہو رہی ہے کہ وہ تمہاری فصلوں کو نقصان پہنچانے والے جانوروں کو پھاڑ ڈالیں۔ تاہم چونکہ یہ وحشی درندے تمہارے ساتھ پالتو جانوروں کی طرح رہنے کے اہل نہیں، تمہیں تیر کمان۔ گولی بارود، اور جال پھندے وغیرہ دیئے گئے ہیں، کہ تم اُن کی مدد سے اپنی اور اپنے مواشی کی مناسب حفاظت کر سکو۔ ان کی بجائے تم بیل۔ گائے۔ بھینس۔ گھوڑے۔ خچر۔ گدھے، بھیڑ، بکری اونٹ، ہاتھی، بندر

وغیرہ گھریلو جانور پالو۔ تاکہ یہ تمہارے ہل چلائیں، دُودھ دیں، تمہاری سواری باربرداری کے کام آئیں۔ اور تمہارا جی بہلائیں +

اے میری اولاد! اے ہندوؤ اے مسلمانو۔ اے سکھو اور عیسائیو! اور اے میرے پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے بچّو! میں تم کو اور تمہیں ہر کام میں مدد دینے والے بے زبان جانوروں کو ہر وقت دیکھتی ہوں۔ . . . . اور یکساں محبّت سے دیکھتی ہوں۔ جس طرح کنول پانی سے محبّت کرتا ہے مجھے بھی تم سے عشق ہے +

میرے دامن کی پرورش کرو۔ اس کی برائی سے بچو، ہل چلا کر اُسے درست کرو۔ کھاد ڈال کر اناج بیجو اور حاصل اکٹھا کرو، تالاب بناؤ بند باندھو، اور نہریں لا کر اُن آفتاب زدہ زمینوں کی پیاس بجھاؤ۔ اور اُنہیں زندگی بخشو۔ تمہیں جس قدر پانی کی ضرورت ہوگی میرے پہاڑ اور بادل۔ میری برف اور بارش۔ اور میری میٹھی جھیلیں اور ٹھنڈے اور صاف دریا مہیّا کر دیں گے۔ تم صرف اس کو بطریق احسن وہاں پہنچا دو جہاں اُس کی ضرورت ہے۔ پھر دیکھنا کہ میں تمہارے خشک خیابان کو کس طرح رشک چمن بناتی ہوں +

تم میرے بڑے بڑے درختوں کو میرے جسم سے جُدا نہ کرو۔ اور اگر ایسا کرو بھی۔ تو مجھے پھر سرسبز درختوں اور خوبصورت پودوں کا رنگین لباس پہنا دو اور میرے ویران باغ کو پھر شاندار بنا دو۔ تاکہ جب اور اقوام کے بچّے مجھے دیکھیں تو تمہاری محنت کی تعریف کریں۔ اور کہیں۔ کہ واقعی فرزندانِ ہند مادرِ وطن کے سچے سپوت ہیں +

میں تمہیں شب و روز اپنے لئے محنت اور مشقت کرتے دیکھ کر بیحد مسرور ہوتی ہوں۔ پارچہ باف کپڑے بنتا ہے۔ کمہار دن چڑھتے ہی برتن بنانا شروع کر دیتا ہے۔ لوہار بلا تمیز موسم تیز آنچ میں لوہا کوٹنے کا مشغلہ جاری رکھتا ہے، اور تیلی ہمیشہ موسمی بیجوں سے تیل نکالنے میں مشغول رہتا ہے +

میں تمہارے کاریگروں کو چمکدار بنارسی صافے گنگا جمنی کپڑے۔ مرگانہ (کناویز) پشمینے، قالینیں، دکنی، مخمل ہلکی اور مہین ململ۔ چمکدار گوٹا کناری، گجراتی جمڑا، یورپ والوں کے لئے رشک کے دوسرے سامان شلاً نمدے اور خوشنما دریاں وغیرہ بناتے دیکھ کر ہمیشہ پھولی نہیں سماتی +

میری بیٹیوں کے گہنے بنانے میں میرے سُنار اور جوہری نت نئی چابکدستیوں سے کام لیتے ہیں اور میرے لاتعداد اقسام کے جواہرات میں جدّت طرازانہ بُرکاریاں، میرے آہن گر کے ہاتھ کی بنی ہوئی خاراشگاف شمشیریں، اور خوبصورت مضبوط کڑیوں کا زرہ بکتر، اِس کے علاوہ آبنوس، شیشم، اخروٹ، صندل وغیرہ کی لکڑی، اور نیز پتھر اور ہاتھی دانت وغیرہ میرے لائق بیٹوں کی حیرت انگیز صناعی کی ایسی چیزیں ہیں۔ کہ اے میری پیاری اولاد! تم اور میں! اقوام عالم میں فخر کی گردن بلند

کرکے کہہ سکتے ہیں کہ ہو! ہمارے بندھے ہوئے ناتوان ہاتھ اتنا عدیم النظیر کام کرنے کے اہل ہیں +

میں مادر ماتہ فخر کے ساتھ اپنے شاندار محلات اور عبادت گاہوں کو دیکھتی ہوں، اور ان میں اپنے ازمنۂ قدیم و دورِ جدید کے صناع فرزندوں کی دستکاریوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں ناز کے جذبات بیدار ہوتے ہوئے محسوس کرتی ہوں۔ ان میں بعض بدھ مت کے پیروؤں۔ بعض شومر برہما اور وشنو کے پجاریوں اور بعض محمد عربی کے نام لیواؤں کی قابلیت اور فنی ذہانت کی نشانیاں ہیں اور ان کے عروج کی زندہ یادگار رہیں +

میرے بچو! تم بیداری کے ساتھ ان کے کنگروں تک کی حفاظت کرو اور اپنے فرطِ عقیدت سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان کی مرمت کرو۔ تاکہ وہ آنے والی صدیوں تک محفوظ ہو جائیں اور آئندہ نسلیں تمہاری طرح ان کی وقار عظمت اور ان کے متین جلال کو دیکھ کر اپنے اجداد کی زندگیوں کو بھول نہ سکیں، اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق پائیں +

دیکھو! میری عمارتیں کتنی باوقار اور شاندار ہیں! اور ان کے ملحقات و متعلقات کس قدر دلآویز ہیں، سنگ مرمر کا نور! تاج محل دنیا کے سات عجائبات کا سرتاج، موتی مسجد آگرہ اور اس کی پاکیزہ دل فریب خاموشی۔ شاہجہان کے محل کا عالی شان ایوان اور اس کا بے عظمت سکوت، گگن نا تھ جی کا بلند و بالا مینار، انسٹا کے دیونا ستون تنجور کا رفیع الشان بدھ مندر۔ نہ اکا ہزار ستون محل۔ آبو کے شاندار جین مندر وغیرہ۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ میتار اور بھی پہلے و فنون میں میرے عزیز بیٹے شجاع اور دلاور ہوتے تھے۔ کیا تم نے ان کی جنگ آرائیوں کے حیات افروز افسانے کورو کشیتر اور مہابھارت میں نہیں پڑھے ہیں؟

اب تم بھی میرے بہادر دلاور بنو۔ میری خاطر سے اپنے بزرگوں کے جمود شکن کارناموں کو یاد کرو۔ مہابھارت اور رامائن سی ہنگامہ خیز رزمیہ نظمیں طلب کرو۔ اپنے خراب آلود جذبات کو بیدار کرو، اور میرے اس قسم کے شاندار گیت اور نظمیں لکھو!

میرے پیارے بچو۔ میرا نام دنیا میں روشن کرو۔ تاکہ لوگ مجھے اور میرے طفیل تمہیں عزت سے یاد کریں +

اپنے دلوں میں باہمی اخوت اور پیار کے ولولوں کو جگہ دو، اپنی زندگیاں پریم کے سانچے میں ڈھال لو۔ اور امن و امان کے تحفظ اور علم و تمدن کی ترقی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دو۔ اور اس طرح تمام دنیا کے لئے قابلِ رشک اور میرے لئے مائہ ناز بنو +

اے میرے پیارے بیٹو۔ اے میرے دل و جگر کے ٹکڑو! تم مادرِ ہند کی اولاد ہو۔ اٹھو اور تمام عالم پر ثابت کردو کہ تم اس عظیم المنزلت نام کے مستحق ہو +

حکومت پروپیگنڈے کی بنا پر

(از عطاء الرحمن ممتاز جالندھری)

حکومت کا پروپیگنڈا کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہیروڈوٹس کو اسی کام کے لئے ایتھینز کی حکومت سے وظیفہ ملتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایتھنز کی تاریخ اس قدر شان و شوکت کی حامل ہوئی گلفس (Guelphs) اور گھبلائنز (Ghibellines) کی لڑائیوں میں اول الذکر کی فتح کا سبب یہ تھا کہ پوپ نے خانقاہوں کے ذریعے سے دفتری پروپیگنڈے کی تنظیم میں شاہنشاہ کو نیچا دکھایا۔ سپین کے "ناقابل تسخیر بیڑے" کے وقت فلپ ثانی اور ملکہ الزبتھ نے اپنے اپنے پروپیگنڈے کی اساس و بنیاد بالکل نئے طریقوں پر رکھی تھی۔ اس سلسلے میں کارڈینل ایلن کی کتاب "انگلستان اور آئرلینڈ کے حرام و خوار کو ناصحانہ فہمائش" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ الزبتھ کے متعلق ہر امکانی بہتان کا الزام لگانے میں قلب انسانی کی پستی درجہ کمال کو پہنچ چکی ہیں۔ بلاشبہ برطانوی باشندوں کا یہ عام خوف کہ سپین کے لوگ ان پر قابض ہونے کے بعد ظلم و ستم ڈھائیں گے محض ملکہ الزبتھ کے پروپیگنڈے کی بنا پر تھا۔ مورخ و ادیب لوگوں نے ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ہنری ہشتم اور میکبتھ یہ دونوں ڈرامے علی الترتیب ملکہ الزبتھ اور جیمز اول کے لئے جو بینکو کا جانشین ہونے کی حیثیت سے تاج ثلاثہ کا وارث تھا بڑا زبردست پروپیگنڈا ثابت ہوا۔

لیکن یہ صرف اسی زمانے میں دیکھا گیا ہے کہ حکومتیں بلکہ ان کے معمولی سے معمولی محکمے بھی اپنی خوبیوں اور مخالفوں کی برائیوں کو برسرعام لانے کے لئے پروپیگنڈے کے علیحدہ دفتر قائم کر رہے ہیں۔ جنگ عالم سے پہلے یہ طریقے کسی حد تک مشکل معلوم ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۰۷ء کے معاہدہ روس و انگلستان کے اکثر اخباروں نے زار کے جبر و تشدد کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا اور لندن کو روسی رقص و سرود کی طرف مائل کرنے کے لئے ایک نہائت عمدہ موقع دیا گیا۔ روسی ادب و شعر کے ترجموں کے لئے طابع و ناشر حاصل کرنا نہائت آسان ہو گیا۔ عین اسی وقت قیصر بالکل ترکی۔ اسلامی اور شرقی وضع قطع اختیار کر رہا تھا۔ جنگ عمومی کے نمودار ہوتے ہی مروجہ طریقے زیادہ واضح ہو گئے۔ اہل جرمنی دیگر امور کی طرح اس معاملے میں بھی نسبتاً زیادہ تیار تھے۔ انہوں نے فوراً ہی مضامین اور مواقع کی تصویروں کے ذریعے سے مشرقی پرشیا پر روسی ظلم و ستم کو الم نشرح کرنا شروع کر دیا۔ جرمن حکومت نے سرکاری طور پر "برائس رپورٹ" کا الزامی جواب دیتے ہوئے بظاہر

کیا کہ اتحادیوں نے جرمن کی انہی تصویروں کو جو انہوں نے روسیوں کے خلاف شائع کی تھیں عنوان تبدیل کرنے کے بعد
"بلجیم پر جرمنوں کے ظلم" ظاہر کر کے خود انہی پر تھوپ دیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں حقیقت کہاں تک تھی۔ کچھ بھی ہو،
مگر انگریزوں کا بحری تار پر قبضہ ہونے کی وجہ سے اتحادیوں کے پروپیگنڈے نے زیادہ اشاعت حاصل کر لی تھی اور ریاستہائے
متحدہ امریکہ کی ہمدردی اور بالآخر ان کی مدد حاصل کر لی۔ غیر جانب دار ممالک میں طرفین نے اپنے اپنے مطالبات پیش کرنے کے
لئے بے تعلقی کے دھوکے میں اپنے اپنے اخبارات جاری کرائے۔ لیکن یورپ سے باہر ممالکِ متوسط کو ایسی پالیسی پر عمل
پیرا ہونے کے لئے نسبتاً زیادہ مشکلات پیش آئیں۔

مختلف حکومتوں کے مروّجہ طریقے بڑی حد تک ملتے جلتے تھے۔ لیکن سلطنت برطانیہ شائد جمہوریت کے طویل تجربے
سے متذبذب حکومتوں کو اپنی طرف لانے اور ان کا جوش بڑھانے میں بحیثیتِ مجموعی اپنے مخالفین سے زیادہ کامیاب تھی۔
سر گلبرٹ پارکر لائے جو امریکہ میں پروپیگنڈا کرنے میں اُس وقت جبکہ یہ ملک ابھی غیر جانبدار تھا۔ ایک نمایاں
حصّہ لے چکے ہیں۔ اپنے طریقوں کو مارچ ۱۹۱۸ء کے ہارپر میگزین میں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا" ہم نے ممالک
متحدہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں کل ۳۶۰ اخبار جاری کئے ان کے ساتھ ہی ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار بھی جاری
کیا جو معاملات جنگ پر نہائت خوبی سے نقد و تبصرہ کیا کرتا تھا۔ ہم نے اپنی بحری اور بری طاقتوں کا سینما کی تصویروں
کے ذریعہ سے عوام الناس سے تعارف کرایا۔ نیز شخصی ملاقاتوں، مضمونوں اور چھوٹے چھوٹے رسالوں کے ذریعہ سے تبلیغ
مقاصد میں نہائت شاندار کامیابی حاصل کی۔ علاوہ ازیں امریکن نقادوں کو فرداً فرداً بہت سے جوابی خطوط لکھے جو
اُن کی اپنی ریاست کے باوقار اخباروں میں موقع بموقع شائع ہوتے رہے اور ہمسایہ ریاستوں کے اخبارات نے
اُنہیں اپنے کالموں میں جگہ دی۔ ہم نے اپنے ہمراز دوستوں کی دوستانہ خدمات اور مدد کا بھی فائدہ اُٹھایا۔ ہمیں
امریکہ کے مشہور و معروف باشندوں کی طرف سے متواتر دبیہم پیغامات موصول ہوتے رہے اور ہم نے ذاتی خط و کتابت
کے ذریعے سے ریاست ہائے متحدہ میں ہر طبقے اور ہر پیشے کے مؤثر اور بارسوخ لوگوں کی ایک انجمن قائم کی۔ اسکی ابتدا
ہم نے کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسروں اور سائینسدانوں سے کی۔ اس کے بعد شہروں کی عام آبادی میں جدوجہد شروع
کر دی۔ ہم نے اپنے دوستوں اور نمائندوں کو امریکہ کے باشندوں کی طرف سے تقریروں، بحثوں اور لیکچروں کا انتظام
کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ لیکن ہم نے برطانوی لوگوں کی اُن کے امریکہ جانے اور وہاں جا کر ان لوگوں کو جنگ میں
حصّہ لینے کے لئے آمادہ کرنے میں کسی طرح کی حوصلہ افزائی نہ کی"۔

امریکہ کی جنگ میں شمولیت کے بعد لارڈ نارتھ کلف کے زیرِ قیادت زیادہ واضح اور حرص انگیز پروپیگنڈا جاری

رکھا گیا، اور دیگر ممالک میں بھی وہاں کی ضروریات کے مطابق منظم پروپیگنڈا شروع کیا گیا۔ مختلف الخیال طبقوں میں سے مختلف اقوام کے لئے متعدد قابل ترین مرد اور عورتیں برطانوی مطالبات پیش کرنے کے لئے مقرر کئے گئے۔ کوئی ایسا واقع جو پروپیگنڈا کی بنا پر ظہور پذیر ہوتا تھا صداقت طلب نگاہوں سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ تمثیلاً اس واقعہ کو کہ "اہل جرمنی انسانی لاشوں کو پانی میں اُبال کر اُن میں سے سریش اور دیگر کار آمد چیزیں نکالتے ہیں" عالمگیر شہرت دی گئی، یہ کہانی چین میں اس وقت جبکہ چینیوں کو جنگ میں شمولیت کی ترغیب دی جا رہی تھی بہت مفید ثابت ہوئی۔ کیونکہ یہ امید کی جاتی تھی کہ یہ چینی مذہبی رہنماؤں کے جذبات کو جو مردہ جسموں کی اتنی زیادہ قدر کرتے تھے ٹھیس لگائے گی۔ اس قصہ میں حقیقت صرف یہاں تک تھی کہ جرمنوں نے جانوروں کی لاشوں کو اوبال کر اُن میں سے مفید اور ضروری اشیاء حاصل کرنے کے لئے ضرورت محسوس کی تھی۔ لیکن ہمارا پروپیگنڈا کرنے والے نے بیک جنبشِ قلم لفظ کارکیس (carcase) حیوانی لاش کو کارپس (corpse) یعنی انسانی لاش بنا کر دنیا جہان کی آنکھوں میں خاک جھونک دی"

اسی عالم میں ان ہی طریقوں سے جرمن میں بھی اتحادیوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا۔ راقم الحروف نے جرمن کے ایک مشہور و معروف اعتدال پسند ڈاکٹر گمبل معروف بہ "زیر جھیر لیوگ (دستر نوازی کے چار سال) سے ایک مختصر رسالہ حاصل کیا ہے، اس پمفلٹ میں جرمنی کا پروپیگنڈا اصلی حالت میں درج کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی والوں کو ۱۹۱۸ء تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہیں بحری جنگ میں اتحادیوں کے خلاف شکستِ فاش نصیب ہوئی تھی روسی ظلم و ستم کے معاملے میں پریس والوں کو یہ سرکاری طور پر ہدائت کی گئی تھی کہ وہ کبھی ایسے معاملے کو جسے کتاب ( ) آئینہ جرمن میں مصدقہ ظاہر کیا جا چکا ہے مشکوک و مشتبہ نہ بنائیں۔ مثال کے طور پر ایک پیشہ ور عورت جس نے قبل ازیں یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کا حمل ایک روسی سپاہی کی دست اندازی کا نتیجہ ہے ۹ فروری ۱۹۱۷ء کو پریس والوں کو اُس کے حلفیہ بیان شائع کرنے سے کہ اس کے حاملہ ہونے کا اصلی سبب کچھ اور تھا روک دیا گیا۔ حکومتِ جرمن نے جرمن قوم کو انگریزی حرف "یو" کی شکل کی کشتیوں (U-Boats) کی کامیابی میں پورا پورا دھوکا دیا اور آخر دم تک اس بات سے انکار کرتے رہے کہ امریکہ اپنی فوجیں فرانس کے میدان میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اندریں حالات جرمن قوم کے لئے جسے رازِ درونِ پردہ کا قطعی طور پر علم نہ تھا یہ ناممکن تھا کہ وہ صحیح صحیح حالات معلوم کر سکتی۔

لڑائی ختم ہوتے ہی ایک نئی پروپیگنڈا جنگ شروع ہوئی، اِس میں دنیا کی تمام سلطنتیں ایک طرف تھیں اور ان کے خلاف صرف ایک مگر نہائت زبردست طاقت بالشوزم کام کر رہی تھی اگرچہ حقیقتاً کسی مقام پر بھی کوئی لڑائی ظہور پذیر

نہیں ہوئی تاہم طرفین کے لئے پروپگنڈا ایک ضروری حربہ سمجھا جاتا تھا اور آہستہ آہستہ اُس نے یہاں تک ترقی پکڑی کہ اس کی مثال دورانِ جنگ میں بھی معدوم تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس اور باقیماندہ تمام ممالک ایک دوسرے کے متعلق مصدقہ خبریں حاصل کرنے سے قاصر رہ گئے۔ اور غلط سلط قصے گھڑنے شروع کردیئے۔ ایک مختصر ذاتی تجربہ اس کو واضح کردیگا راقم الحروف ۱۹۲۰ء میں حزب العمال کے ایک وفد کے ساتھ روس میں موجود تھا۔ ہمارا استقبال بالکل شہزادوں کی سی شان و شوکت کے ساتھ کیا گیا۔ اور جہاں جہاں ہم پہنچے روسیوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ روس سے واپسی پر ہمیں یہ معلوم کرکے سخت حیرت ہوئی کہ عوام الناس بلکہ روسی سرحد پر ہمارے بڑے بڑے شہروں کے قونصل بھی ہمارے متعلق یہ یقین کرچکے تھے کہ ہمیں قید کردیا گیا ہے۔ اس عرصہ میں روس کی اشتراکی جماعت کو یہ یقین ہوچکا تھا کہ تمام یورپ میں انقلابی جماعت کا زور ہے اور یہ برسر اقتدار آتے ہی روس کی اقتصادی حالت میں اصلاح کرے گی۔

بالشویکوں نے محض پروپگنڈے کی بنا پر اس قدر طاقت حاصل کی اور غیر معمولی جانفشانی سے اس طریقے کو روز افزوں کیا۔ اُنھوں نے ریلوے لائنوں پر "پروپگنڈا گاڑیاں" چلائیں جن کے ذریعے سے کسانوں کو تعلیم دی جاتی تھی انھوں نے فوج کو اشتراکی جماعت کے سکھانے کے لئے استعمال کیا، دودھ اور دیگر روزمرہ کی ضروریات کی تنگی کے ذریعے سے شہری والدین کو ترغیب دی کہ وہ اپنے بچوں کو سرکاری درسگاہوں میں بھیجیں جہاں وہ چھ سال کی عمر میں پورے پورے اشتراکی بن جائیں گے۔ فرانسیسی بیڑہ اور برطانوی سپاہی بحیرۂ اسود۔ آرچینجل اور مرمنسک میں بالشویک پروپگنڈے کی وجہ سے یہاں تک متاثر ہوئے کہ اول الذکر نے ایک غدر کی صورت میں بغاوت شروع کردی اور آخرالذکر پر دورانِ جنگ میں کسی قسم کا اعتماد نہ تھا۔ تمام وسطی ایشیا میں بالشویکوں نے "مسئلہ خود اعتمادی" کی تبلیغ شروع کی اس طرح (اور دیگر ذرائع سے بھی) انھوں نے برطانیہ کو افغانستان اور قسطنطنیہ کے وسیع علاقے میں اپنی فتح و نصرت کے فائدے اُٹھانے سے کلی یا جزوی طور پر محروم رکھا۔ حکومت ہند میں بے چینی پیدا کردی اور منگولیا کے راستے سے جاپان پر چڑھائی کردی۔ ایشیائی داناؤں پر بالشویک پروپگنڈے کا جو اثر ہوا وہ ایک عجیب و غریب کتاب "نوجوان ایشیا کا مستقبل" مصنفہ بی۔ کے۔ سرکار پروفیسر نیشنل کونسل آف ایجوکیشن (مجلس تعلیم قومی) بنگال مطبوعہ برلن ۱۹۲۲ء میں وضاحت سے درج کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ جرمنی میں شائع کی گئی ہے، مگر اس کی زبان انگریزی ہے۔ تجارتی معاہدوں میں برطانیہ کا سب سے بڑا مطالبہ یہی رہا ہے کہ بالشویک پروپگنڈا بند کردیا جائے۔ اسی دوران میں برطانیہ اور دیگر مغربی حکومتوں نے بالشویکوں کے خلاف پروپگنڈا کرکے سویٹ حکومت کو کم از کم اتنا ہی باطل اور مؤثر جواب دیا۔ روسی عورتوں کی قومیت کی کہانی مغرب میں خوشحال لوگوں کے درمیان شاید اب تک بھی صحیح مانی جاتی ہے۔ لیکن ہر ایک خبردار شخص جانتا

ہے کہ یہ محض بے بنیاد ہے۔ ایک دفعہ حکومت برطانیہ نے ریول اور اس کی قریبی بندرگاہوں میں امیرالبحر کی مدد سے رسالہ پراودا (روس کا سرکاری اخبار) تقسیم کیا گیا جو آخر کار تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ سفید نسل کے روسیوں کی طرف سے محض ایک دھوکا تھا۔ غلطی سے اس اشاعت پر لندن کی مہر ثبت ہو گئی جس کو بعد میں بہت سی کاپیوں پر سکاٹ لینڈ یارڈ والوں نے کاٹ دیا مگر پھر بھی کافی پرچے اسی طرح نکل گئے۔ جب راقم الحروف نے روس سے مراجعت کی تو میرے دوست (بغیر کسی کو مستثنے کئے ہوئے) میرے عینی مشاہدات کو درست تسلیم نہ کرتے تھے، جو لوگ برطانی حکومت کے پروپیگنڈے کو قابل پذیرائی قرار دے چکے تھے ان کو کسی طرح یہ یقین نہ آتا تھا کہ ماسکو کی گلیوں میں بالکل امن ہے، اور نسبتاً دیگر مغربی دارالخلافوں کے معمولی جرائم سے زیادہ پاک ہیں۔ جن کو بالشویکوں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ وہ کبھی باور نہ کرتے تھے۔ کہ وہاں کے باشندوں سے پولیس بس جبر و تشدد سے کام لیتی ہے۔ تہمت تراشی اور جاسوسی ان طریقوں سے مروج تھی جو پہلے بالکل نامعلوم تھے*

ان لوگوں کا یہ طرزِ عمل برطانی پروپیگنڈے کا جواب تھا جن کو یہ محسوس ہو چکا تھا کہ حکومتِ اشتراکی اتنی بُری نہیں جتنا کہ اس کو رنگا جاتا ہے وہ اسکو بالکل بیگناہ ظاہر کرتے تھے، اور اس بات کو بھول جاتے تھے کہ ایسا ہونا حکومت یا انسانی فطرت میں ہی داخل نہیں، اس قسم کا جواب اُن مغربی حکومتوں کے لئے جو روس کی اصلی حالت معلوم کرنے کے لئے بہت مضطرب تھیں ایک زبردست رکاوٹ تھی۔ مثلاً پروفیسر گوڈ نے جو بالکل غیر جانبدار محقق تھا محض اس لئے روس کا سفر اختیار کیا کہ وہاں جا کر اُن کی برائیوں کا عینی مشاہدہ کرے مگر جب واپس لوٹا تو اُس کے دل میں اُن کے لئے بہت بڑی قدر و منزلت تھی۔ اسی جرم کی وجہ سے برطانی حکومت نے جب وہ ریول پہنچا تو اُسے گرفتار کر لیا، اس کے کاغذات ضبط کر لئے گئے، اور جب اُس کو برائے نام رہا کیا گیا تو بحری افسر اُس کو پھر ریول اٹھا کر لے گئے، اور کافی عرصہ تک ایک برطانی جنگی جہاز میں جو بالٹک میں ٹھیرا ہوا تھا مقیم رکھا*

ایک یا ایک سے زیادہ حکومتیں اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لئے تاربرقی کی بہت سی ایجنسیاں قائم کرتی ہیں ہر ایک سیاست دان مسافر جس نے بلاد مشرقی کی سیر کی ہو بخوبی جانتا ہے کہ بہت سی مشہور و معروف ایجنسیاں جاپان کے زیر اثر ہیں جاپان کرانیکل میں بہت دفعہ اس کا ذکر آچکا ہے، جب جاپانی ولیعہد ایک دفعہ انگلستان میں سیر کرنے کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے جاپانی زیب و زینت کا سامان بہت کم آدمیوں میں تقسیم کیا ان محدودے چند اشخاص میں سے اس ایجنسی کا ایک افسرِ اعلےٰ بھی تھا۔ روسی حکومت نے اپنے نقطۂ خیال کی اشاعت کے لئے مشرقی ممالک میں تاربرقی کی ایجنسیاں قائم کر رکھی ہیں۔ چینی حکومت کی کوئی ایجنسی نہیں اس لئے بیرونی ممالک میں ہمیشہ ان حالات اور واقعات کا پتہ چلتا ہے جو چین کے دشمنوں کی

حمائت میں ہوتے ہیں ۔

اشاعت ایک زبردست ہتھیار ہے مگر مروجہ طریقوں میں تاحال اتنی ترقی نہیں ہوئی۔ لندن ۱۹۳۲ء کے صوبجاتی انتخاب کونسل کے ایام میں سرکاری بے تار برقی کے ذریعے لوگوں کو اکسایا گیا کہ وہ گورنمنٹ پارٹی کے لئے ووٹ دیں۔ بعد میں محسوس ہؤا کہ یہ ایک بیّن غلطی تھی مگر دوسری جانب کی غلطیوں کی وجہ سے اس کی درستی نہ ہو سکی ۔

بلاشبہ سینما یا حرکت کرنیوالی تصویریں جب تک کہ کوئی نئی ایجاد اُن کو پیچھے نہ ڈال دے پروپیگنڈے کے لئے سب سے اعلےٰ طریقہ ہیں، کیوں کہ عام طور پر وہ لوگ جو اخباروں میں سیاسیات سمجھنے کا ملکہ نہیں رکھتے ان کو دیکھنے کے بہت شائق ہوتے ہیں، اور پسندیدہ تصویریں اِن پہ گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ ریاستہائے متحدہ کو جنگ میں شامل کرنے کے لئے ان کو استعمال میں لایا گیا۔ مثلاً یہ دکھایا گیا کہ جرمن کی مالی اور فوجی امداد سے میکسیکو والے حملہ کرنیوالے ہیں۔ اگرچہ اس کی اشاعت صرف ان لوگوں تک محدود رکھی گئی ہے جن کو سمجھنے اور سوچنے کا مادہ بہت کم تھا، دورانِ جنگ میں بدکاری اور بدذاتی دکھانے والی فلمیں تیار کی گئیں۔ جنہوں نے عوام الناس کے جذبات کو اکسانے اور اُن کے دلوں میں عام نفرت پیدا کرنے کے لئے ایک بہت بڑا حصّہ لیا۔ ایک مقامی اخبار جو سینما والوں کو تازہ حالات اور واقعات سے باخبر کرتا ہے پروپیگنڈے میں نمایاں حصّہ لیتی ہے۔ سنجیدہ مُصنف سیاسی نظریہ پر بحث کرتے ہوئے سینما کا ذکر بہت کم لاتے ہیں کیونکہ ارسطو یا مانٹیگیو نے اِس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ تاہم یہ موجودہ وقت کی ایک بہت بڑی ملکی قوت ہے اور اس کا اثر دن بدن روبہ ترقی ہے۔

پروپیگنڈا محض ملکوں کے باہمی معاملات ہی سے تعلق نہیں رکھتا۔ حال ہی میں سر لیمنگ ورتھنگٹن ایونز، برٹش پوسٹماسٹر جنرل کے متعلق اخباروں میں بے شمار توصیفی مضامین شائع ہوئے یہ مضامین پوسٹ اوفس کے ایک پروپیگنڈا کرنے والے افسر نے شائع کئے تھے۔ سر لیمنگ چونکہ اس عہدے پر ابھی ابھی فائز ہوئے تھے، اِس لئے انہوں نے خیال کیا کہ وہ اِس کے مستحق نہیں لہذا اُنہیں یہ پروپیگنڈا بند کرانا پڑا، دوسرے وزیر اس قدر تنگ مزاج واقع نہیں ہوئے۔ راقم الحروف کی موجودہ حالت اس قابل نہیں کہ ایسی برائیوں کی حدود بیان کر سکے۔ اِس کے متعلق اخبار نیویارک فری مین مورخہ ۲۲۔ اگست ۱۹۲۳ء میں اس طرح رقمطراز ہے" ہمیں پورا یقین ہے۔ اگرچہ انگریز اس کو مبالغہ آمیز تصور کریں۔ مگر ریاست ہائے متحدہ کو ان برائیوں سے نارتھ کلف اور لائیڈ جارج کے زمانے کے انگلستان کی نسبت زیادہ اذیت پہنچتی ہے" مگر یہ بیان بہت کم معتبر معلوم ہوتا ہے ۔

حکومت کے پروپیگنڈے کی اشاعت صرف اخباروں کے ذریعے ہی نہیں ہوتی، بلکہ مدرسے بھی بہت حد تک اس میں حصّہ لیتے ہیں۔ تمام ملکوں میں حبّ وطنی کی روح پھونکنا تعلیم کا ایک ضروری شعبہ قرار دیا جاتا ہے اِس کا مادہ دوسرے ملک

کی برائیاں اور اپنی خوبیاں ظاہر کرکے دلنشین کیا جاتا ہے، اور آخرکار قومی راستبازی کیلئے ایک میدان پیدا ہوجاتا ہے آجکل فرانسیسی بچوں کو ابتدائی جماعتوں میں نہایت احتیاط کے ساتھ جرمنوں سے نفرت کرنیکی تعلیم دی جاتی ہے۔ راقم الحروف اپنے دوستوں کے دائرے میں ایک اطالوی اور ایک یونانی کو بھی شمار کرتا ہے۔ یہ دونوں بڑے فاضل اور علامہ ہیں۔ کہا ہے کہ مجھے لکھا کرتے تھے کہ اگرچہ جنگِ عظیم میں شامل شدہ قومیں ظاہراً دغابازی سے کام لیتی ہیں مگر اتنے [illegible] ان پر بھی پروپیگنڈا [illegible] اثر دکھا دیتا تھا اور یہ صرف ان کی ابتدائی تعلیم [illegible] تھا۔

مزدوروں کے لڑائی جھگڑوں میں بھی گورنمنٹ پروپیگنڈا استعمال کیا جاتا ہے۔ تاکہ کارخانہ داروں کو اس سے خبردار کیا جائے۔ تمام صنعت و حرفت سے متعلقہ ملکوں میں اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

نوجوانوں کو حکومت کے پروپیگنڈے سے متاثر کرنے کیلئے اشتہاری دنیا کے طریقوں پر عمل کیا جاتا ہے تجارتی مقابلوں نے اشتہار دینے کیلئے جو کامیاب ہو سکتے ہیں راستہ کھول دیا ہے۔ امریکہ کے ماہران نفسیات نے نفس اشتہاری کا رنگ بڑے غور و خوض سے مطالعہ کیا [illegible] حکومت [illegible] اور سینما کے ذریعے عمل پیرا ہوتی ہے۔ تاکہ حکومت کی منشا کے مطابق [illegible] اگرچہ سلطنت جمہوری کے باشندوں کو رائے دینے کا حق عام ہوتا ہے۔ مگر خاص موقعوں پر وہ اپنی ذاتی رایوں کو استعمال نہیں کر سکتے بلکہ عجیب و غریب طریقوں سے حکومت اپنی مرضی کے مطابق ووٹ لینے کیلئے مجبور کر دیتی ہے ایک ڈرامٹک واقعہ جیسے لڑائی میں شکست فوراً انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ اس سے حکومت کا جادو یکدم زائل ہو جاتا ہے اور یہ تمام عمارت دوسرے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتی ہے، مگر عام طور پر یہ طریقے اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ حکومت کا استقلال برقرار رہتا ہے۔ باوجود ان تمام حقائق کے ابھی ان طریقوں کی ابتدا ہی ہے۔ مگر اسوقت تک نہایت سرعت اور تیزی کے ساتھ مکمل ہوتے جائینگے، جب تک کہ حکومت کی منشا کے خلاف کوئی جنگ شکست اس شے کو بالکل [illegible] یہ نظام قائم کرنے میں بہت مدد دیتا ہے اور سرعت جماعت میں ایک ٹھوس مادہ ودیعت کر دیتا ہے [illegible] بہت سے خطرات بھی ہیں سب سے پہلا [illegible] حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی بدل سا ہے جب کبھی کوئی حقیقت [illegible] سے انکار نہیں کیا جا سکتا تو یہ ان پر پروپیگنڈا

ہے۔ جو اثرات فاسد آناً فاناً نہایت خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے، اگرچہ حقیقت کا انکشاف بتدریج عمل میں آئے تو حالات بھی آہستہ آہستہ وہی شکل اختیار کر لیتے ہیں سنہ ۱۹۱۸ء میں دریائے راہائن کے مشرقی علاقے نے اسی خطرہ کو واضح کیا تھا۔

اس بات کا خطرہ بھی ہے یعنی لوگوں کو عادت ہے کہ ان کا اعتقاد بجائے اسکے کہ درجۂ اعتدال پر ہو اور دلائل و مشاہدات پر مبنی ہو نہایت سنگین، پرجوش اور بیہودہ ہوتا ہے۔ بیہودہ جوش ہمیشہ وہ اعتقاد پیدا کرتا ہے جسکی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے مگر ایسے اعتقادات کی مسلسل تحریک مہذب زندگی کیلئے بہت خطرے پیدا کر دیتی ہے۔

سب سے اخیر میں اس بات کا خطرہ ہے کہ ان ملکوں میں جہاں کسی قوم کی حکومت نہ ہو ہر ایک حکومت اپنے پروپیگنڈے کے ہتھیار استعمال کرتی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں مشتعل جذبات پیدا کرکے انکو لڑائی کیلئے آمادہ کر دیتی ہے، حکومت کے پروپیگنڈے کا مقصد اولٰے قوم پرستی ہے۔ یعنی جب ہم صرف ایک قوم کو نہیں بلکہ سب قوموں کو دیکھتے ہیں تو حکومت کے پروپیگنڈے کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ الف اور ب کو اسبات کا یقین دلادیں [illegible] کو کچل ڈالنا مقدس فرض ہے۔ دنیا مختلف گروہوں میں ایسی قومی حدود میں منقسم ہے کہ [illegible] سے بالکل علیحدہ [illegible] اور نا ممکن دکھائی [illegible] ایسا ہونا بھی چاہیئے۔

اندریں ایام جب کہ سامان حرب کی تخفیف کیلئے مجالس کا انعقاد عمل میں آرہا ہے، یہ امر عجیب ہے کہ پروپیگنڈا بند کرنے کیلئے ابھی تک کوئی تجویز پیش نہیں ہوئی جبتک کہ حکومتیں اپنی قوم کو دوسروں کے اکساتی رہیں گی۔ یہ کبھی ممکن نہیں ہوسکتا کہ انکے مشتعل جذبات خاموش رہیں۔ اگر حکومت کا پروپیگنڈا بین الاقوامی [illegible] کے ہاتھ میں ہو تو جن اعتقادات کی اشاعت کی جائیگی وہ بالکل چھوٹے ہونگے۔ تاہم خواہ کچھ بھی ہو جن باتوں پر وہ مصر ہوگی وہ موجودہ حالات کی طرح ایک دوسرے کی تباہی اور بربادی پر موقوف نہ ہونگے مگر یہ ایک امید موہوم ہے۔ ضروری ہے کہ ہم اسوقت تک انتظار کریں جب تک کہ حکومت کے پروپیگنڈے کی برائیوں کو بار بار دہرانے سے عوام الناس کے قلوب میں شک و اشتباہ پیدا نہ ہو جائے۔ یا کوئی قابل عمل طریقہ رائج شدہ تحریکات کے اثرات کے رد عمل کیلئے دیوانگی کے جذبات کو [illegible] نہ کرے۔ مگر اسکا وجود اسوقت تک معرض وجود میں نہیں آسکتا جب تک کہ موجودہ پروپیگنڈے کی [illegible] سے دنیا کی آبادی میں ایک معتدبہ کمی واقع نہ ہو جائے۔ (مترجمہ از برٹرنڈ۔ اے۔ فیلو درسل)

(از لطیف الرحمٰن بی۔ اے۔ ایل ایل بی)

جمیل کے سر میں یہ سودا مدت سے سمایا ہوا تھا کہ وہ ایک ایسی لاثانی تصویر [illegible]
فن کے لحاظ سے کسی قسم کا کوئی نقص نہ ہو اور جسے دیکھ کر دنیا بھر کے بڑے بڑے مصور [illegible]
اس نے آجتک فن مصوری کے کئی ایک [illegible] تیار کئے تھے، جنہیں مہینوں بلکہ سالوں [illegible]
کرتا رہا تھا۔ اور جو اسکے [illegible] کے مطابق [illegible] کے بہترین مرقعے تھے۔ مگر نقادانِ فن [illegible]
نگاہوں نے ان تصویروں میں بعض [illegible] نقائص نکالے جو عام طور پر مبتدیوں سے سرزد ہوتے [illegible]
ہیں۔ اسکے علاوہ عام پبلک کی بے اعتنائی اور سرد مہری نے تو بیچارے جمیل کے ان مرقعوں [illegible]
اس قدر ناانصافی برتی کہ چند دنوں میں اسکی ساری محنت پر پانی پھر گیا۔ اور یہ تصویریں بازار [illegible]
کے ادنیٰ ترین نمونوں میں شمار ہونے لگیں۔ لیکن زمانہ کی اس ناقدرشناسی سے اس [illegible]
نہ ٹوٹا، بلکہ ان باتوں سے اسکی یہ امید اور زیادہ قوی ہوتی گئی کہ وہ عنقریب ایک ایسی تصویر بنانے میں [illegible]
ہوگا جس کی بدولت اُسے موجودہ زمانے کی بہترین مصوروں کی صفِ اول میں جگہ دی جائیگی۔

جمیل کو یہ یقین تھا کہ اس کی تصاویر کے دیکھنے والوں میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو [illegible]
کے صحیح اصولوں کو واقفیت رکھتے ہوں، یا جو تصویر کی ترتیب، تناسب، روشنی اور سائے۔ رنگ [illegible]
یا خطوں کی موزونیت کو پوری طرح سمجھ سکتے ہوں۔ اُسے عوام کی نے جا نکتہ چینی اور بے معنی اعتراضات
کی کچھ پرواہ نہ تھی۔ ہاں البتہ وہ آرٹ کے سمجھنے والوں نقادوں سے ضرور گھبراتا تھا اور اکثر سوچا [illegible]
تھا کہ مجھے ایک ایسا شاہکار تیار کرنا چاہیئے جو اسقدر اعلےٰ ہو کہ اعتراض کرنے والوں کیلئے [illegible] کسی
قسم کی گنجائش نہ ہو اور نقادانِ فن اس میں کوئی نقص نہ نکال سکیں۔

ایک عرصے تک غور و فکر کرنے کے بعد آخر ایک دن اس نے اپنی یہ [illegible] تصویر [illegible]
کی اور کئی دنوں کی لگاتار محنت کے بعد اسے مکمل کر لیا۔ یہ تصویر ایک عورت [illegible]
میز پر بیٹھی ہوئی رو رہی تھی اور مرد انگیٹھی کی طرف پشت کئے کھڑا تھا۔ اس نے [illegible]

اور بیماری کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ عورت کے سامنے میز پر ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی کھڑکی میں سے چند پھیڑیں ادھر اُدھر پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ اور کھلے ہوئے دروازے میں سے مرد کی موٹر کا تھوڑا حصہ دکھائی دیتا تھا۔

جمیل نے اپنے موقلم سے تصویر پر آخری خط لگاتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا اُسکے چہرے سے خوشی اور کامیابی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے ذرا فاصلے سے تصویر کو غور دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد اُس نے نظر اٹھا کر تصویر کو دوبارہ دیکھا اور جی ہی جی میں اُس کی ظاہری اور باطنی خوبیوں پر غور کرنے لگا۔

اس تصویر کا نفس مضمون ایک معمہ تھا جس کے کئی مختلف حل ہو سکتے تھے، مثلاً یہ کہ عورت کسی خاص جرم کا ارتکاب کر چکی ہے۔ اور خاوند کو علم ہو جانے پر رو رہی ہے۔ یا یہ کہ کئی دن ہوئے عورت نے ایک خط مرد کو ڈاک میں ڈالنے کیلئے دیا تھا اور آج یہ خط مرد کی جیب سے برآمد ہوا ہے اور اس واقعہ پر وہ بے اختیار ہو کر آنسو بہا رہی ہے۔ یا یہ کہ درزی نے عورت کو اپنا بل بھیجا ہے اور مرد نے اس کی ادائیگی سے انکار کر دیا ہے۔ یا پھر یہ کہ مرد افسانہ نگار ہے اور اُس نے اپنا ایک تازہ افسانہ عورت کو پڑھنے کیلئے دیا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر وہ زار و قطار رو رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

جمیل بیحد خوش تھا کہ چونکہ اس قسم کے کئی مختلف حل تصویر کے متعلق پیدا کئے جا سکتے ہیں، اسلئے اہل فن کیلئے اسکی تصویر میں گرفت کی گنجائش نہیں ہے۔ باقی رہا عوام کا معاملہ مگر وہ عوام کے بیجا اعتراضات کی پرواہی کب کرتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اس تصویر کے بنانے میں وہ ہر طرح سے کامیاب ہوا ہے لیکن دو چار روز کے متواتر غور و فکر کے بعد اس نے میز پر ایک طشتری میں مختلف اقسام کے چند پھل بنا دیئے تا کہ رنگوں کی ہم آہنگی سے تصویر مجموعی طور پر ذرا اور زیادہ خوبصورت ہو جائے۔

نمائش کی مقررہ تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے اُس نے تصویر اپنے عزیز دوست امجد کو دکھائی جس نے پورے ایک گھنٹے تک تصویر پر تنقیدی نگاہیں ڈالنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ مرد کے لباس میں تین نقص ہیں اول یہ کہ اسکا پاجامہ بہت ڈھیلا ہے دوسرے یہ کہ یوں معلوم ہوتا ہے اُسنے ٹائی بنانے کے بغیر ہی کمر کے اردگرد لپیٹ لیا ہے اور تیسرے یہ کہ کوٹ کو بٹن تو چار لگے ہوئے ہیں مگر کاج صرف تین ہی ہیں۔ ان اعتراضات پر جمیل نے

مرد کے کپڑوں کو تبدیل کر دینے کا فیصلہ کیا پہلے تو اسکے دلمیں خیال پیدا ہوا کہ پاجامے کی بجائے اُسے تہمد پہنا دیا جائے
مگر آخر کار اُس نے اُسے شلوار میں تبدیل کر دیا اور کوٹ کی جگہ ایک لمبا چوغہ پہنا دیا اس تبدیلی کے دوسرے ہی دن
وہ تصویر کو ایک تاریخ کے پروفیسر کو دکھانے کیلئے لیگیا جسنے دیکھتے ہی اسمیں یہ نقص نکالا کہ مرد نے شلوار تو
بیسویں صدی کی پہنی ہوئی ہے۔ مگر اسکا چوغہ گیارھویں صدی کے زمانہ کا معلوم ہوتا ہے اور جوتا گوتم بدھ کے ایام کا؛

جمیل نے ان کو گھر واپس آکر مرد کے لباس کو پھر تبدیل کرنا شروع کیا، اور کئی گھنٹوں کی لگاتار محنت کے بعد
اسکے تمام کپڑے اتار دیئے اور صرف ایک لنگوٹی اُسکے برہنہ جسم پر رہنے دی، وہ اپنے موقلم کو ہاتھ میں لیے تصویر
کو دور سے کھڑا ہو کر دیکھ رہا تھا کہ یکایک اسکے دل میں خیال پیدا ہوا کہ تصویر میں جو کمرہ دکھایا گیا ہے، وہ
بالکل ایک غسلخانہ نظر آتا ہے، ایک عورت اور ایک لنگوٹی پوش مرد کا اسطرح سے غسلخانے میں باہم ہونا کہاں تک
درست ہو سکتا ہے۔ وہ ساری رات اسی بات کو سوچتا رہا اور صبح کے وقت جب انجم اس سے ملنے کیلئے آیا
تو اُس نے اپنی مشکلات کا اُس سے ذکر کیا۔ انجم نے تصویر کو دیکھکر کہا کہ غسلخانہ میں عورت اور مرد کی موجودگی اتنی قابل
اعتراض نہیں جسقدر کہ مرد کے جسم کی ساخت۔ مرد کے اعضا میں تناسب کا نام نشان تک نہیں۔ اسکا ایک کندھا
دوسرے سے بلند اور نیچا ہے اور اسکے علاوہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسے تیسرے درجے کی دق ہے
اس نازک حالت میں اسے یوں برہنہ رکھنا گویا سراسر ظلم ہے۔

انجم کے چلے جانے کے بعد جمیل نے مرد کو تصویر سے بالکل نکال دیا، اور اسکی جگہ انگیٹھی پر ایک بڑا
کلاک بنا دیا، اب اس تصویر کی نسبت خیال یہ ہو سکتا تھا کہ عورت کے خاوند نے اسے اپنے دفتر سے
ایک چٹھی بھیجی ہے جسمیں تحریر ہے کہ وہ چار پانچ دوستوں کے ہمراہ شام کی چائے گھر پئیگا اور چونکہ
گھر میں کسی قسم کا سامان موجود نہیں، اسلئے عورت اپنی مشکلات کا احساس کرتے ہوئے گریہ وزاری کر رہی تھی

اسکے بعد جمیل کے دلمیں عورت کے متعلق شک پیدا ہونا شروع ہوا چنانچہ تھوڑی سی دیر کے بعد جب حجام اُسکی
حجامت بنانے کو آیا تو جمیل نے عورت کے متعلق اُسکی رائے دریافت کی حجام نے تصویر پر ایک سرسری نظر
ڈالتے ہوئے کہا کہ عورت کے سر پر بالوں کی بجائے گھاس اُگا ہوا معلوم ہوتا ہے جمیل نے پھر اپنا
موقلم اٹھایا اور عورت کے بالوں کو دوپٹے کے آنچل میں چھپا دیا مگر جب حجام کے چلے جانے کے بعد اسے اس
بات کا خیال آیا کہ ساڑھی کے ساتھ علیحدہ دوپٹہ کبھی نہیں اوڑھا جاتا تو اُسنے غصے میں آکر عورت کو بالکل ہی اڑا دیا!
اس تصویر کو دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تصویر ایک کرایہ کے کمرے کی ہے میز پر مالک مکان کا نوٹس
کرایہ ادا کرنے کیلئے رکھا ہے جسے دیکھ کر کرایہ دار دوسرے کمرے میں جاکر مکان خالی کرنے کی تیاری
کر رہے ہیں۔

دوسرے روز جمیل کا ایک دوست اس سے ملاقات کرنے کیلیئے آیا، اس نے تصویر کو دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے جمیل سے کہا "بھائی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کھڑکی عین انگیٹھی سے اوپر ہو؟" جمیل نے اس فاش غلطی کے بتانے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مُوقلم اٹھایا اور کھڑکی کو تصویر سے خارج کر دیا۔

اُسی روز شام کو جمیل کے گھر لسباز نے یہ اعتراض کیا کہ انگیٹھی پر رکھا ہوا کلاک دور سے بالکل لپٹن کی چائے کے بڑے ڈبے کی مانند نظر آتا ہے ——— جمیل نے اس رات کلاک کو بھی صاف کر دیا۔

اور اگلے روز کسی اور شخص نے یہ اعتراض کیا کہ کھلے ہوئے دروازے میں سے موٹر کار کا اگلا حصہ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ایک بہت بڑا ٹائپ رائٹر لاری پر دھرا ہو۔ جمیل نے کھلے ہوئے دروازے کو بند کر دیا۔

اسقدر رد و بدلوں کے بعد تصویر اب نہایت مختصر سی رہ گئی اسمیں اب عورت کی خالی کرسی، میز، پھلوں کی طشتری اور ایک چھوٹے سے گلدان کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کرسی اور میز کی درستی کے متعلق تو جمیل کو پورا یقین تھا کیونکہ اس نے یہ دونوں چیزیں ایک فرنیچر کی باتصویر فہرست سے نقل کی تھیں اور گلدان کی تصویر اس نے ایک سامنے کے گلدان کو سامنے رکھکر بنائی تھی۔ اسلیئے اسکی طرف سے بھی اطمینان تھا۔ باقی رہی پھلوں کی طشتری اسکے متعلق بار بار غور کرنیکے بعد اس کے دل میں یہ شک پیدا ہونے لگا کہ آم اور سنگترے ایک ہی موسم میں نہیں ہوا کرتے اور جب یہ شک رفتہ رفتہ یقین کی حد تک پہنچ گیا تو اس نے طشتری کو پھلوں سے خالی کر دیا۔

تصویر کے متعلق اب جو معمّا باقی رہگیا تھا وہ صرف اسی قدر تھا کہ آخر یہ تصویر کیوں اور کس غرض کیلیئے تیار کی گئی ہے؟ مگر اس خیال سے بھی جمیل کا حوصلہ پست نہ ہوا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اُس نے ایک ایسی چیز بنائی ہے جسمیں باکمال مصوروں کیلیئے بھی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے آخرکار اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے تمام عزیزوں اور دوستوں کو اپنے گھر مدعو کر کے انہیں تصویر دکھائے۔ چنانچہ اس نے اسی وقت اس خانگی نمائش کی تیاری شروع کر دی اور کمرے کی اشیاء کو درست کرنے — اپنی بوڑھی نوکرانی کو فرش صاف کرنے کا حکم دیا دوران صفائی میں نوکرانی کی نظر جو تصویر پر جا پڑی تو اس نے کچھ دیر تک تصویر کو دیکھ کر جمیل سے کہا میاں! یہ تصویر آپ نے کسطرح کی بنائی ہے؟ ذرا میز پر رکھی ہوئی طشتری کو تو دیکھیئے کہ میز کے کنارے کے اسقدر قریب ہے کہ اگر کوئی میز کی صفائی کرنا چاہے تو ضرور ہی اسے نیچے گرا کر توڑ دے۔ اور ———"

جمیل اچھل کھڑا ہو گیا۔ اسکا چہرہ یکایک سرخ ہو گیا۔ ایک دو منٹ تک دانت پیسنے کے بعد اُس نے اپنا سب سے بڑا مُوقلم اٹھایا اور اسے جلدی سے رنگ میں ڈبو کر دو تین مرتبہ نہایت غصے سے تصویر پر اِدھر اُدھر پھیر دیا۔

آجکل یہ تصویر ایک مشہور گیلری میں آویزاں ہے اور زمانۂ حال کے شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے اسکے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں "نئی روشنی کی لڑکیوں کے غسل کا لباس آج سے بیس سال بعد"

لغزشِ شباب

چاندنی رات تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی سنسان جہت میں پھیل کر کائنات کو بقعۂ نور بنا رہی تھی سطح آسمان پر ستارے جگنوؤں کیطرح چمک چمک کر منظر کی دلفریبی میں دوچند اضافہ کر رہے تھے۔ خنک ہوا کے جھونکے میدان میں بہنے والی نرم اور آبجو کیطرح ایک شیریں سی ترنم پیدا کر کے تھکے ہوئے دماغوں کو آسودگی بخش رہے تھے حیوان و انسان دنیا کے ہنگاموں اور زندگی کے جھگڑوں جھمیلوں سے آزاد ہو کر نیند کی آغوش میں پہنچ چکے تھے اس تمام نشہ آور ماحول اور ان خمار آفرین اثرات کے اندر صرف وہ خاموش مضمحل بستر پر پڑا جاگ رہا تھا اسکا دماغ پریشان خیالات کی حدت سے کھولتے ہوئے پانی کی طرح اُبل رہا تھا جذبات کی تندی بعض اوقات اُسکی حرکتِ قلب کو اسقدر تیز کر دیتی تھی کہ خون ہیبتناک سرعت کیساتھ اُسکی رگوں میں دوڑنے لگتا اور اسکا جسم ایک خوفناک تھرتھری سے کپکپا اُٹھتا تھا پھر دوسرے ہی لمحہ میں روح کو منجمد کر دینے والا مبہم و غیر محسوس خوف بارِ گراں کیطرح اُسکے رگ و ریشہ پر [illegible] وہ گھبرا جاتا تھا کہ کہیں اسکے جسم و جاں کا رشتہ منقطع ہو جانے کا وقت نہیں آ پہنچا ماہ تاباں کی ضیا ریاشی رات کا سحر کار حسن، فضا کا سکوت کوئی چیز بھی اسکے بھڑکتے ہوئے اعصاب میں سکون پیدا کرنے کے قابل نہ تھی۔ ایک ہفتہ سے وہ اس جان گسل کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔ اُسکا معصوم و سریع الاحساس دل تفکرات شدید کا مرکز اور اسکا الم نا آشنا دماغ تردوات سے پایانی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا دن کا آرام اور رات کی نیند اس کیلئے حرام ہو چکی تھی وہ ٹکٹکی لگائے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اس کا چہرہ مرے ہوئے انسانوں کی طرح ساکن و بے نور تھا۔ لیکن دل ناقابل تشریح اضطراب میں مبتلا جسم کی ایک ایک رگ کو شعلہ زار بنا رہا تھا۔ وہ نصف گھنٹہ یونہی بےحس و حرکت لیٹا رہا۔ اور آخر ایک اضطراری حالت کے ساتھ یک لخت بستر سے اٹھا لیکن فوراً ہی نیم مردہ انسان کی طرح چارپائی پر گر پڑا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی دندانہ دار آری آہستہ آہستہ اسکے اعضاء کو کاٹ رہی ہے، وہ جانتا تھا کہ اگر یہ ہولناک ذہنی اذیت اُس کے خیالات پر کچھ عرصہ یونہی مستولی رہی تو وہ یقیناً دیوانہ وار دیوار سے سر ٹکرا کر اپنے تئیں ہلاک کر ڈالیگا رنج و غم کی تباہ کن افسردگی اور جوش و التہاب کو طوفان کو حس سے اُسکا دورانِ خون مسموم ہو رہا تھا۔ وہ گلفام انسان بنا ہوا تھا۔ لیکن اسیرِ فاد نہ تھا۔ یکا یک اسکا سینہ پھٹا اور جذبات پنہاں کی خاموشی و طویل تنگ ہے ایک

دردناک آہ کی صورت اختیار کی اسکے ہونٹوں سے ایک مدہم سی چیخ نکلی اور عالم انتشار میں اپنے ہاتھوں کو بیتابی سے ملتے ہوئے اسنے کہا "میرے اللہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے۔ اگر اس خبر میں صداقت ہے تو اور اگر یہ افترا ہے تو بھی مجھے حقیقت سے آگاہ کرے کہ میں بے جا نچی کا عذاب برداشت کرنے سے عاجز ہوں" اس نے بے اختیار ہو کر تکیے کے نیچے سے ایک شکن آلود کاغذ نکالا جس پر نیلی سیاہی سے بہت مختصر تحریر مرقوم تھی آہ یہ نوشتہ تو نہیں، کاش اسے کبھی نہ ملتا، یہ سیاہ داغ، جس نے دفعۃً ابھر کر اس کی جمعیت قلب کو تہس نہس کر ڈالا تھا۔ ہمیشہ اسکی نظروں سے اوجھل ہی رہتا۔ وہ زندگی کے بقیہ ایام اسی عسرت جہالت میں بسر کر دیتا جسکا وہ ہمیشہ سے عادی چلا آرہا تھا اشفاق نے یہ خط بھیجکر یقیناً اس پر بے انتہا ظلم کیا تھا۔ اگر عفت و عصمت کے دامن لوث پر ایسا مکروہ اور گھونا؟ دھبہ لگ چکا تھا تو اسے کیوں اسکی اطلاع دیگئی۔ کیا لکھنے والے کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ اس حادثۂ فاجعہ سے واقف ہو کر آیندہ محتاط طرز زندگی اختیار کرلے یا یہ کہ اس واقعہ جانگداز کی یاد ہر لحظہ اس کے قلب و ضمیر پر نشتر چبھو چبھو کر اسے عقوبت جہنم کی اذیت مسلسل کا شکار بنائے رکھے اگر وہ اسکی حساس طبیعت اسکی معدوم مسرتوں، اور [illegible] سے جو اس نے اپنی زندگی سے لگا رکھی تھیں آگاہ ہوتا تو شاید اس قسم کے طرز عمل سے ہمیشہ گریز کرتا کیا عجب ہے کہ ایک شخص عمداً اپنے آپکو گناہ کی آلائش سے ملوث کرتا ہے، اور پھر خود ہی داغ عصیاں کی تشہیر بھی کر دیتا ہے" اسنے کاغذ کے پرزے کو چاند کی ملگجی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ چند سطریں تھیں جن کے الفاظ جلاد کی خونخوار آنکھوں کی طرح گھور گھور کر اسے لرزہ بر اندام کر رہے تھے۔ اسکے ہاتھوں میں ہولناک جھٹکے لگیں اور کاغذ لڑک کر بستر پر گر گیا کاش یہ خبر غلط ہو، یہ الزام بے بنیاد ہو۔ یہ بہتان جھوٹا ہو۔ وہ بدنامی کی کالک کو ندامت کے آنسوؤں سے دھو کر پھر ایک بار اپنی پیاری کو سینہ سے چمٹا لے اور اپنے دل [illegible] اسکی جلد بازی پر سرزنش کرکے تسلی دے کہ یہ سب مذموم کارروائی ایک ناکام رقیب ایک بد طینت دشمن کی عداوت کا نتیجہ تھی۔ لیکن [illegible] تاویلات سے مطمئن نہ ہوتا تھا۔ اُسے اس خبر پر سے پورے [illegible] آتی تھی اس نے ابھی چند ماہ ہوئے ایک مغربی حکیم کی معرکۃ الآرا کتاب "نفسیات شباب" کا مطالعہ کیا تھا۔ جسکے پر زور لب و لہجہ شاندار انشا بیان اور ناقابل تردید دلائل نے اُسے مجبور کیا تھا کہ وہ اس صحیفہ کے ایک ایک پیرایہ بیان پر [illegible] مصنف نے اپنے خانہ ساز نظریہ کی تائید میں صنف لطیف کے [illegible] کی ہنسی اڑائی تھی اسکے مشرح اور واضح الفاظ میں عورت کی زندگی کے ان خطرناک لمحات کا ذکر بھی کیا تھا جب ایک عورت بلا تمیز تخصیص، محض گوشت پوست خون اور اعصاب کا مجموعہ ہوتی ہے جہاں ہوا و ہوس کا خفیف سا جھونکا اُسے بید مجنوں کی طرح کس طرف جھکا [illegible] ہے اور جہاں تمام [illegible]

ابتلا کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ہی عورت فتحمندی سمجھتی ہے ؟ شعاع حقیقت ایک زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح اُس کے دماغ کو چھلنی کر گئی، اس خوفناک کتاب کی زندہ جاوید مثال اُس کے دماغی پردوں پر متحرک تصاویر کی طرح ناچنے لگیں آہ یہ سب ممکن تھا۔ کوئی بات بھی بعید از قیاس نہ تھی، اب وہ کاغذ کا پرزہ زیادہ معنی خیز ہوگیا تھا، کرب و اندوہ کی ناقابل برداشت تلخی نے اس کی آنکھوں کو شرابور کر دیا ٭

بدنصیب انسان ! آج اُسے معلوم ہؤا تھا، کہ قلب انسانی میں مختلف و متباین تاریں ہیں۔ جن کا ہمیں عمر بھر احساس نہیں ہوتا۔ ان تاروں کو صرف واقعات ہی چھو سکتے ہیں۔ آج سے پہلی مرتبہ محسوس ہؤا کہ وہ اپنی بیوی کو والہانہ محبت کے ساتھ چاہتا ہے۔ اپنی خاموش علمی زندگی میں اس کی کتابیں ہی اس کی محبوبہ رہی ہیں، اُس نے اشتیاق بے نہائت کے ساتھ شادی کی۔ اپنی حسین بیوی کی کشادہ و تابناک آنکھوں میں صحیفۂ عشق کے کئی باب مطالعہ کئے، لیکن پھر عالم خود فراموشی میں اپنے درسی مشاغل میں غرق ہوگیا۔ اُس کا تخیل بیوی کے متعلق ہمیشہ یہی رہا تھا کہ وہ اس کی عبادتِ علمی میں اگر رہبر نہیں تو ہمسفر ضرور ہوگی، وہ بیوی کو ایک ذی روح علمی کتاب سے زیادہ نہ سمجھنا چاہتا۔ لیکن اب جب کہ اُس کی مسرتِ ازدواجی تباہی کے غارِ عمیق کے کنارے کھڑی تھی، وہ اس کو پھر ایک بار شوخ و چنچل لڑکی دیکھنے کا آرزومند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ علمی بار کو دریا برد کر کے کتابوں کے ذخیرہ کو دیا سلائی دکھا کر اپنی بیوی کو پھر عروس نو بنی ہوئی دیکھے، اسے اپنا پرستیدۂ خیال اپنا قبلہ جذبات بنائے۔ اُس کے حنا آلود ہاتھوں کی سرخی کو بوسوں کی کثرت سے دھو ڈالے اور اس کے حضور اپنے بہترین ہدایائے عشق پیش کرے۔ لیکن آہ اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔ وہ اپنی متاہل زندگی کے ابتدائی دور کی سیر کر رہا تھا، جب اس نے نوخیز عاشق کی طرح اپنے عشق پرجوش کی حدت سے نئی نویلی دلہن کو پریشان کر دیا تھا، چوبیس گھنٹے ایک نرم و نازک چیز اُس کے پہلو میں موجود رہتی تھی۔ کسی کے عطر میں بسے ہوئے لباسِ حریر کی خوشبو اس کے دماغ کو مدہوش کئے دیتی تھی۔ وہ اپنی مسرور و شادان بیوی کو، جو دوشیزہ بہار کی مانند موسم کے بہترین الوان سے مزین ایک رنگین تیتری کی طرح اُس کے کاشانۂ خیال میں رنگ و بو کا روح افزا ارتعاش پیدا کرتی رہتی تھی، وفورِ محبت سے "ممتازی ممنازی" کہکر پکارتا تھا۔ اُس کی بیوی نے کئی بار احتجاج محبت کے طور پر کہا کہ تم نے میرا نام بگاڑ دیا ہے، وہ ایک گرم و طویل بوسہ سے اُس کے کھلے ہوئے شیریں ہونٹوں کو بند کر دیتا اور کہتا "آہ تم اتنی نازک، اتنی پیاری اور میری اتنی شوخ و شریر لاڈلی ہو کہ میں کبھی تمہیں ممتاز کے گرانبار لفظ سے نہ بلاؤں گا" ٭

خیالات کی رو اسے کہاں سے کہاں لے گئی۔ اس کے مشتعل دماغ میں قدرے سکون پیدا ہؤا۔ اُس نے سر اٹھا کر اپنی بغل والی چارپائی کو دیکھا، جہاں اُس کی پری وش نوجوان بیوی محوِ خواب تھی۔ اُس کا خوب صورت چہرہ چاند کے نور سے

دُھل کر حد درجہ دلآویز ہوگیا تھا۔ اُس کے مخملیں لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سیاہ بال بے ترتیب ہوکر پیشانی پر بکھر گئے تھے۔ لانبی گھنی پلکوں نے باہم پیوست ہوکر آنکھوں کو چھپا رکھا تھا، وہ آنکھیں جو اُس کے جسم مرمریں کے تمام دلکش اعضا سے زیادہ حسین و رعنا تھیں، وہ اکثر اُس کی سپید و عریاں گردن میں باہیں حمائل کر کے اس کی آنکھوں کو چوم چوم کر شاعرانہ مبالغہ سے کہا کرتا تھا "ممتازی تم آنکھیں بند کرلیتی ہو تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمام کائنات سوگئی ہے۔ اُس کے کل ہنگامے خاموش ہوگئے ہیں، اور آہ جب تم آنکھیں کھول دیتی ہو تو خوابیدہ فتنے یکبارگی جاگ اُٹھتے ہیں، حجر و شجر جن و انس انگڑائیاں لیتے معلوم ہوتے ہیں، اور فضا میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے، پیاری تمہاری آنکھوں میں کیا جادو ہے؟" وہ ایک نغمہ پرواز قہقہے کے ساتھ اُس کی خیال آرائیوں پر تالیاں بجاتی ہوئی طائر نو اسیر کی طرح اسکی گرفت سے نکل جاتی اور دُور جاکر اس کی طرف دیکھ دیکھ کر بے اختیار ہنستی تھی۔

وہ اس زہد شکن نظارہ سے بے تاب ہوکر چاہتا تھا۔ کہ اُس کے سُرخ و سُفید رخساروں کو جہاں خونِ صحیح بادہ ارغوان کی طرح جھلک رہا تھا۔ چوم لے کہ وہ "خونیں تحریر" اپنے شعلہ فشاں نقوش کے ساتھ اُس کی چشم تصوّر کے سامنے آگئی۔ انتہائے یاس میں اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ پھر ایک جھلتی ہوئی نگاہ اپنی بیوی پر ڈالی جو بدستور میٹھی نیند میں مست دایاں گال ریشمیں تکیہ پر رکھے اطمینان سے سو رہی تھی۔ اُس کے دل میں حیرت و استعجاب کا طوفان اُٹھا۔ کیا ایک مجرم ضمیر، ایک گنہگار انسان مکافاتِ بد سے مامون یوں چین سے سو سکتا ہے؟ کیا گناہ کی یاد ارتکاب گناہ سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتی؟ کیا ایک عورت حقوق زوجیت کو ہوس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر خاوند کے پہلو میں بے غل و غش محوِ خواب ہوسکتی ہے؟ جذبات گوناگون کی آمیزش نے اُس کے حواس کو کُند کر دیا، اس کے ذہن نے مزید فکر سے انکار کر دیا، اور عالم بے بسی میں اُس کے مُنہ سے بیساختہ چیخ نکل گئی، اُس کی بیوی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی، آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے اپنے شوہر کو دیکھا جو چارپائی پر بیہوش پڑا تھا، وہ جلدی سے اُس کے قریب آئے اپنا ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھ کر بولی "پیارے، کیوں؟ خیر تو ہے؟" "ممتازی! خواب، بہت ہی ڈراؤنا خواب۔ میرا کلیجہ مُنہ کو آرہا ہے۔"

اُس نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور نرمی سے بالوں کو سلجھانے لگی "پیارے تم ایک ہفتہ سے پریشان ہو رات کو پوری نیند بھی نہیں سوتے، خدا جانے تمہیں کیا ہوگیا ہے۔"

آہ وہ دل سے چاہتا تھا، کہ یہ سب کچھ ایک خواب بن جائے، اس کا روح فرسا غم ایک خوفناک خواب میں تبدیل ہو جائے جس کے اندوہگیں نقوش کو عالم بیداری کی مُسرّت فوراً صاف کر ڈالے۔ صبح ہوئی تو شفیق و غمگسار ماں نے دیکھا

کہ اس کے لختِ جگر کی آنکھیں گدلی ہیں، چہرہ اُداس ہے اور مُنہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ اُس نے اُسے پاس بلایا اور ہمدردانہ لہجہ میں کہا کہ "رات کو زیادہ جاگنا اچھا نہیں۔ تم دن کو بھی نہیں سوتے، رات کو نیند پوری نہ کرو گے تو صحت بگڑ جانے کا ڈر ہے"۔

اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج وہ راز کھول دے گا۔ دو ٹوک فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہے، قوت برداشت اُسے جواب دے رہی تھی، اُس کا دِل مزید بوجھ اٹھانے سے عاجز تھا، اور وہ جانتا تھا کہ اگر یہ آگ یونہی اندر ہی اندر سلگتی رہی تو اُس کے اعصاب تباہ ہو جائیں گے، اُس نے اپنی بیوی سے کہا "میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ میرے ساتھ جھوٹ نہ بولو گی؟"

اُس کی بیوی کا دِل دھڑکنے لگا۔ اُس نے کہا "میں جھوٹ بولنا گناہ جانتی ہوں۔ بے شک میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم سے کوئی بات نہ چھپاؤں گی"۔

اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے وہ کاغذ کا پرزہ، وہ نامۂ اعمال، وہ ورقِ سیاہ اُس کے حوالے کر دیا۔ "بتاؤ، اس میں کتنی صداقت ہے؟"

چشم زدن میں اُس کی بیوی کا رنگ متغیر ہو گیا، اُس کا سر چکرانے لگا۔ جسم شل ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ اُسے یوں معلوم ہوا کہ وہ زمین و آسمان کے درمیان معلق ہے جہاں اُس کے حواس جواب دے بیٹھے ہیں، وہ بولنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی زبان کٹ گئی تھی، وہ حرکت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے پاؤں جنبش نہ کر سکتے تھے، اس کی نظریں کاغذ کے پرزہ پر جمی تھیں، لیکن دکھائی کچھ نہ دیتا تھا سیاہی کے چند نقوش میں وہ خوف و ہراس، موت و ہلاکت، ذلت و رسوائی کی بھیانک تصاویر ناچتی دیکھ رہی تھی، اُسکے خاوند نے کڑک کر کہا "بتاؤ اس میں کتنی صداقت ہے؟"

"جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے"۔

وہ مجروح سانپ کی سی تیزی کے ساتھ اُٹھا اور اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم جان ہو کر گر پڑا، اُسکے جسم کے ایک ایک مسام سے پسینہ بہہ رہا تھا، اُس کی بیوی نے ساس سے پوچھے بغیر برقعہ اوڑھا اور کرایہ کی گاڑی میں سوار ہو کر میکے چلی گئی، وہ اب اپنے خاوند کے مکان میں رہ کر اُس کی حریت و تقدیس کو زیادہ داغدار نہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کھیل ختم ہو چکا اور اب اس چاردیواری میں رہنا اُس کے لئے مداخلتِ بیجا سے کم نہ تھا۔

جب مرگ آور یاس کی غنودگی اُس کے حواس سے اتر گئی تو وہ اٹھا۔ قلم اور کاغذ سنبھال کر اُس نے خط لکھنا [illegible]

"ممتازی! میں تم میں سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ ویسی ہی شدید و بے پایاں جیسی اُس وقت کرتا تھا، جب تم دُلہن بن کر نئی نئی اس مکان پر آئیں تھیں۔ تمہاری الفت سے میں سرشار رہا ہوں۔ درمیانی وقفہ میں بھی جسے تم میری غفلت و بے اعتنائی پر محمول کرو گی، تمہاری محبت بدستور میرے قلب کی گوشہ گیر رہی ہے میں تم کو انسان سمجھتا ہوں، ایسا ہی انسان جیسا میں خود ہوں جس طرح میں اپنے اندر فرشتہ بننے کی اہلیت نہیں پاتا، اسی طرح میں تم سے بھی فوق البشر ہونے کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ جو کچھ تم نے کیا وہ ہر انسان سے ہو سکتا ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں زندہ رہا تو میری محبت مرجائے گی۔ میرے سامنے ایک طرف نفرت و انتقام کی زندگی ہے اور دوسری طرف محبت سے مخمور موت، مجھے ان میں سے ایک چیز انتخاب کرنا ہے۔ یقیناً میرا ہاتھ مؤخر الذکر کی طرف بڑھے گا۔ گلِ نوشگفتہ کو اُس کی رعنائی و زیبائی کے عالمِ شباب میں ٹہنی سے توڑ لینا زیادہ اچھا ہے، بہ نسبت اس کے کہ اس کی طبعی موت کا انتظار کیا جائے جب موسم کی تندی سے کُملا کر، آفتاب کی حدت سے سوکھ کر اس کی پتیاں ایک ایک کر کے باغ کی روش پر گر کر خاک میں ملجائیں۔ میرا چھ گولی کا پستول میرے سامنے رکھا ہے۔ یہ خط جو میں نہائت سرعت سے ختم کر رہا ہوں تمہیں اُس وقت پہنچے گا۔ جب پستول کی گولی میری کنپٹی کے پار ہو چکی ہوگی"۔

اس کی بیوی نے گھر پہنچنے سے پہلے پہلے مستقبل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گھر پہنچ کر اپنی غیر متوقع آمد کا کوئی قابل قبول عذر پیش کرنے کے بعد سب سے پہلے اُس نے ذیل کا خط خاوند کے نام سپردِ قلم کیا:۔

"پیارے۔ گناہ ہر حال میں گناہ، جرم ہر حال میں جرم، اور عیب ہر حال میں عیب ہے۔ گناہ کی کوئی تاویل، جرم کی کوئی صفائی اور عیب کی وجہ جواز پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ مت سمجھو کہ میں اپنی برأت کے لئے کچھ کہنا چاہتی ہوں گناہ کبھی صاف نہیں کیا جا سکتا، اُس کے مسموم اثرات روح و جسم پر ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ میں ایک عذر بھی پیش کر کے گناہ کی سفاکی کو زیادہ گھناؤنا نہیں بنانا چاہتی۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم، نازک و خوش فہم شخص نفس انسانی کے ایک خاص پہلو سے آگاہ ہو جاؤ۔ آہ میں کس بے تکلفی سے تم کو وہ باتیں لکھ رہی ہوں جو ایک بدترین عورت بھی کسی مرد کے سامنے کہنا گوارا نہ کرے گی۔

میری ماں کا ابتدا سے یہی ارادہ تھا کہ وہ مجھے اپنے خاندان میں بیاہیں گی۔ **اشفاق**، اُن کے

دور کے قرابت داروں میں تھا، اور ہمارے ہاں اکثر آیا کرتا تھا۔ کھاتے پیتے والدین کا اکلوتا بیٹا، شکل وصورت کے لحاظ سے بہت اچھا، پھر پڑھا لکھا، گویا میری ماں کے معیار پر پورا اُترتا تھا۔ گھر کے اندر میرا اس کے ساتھ نام لیا جانے لگا، مجھے بھی اس سے انس پیدا ہو چلا تھا، اور ایسا ہونا ہماری معاشرت میں چنداں تعجب انگیز نہیں۔ ابھی باقاعدہ منگائی کی نوبت نہ آئی تھی کہ تم ایک ساحر، ایک جادوگر کی طرح کے بازوؤں پر سوار میرے افق حیات پر نمودار ہوئے اور مجھ سے صبر وشکیب، تاب وتواں سب کچھ چھین کر لے گئے۔ میری راتیں تمہاری یاد سے رنگین اور میرے دن تمہارے خیال سے روشن رہنے لگے۔ حتیٰ کہ میں تمہارے پاس آئی، اور محبت کے دائرہ کو ہویدائی نے کچھ عرصہ کے لئے ہماری متحدہ زندگی کو ایک طویل غنچی میں تبدیل کر دیا۔ پیارے، عورت کا خمیر ہی محبت سے ہوا ہے، وہ ضرور محبت کرنے اور محبت کئے جانے کے لئے تخلیق کی گئی ہے وہ عیش ومسرت کے انتہائی مقام پر اُس وقت پہنچتی ہے جب وہ سعی محبت میں کامیاب ہو، لاریب تم نے مجھ سے اتنی محبت کی کہ شائد ہی کوئی مرد کسی عورت سے کرے گا۔ لیکن وہ بھادوں کی بارش کی مانند تھی کہ ابھی مطلع صاف تھا اور ابھی بادل چھاگیا اور پھر فوراً ہی برس کر کھل گیا۔ تم اس خواب شیریں سے جلد جاگ اُٹھے اور میں نادانی سے یہ سمجھتی کہ ابھی صبح کاذب ہے، تمکو تمہاری محبوب لائبریری اور ریسرچ زبردستی مجھ سے جدا کر کے لے گئے۔ اور میں یاد ایام کی حسرت کو دل کے ایک کونے میں چھپا کر بے صبری سے تمہارا انتظار کرنے لگی۔ گرمی گذر گئی لیکن تم نہ آئے، برسات ختم ہوگئی نہ آئے، جاڑا سارے کا سارا بیت گیا مگر میری آنکھیں تمہاری دید سے محروم رہیں۔ آہ تم نے عواقب سے بیخوف ہو کر ایک کمزور عورت کو جذبات کی ہولناک آزمائش میں ڈال دیا اور پھر خبر نہ لی۔ تم نہیں جانتے عورت جام محبت سے ایک گھونٹ پی کر پیالہ کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتی۔ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ ناکام محبت عورت کی زندگی میں کیسے کیسے ابتلا انگیز اوقات آتے ہیں، اس شخص کی طرف سے جو کسی زمانہ میں میرا خواستگار رہ چکا تھا، اور جس نے اپنی درخواست منتشر ہوجانے پر ہم دونوں سے انتقام لینے کی خاموش قسم کھا رکھی تھی، مجھے غیر محسوس طریقہ سے یقین دلایا جانے لگا کہ تم مجھے فراموش کر چکے ہو۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میرا دل کمزور تھا۔ لیکن تم اُسے قوی بنا سکتے تھے، تمہاری بے رخی نے تمہیں ایک خط تک لکھنے کی بھی اجازت نہ دی۔ میں تمہاری تحریر

دیکھنے کو بیتاب تھی، مجھے یقین تھا کہ تمہارے خط میں وہی جادو ہوگا جو تمہاری آنکھوں میں جلوہ فگن ہے تمہارے الفاظ میں وہی قیامت زا گرمی ہوگی جو تمہارے مضبوط بازووں میں ہے۔ لیکن مابعدالطبعیات اور علم النفس کے مسائل حل کرنے میں منہمک رہے، آہ تم نے جو نفسیات کے عالم ہو یہ نہ سوچا کہ جوان عورت داعیات شباب کو کتنی جلدی لبیک کہتی ہے؟

بس پیارے اب مجھے معاف کرو۔ میں تمہیں ناگفتنی باتیں لکھتی چلی جارہی ہوں۔ وہ شخص ہر لمحہ میرے قریب آتا گیا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ تم اس کے اندر حلول کر گئے ہو، وہ ہر روز تمہارے متعلق جھوٹے قصے گھڑ گھڑ کے سناتا رہا، اُس نے مجھے بتایا کہ تم کسی مغرب نژاد لڑکی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو چکے ہو، آخری خبر نے میرا کاسہ صبر لبریز کردیا، اور آہ تم نہیں جانتے ہم عورتیں اس معاملہ میں کتنی ذکی الحس واقع ہوئی ہیں، اُس شخص کو ہم دونوں سے انتقام لینا تھا، اور اب خود میری مجروح توقعات تم سے انتقام لینے پر مچل رہی تھیں میں ایک مدت تک رضا و رغبت کے خلاف، تحریص و ترغیب کے خلاف، جذبات بشری و تقاضات جنسی کے خلاف شدت سے جنگ کرتی رہی، لیکن نفس کا سیلاب عظیم اٹھا، اور میری بودی کوششیں خس و خاشاک کی طرح بہ نکلیں*

جس طرح تم پُرانا پھٹا ہوا جوتا بے پرواہی سے اتار کر پھینک دیتے ہو ہللہ مجھے بھی ایک حقیر شئے سمجھ کر پھینک دو۔ اور بھول جاؤ۔ آہ میں تمہارے لائق نہ تھی۔ میری حد پرواز بہت ہی مختصر نکلی۔ میں زندہ رہکر تمہاری وسیع و بسیط شہرت کے پاکیزہ دامن کو داغدار کرنا نہیں چاہتی۔ زہر ہلاہل کی شیشی جس کے چند قطرے میرا قصہ پاک کردیں گے بائیں ہاتھ سے اُٹھا چکی ہوں اور تم سے آخری التجا یہی ہے کہ مجھے ہمیشہ کے لئے بھُول جاؤ"*

عاشق بٹالوی (بی اے)

ایک نظر دیکھ کر....؟

آہ وہ ایک لمحہ رنگین جس پر سیکڑوں برس نثار، وہ ایک وقفہ زرین جس پر عمر طبیعی قربان، وہ ایک ساعت سیمین جس پر ماضی حال و مستقبل سب کچھ فدا !!!!!!!!!!!!!! تو برق تبسم سے خرمن صبر و شکیب کو جلاتی، آنکھوں کی مسکراہٹ سے متاع ہوش وخرد کو تباہ و برباد کرتی، اور بے پرواہ قدموں کی ٹھوکروں سے سوتے فتنوں کو جگاتی یکایک یوں نمودار ہوئی جیسے کالی گھٹا سے چاند نکل آئے۔ پھر دفعتہً اس خروش دلخراش سے گھبرا کر تو نے آنچل کو سمیٹا، عرق انفعال سے بھیگے ہوئے چہرہ کی درخشانی کو، وہ درخشانی جس کے سامنے آفتاب و ماہتاب بھی خجل ہوں، نقاب کی آڑ میں چھپا لیا، اور سمٹ سمٹا کر ایک طرف کو ہو گئی، آہ

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے

تیرے لئے اس چشم زدن میں ختم ہو جانے والے واقعہ کی بڑی سے بڑی اہمیت یہی ہو سکتی ہے کہ ایک اجنبی کی گستاخ نظر تیرے حسن محجوب پر پڑ گئی اور تو تو شائد اس اضطراری کیفیت کو اپنی دائمی اضطرار انگیز زندگی کی بھول بھلیاں میں فراموش بھی کر چکی ہو گی۔ مگر میں تمناؤں کے اُس محشرستان، آرزوؤں کے اتھاہ سمندر اور افکار کے قلزم بیکران سے کیوں کر نکلوں جسے تیری ایک نگاہ میرے سینہ میں ہمیشہ کے لئے موجزن کر گئی۔ تیری عشق پرور آنکھوں کی بے پناہ جنبش میرے حواس پر ایک مستقل لرزش بن کر مسلط ہو چکی ہے، تیرا ندامت سے بھیگا ہوا چہرہ یعنی گلاب کا پھول جس کا حسن شبنم سے زیادہ دمک اٹھا تھا میری نظروں کو ایسے منظر سے دوچار کر گیا ہے کہ اب دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو رہی ہے۔ تیری لانبی لانبی گھنی پلکوں اور زہد شکن ابروؤں کے اندر سے نکلا ہوا تیر اس شدت سے جگر میں پیوست ہو چکا ہے کہ میں ڈرتا ہوں اُسے نکالنے کی کوشش میں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائیگا، اور آہ سب سے بڑھکر تیرا خرام ناز، تیری الھڑ چال، تیرے بے پرواہ قدم جن سے پامال ہونے کا جنون مجھے دیوانہ بنا رہا ہے +

شائد یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔ بھلا میری ملول و افسردہ زندگی ایسی تابناک و روشن حقیقت کی کیوں کر متحمل ہو سکتی تھی؟ ایک رنگین تیتری کی طرح جسے موسم نے اپنے بہترین الوان سونپ دیئے ہوں، دوشیزہ بہار کی مانند جس کے بدن سے حسن و موسیقی کے چشمے پھوٹ رہے ہوں، تو دور بہت دور، افق کے پار سے سرد و معطر ہواؤں پر سوار آئی اور میری خواب کی دنیا تیرے پرتو حسن سے جگمگا اُٹھی

خدا نہ کرے کہ میری زندگی ان نورانی خوابوں سے محروم ہو جائے +

(ع)

علی گڈھ تک

(از۔ ملاّ رموزی)

وہ جو کہا ہے کہ "ملاّ کی دَوڑ علی گڈھ تک" سو اِس مثال کے تحت دنیا بھر کے لاکھوں مولٰنا احسن مارہرویوں میں یہ علیگڈھ کالج کے مولٰنا احسن مارہروی بھی بس ایک ہی مارہروی ہیں، جو ماہ نومبر سے اچانک دو طرح کی جد و جہد میں مصروف ہو جاتے ہیں ایک یہ چاہے۔ نائی کی منڈوی کے شاعر اعظم آپ کے درِ دولت پر جا کر آپ کے صاحبزادوں سے اپنے منہ سے مانگ کر چائے پی لیں اور پھر جو مشاعرہ سے گھر جائیں تو الٹی مولٰنا ممدوح کی مخالفت کریں۔ لیکن مولٰنا کی کوشش یہ کہ کالج میں مشاعرہ ضرور ہو۔ دوسری یہ کہ ملاّ رموزی جس حال میں بھی ہوں لیکن مشاعرہ کے وقت اگر وہ کھانا اپنے گھر کھائیں تو پانی کالج کے مشاعرہ ہی میں جا کر پئیں، اور وہ بھی پروفیسر کوری مدظلہ کے گلاس سے ◆

اِدھر علم دوست اور ادب نواز نواب زادہ گرامی منزلت کپتان محمد رشید الظفر خان بہادر بالقابہ کی اَدب دوستی کا یہ اہتمام کہ علیگڈھ کالج کی روائتی اَدب نوازیاں بڑھ جائیں لیکن کم نہ ہوں۔ پس ایسے حالات میں کہ مشاعرہ کے "منصرم ونگل" تو ہوں مولٰنا احسن مارہروی، ایسے شہرۂ آفاق ادیب۔ اور شرکت کے لئے بلانے والے ہوں نواب زادہ رشید الظفر خان بہادر ایسے جلیل القدر میزبان تو پھر ہم تو کیا وہ انگلستان کے خواہ مخواہ کے مشہور میاں برنارڈ شا تک ہال گاڑی میں بیٹھ کر علیگڈھ نہ پہنچ جائیں تو کیا کریں؟ ایسے اوقات میں اس حکومت کا خدا ہی مسبب الاسباب ہوتا ہے جس کا وزیر مالیات "ننھے میاں کی والدہ" ہوں۔ تذکرہ سنتے ہی مہینہ بھر کا بجٹ یوں پیش کر دیتی ہیں کہ

یہ ۷۵ روپیہ تو گیہوں والے کے

اور یہ پچیس قاسم خان درزی کے

اور وہ جو اُس مہینے میں پندرہ روپیہ اپنے کسی دفتر کے آدمی سے لائے تھے یہ پندرہ اُس کے

اور یہ انتیس گیارہ آنے سیٹھ ذاکر حسین چوک والے کے

بس اب یہ مہینے کے پورے اکتیس دن ہیں اور "یہ کلّھم پندرہ روپٹی" اب چاہے آپ ان سے علیگڈھ کا سفر کر لیں یا مہینہ بھر کی ضروریات کا بند و بست۔

اس قسم کے سجبٹ پر ہماری گورمنٹ کی رائے بس یوں ہوتی ہے کہ "اچھا تو لو علیگڈھ کون مردود جاتا ہے" یا پھر کیہ سیدھے سیٹھ جمنا لال اچھا ور والے کے پاس گئے اور جتنا چاہا قرض روپیہ لے کر علیگڈھ چلے یا کئے "تشریف ہو آئے" اور جب تنخواہ ملی تو سیدھے سیٹھ جمنا لال کا قرض ادا کر کے گھر گئے اور **ان** کے سامنے باقی کے سو روپیہ ٹپک کر کہدیا کہ" یہ کلھم اتنی تنخواہ ہی ملی ہے ۔ اب چاہے اس میں مہینہ بھر کا بندولبست کر لو یا ضروریات، اس وقت **وہ** یا دانت پیس کر رہ جاتی ہیں، یا ذرا سا چہرہ خراب کر کے جا بیٹھتی ہیں کسی کمرہ میں مگر ہم ہر حال میں سفر کرتے ہیں ٭

ہندوستانی خواہ کسی درجہ تک انگریزی پڑھے ہوئے ہوں اس بات سے بڑے خوش ہوتے ہیں کہ کسی طویل سفر میں ان کے ہمراہ دس بارہ نہ سہی تو ایک دوست ضرور ہو جو راستہ بھر اُن سے فضولیات پر باتیں کرتا جائے ، یا اگر وہ سو جائیں تو اُن کے بستر اور صندوق کی حفاظت کرتا رہے، یا اگر ہو سکے تو خود ریل ہی میں بیٹھے رہیں یا لیٹے رہیں اور ان کا ساتھی دوڑ کر اسٹیشن سے پانی سے لوٹا بھر لائے اور پوریاں خرید لائے ۔ مگر یہ نہیں کرتے کہ طویل سفر کو کتابوں اور اخباروں کے مطالعہ سے کارآمد بنالیں ، بس خواجہ حسن نظامی نیازمند مولوی انجمن ترقی اُردو عبدالحق صاحب مدظلہ العالی اور مُلّا رموزی جب سفر کرتے ہیں، تو تمام راستہ مضمون نگاری فرماتے جاتے ہیں، اور خدا جانے یہ ریل چلنے میں بجائے غنودگی کے مضامین کی آمد کیوں ہوتی ہے؟ اس لئے مُلّا رموزی ہمیشہ سفر میں ہمراہی سے گھبرا نے ہیں اور تنہائی سے خوش ہوتے ہیں، دوستوں کو معلوم ہے کہ مُلّا رموزی روزانہ کتنا لکھتے ہیں، اور اسی سے اُن کی صحت اب کس درجہ خراب ہو چکی ہے ؟ اس لئے ریل کے تھرڈ کلاس میں صفر اس لئے مصیبت ہو گیا ہے کہ اس کی موٹی موٹی لکڑیوں پر اگر دو لحاف بچھا کر بھی بیٹھتے ہیں تو بیٹھا نہیں جاتا - اور لیٹتے ہیں تو تھرڈ کلاس کے مسافروں کے اپنے اوپر سوار ہو جانے کا اندیشہ ڈراتا ہے ، پھر ان سب پر یہ" تھرڈ کلاسی کسانوں کی چلتی ریل میں" چلم نوشی" جس درجہ دماغ سوز بلا ہے ، اس سے نہ پولیس بچا سکتی نہ ریل کی زنجیر کھینچ لینا کام آتا ہے ٭

فضیلت دستگاہ ، فضائل مآب حضرت مولٰنا محمود علی خان قبلہ مدظلہ ، مولوی ، فاضل ، عربی زبان ، اور علوم متداولہ کے وہ جلیل القدر فاضل اور متبحر عالم دین بزرگ ہیں ۔ جن کی فضیلت اور روشن خیالی ایک نظیر ہے ، ان لوگوں کیلئے جو بلحاظ بصیرت اور روشن خیال دیو بند میں سارے علوم چاٹ جانے پر بھی تاریک خیالی اور بے علمی کے مراد آبادی بنے پھرتے ہیں پھر یہی نہیں بلکہ ، اُردو ، فارسی ، عربی ، انگریزی ، ترکی ، اور پشتو ، زبان میں یہہ درخور کہ اگر ممدوح کو ہندوستان میں "زبانوں کی جمعیتہ الاقوام" کہا جائے تو غلط نہیں ، پھر اس پر ندرت خیال ، جودت طبع ، اور فکری لطافت کے بدرجۂ کمال مالک ، مولٰنا نیاز فتحپوری کے سابق معاون ایڈیٹر اور حال مقیم علیگڈھ ہیں ، ہمارے آپکے تعلقات اُس زمانے سے ہیں

جب گھروں میں یہ امریکہ کی لالٹین جلانا دولتمندی اور امیر آدمی ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی، ممدوح محترم سے ہمیں شاگرد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، لیکن مُلّا رموزی قسم کے شاگرد ہیں، اِس لئے بھی اور اُس لئے بھی کہ قبلہ سے وحدتِ خیال کی متعدد نسبتیں حاصل ہیں، ہم ذرا گستاخ بھی ہیں۔ اور قبلہ شاگرد نواز بھی، تنقید اور نکتہ چینی میں ہم جس درجہ "خورد بین" واقع ہوئے ہیں۔ قبلہ مکرم ہم سے بھی سہ چند زیادہ "مہین بین" ثابت ہو چکے ہیں، اِسلئے علی گڑھ کے سفر میں جو ساتھ ہوگیا تو گھر پر ہی ایک "دِل ہلا دینے والی تقریر" میں سمجھا دیا کہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا اقتصادی نقطۂ نظر سے جب بناہ کن ثابت ہوچکا ہے تو پھر تم بھی میرے ساتھ "تھرڈ کلاس" میں چلنا، یہ سنتے ہی ہم نے سمجھ لیا کہ بس اب، ریل میں ہوچکی مضمون نگاری!

اسٹیشن پر معلوم ہؤا کہ مولوی صاحب قبلہ سفری ساز و سامان کے حساب سے "خاصے مہاجر ہندی" بنے ہوئے ہیں یعنی آپ کے ساتھ صرف "چارپائی" اور "آٹا چکی" تو نہیں تھی، باقی کے تمام معاشی اور معاشرتی اوزار موجود تھے، یعنی چائے کی پیالیاں، چائے کا دُودھ، چائے کی شکر، چائے پکانے کا چوطھا، اور چوطھا جلانے کے لئے ایک بوتل میں تیل بھی، اور ایک کپڑے میں کوئلہ بھی، ہم حیران رہ گئے جب دیکھا کہ سی، آئی، ڈی کے ایک افسر نے بھی قبلہ سے یہ نہ کہا کہ حضرت سلامت جب آپ اپنے ساتھ ریل میں یہ "بھک سے اُڑ جانے والا مادہ" لے جا رہے ہیں، تو بیچارے مُلّا رموزی کو کسی دوسرے ڈبے میں کیوں نہیں بٹھا دیتے، پھر اِن تمام خوردنی اور نوشیدنی اشیاء پر ممدوح کی وہ کوئی تین سیر وزن کی "ایلومونیم کی دھات" طرفہ مصیبت تھی جسے عام طور پر "ناشتہ دان" یا "طعام گھر" کہا جاتا ہے، اور جو آگے بڑھیئے تو ایک عدد "بٹیری نوش ڈرائیور" اور ایک عدد دو ڈھائی فٹے طول عمرہ بھی ہمراہ تھے۔ جو علیگڈھ کے اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔

ہمارے اور قبلہ مکرم کے جو چند بزرگ کہیں افغانستان میں پیدا ہو گئے تھے تو ہمارے اور ممدوح کے درمیان "لسانی اشتراک" عرف پشتو زبان میں۔ گفتگو کرنے کی تمام آسانیاں بھی حاصل ہیں۔ اس لئے جب تفریح کو جی چاہتا تھا تو پاس والے مسافروں کے خلاف ہم دونوں پشتو زبان میں قتل عمد، اقدام عمل، اغوا، استحصال بالجبر، مداخلت بیجا بریل بوقت خواب، بحالت خرّاٹا، بامداد مولوی صاحب ہر قسم کی سازش گرگزرتے تھے۔ اور بیچارے ہندی مسافر ہم دونوں کا منہ دیکھا کرتے جاتے تھے، البتہ پشتو کی گفتگو کا جو حصّہ ہندوستانیوں کی بُرائی سے آراستہ ہوتا تھا وہ سب سے زیادہ پُرلطف ہوتا تھا، ایک مرتبہ تو طالب علم کے گارڈ سے پشتو میں یہ کہہ دیا کہ اب یہ دیکھتا کیا ہے۔ ہم دونوں کچّے انارکسٹ

ہیں اور یہ دیکھ یہ تیری ریل کو "بھک سے اُڑا دینے کا تمام باغیانہ مادہ" اپنے ہمراہ لئے جارہے ہیں" گارڈ صاحب نے اس کا جواب یہ دیا کہ "ابھی جاتی ہے" گویا وہ سمجھے کہ ان سے دریافت کر رہے ہیں کہ "ریل کب جائیگی" پھر اس پر یہ "ریلیاتی دعوے" ہیں کہ ریلوں کا انتظام عمدہ ہے اور تمام گارڈ امتحان دے کر ملازم ہوتے ہیں (یہاں لفظ ریلیاتی) آج کل کے ادیبوں کے لفظ "جمالیاتی" کا نعم البدل ہے) +

وہ جو قبلہ مکرم کے ہمراہ ڈہائی سیر وزن کی ایلومونیم دہات عرف ناشتہ دان تھا یا تھی اس سے قبلہ یا بیرکے تن و توش کا اندازہ تو ہوگیا ہوگا اب یہ کلیہ اور معلوم کر لیجیئے کہ عربی زبان کے طلباء جمعہ کی شب کو محلے کی دعوت میں کھا نا معمول سے سوا کھاتے ہیں لیکن ہمارے قبلہ کو چونکہ جمعہ کی شب اکثر ریل میں پڑتی ہے اسلئے قبلہ نے اس طعام گھر کو کھانے سے یوں لبریز فرمالیا تھا گویا اسکے بعد قبلہ کو عمر بھر کھانا نصیب ہی نہ ہوگا یا نصیب ہوگا تو وہ کھانہ سکینگے یا کھاسکیں گے تو ہضم نہ فرماسکیں گے یا ہضم فرمائینگے تو "خون صالح" پیدا نہ ہوگا۔ یا "خون صالح" پیدا ہو بھی جائیگا تو زیادہ حصہ بلغم بن جائے گا، اور جب بلغم بن جائیگا تو کھانسی کا پیدا ہونا یقینی ہوجائیگا، اور جب کھانسی اپنی حدود سے گذر جائیگی تو پھر خدا جانے کیا ہوجائیگا؟ اِس لئے آپ نے ریل کے چلتے ہی اس طعام گھر کو جنبش دی تو "طولعمرہٗ" بھی آ بیٹھے سامنے اور کوئی نصف گھنٹہ سے بھی زیادہ دیر تک، خدا جانے کیوں [illegible] صاف اور تیز تیز گفتگو نہ فرماسکے، اب اس وقت یہ فرق کرنا مشکل تھا کہ قبلہ نے کھانے میں کمی نہ کی یا طولعمرہ نے الغیۃ پیکھتے رہے کہ سے دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی "

دنیا جانتی ہے کہ شب کا کھانا کھاکر آدمی سویا کرتے ہیں، لیکن یہاں کھانے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میلاد شریف کی مجلس منعقد ہونے والی ہے۔ بڑی شان سے قبلہ نے پان نکالنے بنائے گئے اور کھائے گئے اور فوراً یہ بھی فرمادیا کہ :۔

دیکھو ملا سونا نہیں ہیں رات بھر نہیں چاء پلاتا رہوں گا اور ہم تم صبح تک جاگتے رہیں گے دیکھتے نہیں ہو کہ میرے ساتھ سرکاری سامان ہے آنکھ بند ہوئی کہ بس غائب ہی سمجھو"

اس پر ہم نے عرض کیا کہ اچھا ہی ہؤا کہ آج جناب حکومت برطانیہ کے وزیر خزانہ نہ ہوئے، ورنہ آپ تو سارے خزانہ کی تنجیاں انگلش لے کر عمر بھر جاگتے ہی رہتے کیونکہ ایک حکومت کے خزانہ کی حفاظت سرکاری سامان سے یقیناً زیادہ ضروری ہوتی ہے یہ کہا اور جہاں مسافر پاؤں لٹکا کر بیٹھتے ہیں، وہاں ہم جو بستر جما کر سوئے تو بس اتنا تو یاد ہے کہ ہمارے اوپر کے [illegible] "پر سونے والے ڈرائیور صاحب کی بیڑی کی آگ تو کبھی کبھی ہمارے سر اور بستر پر گرجاتی تھی، مگر قبلہ کرم کے متعلق [illegible] ہوئی کہ کیا ہؤا، البتہ کوئی پندرہ بجے شب کو ہماری کوئی ایک آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں، کہ قبلہ کہ یہ اور [illegible]

طولعمرہٗ بیٹھے یوں چائے پی رہے ہیں گویا رات کے تین بجے چلتی ریل میں چاء پکا کر پی لینا کوئی بات ہی نہیں۔ تب ہمیں یقین آیا کہ اور نہیں تو کم از کم ریل کے سفر میں اولاد واقعی بڑی نعمت ہے، نور کے تڑکے ریل آگرہ سے آگے بڑھی، اور ہمیں معاً خیال آیا کہ اب ریل اکبرآباد کے اُن مقامات سے گزرے گی جہاں سے شاہانِ اسلام اور حضرت غالب کے وطن کی تمام تاریخی علمی اور ادبی یادگاریں نظروں کو علم و عبرت کا ایک مؤثر نظارہ پیش کرتی ہیں۔ لیکن وائے اکبرآباد کہ ریل کا چلنا تھا کہ کوئی تین میل تک ریل کے آس پاس سیکڑوں اکبرآبادی مرد اور عورتیں قدم قدم پر پانی سے بھرے لوٹے سامنے رکھے اس اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے گویا ریل کے مسافر اُنہیں دیکھ ہی نہیں رہے، بس بےحیائی اور بےشرمی کے اِس اکبرآبادی منظر کو دیکھتے ہی ہم نے قبلہ مکرم کو اس "جلوۂ صبحگاہی" پر جو متوجہ کیا تو قبلہ نے فی البدیھ فرمایا کہ یہ ایسی کونسی حیرت کی بات ہے آخر کو یہ سب کے حضرت سیماب اکبرآبادی ہی کے ہم وطن ہیں اس لئے ہم دیر تک حضرت سیماب کے اخلاقی حالات پر غور کرتے رہے کہ شہر متھرا آگیا۔

یہاں سے قبلہ مکرم کی ایک "مالی تجویز" یُوں منظور ہو چکی تھی کہ متھرا سے موٹر لاری کے ذریعہ علی گڑھ جانا روپیہ کیلئے بھی مفید ہے اور راستہ کے فصل کے لئے بھی تو ہم نے اس تجویز سے اِس لئے اتفاق کیا کہ موٹر لاری کے ذریعہ اوّل تو ہندوستانیوں کی "انتظامی صلاحیت" کا اندازہ کرلیں گے دوسرے یو، پی، کے دیہات کے ان لوگوں کے آبائی گھر بھی دیکھتے جائیں گے جو کہیں کے افسر ہو کر اپنے ماتحت ملازموں پر اپنے اس دیہاتی وطن کا رعب ڈالا کرتے ہیں اور حال یہ کہ یو، پی کے گانوں اور قصبات میں درختوں کے سایہ میں دھوتی باندھے پڑے فاختہ اڑایا کرتے ہیں تیسرے یہ کہ موٹر لاری کے ذریعہ دیہاتی راستوں سے چل کر یہ اندازہ بھی کرلیں گے کہ اگر کبھی ہندوستانی جمہوریت کے عہد میں وزارت جنگ کی طرف سے ہمیں علی گڑھ پر حملہ کے لئے حکم ملا تو کن راستوں سے فوجوں کو بڑھانا آسان ہوگا؟ مگر خدا سمجھے اِن انگریز بھائیوں سے کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو اپنے تمدن سے اس درجہ آرام طلب اور عیش پسند بنا دیا ہے کہ جہاں جفاکشی اور محنت کا موقع آیا اور جمائیاں آنا شروع ہوگئیں۔ چنانچہ متھرا سے اُتر کر جب اسٹیشن کے باہر "تانگوں کے اڈے" پر پہونچے تو مارے تعفن اور بدبو کے بُرا حال تھا، حالانکہ میونسپلٹی کا اصل معاملہ انگریزوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اور کہنے کو میونسپلٹی میں ہندوستانی بھر دیئے جاتے ہیں، یہاں سے موٹر کے اڈے تک ایک چھوڑ دو عدد ٹٹو کی جو بند بگھی خریدی اُس کی مضبوطی، صفائی، گنجائش اور تیز رفتاری کو اگر یہ ویسٹ منسٹر ہاؤس میں ٹھیرنے والے "پارلیمنٹی ممبر" کمانڈر کنورتھی دیکھ لیتے، تب ہم جانتے کہ وہ ہندوستان کی سیاحت کرکے گئے ہیں، اماں ہر قدم پر خیال ہوتا تھا کہ بگھی کے چھت پر رکھے ہوئے صندوق بس یہ گرے ہمارے سر پر یا قبلہ مکرم کے سر پر، اب جو

موٹر لاریوں کے اڈّے پر پہنچے تو لاریوں کے مالکوں نے ہمیں یُوں ہاتھوں ہاتھ لیا گویا دنیا میں سب سے پہلے موٹر میں سفر کرنے والے بس ہم دو نوں ہی ہیں۔ طے پاگیا کہ موٹر کی اوپر والی چھت پر تو صندوق اور بستر ے اور نیچے کی سیٹ پر مُلّا رموزی اور قبلۂ مکرم یہاں سے قبلہ مکرم کو جو تفریح سوجھی تو متھرا کا شہر دکھانے چلے بھی تو کسے کہ مُلّا رموزی کو' بس پھر کیا تھا تمام متھرا تھا، اور ہماری تنقیدیں، اعتراضات طعن، پھبتیاں اور گالیاں، امان غضب خدا کا کوئی چھ میل لمبی سڑک طے کرگئے، مگر قسم کھانے کو بھی ایک صاف سے کپڑوں کا مسلمان نظر نہ آیا، بس نظر آیا تو کیا کہ موٹی موٹی گائیں اور ننگے ننگے ہندو بھائی، یا پھر حلوائیوں کی دکانوں پر مکھیاں ملے ہوئے متھرا کے پیڑے، دیواروں سے سر پھوڑ لیا مگر زبان اُردو کا اخبار تو اخبار وہ "پیسہ اخبار" بھی نہ ملا پر نہ ملا۔ . . . . . .

موٹر لاری کی روانگی کا وقت تھا پہلے تو ٹھیک دس بجے، شب شہر سے واپس آئے تو معلوم ہوُا کہ ساڑھے دس بجے، اور جب لاری روانہ ہوئی تو اُس وقت بج رہے تھے ٹھیک ساڑھے گیارہ، پھر بھی لارڈ برکن ہیڈ کہتے ہیں کہ ہندوستانی سوراج کے قابل نہیں، اتفاق کہ لاری روانہ ہونے سے چند منٹ پہلے قبلہ مکرم کو خیال آیا کہ چلتے چلتے ایک مرتبہ کھانے کو پھر آزما لیا جائے اِس لئے لاری کے اندر ہی ہم لوگوں کا "مولی مِلا ہوُا لنچ" شروع ہوگیا، یہاں ہمارے ننھے میاں کی والدہ کے سفری سلیقہ کا یُوں تجربہ ہوُا کہ انہوں نے ہمارے راستہ کے لئے جو کھانا ایک رومال میں لپیٹ کر صندوق میں بند فرما دیا تھا وہ اُس وقت "ریلوے مال گودام کا نیلام شدہ پارسل" بن چکا تھا جس پر قبلہ مکرم نے سیر ہو کر آوازے کسنے اور اپنے کھانے کی خوب خوب تعریفیں فرمائیں ۔ مگر ممدوح نے ایک جگہ یہ بھی نہ سوچا کہ ہماری تنخواہ کتنی ہے اور ان کی کتنی ہ؟ موٹر روانہ ہوُا، اور بیچ بازار میں بغیر کسی اعلان اور اطلاع کے رُک گیا۔ ہم سمجھے کہ بغیر سگنل کا اسٹیشن آگیا، مگر دریافت پر معلوم ہوُا کہ "داروغہ جی" بھی چل رہے ہیں۔ اُن کے لئے موٹر روکا گیا ہے۔ واضح ہو کہ وسطی ہند میں تو پولیس کا ہیڈ کانسٹبل ہیڈ کانسٹبل ہی ہوتا ہے، مگر یو، پی، میں داروغہ جی اس شخص کو کہتے ہیں جس کا رعب اَور دبدبہ "نصف چہرۂ شاہی" کے برابر ہوتا ہے، اگرچہ اُس وقت ہم لوگوں کا مارے دُھوپ کے لاری میں بُرا حال ہو رہا تھا مگر داروغہ جی کے سوار ہو جانے سے پہلے کسے تاب کہ وہ لاری چلانے کا حکم دے سکے ؀

ہندوستانی غلامی اور ماتحتی کے طویل زمانے کے اثرات سے کچھ اس درجہ مغلوب و مرعوب ہو چکے ہیں کہ وہ اپنے سے ذرا بڑے آدمی کے لباس اور اخلاق کی نقل کو اپنی عقل و خرد کا قابلِ تعریف کارنامہ سمجھتے ہیں۔ اور چاہے اِس نقل سے اپنے باپ دادا کے اخلاق اور اپنی وطنی اور ملکی خصوصیات کی کیسی ہی توہین ہوتی ہو، مگر ہندوستانی اسے بڑے

فخر سے گوارا کرکے غیر ملکیوں کی نقالی اختیار کرلیتا ہے، اِس لئے اب جو، داروغہ جی، تشریف لائے تو آپ مزاج سے لے کر لباس تک میں انگریزوں کے "پس افگندہ" بنے ہوئے تھے، خیر سے یہ داروغہ جی متھرا کے نہیں تھے، بلکہ باہر سے آئے ہوئے تھے اِس کے سفری علامتیں نہائت نمایاں تھیں۔ باوجودیکہ جاڑا بہت شدید تھا، مگر آپ "فیشن" کے جوش میں بجائے "یماآستین" کے نیلے رنگ کا وہ کوٹ پہنے تھے جسے جاڑے کے زمانہ میں ہندوستانی غلام "شاہانہ باس" سمجھ کر پہنا کرتے ہیں۔ پاؤں میں گھٹنوں تک کا پاجامہ تھا، ہاتھ میں "گائے کی دُم کے برابر" بید کا ایک ٹکڑا تھا جسے داروغہ جی ہلاتے ہوئے آئے، گویا کہیں کے بڑے ہی فیلڈ مارشل ہیں جو ہم لوگوں کی کمانڈ کے لئے اس لاری پر سوار ہو رہے ہیں، اور بڑے شان سے آپ موٹر ڈرائیور کے برابر بیٹھ گئے، گویا لاری کے حساب سے اس وقت آپ "فرسٹ کلاس" کے مسافر تھے، اب لاری روانہ ہوئی، اب سوال یہ تھا کہ داروغہ جی سے مرعوب ہو تو کون؟ جب کہ بفضل خدا ہمارے قبلہ ٔکرم علم و فضل اور روشن خیالی کے ایسے سرمایہ دار کہ مُلا رموزی تک کے اُستاد اور مُلا رموزی وہ کہ لائڈ جارج تک کے مشہور اُستاد اس لئے سارا راستہ داروغہ جی کے وقار، رعب، دبدبے، اور اکڑ فون کو جس طرح خاک میں ملایا ہے، داروغہ جی کا دِل ہی جانتا ہوگا اور تو اور وہ موٹر لاری کا ڈرائیور جو مارے داروغہ جی کے ڈر کے دم بخود سا بیٹھا ہؤا تھا، ہماری اور قبلہ مکرم کی ترکیبوں سے داروغہ جی کے سامنے اتنا آزاد ہو گیا کہ راستہ بھر تو آلی کہتا رہا اور چلا چلا کر اُس نے وہ گانا سنا ہے کہ ساری لاری وجد کیف کا "مسدس حالی" بنی ہوئی تھی، بیچارے داروغہ جی بس بیٹھے شانے ہلاتے رہے مگر ندامت سے سر نہ اُٹھا سکے، کوئی دو گھنٹہ کے بعد داروغہ جی کی "اُترگاہ" آئی۔ یعنی جس تھانے پر آپ کو اُترنا تھا، وہ آگیا تو ہم لوگوں نے پہلے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہاں حضور داروغہ جی صاحب کا شاندار استقبال ہو کر رہے گا، دیکھا تو ایک میدان میں درختوں کے نیچے چند کرسیاں پڑی ہیں، دو تین سفید پوش بیٹھے ہیں، اور پہرہ دینے والا سپاہی کپڑے کے ایک تھان کو پھیلا پھیلا کر دیکھ رہا ہے، لاری ٹھہر گئی، مگر کسی نے دیکھا بھی نہیں کہ اتنا بڑا "زمینی ہوائی جہاز" کس جگہ ٹھیرا، اور اس سے کون شخص اترا، بیچارے داروغہ جی خود ہی اُترے اور کوٹ کے بٹن خواہ مخواہ کبھی لگاتے اور کبھی کھولتے ہوئے کرسیوں کے پاس پہونچے تو واللہ اس پہرہ والے سپاہی نے سلام تک نہیں کیا، اور یہ خود ہی ایک کرسی کھینچکر بیٹھ گئے، اور لاری کے اندر سے قبلہ مکرم نے مع تمام مسافرانِ لاری ایک فرمائشی قہقہہ ارسال خدمت کیا، اور لاری روانہ ہوگئی۔

ہندوستانیوں میں تعلیم کے فقدان اور صحیح تربیت کی کمی کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ وہ موقع بموقع تفریح کو بھی بھول گئے

اور بدتمیزی قرار دے کر ہر وقت خشکی اور خموشی کا "ٹام لوٹ" بنے رہتے ہیں، اِلّا وہ لوگ جنہیں فیاض فطرت نے سنجیدگی کے ساتھ ہی لطافت و ذکاوت کی دولت ارزانی فرمائی ہے، ایسے سفر میں اپنے وقت کو سقر بنانے کے عوض اپنی زندہ دلی سے خوشگوار بنا لیتے ہیں، قبلہ مکرم نے اپنی مکروہ آواز میں بالجہر جو گنگنانا شروع کیا ہے تو جی چاہتا تھا کہ لاری کے اندر ہی خودکشی کرلیں، لاری کے دوسرے مسافروں کے لئے آپ کے گانے میں بڑی مصیبت یہ تھی کہ تمام اشعار سننے کے قابل تو تھے، مگر سمجھنے کے قابل اس لئے نہ تھے کہ یا وہ ہوتے تھے متنبی کے اشعار یا کبھی کبھی ابو نواس کے اور دنیا کو معلوم ہے کہ یہ دونوں عربی زبان میں شعر کہتے تھے، اس لئے ہم نے کچھ دیر اردو سے جو کام لیا تو قوالی کا مزا آگیا، ڈرائیور کے ہاتھ تک جوڑ لیئے کہ لاری ٹھہرا کر پانی پلا دے، مگر اس دیہاتی بچے نے گاؤں سے پہلے نہ پلایا تو نہ پلایا، گاؤں آیا جہاں گندگی اور غلاظت سے لبریز ایک دکان تھی، ایک درخت کے نیچے ایک چارپائی تھی جس پر بغیر اجازت کے ہم کمر سیدھی کرنے کے لئے جا لیٹے، قبلہ مکرم نے پانی پیا، شیروانی کے بٹن ڈھیلے کیئے، دو چار جمائیاں لیں، کہ لاری اس گاؤں کے کسانوں سے لبریز ہوگئی، اور اب ہم لوگ علیگڈھ تک یوں گئے، کہ اُدنےٰ حرکت کرنا بھی لاری میں "ہندو مسلم فساد" کا باعث بن جاتی تھی، اس لئے ایک ایسے ہندو مسافر سے متین گفتگو فرماتے گئے، جو تعلیم یافتہ ہونے کا وہ سچا اور صحیح نمونہ تھا، جو آج تک مسلم یونیورسٹی بھی نہ پیدا کرسکی، یعنی آپ بی، اے، ایل، ایل، بی تھے، مگر معاشرت کا یہ حال کہ ایک میلی سی ٹوپی، میلا سا کھدر کا کُرتا اور کھدر کی میلی سی دھوتی۔ پہلے علیگڈھ میں وکالت کرتے تھے، اب اسے چھوڑ کر کانگریس کا کام کرنے پھرتے ہیں۔

کوئی تیرہ بجے دن کو علیگڈھ پہنچے اور یہاں جو کچھ ہوا اُسے رسالہ ادیب پشاور بابتہ جنوری ۱۹۳۰ء اور رسالہ عالمگیر لاہور بابتہ جنوری ۱۹۳۰ء میں لکھ چکے ہیں، البتہ جس چیز نے سفر کی ساری تکلیف دُور کردی وہ حضرت گرامی نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خان بہادر بالقابہ کی کوٹھی پر اُس ادبی مجلس کا انعقاد تھا جس میں حضرت جگر مراد آبادی، حضرت اصغر گونڈوی، حضرت حامد سعید خان، حضرت پروفیسر لوپری، حضرت حاذق، جلیل قدوائی، حضرت صاحبزادہ منصور کمال، حضرت صاحبزادہ حامد کمال، حضرت گرامی اوستاذی محمود علی خان مولوی فاضل اور یہ کہ آپ کا دیرینہ نیازمند مُلا رموزی شامل تھے یا تھا۔

باقی سب خیریت ہے خورد و کلان کو درجہ بدرجہ سلام کہیئے۔

غزل

تبسم۔ ایم، اے

اپنے ہی دکھڑے رونے کو ہمراز کوئی بن جاتا ہے
یاں ورنہ کون کسی دل کا دکھ سہتا ہی غم کھاتا ہے

جب خواب میں ہوتی ہے دنیا، اُس وقت دلِ بیتاب مرا
اک شعلہ سا بن جاتا ہے اور پہروں تک تڑپاتا ہے

تسکین سی پیدا کرتی ہے دونوں کی باہم ہمدردی
میں دل کو کچھ سمجھاتا ہوں دل مجھ کو کچھ سمجھاتا ہے

جب تنہائی میں یارانِ رفتہ کی یاد ستاتی ہے
اک ہوک سی اُٹھتی ہے دل میں اور منہ کو کلیجہ آتا ہے

ہمراز مرے، غمخوار مرے مرنے ہی نہیں دیتے مجھ کو
ہر بار یہی کہتے ہیں مجھے وہ آتا ہے وہ آتا ہے

جب یاد کبھی آجاتی ہے الفت کی وحشت انگیزی
میں دل سے کچھ گھبراتا ہوں دل مجھ سے کچھ گھبراتا ہے

یاں آگ سی گرتی ہے دل پر، بجلی سی گرتی ہے دل پر
اور لوگ سناتے ہیں مجھ کو یہ بادل مینہ برساتا ہے

شام اور سحر کی خاموشی میں سحر ہے کیا جادو ہے کیا
پہلو میں قلب اچھلتا ہے اک شعلہ سا بن جاتا ہے

اے چارہ ساز مرے میری بیتابیوں سے حیراں نہ ہو
میں اس کو بھلاتا ہوں لیکن وہ رہ رہ کر یاد آتا ہے

وہ آئیں گے بہرِ تسکیں جب وقت ملے گا فرصت کا
لیکن یاں قلبِ مضطر تو ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے

اس وقت تبسم تڑپاتی ہے اہلِ وطن کی یاد مجھے
جب رات کی گہری خاموشی میں کوئی دیس سناتا ہے

دامانِ باغباں

مغربی شاعری کے دس عطر بیز پھول

(۱)

محبت کے موتی

سمندر کی تہ میں بیش بہا موتی نہاں ہیں، اور آسمان پر ستارے چمکتے ہیں۔ مگر میرا دل ... ... آہ میرا دل محبت سے مالامال ہے۔

میرا دل سمندر اور آسمان سے زیادہ بلند مرتبہ اور عظیم ہے اور میری محبت ستاروں سے زیادہ روشن اور درخشاں۔

اے کمسن نوجوان نازنین، آ، اور میرے عظیم الشان دل میں سماجا۔ کیونکہ میرا دل، سمندر اور آسمان سب تیری محبت میں غرق ہیں۔

(ہائنے)

(۲)

آوارہ گرد کا گیت

(۱) اے زمینوں اور آسمانوں کے مالک۔ اے رنج وغم کے دُور کرنے والے اور اے غمزدہ دل کے چارہ ساز میں اِس کشاکش دوام سے عاجز آچکا ہوں۔ یہ اضطراب پیہم کس لئے؟

(۲) پہاڑوں کی چوٹیاں خاموش ہیں
درختوں کے پتوں میں ذرا بھی جنبش نہیں
درختوں میں چڑیاں سو رہی ہیں
اُن کی طرح تجھے بھی آرام اور سکون حاصل ہوگا۔

(گوئٹے)

(۳)

اُلفت صادق

میں تیرے بوسوں سے ڈرتا ہوں۔ نیک لڑکی
لیکن تو میرے بوسوں سے ناحق ڈرتی ہے
میری روح بوجھ سے اِس قدر دبی ہوئی ہے کہ
وہ تجھے دغا دے ہی نہیں سکتی

میں تیری صورت سے، تیرے لہجے سے۔ تیری ہر حرکت سے ڈرتا ہوں
مگر تو مجھ سے ناحق ڈرتی ہے
میرے دل کے جذبات پاک اور صادق ہیں
اور میں اِن پاک اور صادق جذبات سے تیری پرستش کرتا ہوں

(شیلے)

(۴)

شاعر کے نغمے

جس طرح خوش الحان طیور موسم بہار میں معلوم نہیں کہاں کہاں سے آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ جس طرح شام کو فضا کی گہرائیوں میں سے درخشاں ستارے اُبھرتے نظر آتے ہیں۔

جس طرح کوئی شیریں یا تلخ صدا، فضا کی خاموشیوں کو چیرتی نکل جاتی ہے
جس طرح درخت پھولتے اور پھلتے ہیں۔ جس طرح ہوا کے تیز تیز جھونکے چلتے ہیں یا سمندر میں مد اُٹھتا ہے۔
جس طرح جہازوں کے سفید بادبان اُفق بحر پر نمودار ہوتے ہیں یا جس طرح تبسم لبوں پر رقص کرنے لگتا ہے۔
اُسی طرح ایک نامعلوم، نمناک فضا سے نغمے اُٹھتے ہیں اور شاعر کے دِل میں سرائت کر جاتے ہیں۔
یہ نغمے شاعر کے ہوتے ہیں مگر شاعر کے تخلیق کردہ نہیں ہوتے۔ اُن کی شہرت، اُس کی ہوتی ہے۔ مگر اُس کی حاصل کردہ نہیں ہوتی۔

کیونکہ عجیب وغریب، صدائیں، دن کو اُس کی روح کا تعاقب کرتی ہیں، اور راتوں کو خواب بن کر اُسے ستاتی ہیں

فرشتہ اُس کو حکم دیتا ہے "لکھ" اور شاعر کا کام صرف اِتنا ہے کہ وہ اِس حکم کی تعمیل کرتا ہے۔

(لانگ فیلو)

(۵)

ایک عورت کے آخری الفاظ

" اب ہم خاموش ہو جائیں۔ پیارے
گریۂ و اضطراب ختم کر دیں
اور پھر وہ اگلے دِن تازے ہو جائیں پیارے
اور پھر ہم محوِ خواب ہو جائیں ———

الفاظ کس قدر خوفناک ہیں؟
ہم اِس طرح لڑ رہے ہیں
جیسے طیور ٹہنیوں پر چہک رہے ہوں

دیکھو ہم باتیں کر رہے ہیں
اور طیور رقص کر رہے ہیں
آؤ اب باتیں بند کر دیں
اور گال پر گال رکھ کے سو جائیں

تیرے نزدیک امرِ حقیقت سے زیادہ جھوٹی کوئی بات نہیں
مگر جس درخت پر سانپ کا دانت ہو
اُس کو بالکل ہی چھوڑ دے ———————

دانۂ گندم کی [illegible] بالکل [illegible] نہیں —— ——

ورنہ ہم کو جنت عدن سے ہاتھ دھونا پڑے گا،
مجھ کو اور حوّا کو۔

خدا بن کر مجھے اپنی قدرت سے سنبھال لے
اور مرد بن کر مجھے اپنے سینے سے لگا لے

تلقین کر پیارے
صرف تلقین کر
میں تیری سکھائی ہوئی باتیں بولا کروں گی، پیارے
اور تیرے خیالات ہی میرے خیالات ہوں گے

اور اگر ممکن ہو تو میری دونو تمنّائیں پوری کر
جسمانی اور روحانی دونوں تیرے قبضے میں ہیں

یہ سب کل ہوتا رہے گا
آج رات کچھ بھی نہیں
آج میں سارے رنج کو نظروں سے چھپا دوں گی

اب میں ذرا رو کر دل کی بھڑاس نکال لوں پیارے
افسوس
اور پھر تیری اُلفت کا مرکز بن کر ہمیشہ کے لئے محوِ خواب ہو جاؤں

(براوننگ)

(۶)

میرے مرنے کے بعد

میں مرجاؤں تو میری قبر پر نرگس کا ایک پودا لگا دینا۔ اسکی شکباری اسکی زردی کا نظارہ میرے لئے جنت نگاہ ہے۔
کاش کہ میرے مرنے کے بعد بھی اُس کا نرم اور دلکش سایہ میری آرام گاہ پر رقص کرتا رہے۔

(الفرڈ دموسیہ)

(۷)

اُلفتِ مدفون

وہ طیور کے آشیانوں کے پاس، اس سرزمین میں رہتی تھی، جسے انسانی قدموں نے ناپاک نہیں کیا
وہ ایک دوشیزہ تھی جس کی تعریف کرنے والا کوئی نہ تھا
اور چاہنے والے بہت کم۔
وہ آنکھوں سے اِس طرح نہاں تھی، جیسے کوئی پھول سبزے میں پوشیدہ ہو
لوسی کی زندگی ایک غیر معروف زندگی تھی اور اُس کے مرنے کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہوا
اب وہ قبر میں آرام سے سو رہی ہے
مگر افسوس اب وہ مجھ سے کس قدر دور ہے

(ورڈس ورتھ)

(۸)

پرستیدہ نگاہ

عام لڑکیوں کی طرح وہ ظاہری حسن سے موصوف نہیں
جب وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تو پہلی بار میں نے اُس کے حسن کو بے نقاب دیکھا
اور پہلی بار میں اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ اُس کی نظر ایک چشمۂ اُلفت اور ایک جوئبار نور ہے۔

لیکن اب اُس کی نگاہیں سرد اور متامل ہیں۔ اور میری پرشوق نگاہوں کا جواب نہیں دیتیں
پھر بھی میں اُس کی نظر میں محبت کی روشنی دیکھتا ہوں
اور اب بھی اُس کی چڑھی ہوئی تیوریاں، مجھے دوسری لڑکیوں کے تبسموں سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہیں۔

(کولرج)

(۹)

اُلفتِ خاموش

جو محبت کا جویا ہو
اُسے چاہیئے کہ برابر الفت میں سرشار رہے
اور بالکل خاموش رہے
کیونکہ الفت کی سرزمین میں خاموشی کی حکومت ہے
ورنہ اس کا نتیجہ دلی اضطراب ہے
اور رنج ——————

(شوپن ہار)

(۱۰)

مرگ اُلفت

میرے پیارے، میرے مرنے کے بعد میرے ماتم میں حسرت آگین نغمے نہ گانا۔ میرے سرہانے پھول نہ چڑھانا۔ میری قبر پر کوئی سایہ دار درخت نہ لگانا

صرف سبز گھاس شبنمیں قطروں کے ساتھ میری قبر پر اُگے گی
کبھی کبھی مجھے یاد کر لیا کرنا ——— یا بالکل بھول جانا

میں سایوں کو نہ دیکھ سکوں گی
بارش کو نہ محسوس کر سکوں گی
عندلیب کے حسرت آگین نغمے نہ سُن سکوں گی
اور طویل خواب نیم شبی میں کبھی کبھی تجھے یاد کیا کروں گی ——— یا شاید بھول جاؤں گی

(کرسچیانا روزیٹی)

عزیز احمد
کالج جامعہ عثمانیہ

مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی فارسی تعلیم کا انتظام

(از سید محمد عبداللہ ایم اے ریسرچ سٹوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی)
(رکن اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ لاہور)

مغلوں سے پہلے ہندوؤں کی فارسی تعلیم

ہندوؤں کے ساتھ فارسی بولنے والی اقوام کا سب سے پہلا اختلاط سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے بعد شروع ہوا۔ اگرچہ مکرانی لوگ جو کہ اصطخری اور ابن حوقل کے بیان کے مطابق فارسی بولتے تھے۔ ہندوؤں کے ساتھ اس تاریخ سے پہلے بھی میل جول رکھتے تھے۔ نیز یعقوب صفار کے زمانے میں سندھیوں کے ساتھ ایرانیوں کے تعلقات بھی رہ چکے تھے تاہم سلطان محمود غزنوی کے حملوں نے اس اختلاط کو زیادہ شدید اور دیرپا بنا دیا۔ لیکن یہ مقام تعجب ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے لے کر، سکندر لودھی بلکہ اکبر اعظم تک بجز چند مستثنیات کے ہمیں ہندوؤں کے درمیان فارسی تعلیم کا پتہ نہیں چلتا۔ محمود غزنوی کے دربار میں تلک ایک فارسی دان ہندو تھا۔ سکندر لودی نے ہندوؤں کے اندر فارسی نوشت و خواند کو رواج دیا۔ مگر تاریخ صرف ایک برہمن شاعر کا پتہ دیتی ہے جو اُس زمانے میں فارسی عربی کا زبردست عالم تھا۔ شیر شاہ کے عہد میں ٹوڈرمل کھتری منشیوں میں ملازم ہوا۔ اور جیسا کہ اکبر کے زمانے کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ فارسی کا اچھا ماہر تھا۔ اور تذکرہ خوشنویسان کے بیان کے مطابق، خوشنویس بھی تھا۔ کشمیر میں سلطان زین العابدین کے عہد میں، ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا آغاز ہوا۔ چنانچہ اس زمانے میں بودھی بھٹ ایک ہندو شاہنامہ کا حافظ تھا۔ اور بادشاہ کے سامنے نہایت خوش الحانی سے اس کے اشعار پڑھا کرتا تھا۔ مغلوں سے پہلے کی تاریخ سے فارسی دان ہندوؤں کے صرف اتنے ہی حالات معلوم ہو سکے ہیں۔ اگرچہ اس زمانے کے سوشل حالات ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلاط اور خلط ملط کے پیش نظر یہ بات نہایت یقین کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہے۔ کہ ان ہندوؤں میں جو مسلمان بادشاہوں کی ملازمتوں میں تھے فارسی کی واقفیت ضرور ہوگی۔ گرو نانک جن سے مسلمان صوفیوں کے اچھے تعلقات تھے۔ فارسی کی سرسری سی واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ آدی گرنتھ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فارسی کے چند شعر بھی لکھے ہیں۔ ان سب امور سے معلوم

ہوتا ہے کہ فارسی کا رواج عوام میں کچھ نہ کچھ ہو گیا تھا۔ تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ اس زمانے میں فارسی تعلیم کا باقاعدہ بندوبست نہ تھا۔ اور بجز خاص لوگوں کے بہت کم ہندو فارسی کی طرف متوجہ ہوئے۔

سکندر لودہی اور اکبر کی کوششیں

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔ سکندر لودہی نے اپنے زمانے میں ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ کچھ لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ مگر اس تحریک کا اثر ہمہ گیر نہ تھا۔ جب اکبر کا زمانہ آیا۔ تو سنہ ۹۹۰ھ میں راجہ ٹوڈرمل نے مشہور مالی اصلاحات کو ممالک محروسہ میں نافذ کیا۔ خلاصۃ التواریخ کے مصنف کا بیان ہے کہ راجہ ٹوڈرمل نے حکم دیا کہ آئندہ دفاتر کے تمام معاملات فارسی میں انجام پایا کریں۔ حالانکہ اس سے قبل کچھ کام ہندی میں اور کچھ فارسی میں ہوتا تھا۔ راجہ نے اس دو عملی کو انتظام کے لئے مضر خیال کیا اور کام میں یکسانیت پیدا کرنے کے خیال سے فارسی کو رائج کیا۔ اکبر کی فیاضیوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ہندوؤں نے تھوڑے ہی عرصے میں فارسی زبان میں اتنی مہارت پیدا کر لی۔ کہ ان میں بڑے بڑے مصنف پیدا ہوئے بلوخمن کا قول ہے کہ اٹھارہویں صدی تک، ہندوؤں نے اتنی ترقی کر لی تھی۔ کہ وہ مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ اگرچہ یہ قول صورت حالات پر پورے طور پر صادق نہیں آتا۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ سنہ ۱۹ء تک ہندوؤں میں فارسی کا بہت چرچا رہا ان میں بڑے [illegible] بڑے بڑے انشا پرداز، عظیم الشان شاعر قابل سیاسدان اور ماہر منتظم پیدا ہوئے اور جب انگریز ہندوستان میں وارد ہوتے تو ملک میں ہر کام پر ہندو لوگ ہی چھائے ہوئے تھے۔

تعلیم کا انتظام

ہم ہندوؤں کی فارسی تعلیم کی باقی جزئیات سے قطع نظر کرتے ہوئے، آج صرف اُن کی تعلیم کے انتظام کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں جو کچھ بیان ہوگا وہ عہد مغلیہ کے سارے نظام تعلیم کا ایک خاکہ ہے۔ چونکہ ہمارے مضمون کا تعلق صرف ہندوؤں سے ہے اس لئے ہم نے جابجا ہندوؤں کو ہی مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔

ہندوستان میں پرانے زمانے سے تعلیم کا انتظام پنچایتوں کے سپرد تھا۔ پنڈت ملکی نظام کا ایک جزو لاینفک ہوتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی ضروریات زندگی کو پورا کرتے تھے۔ یہ پنڈت اپنے مکان پر یا کسی اور معیّن مقام پر لڑکوں کو تعلیم دیا کرتا تھا۔

مغلوں سے پہلے ہندوستان میں اسلامی مدارس بکثرت موجود تھے۔ جن میں سے بعض تو اوقاف کی آمدنی سے اور بعض عطیات پر چلتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مکاتب اور مساجد میں ہوتی تھی۔ جب طالب العلم ان منازل کو طے

کر چکتا۔ تو پھر ان مراکز علمی کی طرف متوجہ ہوتا۔ جن کا سارے ملک میں شہرہ ہوتا تھا۔ ان مراکز میں طالب علم عربی فارسی کی اعلٰے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور نصاب کو ختم کرنے کے بعد، فارغ التحصیل ہو جاتے تھے۔

عہد اکبری

اکبر کے زمانے میں مکاتب اور مدارس کو زیادہ رونق حاصل ہوئی۔ یہی زمانہ ہے۔ جب کہ ہندو اور مسلمان بکثرت ایک جگہ تعلیم حاصل کرنے لگے تھے۔ آئین اکبری میں تعلیم، نصاب تعلیم اور طریق تعلیم کے متعلق ایک آئین موجود ہے:-

"آئین آموزش، در ہر کشور خاصہ دریں آباد بوم سالہا نو آموز را بدبستان باز دارند و مفردات حروف معجم را بچندیں گونہ اعراب آموزش رود۔ بفراوان نامہ گرامی انفاس را نگان شود . .

. . . .

اخلاق، حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست، مدن، طب منطق، طبیعی، ریاضی، الٰہی، تاریخ مرتبہ مرتبہ اندوزد و از ہندی علوم بیاکرن، نیای، بیدانت و پاتنجل برخوانند۔ و ہر کس را از بایست وقت در نگذرانند، ازیں طرز آگہی نکنبہ دبستان دیگر گرفت، و مدرسہا فروغ تازہ گرفت"۔

مکاتب اور مدارس

غالباً اکبر کے زمانے سے مشترکہ مکاتب کا دستور قائم ہوا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال و انحطاط کے بعد تک بحال رہا۔ مکتب کا مفہوم یہ ہے کہ محلے میں کوئی تعلیم یافتہ فرد اپنے ذاتی مکان میں یا کرایے کے مکان میں ایک مدرسہ کھول لیتا تھا۔ لوگ اپنے لڑکوں کو مکتب میں بھیجا کرتے تھے۔ معلم کا ذریعہ معاش انہی اطفال کی امداد پر منحصر تھا۔ بعض وقات مشترکہ تعلیم کا انتظام مساجد میں بھی ہوتا تھا۔ مسلمانوں میں مساجد ہمیشہ علم و تعلیم کی اشاعت کا ذریعہ بنی رہی ہیں۔ ہندوؤں نے جب فارسی کو اپنایا تو وہ اپنے مسلمان ہمجولیوں کے ساتھ مساجد میں بھی تعلیم حاصل کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ فارسی کے مکاتب عام حالات میں مسلمان "میاں جی" اور بعض صورتوں میں "ہندو معلموں" کے زیر ہدایت چلتے تھے۔ مسلمان بچے ایک ہی چھت کے نیچے حاصل کیا کرتے تھے۔ خورشید جہان نما (بچھلی صدی کی ایک تصنیف ہے) کا بیان ہے۔ کہ بنگال میں انگریزوں کی حکومت کی ابتدا میں بیشمار مدارس اور مکاتب عربی فارسی کی تعلیم کے لئے موجود تھے۔ جب انگریز ہندوستان میں اچھی طرح سے جم گئے تو انہوں نے اپنی تعلیمی پالیسی پر غور کیا پہلے پہل تو ایک عرصے تک وہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے مخالف رہے۔ وارن ہیسٹنگز کے زیر ہدایت ان کا مسلک یہ تھا کہ ہندوستان میں فارسی عربی سنسکرت تعلیم کو رواج دینا چاہیے۔ چنانچہ

وارن ہسٹنگز نے کلکتہ میں "مدرسہ عالیہ" قائم کیا۔ اور سنسکرت کی تعلیم کے لئے ولیم ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت کالج کا افتتاح کیا۔ اس سلسلے میں آگرہ کالج اور دہلی کالج کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے بیشمار ہندو مسلمان مصنف نکلے۔ ان سب کالجوں کو سرکاری امداد ملتی تھی۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے تعلیمی پالیسی کا رخ تبدیل کر دیا تھا۔ اور فارسی سنسکرت کی بجائے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی ترویج ضروری قرار دی گئی۔ یہی نہیں بلکہ ۱۸۴۴ء کے قریب فارسی زبان کی کاروباری حیثیت کو بھی مٹا دیا گیا۔ اور دفاتر میں فارسی کی جگہ انگریزی کو دخل حاصل ہو گیا۔

نصاب تعلیم

فارسی کی ابتدائی تعلیم میں ابتدائی [illegible] کتابت اور اخلاقی حکایات کی کتابیں ہوتی تھیں مثلاً پندنامہ عطار۔ کریما، مقیمان، دستور الصبیان، نصاب الصبیان، اخلاق محسنی وغیرہ

ثانوی تعلیم کے لئے گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، انشا، انشائے خلیفہ، مادھورام، سہ نثر ظہوری، پنج رقعہ، اخلاق ناصری، بہار دانش، انوار سہیلی، سکندر نامہ، شاہنامہ وغیرہ

بندرابن داس خوشگو اپنے تذکرے میں لکھتا ہے۔ کہ "میں اور لالہ حکیم چند ندرت ایک دوسرے کے مخلص دوست تھے اور دونوں میاں محمد عابد کے پاس اخلاق ناصری پڑھا کرتے تھے"

چندر بھان برہمن اپنے فرزند خواجہ تیج بھان کو ایک مکتوب میں گلستان، بوستان، اخلاق جلالی اور اخلاق ناصری کے دائمی مطالعہ کی سفارش کرتا ہے۔ یہی مصنف اپنی کتاب چار چمن میں اس مسئلے پر زیادہ تفصیل سے بحث کرتا ہے۔ ہم اس اقتباس کو یہاں درج کرتے ہیں:۔

"چوں در آغاز حال پاس بعضے از شرائط تہذیب الاخلاق مطلوب است۔ میباید کہ پیوستہ گوش بر سخنان بزرگان نہد و مطابق آں عمل نماید و مطالعۂ اخلاق ناصری و اخلاق جلالی و گلستان و بوستان دست مایۂ وقت خود ساختہ یک لحظہ از حصول سعادت علم با عمل غافل نباشد۔ اگرچہ اصل مطلب در فن ہمین ظاہر ربط کلام متانت عبارت است اما حسن خط اعتبار دیگر دارد و بوسیلۂ ایں جا در مجلس بزرگان تواں یافت آں فرزند عزیز کوشش نماید کہ در ہنر فائق گردد و بایں حال اگر سیاق و نویسندگی نیز حاصل شود بہتر و خوبتر خواہد بود۔ چہ منشی سیاق داں کم بہم مے رسد و سیاق داں منشی کمتر مے باشد۔ اگر در شخصے ہر دو ہنر جمع شود نادر است، و نور علےٰ نور۔ منشی ہماں است کہ رازدار باشد۔ و نویسندہ ہماں کہ نیک ذات است کمترین بندگان کہ در سلک منشیان آستان خلافت نشان منظم است اگرچہ جائے بشریت و غفلت خالیست اما در

رازداری باصد زبان ہمچو غنچہ بستہ دہاں است .... اگرچہ علم فارسی وسعتگاہ
بسیار دارد واحاطہ جمیع اش از حد بشریت متجاوز لیکن اولاً بجہت افتتاح ابواب سخن بطریق تمین مطالعہ
گلستان و بوستان و رقعات ملا جامی از ضروریات است وچون تقدیر شعور بہ رسد خواندن کتب اخلاق
مثل اخلاق ناصری واخلاق جلالی ومطالعہ تواریخ سلف مثل حبیب السیر وروضۃ الصفا وروضۃ السلاطین
وتاریخ گزیدہ وتاریخ طبری وظفرنامہ واکبرنامہ واشال آن ضرورت کہ ہم متانت بسخن میرسد وہم اطلاع
براحوال جہاں وجہانیاں حاصل شود ودر مجالس ومحافل بکار می آید وازدواوینہا ومثنویہا بعضی از
اوستادان روزگار کہ این نیازمند در عنفوان شباب مطالعہ نمودہ اسامی گرامی طبعہ بعضی را در ذیل این
رقیمہ مرقوم مے سازد تا این فرزند بقدر فرصت ہرچہ تواند از تصانیف این بزرگان مطالعہ نماید تا برکتے
و فرحتے ومایۂ استعداد حاصل گردد وسررشتۂ سخن بدست افتد، حکیم سنائی، ملا روم، شمس تبریز
شیخ فریدالدین عطار، شیخ سعدی، خواجہ حافظ، شیخ کرمانی، ملا جامی ودیگر شعرا وبلغاء مشہور روزگار
مثل سردفتر شعراء روزگار ملا رودکی، حکیم قطران عسجدی، عنصری، فردوسی، فرخی، ناصر خسرو، جمال
الدین عبدالرزاق، کمال اسمعیل، خاقانی، انوری، امیر خسرو وحسن دہلوی۔ ملا جامی، ظہیر فاریابی، کمال
خجندی، عروضی، سمرقندی، عمعق بخاری، عبدالواسع جبلی، رکن صاین۔ محی الدین سبحانی
مسعود بک، فریدالدین (؟) عثمان مختاری، ناصر بخاری، ابن یمین، حکیم سوزنی، فرید کاتب۔ ابوالعلا
گنجوی، ارزقی، فلکی سودائی، بابا فغانی، خواجہ کرمانی، آصفی، ملا ہلالی، ملا عماد، اصفہانی، خواجہ
عبید زاکانی، تیسائی، لطف اللہ حلوائی، رشید الدین وطواط، ترمانی (؟)، واضح
ضمیر منیر پذیر فرزند نیکو کار باد کہ چون در عنفوان حال خاطر از مطالعۂ کتب متقدمین فے الجملہ فراغ یافت
طبع سخن دوست را میل بسخنان متاخرین بہم رسید تا آنکہ شروع در بہم رسانیدن دیوانہا ومثنویہا بمرور
ایام نسخہ بسیارے بدست آورد بعد از مطالعہ ایشان بشاگردان داد از آں جملہ اسامی بعضے از ارباب سخن
این است۔ اہلی ہلالی محتشم، وحشی، قاضی نور، نرگس، محتفی، امیدی، میرزا قاسم گونہ آبادی، ملا
زبانی پرتوی حرانی حسانی صبری، ضمیری رشکی، حسانی، ہلاکی نظیری نوعی ناظم
یغما، میر حیدر، میر معصوم، نظیر مشہدی ولی دشت بیاضی۔ ... ودیگر ارباب سخن واہل
طبع کہ صاحب دیوان ومثنوی اند واظہار تفصیل اسامئے آنہا درین نسخہ مختصر گنجائش ندارد۔ جارجمن قلمی ورق
(۱۶۲ تا ۱۶۵)

اعلےٰ تعلیم کے لئے ضروری ہوا کرتا تھا۔ کہ طالب علم ایسے مقامات کا سفر کریں۔ جہاں خاص طور پر نامور استاد مقیم ہوں اعلےٰ درجے کے طالب علم صرف نحو، عروض، قافیہ، منطق، شعروشاعری کے علاوہ عربی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ ہندوؤں میں عربی تعلیم کا رواج کم تھا۔ مگر بعض شوقین طالب العلم عربی بھی حاصل کرتے تھے۔ لچھمن سنگھ غیوری نے تحریر اقلیدس شرح چغمینی وغیرہ کو نہایت خوش اسلوبی سے ازبر کیا ہوا تھا (مخزن الغرائب) لچھمی نرائن دہلوی، منطق اور فلسفہ کا بہت بڑا عالم تھا۔ اٹھارویں صدی میں حساب وغیرہ کی طرف بہت توجہ ہوئی۔ چنانچہ دیوان کاہنی۔ رتن سنگھ زخمی، منولال۔ بھجولال۔ تمکین وغیرہ حساب کے اچھے خاصے ماہر تھے۔ اس زمانے میں فلسفہ اور طب کو بھی بہت زیادہ رواج ہوا۔ رتن سنگھ زخمی۔ میرزا محمد حسن قتیل (سابق دیوالی سنگھ) منولال فلسفی فلسفہ میں بہت نام آور ہوئے ٭

انشا، سیاق، اور خوشخطی

لیکن سلطنت مغلیہ میں ہندوؤں نے سب سے زیادہ جس چیز کی طرف توجہ کی۔ وہ انشا۔ سیاق۔ وقائع نگاری اور خوشخطی تھی۔ یہ علوم وفنون، حکومت کے کاروبار میں ممد ومعاون ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں نے ملازمت پیشہ گروہ ہونے کی حیثیت سے ان ہی فنون کو زیادہ اپنایا۔ شاعری۔ تاریخ اور ادب فضیلت کے نشان تھے۔ اور ہر تعلیمیافتہ شخص کچھ نہ کچھ فکر سخن کرتا تھا۔ وارستہ سیالکوٹی نے بہت کم شعر لکھے ہیں مگر پھر بھی تخلص موجود ہے۔ چونکہ یہ لوگ بادشاہوں کے پاس ملازم ہوا کرتے تھے۔ اس لئے وقائع نگاری اور تاریخ نویسی کے مواقع بہت آسان تھے۔ خوشخطی مشرق میں علوم کی اشاعت کا ایک بہت بڑا سبب رہی ہے۔ علی الخصوص مسلمانوں نے اس فن کو بہت ترقی دی۔ جیسا کہ ارنلڈ صاحب نے اپنی کتاب "مسلمانوں کی مصوری" میں بیان کیا ہے۔ ہندوؤں نے بھی خوشخطی میں کمال پیدا کیا۔ اور تذکرۂ خوشنویساں میں کم وبیش ۱۵، ۲۰ اعلےٰ خوشنویسوں کے حالات درج ہیں غرض انشا، خط وکتابت، سیاق، تاریخ اور خوشخطی ہندوؤں کے نصاب تعلیم کا ایک ضروری جزو ہوتا تھا۔ منشی سجان رائے بٹالوی خلاصۃ المکاتیب کے دیباچے میں لکھتا ہے:۔

"چون اکثر اوقات بفن مکتوب نویسی کہ عبارت از منشی گری بودہ باشد۔ بملازمت صاحبان دولت واقبال وناظمان ملک ومال بسر بردہ، بنابران فرزندان کمترین بندگان نیز طریقۂ نوکری راموروثی تصور نمودہ وسلیقۂ منشی گری از فنون دیگر بہتر دانستہ بتحصیل وتکمیل فن انشا تقید دارند" (قلمی ورق ۳)

چونکہ فارسی تعلیم بجائے کسی روحانی فائدے کے، معاش کی خاطر حاصل کی جاتی تھی۔ اس لئے عام لوگ اپنے بچوں کو بہترین نشار بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ استاد جی کے پاس فرامین ومراسلات کا ایک ذخیرۂ وافر موجود رہتا

اور طالب علم اکثر صورتوں میں، ان نمونوں کو حفظ کر لیتے، انشائے خلیفہ اس سلسلے میں بہت مقبول رہی ہے - درجۂ وسطانیہ (یا ثانیہ) کے بعد لوگ ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، ملازمت کے لئے بڑا موقعہ موجود ہوتا تھا - بعض وقت موروثی حق کی بنا پر ملازمت جلد مل جاتی تھی - ورنہ ایک شخص معمولی منصبیوں میں شامل ہو جاتا تھا - اور پھر ترقی کرتے کرتے، دیوان یا دستور جیسے رتبۂ عالی تک بھی پہنچ سکتا تھا +

ہمہ دان بننے کا دستور

جو لوگ علم کے زیادہ شائق ہوتے تھے - وہ بڑے بڑے علمی مراکز کی طرف متوجّہ ہوتے - اور بڑے بڑے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے - شعر و شاعری میں اصلاح لیتے - وہ ادب اور شعر کا ذوق جو بزرگوں کے فیض صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا پیدا کرنے کی کوشش کرتے - ان اعلےٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک خصوصیت یہ تھی - کہ "ہر فن مولا" بننے کی کوشش کرتے تھے - جیسا کہ مشرق میں رواج ہے - بیک وقت شاعر، ادیب، مؤرخ، فلسفی، منشی، نثار اور کیا کچھ نہ ہوتے - ہم ذیل میں منشی لچھمی نرائن دبیر کھنّاہ کے حالات جو رقعات کے دیباچے میں مرقوم ہیں درج کرتے ہیں تاکہ اس زمانے کی تعلیم کا سرسری سا اندازہ ہو جائے :-

"قوم کھتری - موطن اصلی او قصبہ کنجاہ از مضافات دار السلطنت لاہور است - رائے جسونت رائے جد امجدش در عہد عالمگیر بادشاہ انار اللہ برہانہٗ جہت تلاش معاش وارد شاہ جہان آباد شد و در شہر کہنہ محلہ وکیل پورہ رخت اقامت انداختہ بوکالت امرائے عظام بادشاہی و کالت ناظم صوبۂ کابل سرفرازی داشت . . . منشی ممدوح الیہ در ایام طفولیت کتب متداولہ فارسی کہ رائج تدریس اطفال اند، از مولانائے شیخ محمد برادر زادۂ غنیمت گنجاہی دیدۂ سواد خود را روشن ساخت، و در سن دوازدہ سالگی متوجہ تحصیل رسائل عروض و قوافی و اصلاح غزل گشتہ در خدمت قدوۂ فصحاء و زبدۂ بلغا سخنگو و سخندان سراج الدین علی خان . . . . . از علوم مذکورہ ذخائر اندوختہ مستثنائے روزگار شد و مختصرات صرف و نحو را از ٹیک چند متخلص بہ بہار خواندہ مائل بدین کتب طب کہ از ضروریات انسانیت گشتہ و عمرے در خدمت اطبائے دار الخلافہ مشغول نسخہ نویسی بودہ مدت دوازدہ سال بمشق معالجۂ اغنیا و غربائے دہلی پرداخت . . . . . . الخ

تذکرہ نشتر عشق میں سبقت لکھنوی کا حال یوں لکھا ہے :-

"سکھراج نام از قوم کائتھ رونا ؤ ست اکثر آبائے او بملازمت عمدۃ الملک نواب اسد اللہ خان وزیر اعظم

عالمگیری بودند۔ درخوش کلامی وتحصیل صرف ونحو ومنطق وبیان ومعانی ومعما وتاریخ وصنائع وبدائع وحساب و کتب واصطلاحات وتحقیق مسائل صوفیہ گوئے سبقت ربود واز میرزا عبدالقادر بیدل اصلاح میگرفت"

الخ

ہندو اساتذہ

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ مکاتب میں مسلمان استاد ہؤا کرتے تھے۔ اور ہندو مسلمان بچے سب آشتی اور یگانگت کے ساتھ استاد جی سے اخذ علم کرتے تھے۔ مگر اکثر مثالیں ایسی بھی ہیں۔ جن میں ہندو معلم ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے حالات میں ایسے بیشمار لوگ ملجائیں گے۔ جن کا پیشہ معلمی ہوتا تھا۔ اور وہ شہر یا گاؤں کی تعلیم کے علمبردار ہوتے تھے۔ لالہ چینی داس ذرہ اٹھارویں صدی کے ایک مشہور معلم تھے۔ جن کے مکتب میں ہندو مسلمان طالب العلم پڑھا کرتے تھے۔ مولٰنا مفتی لطیف اللہ صاحب مرحوم کے استاد فارسی منشی سوہن لال تھے۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ۔ جعفر علی حسرت کے استاد تھے (یہ حسرت، قلندر بخش جرأت کے استاد تھے) گذشتہ صدی کے اوائل میں اکثر ہندو اہل علم پیشہ معلمی اختیار کر لینے کی وجہ سے استاد کہلانے لگ گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوخمن نے (ترجمۂ آئین اکبری ص ۳۵۱) کہا ہے۔ کہ اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے۔ ہندو فارسی زبان میں مسلمانوں کے استاد بن گئے تھے۔

چند نامور اساتذہ

آج کل جو کام اعلےٰ درجے کے کالجوں سے لیا جاتا ہے وہی کام زبردست علمی شخصیتوں سے لیا جاتا تھا۔ ان بزرگوں کے گھر اہل علم کا مجمع ہوتے تھے۔ شائقین علم، اطراف، واکناف سے اُن کے پاس جمع ہوتے۔ اور اُن سے کسب فیض کرتے۔ اس زمانے کی تعلیم کا حال ان بزرگ شخصیتوں کے ذکر کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ افسوس ہے کہ ہمیں تمام ہندو اہل قلم کے اساتذہ کا حال معلوم نہیں۔ صرف شعرا کے حالات میں ان کے استاد کا ذکر آجاتا ہے۔ اس لئے ہم ذیل کے بیان میں ایک دو شخصیتوں کے علاوہ صرف اکابر شعراء کا ذکر کریں گے۔ اور ان کے ساتھ ان ہندو شعراء کو بھی گنائیں گے۔ جنہیں ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اس تطویل سے ہمارا مقصد یہ ہے۔ کہ تعلیم کا تصور زیادہ وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہو جائے۔ عہد شاہجہانی میں، شمالی ہندوستان میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ایک بہت بڑے عالم تھے۔ جن کے سامنے زانوئے اَدب تہ کرنے کے لئے دُور دراز سے لوگ آتے تھے۔ خلاصتہ التواریخ کا مُصنف جس نے ۱۱۰۷ھ میں اپنی کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ لکھتا ہے۔ کہ سیالکوٹ کا شہر، مولانا عبدالحکیم اور اُن کے فرزند مولانا عبداللہ کے طفیل علمی اعتبار سے بہت ممتاز تھا۔ ہمارے ہندو مصنفین میں سے منشی چندربھان برہمن اُن کے ایک ممتاز شاگرد

ہیں۔ یہ وہی برہمن ہیں جنہیں شاہ جہان پیار سے "ہندوئے فارسی دان" کہا کرتا تھا۔ عمل صالح کے مصنف محمد صالح کا بیان ہے کہ برہمن نے ابتدائی تعلیم مُلّا عبدالحکیم سے حاصل کی تھی۔ اسی زمانے میں ملا شاہ بدخشی بھی مرجع خاص و عام تھے۔ برہمن اور بنوالی داس ولی دونوں نے اس چشمۂ معرفت سے پیاس بجھائی ہے۔ ولی کا متصوفانہ لٹریچر غالباً اسی بزرگ کے طفیل ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ولی، برہمن، ہندو وغیرہ شعرائے عہد شاہجہانی نے شعر و سخن میں کس شاعر سے اصلاح لی تھی +

اورنگ زیب کے عہد میں شیخ محمد افضل سرخوش جنہوں نے تذکرہ کلمات الشعراء لکھا ہے استاد کل خیال کئے جاتے تھے۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا فلسفی شاعر بھوپت رائے بیرگی، اسی سرخوش کا شاگرد تھا۔ ان کے علاوہ بندرابن داس خوشگو کو بھی ان سے شرف تلمذ حاصل تھا +

اس کے بعد جو زمانہ آیا۔ اُس میں شعراء میں دو ممتاز شخصیتیں معرض وجود میں آئیں۔ میرزا عبدالقادر بیدل اور شیخ سراج الدین علی آرزو۔ بیدل متاخرین شعراء کے امام مانے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کے بعد جتنے لوگ آئے ہیں تقریباً سب نے اُن کا تتبع کیا ہے۔ اسداللہ خان غالب بھی باوجود اپنی جدت طبع، طرز بیدل کے مقلد تھے۔ میرزا بیدل کے سینکڑوں ہندو مُسلمان شاگرد تھے۔ ان کے دارالتربیت سے جن اکابر ہندو شعراء نے فیض حاصل کیا۔ اُن کے نام یہ ہیں۔ منشی امانت رائے امانت۔ شورام حیا۔ سکھراج سبقت۔ سری گوپال تمیز۔ حضوری اور ندرت +

تقریباً اسی زمانے میں امام المتاخرین سراج الدین علی خان آرزو بھی وارد شاہ جہان آباد ہوئے۔ آرزو فن شعر سے کہیں زیادہ زباندانی میں کمال رکھتے تھے۔ شعر و شاعری کی تنقید آپ پر ختم تھی۔ خان آرزو کی ذات، اس عہد میں اپنی علمیت کے باعث، دوست دشمن سب پر مسلّم تھی۔ یا یوں سمجھیئے کہ اس زمانے میں ایک طالب علم اپنے آپ کو علم و ادب میں کامل نہ سمجھتا تھا۔ تاوقتیکہ وہ کسی نہ کسی وقت خان آرزو کے حلقہ درس میں شریک نہ ہوا ہو۔ خان آرزو بھی اپنے تلامذہ کے ساتھ بیحد شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ مجمع النفائس میں جو خان آرزو کا تصنیف کردہ، تذکرۂ شعراء ہے۔ اُنہوں نے اپنے جن شاگردوں کے حالات دیئے ہیں وہ یہ ہیں :-

بابو بالمکند شہود۔ پنڈت جے کشن عشرت۔ رائے انند رام مخلص۔ بندرابن داس خوشگو، ان کے علاوہ ٹیک چند بہار کو بھی ان سے نسبت تلمذ حاصل ہے۔ یہ یاد رہے کہ بہار نے ایک جامع لغت لکھا ہے جو فارسی زبان کی سب سے بڑا اور مستند لغت ہے۔ اِس لغت میں بہار نے اپنے استاد خان آرزو کے اقوال پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ چنانچہ خان آرزو اپنی

تصنیف "مثمر" (قلمی ورق ۱۳۴) میں لکھتے ہیں :-

"وبہار عجم وغیرہ کہ از یاران فقیر آرزو ست وشل او دریں عصر بہم نرسیدہ ودریں کتاب گاہے با او صلح است وگاہے جنگ بسیار"

اِس زمانے میں بعض اور ممتاز ہستیاں بھی موجود تھیں۔ مثلاً شرف الدین پیام۔ میرزا عبدالغنی بیگ قبول۔ میرزا گرامی۔ حکیم حسین شہرت۔ سعد اللہ گلشن۔ لیکن خان آرزو ان سب کے امام تھے۔ ان اکابر میں سے ہر ایک کے سلسلہ درس میں ہندو شعرا موجود تھے۔ سیالکوٹ میں میر محمد علی رائج استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ مشہور محقق وارستہ سیالکوٹی انہی کا شاگرد تھا۔ کشن چند اخلاص اور نشاط، میرزا عبدالغنی بیگ قبول کے شاگرد تھے۔

بساون لال بیدار۔ سرب سکھ خاکستر اور ثروت مظہر جانجاناں کے شاگرد تھے۔

اِن کے علاوہ اکابر اساتذہ میں سے میرزا فاخر مکین، میر افضل ثابت، معیم آزاد کشمیری۔ میر غلام آزاد بلگرامی شیخ علی حزین استاد کل مانے جاتے تھے۔ میرزا فاخر کے ایک شاگرد رشید موہن لال انیس نے ایک تذکرہ انیس الاحبا کے نام سے لکھا ہے جس میں میرزا کے تمام ہندو مسلمان شاگردوں کے حالات دیئے ہیں۔ راجہ رام نرائن موزون شیخ محمد علی حزین کے شاگرد تھے۔ شفیق اورنگ آبادی کو، آزاد بلگرامی سے نسبت تلمذ تھی۔

سکھوں کے عہد میں، پنجاب میں مولانا نور احمد صاحب چشتی ایک فاضل اجل تھے۔ جنہوں نے تحقیقات چشتی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اکثر ہندو اُن کے شاگرد تھے۔ دیوان امرناتھ اکبری مصنف ظفرنامہ رنجیت سنگھ اُن کا شاگرد تھا پچھلی صدی کے اکابر اساتذہ کے حالات زیادہ معلوم ہوئے۔ میرزا غالب۔ میرزا محمد حسن قتیل اور میرزا ہرگوپال تفتہ سے پہلے میاں نور العین واقف بٹالوی مشہور شعراء میں سے تھے۔ جن سے اکثر ہندو شعراء نے تربیت حاصل کی۔

مُسلمان اساتذہ کی ہندو شاگردوں پر شفقت

ہم نے اساتذہ کا جو حال بیان کیا ہے وہ سرسری ہے جس کا مقصد جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے صرف یہ ہے کہ ہندو اہل قلم اور مسلمان اُستادوں کے باہمی تعلقات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ آج جب کہ ہندوستان کے طول وعرض میں ہندو اور مسلمانوں میں یک گونہ مغائرت پائی جاتی ہے یہ بیان شائد تعجب انگیز ہو۔ لیکن پرانے زمانے کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان ایک بہشت تھا جس میں ہندو مسلمان برادرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے مکاتب آجکل کی طرح جدا جدا نہ تھے بلکہ سب کی تعلیم یکجا ہوتی تھی۔ استاد کو اپنے ہندو شاگرد کی تعلیم کا اُسی طرح خیال تھا جس طرح مُسلمان شاگرد کی بہبود کا فکر تھا۔ حالات ہمیں بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں ہندو مسلمان کی چنداں تمیز نہیں تھی، ایک اخوت تھی۔ برادرانہ

تعلقات تھے۔ مودّت اور یگانگت تھی۔ اور آج جو تلخی ہندوستان میں پائی جاتی ہے اس کا نام نشان بھی موجود نہ تھا۔
اس سلسلے میں یہ عرض کرنا بے حد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان کے بعض حلقوں میں حقیقت رائے کے افسانے کو جو ترویج و اشاعت حاصل ہو رہی ہے۔ اس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں۔ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے اپنی کتاب "ٹرانسفارمیشن آف دی سکھز" میں اس موہوم افسانے کو تاریخی رنگ دینے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیں اطمینان ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان کا بیان ہے کہ "اس قصہ کا ذکر انگریز مورخین نے نہیں کیا صرف ملک راج بھلا جو موجودہ صدی کے ایک پنجابی مصنف ہیں اس حکایت کو بیان کرتے ہیں۔ اور اس زمانے کے ایک پنجابی شاعر ملکھی رام نے اس کو منظوم کیا ہے" اور بس۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ سوائے منشی سوہن لال مصنف عمدۃ التواریخ کے جو خود مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقائع نویس تھے۔ فارسی مورخین میں کسی نے اس افسانہ کا ذکر نہیں کیا یہ واقعہ بقول ڈاکٹر نارنگ صاحب محمد شاہی عہد میں وقوع پذیر ہوا ہے۔ لیکن اس کے بعد بیشمار مورخین نے مستند تاریخی کتابیں لکھی ہیں۔ ان سب کی خاموشی یہ کہہ رہی ہے کہ اس افسانے کا کوئی سراغ نہیں۔ اور موجودہ عہد کے خود غرض لوگوں نے اس کو خاص مقاصد سے رواج دیا۔ ورنہ حقیقت میں "حقیقت رائے" کا قصہ تاریخی نہیں +

حقیقت رائے کا قصہ یہ ہے۔ کہ ایک مسلمان استاد نے سیالکوٹ کے شہر میں حقیقت رائے پر اسلام کے متعلق ہتک آمیز الفاظ کہنے کے عوض۔ قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا تھا۔ جس پر قاضی نے اس کو پھانسی کی سزا دی لیکن ہمارا دعویٰ ہے۔ کہ اس زمانے میں ہندو شاگردوں اور مسلمان اساتذہ میں جس قسم کے تعلقات قائم تھے وہ آج موجود نہیں۔ مسلمان استاد اپنے شاگرد کا روحانی باپ ہونے کی حیثیت سے اس کی بہبود و رفاہ کا دل سے خواہشمند ہوتا تھا۔ اور تلمیذ استاد کو اپنا روحانی خیال کرتے ہوئے عزت و احترام سے تھے اس کے قدموں پر نچھاور کرتا تھا ذیل میں بعض اقتباسات ہیں جو مسلمان اساتذہ اور ہندو شاگردوں کے تعلقات باہمی پر روشنی ڈالتے ہیں +

خان آرزو مجمع النفائس میں اپنے ہندو شاگردوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔

شہود تخلص رائے است مہذب۔ منسوب از قوم کائستھ . . آبا و اجدادش ہمیشہ در سرزمین بنگالہ و بہار بعمدگی امتیاز داشتند۔ بوساطت خط عزیز القدر خوشگو با فقیر آرزو ملاقات نمودہ۔ خیلے حدید الفکر و جید الطبع بنظر آمد ہنوز اول مشق است اگر مساعدت روزگار رفیق دست و پا پیدا ساخت در بپایۂ اعلیٰ برسد۔ انشاء اللہ تعالیٰ الخ

عشرت۔ سازمرا بہ کتہ ہ برادر۔ خیلے جوان اہلے است۔ خدا از چشم مردم خودش نگاہدارد۔ بیچارہ مرد

غریبے با ذوائے ست　　　الخ

خوشگو　　. . از مدت بیست و پنج سال تخمیناً باین ہیچمدان ربط کلی بہم رسانیدہ و این عاجز ہم در تربیت او تقصیر از خود راضی نشدہ و نیست"

انندرام مخلص کے تعلقات خان آرزو کے ساتھ دوستانہ بھی تھے اور مربیانہ بھی۔ خان آرزو لکھتے ہیں:-

پھتری۔ خوش اخلاق۔ باعث بودن فقیر آرزو شاہ جہان آباد دہلی اخلاص اوست　الخ

تذکرہ نشتر عشق میں لکھا ہے:- کہ "چوں در ۱۱۳۲ھ (آرزو) در دار الخلافہ شاہ جہان آباد وارد شد۔ اور با انندرام مخلص اتفاق مصاحبت افتاد۔ بمناسبت طبع و حق آشنائی برائے خان متاَّرالیہ جاگیر و منصب و خطاب استعداد خانی از حضور حضرتِ جہانبانی حاصل نمود۔ نیز خدمت گزاریئے خان موصوف از خود سے نمود"

بندرابن داس خوشگو نے ایک تذکرہ لکھا ہے۔ جس کا نام سفینہ ہے۔ اُس میں وہ جہاں کہیں خان آرزو کا نام لیتا ہے۔ خان صاحب قبلۂ نیازمندان کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ انندرام مخلص کے رقعات میں بھی انتہائی خلوص اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے جو اسے خان آرزو سے تھی۔

ہندو شاگردوں کی مسلمان استادوں کے ساتھ عقیدت

شفیق اورنگ آبادی کو اپنے استاد آزاد بلگرامی سے کمال عقیدتمندی تھی اور جہاں کہیں تالیفات میں ان کا ذکر آیا ہے۔ اُن کا نام بڑے ادب و احترام اور خلوص و ارادت سے کیا ہے۔ اور ہر جگہ انہیں "میر صاحب قبلہ" "پیر و مرشد" یا "قبلۂ و کعبۂ برحق" اور اپنے آپ کو غلام لکھا ہے۔ گل رعنا (جو شاعروں کا تذکرہ ہے) میں آزاد کا تذکرہ نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنے کلام میں جابجا حضرت کے کمال اور اپنے تعلقات و عنایات کا ذکر کیا ہے۔ ایک پرزور قصیدہ ان کی مدح میں لکھا ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے:- ؎

قبلۂ ہر دو جہاں، مرشد ارباب سلوک　　ختم ہے ذاتِ مبارک پہ کرم فرمائی

ایک بدری غزل آزاد کی مدح میں لکھی ہے۔ جس کے کچھ اشعار یوں ہیں:-

سرور ہر دو جہاں آزاد ہے　　والیٔ کون و مکاں آزاد ہے
کنت کنزاً کے معانی پر خبر　　واقفِ سرِّ نہاں آزاد ہے

مرکزِ ادوارِ چرخِ عنبری قطب الاقطاب زماں آزاد ہے

ایک فارسی غزل کے اشعار یوں ہیں :-

لامکان است مقام آزاد فوقِ عرش است خرامِ آزاد

صاحبِ ہر دو جہاں ہست شفیق ہر کہ گردید غلامِ آزاد

ہم خوفِ طوالت سے شفیق کی تالیفات میں سے زیادہ مثالیں نہیں پیش کر سکتے۔ ورنہ بے شمار غزلیں ایسی موجود ہیں۔ جن کے ہر ہر حرف سے ارادت و عقیدت کے جذبات مترشح ہو رہے ہیں ؛

اسد اللہ خان غالب اور منشی ہر گوپال تفتہ کے تعلقات بے حد گہرے تھے۔ میرزا ہر گوپال کو از رہ شفقت میرزا تفتہ کہا کرتے تھے۔ اُردوئے معلےٰ میں میرزا کے بے شمار خطوط تفتہ کے نام لکھے ہوئے موجود ہیں۔ میرزا کو تفتہ سے بے حد محبت تھی۔ اور تفتہ بھی اپنے استاد پر جان چھڑکتے تھے۔ اُردوئے معلےٰ کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ناداری کے ایام میں تفتہ میرزا کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے چنانچہ لکھا ہے :-

" سو روپے کی ہنڈی وصول کر لی ۔ ۲۴ روپیہ داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیئے ۔ پچاس روپے محل میں بھیجد یئے ۔ باقی ۲۶ رہے وہ بکس میں رکھ لیئے . . خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے " (اُردوئے معلےٰ طبع مبارک علی صفحہ ۶۲)

مجبورِ زیست

خردمند و ! خرد سے دُور ہوں میں بہت خوش ہوں بہت مسرور ہوں میں

میری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو کہ جینے کے لئے مجبور ہوں میں

نہیں کرتا عزیزوں کی شکایت عزیزو ! ہاں بہت مغرور ہوں میں

میری دُنیا کا سرمایہ ہے عقبےٰ بڑی تنخواہ کا مزدور ہوں میں

کسی نے بھی نہ پہچانا وطن میں میں سمجھا تھا بہت مشہور ہوں میں

نہیں ہوں لائقِ تسنیم و کوثر خرابِ بادۂ انگور ہوں میں

حفیظ

آشیانۂ بلبل

از تھیوفیل گاتئیر

(مترجمہ تبسم۔ ایم اے)

قلعے کے پاس ایک خوبصورت باغیچہ تھا۔

باغیچے میں بلبل، کستورا، چڑیا سبھی قسم کے جانور تھے۔ ان سب پرندوں نے وہاں بسیرا کیا تھا۔ بہار کے موسم میں باغیچے میں ایک شور برپا ہوتا کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ ہر پتے میں ایک آشیانہ تھا اور ہر درخت تھئیٹر کی نغمہ گاہ بنا ہوا تھا۔ یہ گانے والے پرندے اپنی دل آویز راگنیوں کا مقابلہ کرتے رہتے۔ کوئی چہچہاتا کوئی کوکو کرتا، کوئی گٹکری لیتا تو کوئی راگ الاپتا، بعض ترانہ بجاتے تو بعض تانیں اڑاتے، پختہ مشق مطرب اُن کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔

لیکن قلعے میں دو حسین بہنیں رہتی تھیں جن کے نغمے اس باغ کے پرندوں سے کہیں زیادہ دلکش تھے، ایک کا نام فلوریت تھا دوسری کا نام ازابو، دونوں کی صورت بیحد جاذب تھی۔ اتوار کے دن جب وہ خوبصورت پوشاک زیب تن کرتیں تو اُن کی رعنائی کا کچھ اور ہی عالم ہوتا۔ اگر ان کا سفید سفید جسم نظر آتا تو دیکھنے والوں کو بیتک اُن پر فرشتوں کا گمان ہوتا۔ ان میں اور فرشتوں میں صرف یہ فرق تھا کہ ان کے پر نہ تھے۔ جب وہ گاتیں تو اُن کا بوڑھا چچا مولوریر اُن کا ہاتھ پکڑ لیتا اس خیال سے کہ کہیں وہ اپنے تئیں فرشتے تصور کر کے اُڑ نہ جائیں۔

فلوریت اور ازابو کے اوصافِ حسن کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ ان کے شیدائیوں نے کتنے موقعوں پر اپنی جوانمردی کے جوہر دکھانے کا تہیہ کیا ہوگا تاکہ میدانِ عشق پر فتحیابی حاصل کر کے ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیں۔ ان کی صورت اور سیرت کا شہرہ تمام یورپ میں تھا۔ لیکن اس شہرت نے اُن کی سادگی طبع کو خود بینی سے آشنا نہ ہونے دیا تھا۔ وہ بالکل گوشہ نشین تھیں اور ان کی نظریں اپنے فرسودہ بزرگ چچا اور خورد سال حسین ہسپانی ولنٹیٹن کے سوا کسی پر نہ پڑتی تھیں۔

اُن کا وقت پرندوں کے ترانے سننے، عود بجانے، فن کے استادوں کی کتابوں کے مطالعہ اور مختلف راگوں

وہ بیمار نغمہ تھیں، وہ خواب دیکھتیں تو نغمے کا، ان کی غذا تھی تو نغمہ، دنیا میں نہیں کسی اور شئے سے الفت نہ تھی۔ ہاں وہ ولینٹن کو چاہتی تھیں اور پھولوں کو پسند کرتی تھیں، ولینٹن کو اس لئے کہ وہ پھولوں سے ملتا جلتا تھا، اور پھولوں کو اس لئے کہ وہ ولینٹن سے ملتے جلتے تھے، مگر یہ جذبہ محبت اظہار سے ناآشنا تھا، کیونکہ ولینٹن کی عمر ابھی تیرہ سال کی تھی۔ ان کی انتہائی خوشی اسبات میں تھی کہ وہ شام کو کھڑکی میں کھڑے ہو کر وہ راگ الاپیں جو انہوں نے دن کو موزوں کیا تھا، دُور دُور سے بڑے بڑے مشہور کامل فن اُن کا گانا سننے اور مقابلہ کرنے کے لئے آتے لیکن اُن کی ایک تان سننے پر ہار مان جاتے اپنے ساز توڑ ڈالتے اور نغموں کے نقشوں کو پھاڑ دیتے۔ حق تو یہ ہے کہ اُن کے نغمے کچھ ایسے دل آویز تھے کہ آسمان سے ملائک زمین پر اُتر آتے اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر اُن کے راگ سنتے اور راز بر کر لیتے۔ تاکہ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں جا کر گائیں۔

مئی کا مہینہ تھا، شام ہو چکی تھی، دونوں بہنوں نے مل کر راگ الاپنا شروع کیا، دنیا کے کان اس نغمے سے پہلے کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ باغ میں ایک بلبل شاخِ گل پہ بیٹھی ہمہ تن گوش تھی، راگ ختم ہوا تو وہ اڑ کر کھڑکی میں آ گئی اور اور اپنے طائرانہ لہجے میں بولی،

”میں تم سے مقابلہ کرنا چاہتی ہوں“

بہنیں بولیں ”ہم تیار ہیں گاؤ“

بلبل نے گانا شروع کیا، وہ سب بلبلوں سے اچھا گاتی تھی۔ گاتے وقت اُس کی گردن کی رگیں پھول گئیں، اُس کے پر پھڑپھڑائے، اُس کا سارا جسم کانپ اُٹھا، اُس نے ترانہ، گٹکری، ترنم، رنگین نغمہ سبھی کچھ گایا۔ وہ اڑی اور پھر آ کر بیٹھی، اس کے سُروں اور تانوں میں بے حد پاکیزگی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آواز بھی اُس کے پروں کی طرح اڑ رہی ہے وہ آخرکار تھم گئی گویا بازی جیت گئی تھی۔

اب دونوں بہنوں نے گانا شروع کیا، ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ بلبل کا گانا اُن کے مقابلے میں چڑیا کا بول تھا۔

شکست کھائے ہوئے مغنی نے پھر گانا شروع کیا، پہلے ایک عشقیہ راگ گایا پھر ایک نہایت دلکش گٹکری لی اس پر بلند آہنگی سے تانیں اڑائیں۔ انسانی آواز وہاں تک نہ پہنچ سکتی تھی۔

دونوں بہنوں کو جنبش تک نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنی نغمے کی کتاب اُٹھائی اور بلبل کے ترانے کا وہ جواب دیا کہ آسمان پر راگ کی دیوی کا چہرہ رشک سے زرد پڑ گیا، اور ساز اس کے ہاتھوں سے گر پڑا۔

بلبل نے پھر گانے کی کوشش کی، لیکن مقابلے میں اس کی طاقت جواب دے چکی تھی - پیہم کوشش کے باوجود اُس کا سانس رُک گیا، پر جھک گئے، آنکھیں بند ہو گئیں، وہ جاں بلب تھی - بولی

تم نے مجھ سے بہتر گایا، میرا غرور کہ میں تم سے بہتر گا سکتی ہوں میری موت کا باعث ہوا ہے - میری تم سے ایک التجا ہے، میرا گھونسلا "تالاب کے پاس کھلی روش پر نسرین کی شاخوں میں ہے اس میں میرے تین بچے ہیں کسی کو بھیج کر اُن کو منگا لینا یہاں لا کر اُن کو اپنی طرح گانا سکھانا، میں تو اب دنیا سے جا رہی ہوں ع

یہ کہہ کر وہ مر گئی، دونوں بہنیں اُس کے مرنے پر بہت روئیں - وہ خوب گاتی تھی! اُنہوں نے خوب صورت بالوں والے ولینٹن کو بلا کر گھونسلے کا پتہ بتایا - ولینٹن بڑا زیرک شوخ لڑکا تھا - فوراً وہاں پہنچا گھونسلے کو اُٹھا چھاتی سے لگایا اور بڑے آرام سے قلعے کی طرف چل دیا، فلوریٹ اور ازابو قلعے کی کھڑکی میں کھڑی اُس کی منتظر تھیں، ولینٹن ہاتھوں میں گھونسلا لئے واپس لوٹا، ننھے ننھے پرندے گھونسلے کے کنارے چونچیں کھولے پڑے تھے، یتیموں کو دیکھ کر دونوں بہنیں آبدیدہ ہو گئیں +

وہ اُنہیں باری باری دانہ کھلاتیں - جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو حسب وعدہ راگ سکھانا شروع کیا، اُن ننھے پرندوں کا سُدھر جانا تعجب انگیز تھا، وہ خوب گاتے تھے - کمرے میں اِدھر اُدھر اُڑتے رہتے کبھی ازابو کے سر پر جا بیٹھتے کبھی فلوریٹ کے کندھوں پر پھر نغمے کی کتاب کے سامنے آ کر بیٹھ جاتے +

اُن کا راگ سریلا اور پاکیزہ تھا گویا وہ سروں کو پڑھ سکتی تھیں، فلوریٹ اور ازابو کے تمام راگ ختم کر چکنے پر انہوں نے بہت سے سُر خود ایجاد کئے +

دونوں بہنیں زیادہ خلوت میں رہنے لگیں - رات کو اُن کی خواب گاہ دلکش نغموں سے گونج اُٹھتی تھی - اِس مجلس سماع میں بلبلیں بھی شامل ہوتیں - استاد، شاگرد سبھی ماہر ہو گئے تھے +

ان کی آواز کا رسیلا پن بڑھتا گیا، نغموں کا تموّج قدرتی آواز سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا، دونوں بہنیں نحیف سی ہو گئیں، اُن کے چہرے کے دلآویز رنگ اڑنے لگے، ان کے گالوں پر سنگ یشب کی سی زردیاں چھا گئیں بوڑھے چچا نے گانے سے روکنا چاہا مگر وہ نہ رُکیں +

جب وہ ایک آدھ تان اڑاتیں تو ایک سرخ داغ ان کے گالوں پر پڑ جاتا، پھر بڑھنے لگتا - جب وہ خموش ہو جاتیں تو وہ داغ مٹ جاتا، لیکن ان کے جسم سے سرد سرد پسینہ نکلتا، ان کے لب کانپنے لگتے، جیسے بخار اُتر رہا ہو +

مگر اُن کے نغمے بے حد دلآویز تھے۔ اُن میں اس عالم سفلی کا کوئی انداز نہ تھا۔ وہ نحیف و زار جب بلند آہنگی سے گاتیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سانس آواز کے جوش سے پھٹ جائے گا۔

اس چیز کو انہوں نے خود بھی محسوس کرلیا، صوتی نغموں کو چھوڑ ساز بجانا شروع کیا، لیکن ایک رات کھڑکی کھلی تھی۔ باغ میں پرندے چہچہا رہے تھے۔ ہوائیں دھیمی دھیمی اور ان میں سرسراہٹ تھی۔ نسیم کے جھونکوں میں کچھ ایسا ترنم تھا، کہ وہ تازہ راگ گانے پر مجبور ہوگئیں۔

یہ "راج ہنس" کا راگ تھا، اس راگ کے بول [illegible] انتہا [illegible]

ایک درخشندگی تھی کیا یہ نغمے تھے؟ دل نہ مانتا تھا، ترانوں کا سیلاب تھا بکھرتے ستاروں کی آتشین بارش تھی، ہوا میں الحانی آتشبازی کا نقشہ کھنچ کے رہ گیا تھا۔

اس اثنا میں ان کے چہروں کے سرخ داغ بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ اُن کے رخساروں پر چھا گئے۔

بلبلیں اُنہیں دیکھ رہی تھیں، اُن کے دل غمناک تھے، اُنہوں نے پر پھیلائے، اِدھر اُدھر اُڑیں، اُن کی طبیعت میں ایک اضطراب تھا" دونوں بہنیں گاتی رہیں، وہ راگ کی آخری تانیں اڑانے لگیں، اُن کے نغمے میں بلند آہنگی پیدا ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گانے والا کوئی زندہ جسم نہیں ہے۔

بلبلیں اڑ گئیں، دونوں بہنوں نے جان دے دی، راگ کی آخری تان اُن کی روحوں کی پرواز تھی، بلبلوں نے آخری راگ سُن کر آسمان کا رُخ کیا، بارگاہِ الٰہی میں خبر دی، خدا نے [illegible] انہیں بہشت میں چھوڑ دیا تاکہ بہنوں کی جگہ گانا گایا کریں۔

اِن ہی تین بلبلوں کی روحوں نے بعد میں جلسٹرینہ، مشہور [illegible] کامل [illegible] کی صورت میں جنم لیا۔
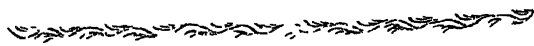
مذہب و فلسفہ

(شیخ احمد فصیح نیازی صاحب)

ازمنۂ ماضیہ سے کیمیاگروں کی ایک کثیر التعداد جماعت اس سعی و کوشش میں سرگرم کار ہے۔ کہ مس کو زریں تبدیل کرنے کے ذرائع معلوم ہو جائیں۔ بلاشبہ نہیں آج تک کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور نہ شائد کبھی ہو سکتی ہے۔ مگر باوجود ناکامی و نامرادی کے ان کی طلب و امید کا وہی عالم ہے جو آغاز میں تھا۔ اس جماعت کے ہمعصر ایک اور جماعت مصروف جدوجہد رہی جس کا مطمح کار یہ تھا کہ اکسیر حیات جس سے زندگی جاودان ہو سکے دستیاب ہو جائے۔ بعینہٖ فلسفیوں کی ایک جماعت نامعلوم وقت سے اس عقدہ کے حل کرنے میں کوشاں ہے کہ آیا کوئی ایسا وجود یا ہستی موجود ہے جسے خدا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس کی قدرت و طاقت لامحدود خیال کی جاتی ہے۔ مشرق کا سالہا سال سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ اس "عالم" کو جو یقیناً اپنی پیچیدگیوں اور صناعیوں میں محیر العقول ہے کوئی بنانے والا ضرور ہے۔ فلسفیوں کی تمام کوششیں ایسے "معمار" کی ہستی و ماہیت کے عرفان و آگہی کے حاصل کرنے پر مرکوز ہیں۔

قدیم حکمائے یونان جن کے خیالات آج اوراق تواریخ میں پڑھے جا سکتے ہیں "مادیت" کے معتقد تھے اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ مادہ کے مختلف صور و اشکال اختیار کرنے سے یہ "عالم" ظہور پذیر ہوا ہے۔ مگر معاً وہ "مادہ" کے "بیچ اصل" کے بھی جویا تھے۔ امتداد وقت نے مادیت کی جگہ دیوتاؤں کو لا کھڑا کیا اس لئے کہ تہذیب و تمدن گو ابھی گہوارۂ طفولیت میں تھا مگر نمودار ہو چکا تھا۔ مادہ پرستوں نے سمجھ لیا کہ بعض مسائل و عملیات محض مادہ ہی کی قدرت و طاقت تسلیم کر لینے سے ثابت نہیں ہو سکتے۔ جب اذہان نے اور ترقی کی اور انسانی دماغ میں اس قدر استعداد و قابلیت پیدا ہو گئی کہ "اعتقادِ اوثان" کی بیہودگی کو سمجھ سکے تو لازمی طور پر دلوں میں ایک دیوتا یا ایک خدا کا خیال جاگزین ہو گیا۔ یہ زمانہ تہذیب و تمدن کے ارتقا کا زمانہ تھا۔

عموماً اس بات کے ثابت کرنے پر دلائل و براہین پیش کئے جاتے ہیں کہ "مذہب" و "فلسفہ" دو جداگانہ ولائتیں نہیں بلکہ دراصل ایک ہی ولائت ہے جس میں بعض کے نزدیک مذہب کی حکمرانی ہے اور بعض کے نزدیک فلسفہ کی۔ آجکل بھی بعض حکمائے مغرب کا یہ خیال ہے کہ ایک خدا کا عقیدہ ان لوگوں کا ترکہ ہے جن کا زمانہ ابھی ارتقا کی ابتدائی منازل میں

تھا۔ ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا اس عالم سے جدا نہیں بلکہ یہ عالم ہی ہے جسے خدا کہا جا سکتا ہے یقیناً یہ عقیدہ رجعتِ قہقری کا نتیجہ ہے۔ اگر حکمائے یونان کی دماغی نشو و ترقی اُن حکماء کے ہم پلہ ہوتی تو وہ بھی عقیدۂ مادیت کو انہی الفاظ میں پیش کرتے +

بہر حال، مقام شکر ہے کہ اب یہ خیال برروئے ترقی ہے کہ مذہب و فلسفہ یہ دو ایسی چیزیں نہیں جو کبھی علیحدہ ہو سکیں ہر وہ نظریہ و عملیہ جو مذہب میں صحیح اور حقیقت پر مبنی ہو فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے غیر صحیح و غیر حقیقی نہیں ہو سکتا۔ مگر باوجود اس غضب کی مناسبت کے فلسفہ و مذہب ایک اصطلاح تصور نہیں کی جا سکتے۔ ایک مسئلہ کے اثبات و نفی میں جو ذرائع اختیار کئے جائیں گے وہ ہر دو صورتوں میں مختلف ہوں گے۔ ممکن ہے کہ برآمد شدہ نتائج بھی مطابقت نہ رکھیں جو نتائج فلسفہ کی رو سے اخذ کئے جائیں یہ ضروری نہیں کہ مذہب میں نہائت اہم سمجھے جائیں مگر برعکس اسکے وہ نتائج جو مذہبی نکتہ نگاہ سے اخذ کئے گئے ہوں اور اپنے اندر کامل صحت و حقیقت رکھتے ہوں حقائق فلسفیہ و حکمیہ کا اہم جزو بن سکتے ہیں +

یہ مسئلہ متعدد پہلو رکھتا ہے۔ جس کے ہر پہلو پر ایک بسیط مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ مگر میں ان مختلف پہلوؤں پر نہائت اختصار کے ساتھ بحث و نظر کروں گا۔ بہر حال میرا روئے سخن زیادہ تر "اصولِ وحدت" کی طرف ہوگا۔ بلاشبہ یہ مضمون فلسفیانہ رنگ میں ہوگا اور جو نتائج اخذ کئے جائیں گے ممکن ہے کہ بعض حضرات کو ناگوار معلوم ہوں۔ مگر میں ان حضرات سے مستدعی ہوں کہ میری اس مختصر تحریر کو ٹھنڈے دل سے اور مفکرانہ انداز میں پڑھنے کی کوشش کریں "مادیت" کا نظریہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس کا یہ مفہوم ہے کہ روح درحصل کوئی چیز نہیں۔ صرف مادہ ہی تعمیر عالم کا ذمہ دار و کفیل ہے اس کی کثافت و لطافت ہی میں مختلف اشکال و اجسام کی نمود کا راز مضمر ہے۔ مادہ صرف تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے ٹھوس، مائع، اور گیس۔ کبھی تو یہ ایک کوہِ فلک بوس بن کر نظر آتا ہے کبھی ابر بن کر مطلع آسمان پر چھا جاتا ہے کبھی قطرات باراں میں جھلکنے لگتا ہے۔ اور کبھی [illegible]۔ کبھی حدت۔ کبھی حرکت۔ کبھی خیال۔ کبھی نفرت کبھی محبت، میں جلوہ فگن ہوتا ہے۔ جس طرح پانی اور برف ایک شئے ہے جس نے دو صورتیں اختیار کی ہوئی ہیں اسی طرح جسم انسانی اور [illegible] کی پوشاک دونوں ایک ہی چیزیں ہیں جو دو صورتوں میں منتقل ہے۔ خیالات جو نظم میں منسلک ہو جاتے ہیں، اور حسد و عداوت جو [illegible] وخون میں پیدا ہو جاتی ہے یہ تمام چیزیں دراصل ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں۔ مادہ پرست یہ دعوے کرتے ہیں کہ احساسات و جذبات مادہ کا نتیجہ ہیں +

اگر مادہ پرست ان عناصر کے امتزاج و التیام سے جو موجودہ علمائے کیمیا کی روسے کثیر التعداد ہیں تعمیر عالم منسوب کرتے ہیں تو اس صورت میں وہ "وحدتِ مادہ" کے قائل نہیں رہ سکتے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان عناصر کی ترکیب کیسے عمل

میں آئی۔ اور اُن کا امتزاج کیوں کر ہُوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر کیمیاوی امتزاج[1] وافتراق[2] کے لئے طاقت[3] کا صرف ہونا یا خارج ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ علم کیمیا میں اسی نظریہ کا نام "تصرف طاقت" ہے۔ اِس سوال کا جواب جو عموماً دیا جاتا ہے یہ ہے کہ مادہ "بذاتہٖ[4] خود طاقت" ہے۔ اس لئے کہ ذرات یا سالمات[5] مادہ جب اور چھوٹے ذروں میں تقسیم کئے جاتے ہیں (تشتتِ سالمات[6] کا نظریہ) تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایلیکٹرونز (برقی ذرات مادہ) ایک غیر متناہی جنبش میں مصروف ہوتے ہیں اُن کی اس حرکت سے واضح ہے کہ مادہ سراپا برقی طاقت ہے۔ آج علمائے کیمیا کو جو دقّت درپیش ہے وہ یہی ہے کہ اگر مادہ کو سراپا برقی طاقت تسلیم کر لیا جائے تو مادہ وجود سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور اس کی صفات کہ اس کا ظرف کے ساتھ ازلی وابدی تعلق ہے اور حواس خمسہ کے اندر محدود ہے قائم نہیں رہتیں۔ اس لئے کہ طاقت ایک غیر مرئی اور خارج از جسم شئے ہے۔ یہاں آ کر مادہ پرست کی حالت قابلِ دید ہوتی ہے۔

مادہ پرست بزعم خود سمجھتا ہے کہ بغیر کسی معمار کے آب و گل (مادہ) خود بخود ایک محل تیار کر سکتے ہیں۔ اِسکو نقش و نگار کے ساتھ مزین و دلکش بھی بنا سکتے ہیں، اور پھر اُس کے مکین بھی تیار کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک ذہنی عمل ہے جس کی واقعیت کے ساتھ دور کی بھی نسبت نہیں جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کس طرح مادہ مختلف عناصر سے جو اپنی سادگی ساخت میں اظہر من الشمس ہیں اس قدر پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے تو اکثر یہی جواب دیتا ہے کہ مادہ عناصر سے ترکیب پا کر ایسے ہی پیچیدہ اور مختلف صورت اختیار کر لیتا ہے جیسے ایک تخم ذرات کی ایزادی و امتزاج سے ایک درخت کی صورت و جسامت میں نمودار ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ درخت کا جسم ان ذرات کی ترکیب والتیام سے حاصل ہُوا ہے جو زمین اور ہوا میں موجود تھے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ ان ذرات کی ترکیب کی ذمہ دار وہ طاقت ہے جسے اصطلاح عام میں حیات یا زندگی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جو دانہ میں موجود تھی۔ یہی حیات یا زندگی تھی۔ جس نے ذرات ہوائیہ و ارضیہ کا انتخاب کیا اور پھر اسکو مادۂ شجریہ میں منتقل کیا۔

یہ ایک حقیقت ہے جس سے ایک انصاف پسند مادہ پرست بھی انکار نہیں کر سکتا کہ کارخانۂ عالم محض مادہ اور اُس کے تجزیہ و ترکیب کا مرہون منت نہیں بلکہ وہ فطرتی طاقتیں بھی ہیں جو اس کے اندر کام کر رہی ہیں۔ اور جو ان عملیات کی ذمہ دا

ہیں - یہ طاقتیں کیمیاوی - حیاتیاتی - باطنی - جذباتی اور ارادی طاقتوں پر مشتمل ہیں - مادہ پرست کے پاس کیا دلائل ہیں کہ قوائے مادہ سے ماخوذ ہیں - کیا تلغرام یا برقیہ تانبے کی تار سے پیدا ہوتا ہے - اور کیا وہ تار اس کے پہنچانے کی ذمہ دار ٹھہرائی جاتی ہے کیا ذرات لونیہ خود بخود ممتزج ہوکر ایک تصویر کی شکل میں نمودار ہوجاتے ہیں - یا کوئی مصوّر ہے جس کا ہاتھ اس عمل کا ذمہ دار ہے - فن تعمیر کیا مٹی - چونہ اور خشت ہے ؟ نہیں - بلکہ اس سے مقصود معمار کے وہ ذہنی مخصوصہ اور مجوزہ قوئے ہیں جو مٹی چونہ اور خشت کی ترکیب و تعمیر پر حاوی ہیں - عالم مادہ نہیں بلکہ تجویز و تعمیر شدہ مادہ کا نتیجہ ہے اور تعمیر و تجویز کرنے والا وہ معمار حقیقی ہے جس کو "خدا" کے نام سے پکارا جاتا ہے ؛

نظریہ نشو وارتقاء[1] کے معتقدین کہتے ہیں کہ تمام حیوانات و نباتات جو آج اپنی ساخت اور شکل وصورت میں نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں - ابتدائی منازل میں نہائت سادہ تھے - یہ ارتقاء ماحول کے تغیر و تبدیل کے باعث عمل میں آیا - یعنی وہ "فرینش مخصوص"[2] کے قائل نہیں - وہ اس ارتقا کے سلسلے کی پہلی کڑی "امیبا"[3] کو گردانتے ہیں - یہ ایک آبی جانور ہے جو صرف ایک "خلیہ"[4] پر مشتمل ہے - اس کا "نخرمایہ"[5] نہائت ہی مختصر اور سادہ ہے - یہ جانور غیر مسلح آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا - ان کا خیال ہے کہ امیبا کے ماحول میں تغیر آگیا اور اُسے ضروریات زندگی ایسی پیش آئیں کہ وہ جماعتوں کی صورت میں رہنے پر مجبور ہوگئے - جماعتی زندگی کے ساتھ ہی تقسیم کار کا سوال پیدا ہوگیا - لازمی طور پر تقسیم کار نے اعضا کی تشکیل کا آغاز کردیا - چنانچہ اسی طرح بڑھتے بڑھتے ترقی یافتہ حیوانات و نباتات کا ظہور ہوتا گیا - اگر اس نظریہ کو مان بھی لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ امیبا کی خلقت کا کون ذمہ دار ہے - یعنی نخرمایہ جو سرچشمۂ حیات خیال کیا جاتا ہے کس طرح پیدا ہوا اِس کے پیدا کرنے والا کون تھا ؛

بلاشبہ اگر نخرمایہ (پروٹو پلازم) کی ماہیت معلوم ہوجائے اور حکماء کیمیا اسے معمل میں تیار کرنے پر قادر ہوجائیں تو اسرار حیات آشکار ہوجاسکتے ہیں - مگر یہ یاد رہے کہ خدائی ہستی اس کیمیاوی انکشاف سے باطل نہیں ثابت ہوسکتی تاہم مادہ پرست جس کی گردن ہر ادنے سے ادنے سوال پر جھک جاتی ہے اپنی سرکشی پر ناز کرسکتا ہے - موجودہ علماء ارتقاء جو مادیت کے نہ صرف قائل ہی ہیں بلکہ بڑی شدومد کے ساتھ اس کی نشر و تبلیغ میں مصروف کار ہیں ماہیت حیات کی گتھی کو کیمیاوی اصول و مبادیات کے ماتحت سلجھانا چاہتے ہیں اور یہ ان کا دعوےٰ ہے کہ ماہیت حیات کا مسئلہ عنقریب حل ہوا چاہتا ہے ان کا خیال ہے کہ ذی حیات اور غیر ذی حیات اجسام کے مابین خط فاصل نہیں کھینچا جاسکتا وہ کہتے ہیں کہ جب

---

(1) Evolution (2) Theory of Special Creation (3) Amoeba (4) Cell (5) Protoplasm

ہم دیکھتے ہیں کہ کم ترقی یافتہ مخلوق ترقی یافتہ مخلوق میں تبدیل ہو رہی ہے اور اس سلسلۂ ازلی و ابدی کی متعدد درمیانی کڑیاں موجود ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ واقعی کیمیاوی اجزا جن کی ترکیب و تحلیل ازمنۂ ماضیہ میں جس وقت کہ محض غیر جاندار مادے کے ذرات موجود تھے عمل ارتقا میں مصروف تھی بتسلسل ترقی حاصل کرتے ہوئے ایسے پیچیدہ مادہ پر منتج ہوئے جو اب ان اجزاء سے معمل میں انسانی ہاتھ تیار نہیں کر سکتے :

اس میں شک نہیں کہ کیمیاوی مرکبات میں ارتقا جاری و ساری ہے مگر یہ ارتقا اس نوعیت کا نہیں جو تخم مایہ کی آفرینش کے آغاز میں تھا یقیناً یہاں دو سوال پیش ہوتے ہیں:-

۱- وہ کونسی طاقت تھی اور اب بھی ہے جو ان اجزا کی ترکیب و تحلیل کی ذمہ دار ہے *

۲- جب یہ مادہ اُس وقت تعمیر ہو سکتا تھا - کیا اِس وقت تعمیر نہیں ہو سکتا *

پروفیسر گڈرچ جو موجودہ علمائے حیاتیات میں سب سے بلند پایہ ماہر ارتقا ہے لکھتا ہے کہ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بہت سے خواص جاندار اور غیر جاندار اجسام میں مشترک ہیں - صرف یہی ایک فرق کہ جاندار " تناسل " کی قدرت رکھتا ہے اور غیر جاندار اس سے قطعی محروم ہے - انیسویں صدی کے ایک مشہور عالم[1] حیاتیات کا مضحکہ خیز نظریہ ہے - کہ اگر انجن چھوٹے چھوٹے انجن پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں اور انجن خانہ کے باہر اُن کے بچے کھیلتے نظر آئیں تو ہم اُسے جاندار کہنے میں ذرا تامل نہیں کریں گے *

بہرحال پروفیسر گڈرچ کہتا ہے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا بڑا جانور (مثلاً بکٹیریا) قرنہا قرن کے نشو و ارتقاء کا نتیجہ ہیں - جس کی ابتدائی منازل یا تو ابھی معلوم نہیں ہوتیں یا ضائع ہو چکی ہیں - اور معلوم نہیں ہو سکتیں - " علمائے متحجرات[2] نے آثار حیاتیہ سے حیوانات و نباتات کے ارتقاء کا سراغ لگایا ہے - مگر وہ زمین کے کسی طبقہ میں ایسے جانوروں کے آثار جو صرف ایک خلیہ پر مشتمل ہوں اور کوئی ہڈی و تحجرہ نہ رکھتے ہوں نہیں حاصل کر سکے - تخم مایہ جو ایک لعابی مادہ ہے عظام کی طرح قائم نہیں رہ سکتا - جونہی اس کے سالمات کی ترکیب میں خلل آ جاتا ہے عمل تجزیہ کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا ہے - پس یہ ناممکن ہے کہ تخم مایہ کی ابتدائی حالتیں ہڈیوں کی طرح آثار متحجرہ کی صورت میں قائم رہتیں - اور ہم ان کا دیگر آثار کی طرح مطالعہ کر سکتے "

---

[1] سموئل بٹلر Samual Butler

[2] Palaeontologist

"عملِ تناسل"[1] جو ذی حیات اجسام کے ساتھ مختص ہے ان مرکبات کیمیاوی کا نتیجہ ہے۔ جن سے ان کا وجود ظہور پذیر ہے۔ یہ مرکبات کسی غیر جاندار جسم میں موجود نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جاندار اور غیر جاندار میں صرف یہی فرق ہے کہ پہلا ایسے مرکبات پر مشتمل ہے جو نہائت پیچیدہ ہیں اور دوسرا سادہ اور مختصر مرکبات کا نتیجہ ہے۔ آج سے چند سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہر وہ مرکب جو جاندار مادہ میں موجود ہے معمل میں تیار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اب چند ایسے مرکبات جو حیوانات میں موجود ہیں معمل میں تعمیر کئے جا چکے ہیں۔ مثلاً یوریا جس کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہ حیوانات میں پایا جاتا ہے اس لئے یہ مصنوعی طور پر تیار نہیں کیا جا سکتا۔

"جاندار مرکبات"[2] میں سب سے زیادہ جو پیچیدہ مرکب ہے اور جس پر حیوانات و نباتات کی حیات کا تمام تر انحصار ہے "پروٹین"[3] ہے۔ کیا پروٹین معمل میں تیار ہو سکتا ہے۔ پروفیسر گڈرچ اعتراف عجز کو ان الفاظ میں ادا کرتا ہے "جب یہ زمین اس قابل ہو گئی کہ اس پر حیوانات و نباتات زندہ رہ سکیں تو اجزائے کیمیا کی ترکیب و تحلیل کا آغاز ہوا۔ مختلف مرکبات پیدا ہوئے۔ کچھ مرکبات جو غیر قائم فطرت کے تھے جلد ضائع ہو گئے۔ اور جو اُس خاص ماحول۔ آب و ہوا۔ حرارت و رطوبت میں قائم رہ سکتے تھے ارتقا کی منازل طے کرنے میں مشغول ہو گئے۔ چنانچہ اُن سے جو جلد تخم مایہ کی حالت پر پہنچ گئے وہ اپنے عجیب و غریب خواص کے باعث ماحول کے تخریبی اثرات سے مامون و مصئون ہو گئے، اور جو اس حالت تک نہ پہنچے تھے یا کسی دوسری جانب ترقی کر رہے تھے تلف ہو گئے۔ کون وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس وقت زمین کی کیا حالت تھی۔ ماحول کی کیا کیفیت تھی اور آب و ہوا میں کیا خصوصیت تھی جو اجزائے کیمیا نے سلسلۂ ترکیب والتیام کی آخری اور مقصود کڑی کو جا لیا۔ ممکن ہے اُس ماحول اور آب و ہوا کا پھر کبھی اعادہ نہ ہو اور علمائے کیمیا ان اجزا سے تخم مایہ (یعنی پروٹین) ہمیشہ کے لئے تعمیر نہ کر سکیں"۔

---

[1] "عمل تناسل" کا آغاز۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایمبا مقدار غذا اپنے جسم کی بیرونی سطح کے مطابق حاصل کر سکتا ہے۔ فرض کر لیں کہ اسکے ماحول (یا پانی) میں غذا کافی مقدار میں موجود ہے اور وہ اسکو حاصل کر رہا ہے اور بڑھ رہا ہے جیسے جیسے اسکا جسم بڑھتا جائیگا اسکی ضروریات حصول غذا بڑھتی جائینگی۔ مگر اسکے جسم کی سطح اتنی کافی نہیں ہوتی کہ وہ مطلوب مقدار کی غذا حاصل کر سکے۔ اس لئے کہ اس کا جسم یا تو مکعب کا ہوتا ہے یا مدور۔ چنانچہ حیدرٹی کے اصول کے ماتحت دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اب اگر پانی کے قطرہ کو دو قطروں میں تقسیم کر دیا جائے تو لازمی طور پر بیرونی سطح میں اضافہ ہو جاتا ہے، اسی تقسیم کو حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے عمل تناسل کہا جاتا ہے۔

[2] Organic Compound

[3] Protein

دوسرے سوال کا جواب جو اکثر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تحلیل و ترکیب کی طاقت و قابلیت اُس برقی توانائی پر موقوف ہے جو ہر ذرہ (سالمہ) میں موجود ہے اگر ان مادہ پرستوں سے پوچھا جائے کہ آخر برقی طاقت کیا شے ہے اور یہ مادہ کو کہاں سے حاصل ہوئی تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ معتقدین مادیت موجودہ سائنس کی روشنی میں چند ایک عملیات اور قوانین فطرت کی ماہیت و کیفیت بتا سکتے ہیں مگر یہ نہیں بتا سکتے کہ زندگی کیا چیز ہے۔ کیوں کہ یہی وہ آئینہ ہے جس میں خداوند عالم کی تصویر جلوہ فگن ہے ٭

انشاءاللہ کسی آئندہ فرصت میں مسئلہ ماہیت حیات پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے گی۔ اگرچہ اس مسئلہ کا نفس مضمون کیساتھ گہرا تعلق ہے مگر بعض طبائع طوالت کی متحمل نہیں ہوتیں۔ اِس لئے جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے اِسی پر اکتفا کیا جاتا ہے ٭

اب ہم اُس گروہ کے عقیدہ پر بحث و نظر کرتے ہیں۔ جس کا یہ خیال ہے کہ یہ عالم محض وہم۔ خیال اور تصوّر کا نتیجہ ہے ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کا سنگِ بنیاد" مادہ' نہیں بلکہ ذہن ہے۔ ذہن میں مادہ کا تقرر ضرور موجود ہے۔ مگر مادہ میں ذہن کا نہیں۔ اب اگر ان دونو عقیدوں کا موازنہ کیا جائے کہ ان میں کونسا بہتر ہے تو یقیناً آخر الذکر عقیدہ بہتر نظر آتا ہے۔ مادہ میں اعتقاد کے بجائے یہ بدرجہا احسن ہے کہ دنیا کو ایک خواب ایک سانحہ اور ایک حادثہ مان لیا جائے۔

یہ عقیدہ بھی رموز عالم کی تشریح کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ ایک دلچسپ عقیدہ ہے مگر گویا ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ مادی دنیا دراصل مادہ سے تعمیر نہیں ہوئی۔ بلکہ محض ذہن کا پرتو ہے۔ کائنات عالم ایک تصویر ہے یعنی مصور اور تصویر دونو ذہن کی مخلوق ہیں۔ ہم یہ کبھی نہیں کہ سکتے کہ مادہ اور ذہن ایک ہی چیز ہیں۔ مادہ مادہ ہے اور ذہن ذہن ہے۔ یہ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ ایک ہی چیز کے دو نام نہیں ٭

اعتقاد" ذہن" میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہمیں جس چیز کا ادراک حاصل ہے اس کے وجود سے انکار کرنے پر مصر ہے انسانی طبیعت اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہاں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس عقیدہ کے مان لینے میں خاموشی اور آشتی کی خصوصیات ضرور پنہاں ہیں۔ اس عقیدہ کی اہم کمزوری یہ بھی ہے کہ یہ مطالعۂ ادراک کے ایک پہلو سے اخذ کیا گیا ہے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں۔" ادراک" کو تسلیم تو کیا جاتا ہے مگر نہائت ہی مشکوک اور ناقابل اعتبار صورت میں۔ دراصل حقیقت سے پہلو تہی کی جاتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ادراک کسی وجود سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی جب تک کوئی شئے موجود نہ ہو ادراک ناممکن ہے تو پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی چیز موجود نہیں۔ جب ہم گرمی یا سردی محسوس کرتے ہیں یا کوئی آواز سنتے ہیں تو ہم یہ کہ سکتے کہ چونکہ نہیں [illegible] نظر نہیں آتیں اسلئے ان کی کوئی ہستی نہیں۔ ادراک سے انکار

نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ ذاتی تجربہ ہے۔ یقیناً یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ مدرکات کی نوعیت بیرونی اشیاء کی کیفیت پر موقوف ہے ادراک بذات خود ایک مستقل شئے ہے +

کسی ایک شخص کے ادراک کو محیط کل تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور حواس کے مدرکات نے نتیجہ اخذ کیا ہو کلیہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ محیط کل وہ قوت مدرکہ جس کو خدا کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے +

کہا جاتا ہے کہ یہ چیزیں دراصل ایسی نہیں جیسی کہ وہ نظر آتی ہیں مگر یہ دلیل نہیں ہوسکتی کہ چونکہ ہم اشیا کی حقیقت واصلیت سے ناواقف ہیں اس لئے ان کی کوئی ہستی ہی نہیں۔ یہ فلسفیانہ عقیدہ روزانہ زندگی میں قابل تعمیل نہیں ثابت ہوسکتا۔ اِس لئے کہ یہ سائنس اور مذہب کی تعلیم کے بالکل متضاد ہے۔ اگرچہ تفحص وتجسس کے نظریئے فلسفہ و سائنس میں مختلف ہیں مگر حقیقت ہر جگہ حقیقت ہے۔ خواہ سائنس کی ولائت میں ہو یا فلسفہ کی۔ سائنس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قوانین فطرت وقدرت کی تلاش کا جذبہ کارفرما ہے۔ اور جو آراء قائم کی جاتی ہیں وہ شواہد قدرت سے کم یا زیادہ مطابقت ضرور رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس عقیدہ (مایا) پر ہم کاربند نہیں رہ سکتے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ "یہ اشیاء بالکل درست ہیں۔ ٹھیک ہیں۔ بجا ہیں۔ مگر ان پر عمل نہ کرنا۔ کیوں کہ یہ ذہنی ہیں ان کا تعلق محض وہم وگمان سے ہے یہ کاروبار زندگی میں درخور اعتماد نہیں۔" "ذہنی" فلاسفر نہ صرف مشورہ دیتا ہے بلکہ خود کاربند رہنا چاہتا ہے۔ مگر باوجود مساعیٔ پیہم کے کاربند نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کے سامنے کوئی دیوار آتی ہے تو وہ دوسرے آدمیوں کی طرح پرے ہٹ جاتا ہے۔ کیوں نہیں اُسے محض ایک ذہنی چیز تصور کرلیتا۔ اور اگر ایسا کرے تو وہ جانتا ہے کہ اپنا سر پھوڑ لے گا +

ایک فلسفی اور غیر فلسفی میں کوئی بہت بڑا فرق نہیں۔ آخر الذکر اگرچہ حقائق اشیاء سے اس صحت کے ساتھ واقف نہیں ہوتا جتنا کہ قبل الذکر ہوتا ہے۔ مگر حقیقت پر دونوں کی نظر ہوتی ہے۔ ایک معقولیت کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے، اور دوسرا سطح پر تیر رہا ہے۔ مگر جو شئے فلسفی کی نگاہوں میں حقیقت ہے۔ وہی شئے اپنے سطحی اوصاف کے ساتھ غیر فلسفی کی نگاہوں میں حقیقت ہے۔ ہر متنفس روحانیت۔ عرفان۔ احساس اور قوت ارادہ سے سرفراز ہے۔ وہ جہاں چاہے انہیں استعمال کرسکتا ہے۔ اُسے ادراک ہے۔ نہ بیرونی طاقتیں بھی موجود ہیں۔ اور ان تمام طاقتوں کا مظاہرہ مادہ کی وساطت کے بغیر نہیں ہوسکتا +

لہذا تین مختلف نوع کے حقائق ہماری عملی زندگی میں کارفرما ہیں۔ یہ ہمارے تجربہ کے مختلف حصص ہیں انہی پر قابل قبول فلسفہ کا سنگ بنیاد رکھا جاسکتا ہے +

۱۔ نفسِ معقول - ۲۔ عوام - ۳۔ مادہ

عوام سے مراد گرد و نواح کے لوگ جو اوضاع و اطوار میں متنوع ہوں مگر بنیادی اوصاف مشترک ہوں مادہ سے مراد ہر وہ شئے جو ذہن سے مختلف و متضاد ہو - روحانی نہ ہو - بلکہ جسمانی ہو اُن کے اور محیط طرف یہ کلیہ نہایت وسیع ہے - اگرچہ اس کے بارے میں اختلاف آراء موجود ہے - مگر ہم ان پر اس وقت بحث نہیں کر سکتے۔

(باقی آئندہ)

احمد رفیع زیدی

نالۂ پابند[1]

نہ کر دلجوئی اے صیّاد میری — کہ فطرت ہے بہت آزاد میری

اسیری سے رہائی پانے والو — تمہیں پہنچے مبارکباد میری

سہارا کیوں لیا تھا نا خدا کا — خدا بھی کیوں کرے امداد میری

مٹا دو مجھ کو لیکن یاد رکھنا — ستائیگی تمہیں بھی یاد میری

فرشتے کیا مرتب کر سکیں گے — بہت بے ربط ہے روداد میری

پسند آنے لگی تھی سربلندی — یہی تھی اوّلیں افتاد میری

کیا پابند نَے نالے کو میں نے — یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

میرے اشعار پر چپ رہنے والے — تیرے حصّے میں آئی داد میری

قضا کا ظلم حد سے بڑھ گیا ہے — خدا سنتا نہیں فریاد میری

خداوندا - قضا نے چھین لی ہے
میرے آغوش سے ارشاد میری

حفیظ

[1] میری بچی۔

مکرم بندہ جناب ایڈیٹر صاحب تسلیم

میرزا غالب کے دو غیر مطبوعہ خط مجھے کہیں سے ملے ہیں - مہربانی فرما کر آپ اپنے مؤقر پرچہ کے کسی سب سے پہلے نمبر میں شائع کردیں - ایک خط کسی قدر ضائع ہوچکا ہے - تاہم با قیات [illegible] سمجھ کر بھیجا جا رہا ہے - یہ دونوں خطوط میرزا احسن علی بیگ کے چھوٹے بھائی کے نام ہیں - وہ بہادر شاہ بادشاہ کے ہم زلف تھے - میرزا احسن علی بیگ مہارانا سجن سنگھ جی سابق والی میواڑ کے جوڈیشل سیکرٹری تھے ۔

(نام)

خطوط حسب ذیل [illegible] -

- بندہ پرور آپ کے [illegible] مسرت اور [illegible] کو عزت ہوئی - یہ جو آپ نے میری ستائش کی ہے صرف آپ کا حسن ارادت ہے [illegible] سزاوار نہیں - ہاں غالب مرحوم البتہ ایسا ہوگا نہ کہ یہ غالب محروم ؎

مردم از من داستان رانند واز دوران چرخ   گشت صرف طعمۂ زاغ و زغن عنقائے من

یہ شعر میرا ہے - غور کیجئے - گمنامی میں اپنے کو عنقا کہتے ہیں - یہاں مضمون کی ترقی ہے - یعنی عنقا مر گیا اور اس کا گوشت چیل کوے کھا گئے - پورے ستر برس کی عمر ہوئی - منہ میں ڈاڑھ دانت کچھ نہیں، کانوں سے بہرا، پاؤں سے اپاہج امراض جسمانی کا ہجوم آلام روحانی کا وفور شعر کیا کہوں نثر کیا لکھوں - اُردو کہتا تھا بہادر شاہ کے واسطے فارسی کہتا تھا اپنے دل کی خوشی کے واسطے - نہ وہ سلطنت رہی نہ وہ طبیعت رہی - آج جیا کل مرا، کل بچا پرسوں چل دیا - زیست کی توقع نہیں ہر دم دم واپسیں ہے ؎

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ   ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

آپ کے خط کا جواب لکھنے کو اپنی سعادت سمجھا - اب جب ادھر سے خط آئے گا ادھر سے جواب اسی طرح لکھا جائیگا

مرگ ناگہاں کا طالب غالب

چارشنبہ پنجم شعبان ۱۲۸۱ھ

نوٹ - اس خط کے ا[illegible] کا حصہ ضائع ہو سکا ہے ۔

ستائش کے سزاوار نہیں، امیر نہیں۔ فقیر ہیں، حکیم نہیں، فقیر کامل نہیں، عالم فاضل نہیں۔ ایک سپاہی زادہ بے علم و ہنر فن آبا سے عاطل و بے خبر۔ طبع میں موزونی خداداد تھی۔ تُک جوڑنے لگا۔ نثر کی طرف طبیعت نے راہ دی۔ اس میں بھی کچھ لکھ لیا۔ اب وہ نظم و نثر کہاں اور میں کہاں۔ بعد ویرانی دہلی کے اردو کا ریختہ یا فارسی کی غزل کہی ہو تو گنہگار ہاں قدیم سے رسم ہے کہ گورنمنٹ کے دربار میں اشعار مدح میری طرف سے نذر گزرتے ہیں۔ البتہ اس قسم کے اشعار کچھ انہی آٹھ برس میں کہے ہیں۔ بھائی ستر برس کی عمر ہوئی کانوں سے بہرا دانتوں سے پوپلا پاؤں سے اپاہج چل چلاؤ لگ رہا ہے شعر کیا کہوں گا۔ میری تصنیفات میں سے جن کا آپ نے اپنے خط میں نام لکھا ہے کوئی نسخہ فقیر کے پاس نہیں۔ اگر کوئی رسالہ مل گیا تو نذر کروں گا۔ میں حیران ہوں [illegible] ساخطہ تھا۔ جس میں مدح و ثنا کے سوا کچھ اور مدعا نہیں۔ سب میں اس کا جواب کیا لکھوں۔ ہاں میں یہ عرض کرتا ہوں کہ [illegible] اس تحسین کے لائق [illegible] ہوں تو جو تعریف آپ نے میری کی ہے وہ سب آپ کی طرف عائد ہوئی۔ خدا تعالیٰ نے تمہیں بہت [illegible] مدارج عالی کو پہنچائے۔ یوں تصور کرو کہ اسد غالب مر گیا، یہ قالب ہے جو [illegible] خط کا جواب لکھا ہے۔

۱۴ شعبان، ۱۲ جنوری سنہ حال

"شاہکار!"

چیخوف سے ترجمہ

از

(سید بادشاہ حسن حیدر آبادی)

شاشا اپنی ضعیف ماں کا اکلوتا لڑکا کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک چیز کو بغل میں دبائے ڈاکٹر کاشلخوف کے دواخانہ میں داخل ہوا!!

" آہا - تم ہو! کہو مزاج کیسا ہے؟" ڈاکٹر نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

شاشا کا ایک ہاتھ سینہ پر تھا اور دوسرے سے آنکھیں مل رہا تھا۔ اُس نے لکنت آمیز لہجہ میں جواب دیا"۔

"میں اپنی . ماں کا ایک لو . . تا لڑکا ہوں —— ہم . دونوں آپ کے بے حد . شکر . گذار ہیں —— آپ نے . میری . جان بچائی ——"

"اس کا ذکر جانے بھی دو" ڈاکٹر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا" ہر سمجھدار ڈاکٹر وہی کرتا جو میں نے کیا۔"

" میں اکلوتا .. لڑکا ہوں" شاشا نے کہا —" ہم ... غریب لوگ .. ہیں — آپ کی محنت . کا ... معاوضہ دینے سے . قاصر ہیں —— پھر بھی یہ . تحفہ آپ . ہماری طرف سے . . . قبول کریں —— یہ مصوری کا ایک نادر شاہکار ہے ———"

ڈاکٹر نے منھ بنا کر کہا —" میرے دوست - اس کی کیا ضرورت ہے۔"

" نہیں .. نہیں —— نہیں" لڑکے نے لکنت کرتے ہوئے کہا" آپ کو قبول .. کرنا ہوگا"

وہ "شاہکار" کے اطراف لپٹے ہوئے کاغذوں کو جدا کرتے ہوئے کہنے لگا ————

" اگر آپ . .. قبول نہ ... کریں گے تو . . ہم . دونوں کو . بڑا رنج ہوگا —
یہ ایک نادر باپ شاہکار ہے —— بہت . قدیم . میرے والد کو .. بڑا

شو .تی تھا - وہ بہت جمع کرتے .تھے ــــ یہ بھی .. انہیں کی .
یادگار ہے ــــ" شاتانسا اب تمام کا غذوں کو علیحدہ کر چکا تھا اُس نے اُس کو میز پر رکھدیا ٭
یہ ایک قریب قریب برہنہ عورت کی سورت تھی - ڈاکٹر اس کو دیکھ کر ذرا متفکر ہو گیا - وہ کھانسا اور گلا صاف کیا - پھر سر کھجاتے ہوئے کہنے لگا ٭

"ہاں یہ سچ ہے کہ یہ شاہکار ہے اور یقیناً مصوری کا ایک شاندار نمونہ ہے ــــ لیکن پھر بھی ــــ سوال یہ ہے ــــ کیا یہ اس قابل ہے کہ ایک ڈاکٹر کے کھلے ڈرائنگ روم میں رہے؟ ــــ"

"افسوس! ڈاک . ٹر تم . . . کو اس .کا مذاق نہیں" شاتاشا نے وہی اپنے لکنت کے لہجے میں کہا" دے . . .کھو اس، .کا جسم کس قدر خوش، .نما ہے ــــ اس کا چہرہ کتنا خوب . . .صورت ہے ــــ آ نکھیں کتنی چمک . دار ہیں - ــــ با لوں کا رنگ . . کیسا نے چرل ہے ــــ دے کھو اس کی مو رت میں کتنی جان ہے ــــ یاد رکھو ایسا شا ہکار ملنا مشکل ہے ــــ تم ہی . . . خود دے .کھو .ہے کہ نہیں؟ ــــ"

"مجھے اس کی خوبصورتی سے انکار نہیں" ڈاکٹر نے تنگ آکر دخل دیا" لیکن ــــ بات یہ ہے کہ میں شادی شدہ آدمی ہوں ــــ میری بیوی بچوں کے علاوہ اور بھی بہت سی عورتیں مجھ سے اس کمرہ میں ملنے آیا کرتی ہیں ــــ"

"آیا . کریں" شاتاشا نے پُرزور لہجے میں کہا" سُنیئے .ڈاک ٹر صاحب ــــ بات یہ .ہے کہ اگر انسان .پاک دل اور نیک نہاد ہو تو اُس کے لئے یہ سب فضو لیات ہیں ــــ ہاں . اگر دل ہی میں . کھوٹ ہو تو . . اس کو بھلائی میں بھی بُرائی کی جھلک . . . دکھائی دیتی ہے ــــ میں ایک لوٹا .لڑکا ہوں ــــ آپ نے میری جان بچائی ــــ دیکھتے اگر آپ قبول نہ . . . کریں گے . . . تو ہم دونوں . کو کتنا . صدمہ ہو . . گا! ــــ"

"دیکھو! وہ میرے لڑکے کھیل رہے ہیں - وہ ہمیشہ اس کمرہ میں آتے جاتے ہیں ــــ" گھڑی کی طرف دیکھ کر" اب میری بیوی کے بھی آنے کا وقت ہو رہا ہے نہ معلوم اس کے ساتھ کتنی اور عورتیں آئیں گی ــــ گر

خیر ـــــ تم سے بحث کرنا مطلق بے سود ہے ـــــ اس کو رہنے دو ـــــ شکریہ تمہارا ـــــ جاؤ خدا حافظ"
ڈاکٹر نے مجبوراً کہا ـ

"بس . ٹھیک ہے ـــ آگے کچھ . نہ کہو" شاشا نے خوش ہو کر کہا ـ اُس کے بعد اس نے ہاتھ
ملایا اور روپس ہوگیا ـ

اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر تھوڑی دیر تک اس . . . کو گھورتا رہا " یہ کتنی خوبصورت ہے " آخر کار وہ بولا
" لیکن ـــــ میں اپنے ڈرائنگ روم کو اس سے زینت نہیں دے سکتا ـــــ مجھے چاہیئے کہ اس کو کسی اور کے گلے
منڈھوں ـ چیز تو اچھی ہے ـ ہر اک شوق سے رکھ لے گا ـــــ مگر ـــــ کس کے پاس لے جاؤں ؟" تھوڑی دیر تک
وہ ایک گہری سوچ میں مبتلا رہا ـ یکایک اُس نے گردن کو . . . . . . دی اور . . . . . . ہاتھ مارا ـــــــ
وہ کھڑا ہو گیا اور ٹہلنے لگا ـ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار تھی جیسے . . . . . . وہ اپنی سوچ میں کامیاب رہا اور
کوئی نہ کوئی تدبیر اُس کے دماغ میں آگئی ـ اب وہ آواز سے کہنے لگا " وکیل تو . . . وہ فی الحال مجرد ہی ہے ـــــ اس
سے بہتر آدمی اس معاملہ کے لئے ملنا مشکل ہے ـــــ بس ٹھیک ہے ـــــ"

اس نے فوراً ہی کپڑے بدلے اور وکیل کے گھر کا راستہ لیا ـ خوش قسمتی سے وکیل کمرے میں موجود تھا ـ سلام علیک
اور مزاج پرسی کے بعد ڈاکٹر نے کہا " کیا کہوں کئی مرتبہ آنے کا ارادہ کیا ـ لیکن اتفاق دیکھئے کہ جب کبھی خیال کرتا کوئی نہ
کوئی مریض پہنچا ـ آپ جانتے ہی ہیں کہ ان لوگوں سے پیچھا چھڑانا کارے دارد ـــــــــ غرض بہت
دنوں سے میں نہ آ سکا ـــ میرے اس مقدمہ میں آپ نے جو امداد فرمائی اُس کے لئے میں دل سے ممنون ہوں اور اسی کے
شکریہ کے سلسلہ میں یہ ناچیز تحفہ پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں " یہ کہکر ڈاکٹر نے کاغذ میں لپٹی ہوئی تصویر کو میز پر رکھدیا
" دیکھنا کیسا نادر شاہکار ہے ـ سچ کہنا کبھی تم نے ایسا بے نظیر مرقع دیکھا ہے ؟" اُس نے تصویر کو بتاتے ہوئے کہا ـ
" بہترین ـ واقعی بہترین تصویر ہے ـ کیا انسان چند رنگوں کی مدد سے ایسی جیتی جاگتی تصویر بنا سکتا ہے ؟ کمال ـ انتہائی
کمال ہے " وکیل نے بے ساختہ کہا ـ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں ـ دیدے باہر کو نکل پڑتے تھے ـ ہونٹوں پر ہلکا سا
تبسم نمایاں تھا ـ

تھوڑی دیر تک وہ تصویر کو گھورتا رہا اور جب اس کی نظروں نے حسن تصویر کو جذب کر لیا تو وہ آنکھیں بند کر کے کچھ
دیر تک یونہی بیٹھا سوچتا رہا ـ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کشمکش میں مبتلا ہے ـ آخر وہ کہنے لگا ـــــ " لیکن ـــــ میں
اس کو قبول نہیں کر سکتا ـ تم اس کو واپس لے جاؤ ـــــ " کیوں ؟" ڈاکٹر نے استعجاب سے پوچھا ـ

"اس لئے . . . اس لئے کہ میری ماں اکثر یہاں آیا کرتی ہے . میرے مؤکل بھی مجھ سے یہیں ملتے ہیں ہاں اس کے علاوہ ——— نوکر بھی مجھ سے بدظن ہو جائیں گے"

"بس۔بس۔تم کو قبول کرنا پڑے گا——— ایسا نایاب تحفہ اور تم جیسا شوقین آدمی اس سے انکار کرے۔لاحول ولا۔کس قدر مضحکہ خیز بات ہوگی——— اس چھوٹی سی میز پر رکھنا، سمجھے ——— بخدا کمرے کی زینت میں چار چاند لگ جائیں گے" ڈاکٹر نے کھڑے ہوکر پر اثر انداز میں کہا۔

وکیل کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر نے "خدا حافظ" کہکر زبردستی ہاتھ ملایا اور چلتا بنا۔ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد وکیل ایک گہری سوچ میں غرق رہا۔اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیئے۔"واقعی ہے تو سہی مصوری کا بہترین نمونہ ——— لیکن وکیلوں کے ڈرائنگ روم کے لئے موزون نہیں"۔ بوخوف نے دل میں کہا" تحفہ دینا چاہیئے" اُسے خیال آیا۔"مگر کس کو؟ . عورتوں کو تو دے نہیں سکتا . کون شریف آدمی اس کو قبول کرے گا؟

. "بہت دیر تک وہ اپنے دوستوں کے نام گنتا رہا۔آخرکار شاشکن کا نام اُس کی زبان پر آیا۔ساتھ ہی وہ [illegible] دو ایکٹر ہے . مجرد ہے . نوجوان ہے . . اِن سب کے علاوہ اُسے آرٹ کا بے حد شوق ہے۔ ——— ضرور وہ خوشی سے اس کو قبول کرے گا

چند ہی لمحوں میں وکیل شاشکن کے کمرے میں تھا۔ایکٹر بڑے تپاک سے ملا۔رسمی گفتگو کے بعد وکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شاشکن تمہارے ایکٹنگ کی تمام لوگوں میں دھوم مچ گئی۔اور واقعی تم نے پرسوں ایسا ہی کام کیا۔جھوٹ نہیں میں تو دنگ رہ گیا——— تمہاری اس کامیابی کی خوشی میں ——— . میں ایک تحفہ پیش کرنے کے لیے آیا ہوں——— نادر شاہکار . عجیب مرقع . جیتی جاگتی تصویر ———" اُس نے ایک پُر زور قہقہہ لگایا اور جلدی جلدی کاغذوں کو ہٹا کر تصویر کو ایکٹر کے سامنے رکھ دیا——— اور خود فخریہ انداز میں کمر پر ہاتھ رکھکر دریچہ کی طرف دیکھنے لگا۔کبھی کبھی دزدیدہ نگاہوں سے ایکٹر کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔تھوڑی دیر تک شاشکن نے تصویر پر نگاہیں جمائے رکھیں۔اُس کے بعد یوں رکتے رکتے کہنے لگا۔

"شکریہ آپ کا . مگر . "

"اس کا ذکر ہی جانے دو" اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔اس معمولی سے تحفہ کے لئے میں آپ کی زبان سے "شکریہ" نہیں سننا چاہتا ——— خیر پھر کبھی فرصت سے ملیں گے۔مجھے ذرا کام ہے ——— خدا حافظ" یہ کہتا ہوا ایکٹر سے

ہاتھ ملایا اور چل دیا ۔

شاشکن کرسی پر واپس آیا اور محویت کے عالم میں تصویر کو دیکھنے لگا ۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے دروازے پر کسی ایکٹرس کی آواز آئی "کیا میں آسکتی ہوں ؟"

" نہیں پیاری ۔ میں تبدیل لباس کر رہا ہوں" اُس نے پریشانی کے لہجے میں جلدی سے کہا ۔

بوٹ کی چاپ سے معلوم ہوا کہ لیڈی واپس ہو گئی ۔ شاشکن تصویر کو ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو گیا اور دل میں کہنے لگا " عجیب مشکل ہے ۔ یہ اتنی بڑی ہے کمبخت کہ میز کی دراز میں بھی چھپ نہیں سکتی ——— باہر پھینک دوں یہ بھی نہیں ہو سکتا ——— کسی کو دے دوں ہاں البتہ یہ ہو سکتا ہے ۔ مگر کس کو ہ" تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا ۔ کچھ یاد کر کے وہ یکایک اچھل پڑا اور بے ساختہ اُس کی زبان سے نکل گیا " آہا ! اُس بڑھیا کو بڑا شوق ہے آرٹ کا ۔ پرسوں کی ملاقات میں وہ فخر سے کہہ رہی تھی کہ اپنا تمام روپیہ وہ اسی پر صرف کرتی ہے ——— بس ٹھیک ہے اسی کے ہاتھوں ٹھکے کرنا چاہیئے " اسکے بعد اس نے جلدی سے تصویر کو کاغذوں میں لپیٹا اور بغل میں دبا کر کمرے سے باہر ہو گیا ۔

دوسری صبح کے کوئی نو بجے ڈاکٹر کاشلخوف اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب دیکھ رہا تھا کہ یکایک اُس کے کمرے پر کسی نے زور سے دستک دی ۔ دروازہ کھولا تو شاشا اس کے سامنے کھڑا تھا ۔ اُس کی بغل میں کوئی چیز کاغذوں میں لپٹی ہوئی تھی ۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنے بوجھ کو میز پر رکھتے ہوئے کہنے لگا ۔" او ۔ ۔ ڈاک ٹر تم کتنے خوش ۔ قسمت ہو ۔ میری ماں ۔ تمہاری ۔ قسمت پر رشک کر تی ہے ۔ ۔ دیکھو اُس ۔ جیسی تصویر ایک اور ہاں گئی ۔ ——— اب دو ۔ نوں کا جوڑ ہو گیا ——— میں ایک لڑا ک ا ہوں ۔ ۔ اور تم نے میر جان بچائی ——— " اب وہ کاغذ علیحدہ کر چکا تھا ۔ تصویر کو دیکھتے ہی ڈاکٹر پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا ۔ ۔ یہ وہی پرانی تصویر تھی !

شاشا " خدا ۔ حافظ " کہہ کر واپس ہو گیا ۔

شاہکار

(ترجمہ نمبر ۲ - از اے یوخان ٹکہ بی اے اسلامیہ کالج لاہور)

ساشا اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز بغل میں دبائے ڈرتا ڈرتا ڈاکٹر کوشل کے دفتر میں داخل ہوا

"ننھے میاں" ڈاکٹر صاحب نے گرمجوشی سے کہا۔ "طبیعت کیسی ہے آج۔ کیا خوشخبری لائے ہو"

ساشا زور زور سے آنکھیں جھپکانے لگا سینے پر ہاتھ رکھا اور رُک رُک کر کہنے لگا "اماں نے سلام بھیجا ہے۔ . شکریہ ادا کیا ہے۔ . . . . میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں . . . . آپ نے مجھے موت کے منہ سے بچایا ہے . . . . ہم دونوں حیران ہیں . . . آپکا شکریہ کس طرح ادا کریں . . ."

ڈاکٹر صاحب نے جو اپنی کامیابی پر نازاں اور خوش تھے بات کاٹ کر کہا۔ "بس بس۔ ننھے میاں ہمیں اس کا ذکر تک نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی تمہاری جان بچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا"

"ڈاکٹر صاحب، میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں . . . . . ہم غریب آدمی ہیں . . . . آپ کی تکلیف کا معاوضہ ادا نہیں کرسکتے . . . . . . اس خیال نے ہمیں سخت پریشان کر رکھا ہے . . . . اماں اور میں آپ سے بمنت درخواست کرتے ہیں کہ اس تحفہ کو قبول فرمایئے"

ڈاکٹر صاحب تو چاندی کی چھنکار سننے کے خواہاں تھے۔ ماتھے پر شکن ڈال کر فرمانے لگے "ننھے میاں مجھے اس کی ذرا بھی ضرورت نہیں"۔

"آہ! ڈاکٹر صاحب . . . . . نہیں نہیں . . . میری التجا ہے آپ اس تحفے کو ضرور رکھ لیں" ساشا نے بنڈل کو کھولتے ہوئے کہا "اگر آپ اسے قبول نہ کریں گے تو اماں اور میرے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی . . . . یہ صنعت کا بہترین نمونہ ہے . . . . . مرحوم اباّ کی نشانی ہے . . . ہمارے دل میں اس کا بڑا احترام ہے۔ میرا باپ زمانہ قدیم کے آرٹ کی بہترین اشیا خرید کر فن مصوری کے شائقین کے پاس بیچا کرتا تھا . . . اماں اور میں اب بھی یہی کام کرتے ہیں" ساشا نے بنڈل کھول کر شمعدان میز پر رکھ دیا، اور مسکرانے لگا۔

یہ برنج کا بیش قیمت شمعدان تھا۔ دو عریان عورتیں پشت سے ملائے عجیب دل ربایانہ انداز سے مُسکرا رہی تھیں۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ مفصل بیان کروں۔ ہاں انہیں دیکھ کر منّا یہ خیال ہوتا کہ اگر شمع کو سہارا نہ دینا ہو تو ابھی زمین پر کود پڑیں گی اور رقص کریں گی۔ اس خیال سے میں خود شرمندہ ہو جاتا ہوں +

ڈاکٹر صاحب نے جب تحفہ کا بغور ملاحظہ کیا تو سٹ پٹائے۔ لگے چند بار پر ہاتھ پھیرنے۔ کھانس کر گلا صاف کیا اور کہا "بے شک اچھی چیز ہے۔ لیکن .... کیا کہوں .. کچھ .. میرا مطلب ہے .. .. مخرب اخلاق ہے ... مجلس میں رکھنے کے قابل نہیں"

"کیوں؟"

"اگر میں اسے اپنے میز پر رکھوں تو لوگ کیا کہیں گے؟"

ساشا نے خشمگین لہجے میں کہا "واہ! ڈاکٹر صاحب آپ بھی عجیب مذاق رکھتے ہیں، آرٹ کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ شاہکار ہے۔ شاہکار! ذرا اسے دیکھئے۔ کیا حسن ہے، کیا نزاکت ہے۔ مسکراہٹ کس قیامت کی ہے اس کا خیال ہی روح میں کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اتنی خوب صورت چیز دیکھ کر انسان سب کچھ بھول جاتا ہے"

"میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ لیکن میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ ننھے بچوں کی یہاں آمد و رفت رہتی ہے یہاں معزز خواتین اکثر آیا کرتی ہیں .. "

"بیشک اگر آپ اسے رذیل آدمی کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو اور بات ہے، مگر ڈاکٹر صاحب میں نہایت وثوق سے کہتا ہوں اگر آپ ایسے نہیں......... آپ کا انکار اماں کو اور مجھے جو اپنی اماں کا اکلوتا بیٹا ہوں سخت تکلیف دے گا. .. . .. آپ نے مجھے از سر نو زندگی عطا کی ہے، معاوضہ میں ہم آپکو اپنی سب سے پیاری اور قابل احترام چیز پیش کرتے ہیں۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ ہم شمعدانوں کی جوڑی نہیں مہیا کر سکتے"

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔ اپنی اماں کو میری طرف سے سلام کہدینا۔ لیکن. . خدا کے لئے ... . تم خود خیال کر سکتے ہو ..... . خیر اسے یہاں چھوڑ جاؤ۔ تمہیں کوئی دلیل قائل نہیں کر سکتی"

ساشا نے خوش ہو کر کہا "بس ڈاکٹر صاحب بس اور کچھ نہ کہیئے۔ اِس شمعدان کو ٹھیک یہاں گلدان کے اس جانب رکھیئے۔ دیکھیئے کمرے کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ بخدا افسوس ہے کہ اس کا ثانی میرے

پاس نہیں۔مگر اس کا کیا علاج۔اچھا ڈاکٹر صاحب سلام"۔

ساشا کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب دیر تک سر کھجاتے رہے "بیشک یہ خوب صورت ہے اِسے پھینک دینا بے وقوفی ہے۔مگر اُسے رکھنے کی بھی جرأت نہیں، اسے کسی کو دے دینا بہتر ہوگا۔بہت دیر تک سوچنے کے بعد انہیں مسٹر جرنداس وکیل کا نام یاد آگیا، آخاہ! بہت خوب! ڈاکٹر صاحب نے مسرت آمیز لہجے میں کہا" میں نے چند قانونی معاملات میں مشورہ لیا تھا، میں اس کا زیر بار احسان ہوں۔دیرینہ دوست ہونے کے باعث وہ مجھ سے روپیہ کبھی نہ لے گا۔اِس لئے میں اسے یہ خلاف تہذیب مگر خوبصورت چیز پیش کروں گا ہے بھی وہ ایسے ہی مذاق کا آدمی۔مجرد اور کچھ کچھ رنگین مزاج بھی" ڈاکٹر صاحب اُٹھے اور شمعدان کو بغل میں دبا کر مسٹر جرنداس کے گھر روانہ ہوگئے۔

"آداب عرض۔طبیعت کیسی ہے۔میں ان تکالیف کا جو آپ نے میری خاطر برداشت کی ہیں، شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔میں جانتا ہوں آپ روپیہ نہیں قبول کریں گے، اِس لئے یہ مفت کا شاہکار آپ کی نظر کرتا ہوں۔اسے اپنے دوست کی یادگار سمجھ لیجئے"۔

اس کی خوبصورتی کو دیکھتے ہی وکیل کی باچھیں کھل گئیں "واقعی آرٹ کا نادرۂ روزگار شاہکار ہے میرے اللہ لوگ کیا کیا جدتیں اپنے دماغوں میں پنہاں رکھتے ہیں۔کتنا دلکش نظارہ ہے، آپ کے ہاتھ یہ چیز کہاں سے لگ گئی"۔ ساتھ کے کمرہ میں پاؤں کی چاپ سنائی دی۔وکیل صاحب نے دزدیدہ نظروں سے دروازہ کی طرف دیکھ کر کہا" پیارے دوست میں یہ تحفہ نہیں لے سکتا"۔

ڈاکٹر نے خوف زدہ ہو کر پوچھا " لیکن کوئی وجہ"

" کیونکہ . . . . . . کیونکہ والدہ محترمہ کبھی کبھی یہاں آیا کرتی ہیں۔میرے مؤکل روزانہ یہاں جمع رہتے ہیں اور . . . . میں ملازموں کی نظر سے گر جاؤں گا"۔

"بس جی بس۔میں زیادہ سُننا نہیں چاہتا۔مجھے خوش کرنے کے لئے آپ کو اسے منظور کرنا ہوگا۔کچھ مذاق سلیم بھی ہے آپ میں؟ ایسا شاہکار! کیا حسن ہے۔کیا نزاکت ہے۔مسکراہٹ کس قیامت کی ہے۔اس کا خیال ہی روح میں کیفیت پیدا کر دیتا ہے . . . . ."

" اگر مجسمہ کو عریاں نہ بنایا ہوتا، یا کم از کم انجیر کے پتوں کا لباس پہنایا ہوتا . . ." ڈاکٹر صاحب بغیر کچھ سنے دوڑ کر باہر نکل گئے، ان کا دل فاتحانہ جذبات سے لبریز تھا کہ شمعدان سے نجات ملی۔ڈاکٹر صاحب

کی طرح اب وکیل صاحب بھی خیالات کے جال میں اسیر ہو گئے " چیز تو خوبصورت ہے مگر کمرے میں رکھ نہیں سکتا - بے عزتی ہو گی - تلف کر دینی بھی ناجائز ہے - بہتر یہی ہے کسی کو دے دوں - خوب آج ہی شام کو تھیٹر کے مذاقیہ ایکٹر مسٹر گھوش کے پاس جا رہا ہوں" اسی شام کو شمعدان مسٹر گھوش کے کمرے کی خوب صورتی کو دوبالا کر رہا تھا *

دوسرے دن مسٹر گھوش کا کمرہ تماشائیوں سے بھرا رہا - تمام دن بے ہنگام قہقہے فضا میں گونجتے رہے - سڑک سے سننے والے کو یہ معلوم ہوتا کہ گھوڑے ہنہنا رہے ہیں، اگر کوئی ایکٹرس اندر آنے کی اجازت طلب کرتی تو مسٹر گھوش کی بھدی آواز سنائی دیتی کہ میں لباس تبدیل کر رہا ہوں، ایسا واقعہ ایک بار ہی نہیں ہؤا بلکہ کئی بار انہیں اپنا بہانہ دوہرانا پڑا - اب اِن حضرت کو بھی خیال ہؤا کہ اس شمعدان سے کیا سلوک کیا جائے وہ کوئی اتنی چھوٹی چیز بھی نہیں تھی جسے میز ہی کے دراز میں ڈال دیا جاتا *

ایک شخص نے کہا " آپ اسے بیچ کیوں نہیں دیتے ؟ یہاں ایک سمبرن نامی بڑھیا رہتی ہے، وہ ایسی چیزیں خریدا کرتی ہے - اُس کا گھر معلوم کرنے میں آپ کو تکلیف نہیں ہو گی - کیونکہ تقریباً ہر ایک شخص اِسے جانتا ہے - مسٹر گھوش نے اِس نصیحت پر عمل کیا *

دو دن گذر گئے - ڈاکٹر کوشل اپنے مطب میں بیٹھے دوائیاں تیار کر رہے تھے، اچانک دروازہ کھلا اور ساشا اندر داخل ہؤا - وہ مسکرا رہا تھا - اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز اُس کے ہاتھ میں تھی، اُس نے چلا کر کہا ڈاکٹر صاحب، قسمت کی بات دیکھئے، میں اس شمعدان کا ثانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں اماں جان بہت خوش ہیں - میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں - آپ نے میری جان بچائی ہے " یہ کہہ کر اُس نے جوش مسرت سے کانپتے ہوئے شمعدان میز پر رکھ دیا - ڈاکٹر صاحب نے اپنا منہ کھولا جیسے کچھ کہنے کو تھے، مگر زبان سے ایک حرف تک نہ نکلا - صرف چندیا کے چند بال ہاتھ میں تھے، جنہیں وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے *

(عزیز احمد صاحب از عثمان آباد)

یہ افسانہ آسٹریا کی ایک ادیب شہزادی کا لکھا ہوا ہے۔ شہزادی نے اسے
بہت کم عمری میں لکھا تھا تاہم آسٹری ادب کے بہترین شاہ پاروں میں شمار کیا جاتا ہے (مترجم)

"لکس" لکس۔ اِدہر تو آ ذرا جلدی تو آنا، کمبخت بھیانک بدمعاش کتے"

وہ اپنی یادداشت کے گوشے گوشے میں اسی طرح کے ذلیل کن الفاظ تلاش کر رہی تھی، تاکہ ان سے کتے کو مخاطب کر سکے۔ کتا اسکیمو نسل کا تھا سفید رنگ تھا اور چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ اس کے بائیں کان پر داغ تھا جس نے اُسے کریہ المنظر بنا دیا تھا۔ شاید ہی دنیا کا کوئی اور کتا اپنے آپ کو اس قدر حقیر بنانے میں کامیاب ہو سکے۔ اُسنے پہلے تو خوبصورت پرستان بالوں والی لڑکی پر نظر ڈالی اور پھر اس ننھی سی جاندار چیز پر نگاہ جمائی جو زمین میں گھانس پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اور پھر پنا پنجہ اسکے پکڑنے کو بڑھایا۔

"نکل یہاں سے" اور اس کے ساتھ ہی اسکیمو کی پسلیوں پر آٹھ سال کی ننھی اور نازک بچی نے لات جمائی اور لات مارنے میں اسے خود بھی کافی چوٹ لگی۔ کیونکہ کتے کی ہڈیاں وہیل مچھلی کی ہڈیوں کی طرح مضبوط تھیں اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ کتا، وہیل مچھلی کی نسل سے ہے۔

ہبا کا چہرہ سرخ اور آنکھیں اشک آلود تھیں۔ وہ جھکی اور زمین پر سے وہ ننھی سی جاندار چیز اٹھالی جو۔ افسوس کہ ایک ننھی، قابل رحم چڑیا تھی۔ وہ اپنے آشیانے سے جو ایک پرانے درخت پر تھا بہت سویرے اڑ رہی تھی۔ درخت کی چوٹی آسمان کے قریب تک پہنچ گئی تھی اور اس کی شاخیں بجائے خود ایک جنگل تھیں۔ ننھی تھکی ہوئی چڑیا کے لئے اپنے گھونسلے تک اڑنا کس قدر مشکل تھا؟

اور معلوم ہوتا تھا کہ ننھی چڑیا اپنی بدقسمتی کا اظہار کر رہی ہے۔ وہ بار بار مچلتی اور اپنے سیاہ چمکیلے پر پھڑپھڑاتی اپنے جسم کو خوف زدہ انداز سے حرکت دیتی اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یقیناً وہ بے حد زخمی ہوئی تھی۔ شاید بدمعاش لکس نے اُسے کاٹ کھایا ہو۔ یا شائد اس کا سینہ کچل دیا ہو ...... بیچاری کیا جانے کہ خطا کس کی ہے۔

وہ جھپٹ کر باورچی خانہ پہونچی اور چڑیا کو دودھ اور آٹا کھلانا چاہا۔ وہ اس کام میں ماہر تھی۔ گذشتہ سال تین ننھے تیتر اپنے گھونسلوں سے گرے تھے ان میں سے دو تو اس چڑیا سے بھی چھوٹے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ بھدّے بدصورت تیتر تھے۔ اس ننھی نازک چڑیا کو اُن سے کیا نسبت؟

ننھی چڑیا نے اپنی محسنہ کی مہربانی قبول نہ کی، اور جب اس نے آہستہ سے زبردستی اس کی چونچ دودھ میں ڈالی تو اس نے پیا ہی نہیں۔

باورچن ایک بھاری بھرکم عورت تھی، جس کا چہرہ سنو ربے کی پلیٹ کا سا تھا، اور آنکھیں نیلی نیلی تھیں۔ حلوا بنانے کی میز سے چڑیا پر ایک رحم بھری نگاہ ڈالی "ناحق بچاری چڑیا کو پریشان کر رہی ہو" اس نے نرمی مہربانی سے کہا "مجھے دیدو، بس اس کی تکلیفوں کا خاتمہ کردونگی"۔

خاتمہ کردوگی " پیا نے اپنا خوبصورت سر اٹھا کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اور غصّے سے سرخ ہوتے ہوئے کہا "تو وہ تمہارا خاتمہ ہوجائیگا۔ بے رحم عورت"

لاتعداد کبوتروں، چوزوں، بٹیروں اور دوسرے پرندوں کی قاتلہ نے لاپروائی سے اپنے شانوں کو جنبش دیکر کہا "بے رحم تو نہیں ہوں مگر یہ نہیں دیکھ سکتی کہ کوئی جاندار صرف اس لئے زندہ رکھا جائے کہ تم اس سے کھیلو اور اسے تکلیفیں دو۔"

پیا کانپ کر باورچی خانہ سے بھاگ آئی۔ اس بنیہ ورقانلہ کے پاس سے جو ایسی بھیانک باتیں کرتی تھی اور پھر شاید وہ سچی بھی تھی۔

کیونکہ میں اس سے کھیلنا چاہتی ہوں۔؟ پھر تو وہ لکس سے بھی زیادہ گنہگار تھی، کیونکہ لکس اپنے فعل سے ناواقف تھا اگر انسان ہو اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔ کل جب ڈاکٹر حیوانات کو بڑھے شکاری کتے فلاک کو دیکھنے بلایا گیا۔ اور اس نے کہا کہ اب کتّا ناقابل علاج ہے تو کیا ہوا؟ دادی اماں نے ابا سے کہا "اب رحم کھاکے اس غریب کا گولی سے خاتمہ کردو۔ اور اسے شکاری کی موت مرنے دو" اور ابا نے اس کے فرشتہ سیرت آقا نے اُسے اپنی گولی کا نشانہ بنادیا، حالانکہ وہ اس کا پیارا تھا۔" اور تم میری پیاری ہو" پیا نے چڑیا سے سرگوشی کی "بس تم پر رحم کروں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے لئے بلکہ ہر پرندے کے لئے بہترین موت کونسی ہوسکتی ہے۔ آخر دم تک تم یہ خیال کروگی کہ میں اُڑ رہی ہوں، اور پھر معاملہ ختم ہوجائیگا۔ ایک چڑیا کے لئے......... یہی سب سے اچھا خاتمہ ہے"

وہ صحن سے گذر کر اس راستے دوڑتی چلی گئی جو مینار میں چوکیدار کے کمرے کی سیڑھیوں تک جاتا تھا۔ چوکیدار صرف برائے نام چوکیدار تھا، اصل میں وہ ایک بڈھا وظیفہ خوار ملازم تھا جس کا سوائے سوتے رہنے

اور ناس سونگھنے کے کوئی اور کام نہ تھا۔ مینار کو وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا، اور چونکہ وہ خود کبھی اوپر نہ جاتا۔ اس لئے بجائے اُسکے، اس کی بلی سر آنے۔ اسکے ساتھ اوپر تک جاتی۔

چوکیدار کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک سوراخ میں سے ستے جھانک کر دیکھا تو بڈھا اپنی آرام کرسی پر پڑا سو رہا تھا، اور اس کی بلی جو مسہری اس کے پاس بیٹھی نگہبانی کر رہی تھی، چھوٹی لڑکی کو دیکھ کر کود پڑی سوراخ میں سے سانپ کی طرح بل کھا کر نکلی، اور نرم خاموش قدموں سے اس کا تعاقب کیا آہستہ آہستہ اس کے قریب ہوتی گئی۔ پھر اپنے جسم کو چھوٹی لڑکی کے پیروں سے رگڑنے لگی۔ اور اُس کی طرف اپنی بڑی گول آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

کیا وہ سونگھ چکی تھی یا بھانپ گئی تھی کہ ننھی لڑکی کے ہاتھ میں چڑیا ہے؟

زینے پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی جو نیم تاریکی میں بکھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کھڑکیوں میں بھی مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی کسی چوہے کے دوڑ جانے کی آواز آتی جس کے بعد غرّانے اور درد اور خوف سے کراہنے کی آواز آتی بلی اپنے شکار سے فارغ ہو کر واپس آئی تو پیار کی طرف دیکھ کر زبان حال سے کہتی مجھے ان چوہوں کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے چڑیا نہیں دیتیں، مگر خبر میں اسے لے ہی کے چھوڑوں گی۔ میرے پنجے تیز ہیں"

لڑکی خوف زدہ ہو کر تیزی سے اوپر چڑھنے گئی۔ آج سیڑھیاں لامتناہی معلوم ہو رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے چکرّنے اسے بیسب کر دیا تھا۔

بہت دیر سے ننھی چڑیا نے جنبش نہ کی تھی۔ دفعتاً اس نے جنبش کی پر پھڑپھڑائے۔ اس کے ننھے سے پاؤں کھنچ گئے اور پھر وہ بالکل بے حس و حرکت ہو گئی۔ شائد یہ اس کی آخری جنبش تھی۔ اور شائد پیار اب اپنے ہاتھ میں چڑیا کی لاش لئے جا رہی تھی۔

خوفناک اور کس قدر خوفناک خیال یہی موت کا خیال . تو کیو موت اس قدر نزدیک۔ اُس نے کانپ کر چڑیا سے کہا "نہ مرنا۔ نہ مرنا۔ میرے ہاتھ میں نہ مرنا،" اس نے اپنا رخسار چڑیا کے منہ سے لگایا۔ پھر اس کو اپنی سانس سے گرمی پہنچائی اور آخر کار چلّائی۔ بلی اس کے سر کے برابر کود دی تھی۔ اور اس کی طرف خوفناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ننھی لڑکی کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ ایک بزدلانہ خیال۔ کیا چڑیا بلی کو دیدی جائے؟ کیونکہ اب تو وہ مر چکی ہے مگر ممکن ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہو۔ اور شائد اب بھی جب بلی اسے چیرے پھاڑے گی تو اسے خوف اور درد محسوس ہوگا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں، وہ بلی مقابلے میں اپنے ارادے اور استقلال کو برقرار رکھیگی۔

وہ چلائی "نکل یہاں سے کمبخت بلی" اور یہ ذلیل کن لفظ استعمال کر کے اپنے دل میں ایک مسرت سی محسوس کرنے لگی۔

وہ سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ اور آخر اُس دروازے تک پہنچ گئی، جو مینار کے اوپر کے چبوترے پر کھلتا تھا۔ سورج لکڑی کے بوسیدہ دروازے پر اپنی زرّین اور زمردین شعاعیں ڈال رہا تھا۔ پیا دروازہ کھول کر چبوترے پر پہنچی بلی پنجوں کے بل اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اب وہ اس سے خائف نہ تھی۔ اس نے چڑیا کو دوسرا بوسہ دیا۔

اب میں تم پر رحم کرونگی۔ تم کو اب تکلیف نہ ہوگی۔ تم نیچے گروگی — گرتی جاؤگی اور یہ سب تم کو ایک خواب معلوم ہوگا اُس نے مینار کی چوٹی پر سے نیچے نگاہ ڈالی۔ نیچے بہت سے درختوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ اور اُن میں سے زیادہ اونچی تھی۔ ایک بڑی ڈالی پر سنسنی اور پھڑ پھڑاہٹ سی معلوم ہو رہی تھی۔ اور کبھی چھوٹے سے سینے سے درد بھری آواز نکل رہی تھی۔ تو یوں کہئے کہ یہ اس ننھی چڑیا کی ماں ہے تیری ننھی پیاری چڑیا تیرے پاس آتی ہے۔ مگر بہت دیر کے بعد وہ اب مردہ ہے۔ پیا نے اپنا ہاتھ بھی ملا یا ہی تھا کہ بلی نے جست کی۔

" تو اس کو لینے پائے گی — نہ لینے پائیگی" ننھی لڑکی نے چیخ کر کہا۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا ہاتھ کھول دیا۔ ایک لمحہ تک تو چڑیا گرتی گئی اور پھر — میرے اللہ — اُف میرے خدا — وہ مری نہ تھی — وہ زندہ تھی۔ اس نے پر پھیلائے اور خوف زدہ اور مسرت آمیز نغمے گاتی ہوئی اُڑنے لگی۔ کسی قدر بے ڈھنگے پن سے اُڑی۔ مگر اُڑی، اُڑ کر اُس بڑے درخت تک پہنچ گئی جہاں وفورِ مسرت سے اُس کا خیر مقدم کیا گیا .. شاید مضطرب آواز اس سے پوچھ رہی تھیں اچھی تو رہیں؟ کوئی ضرر تو نہیں پہنچا؟"

" نہیں اب اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا" پیا چلائی اور بلی کے فراخ گول، مایوس چہرے کی طرف دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا "جا کود اور اس کو پکڑ... بیوقوف بلی۔ .. اب وہ محفوظ ہے، تم سے اور اپنے تمام دشمنوں سے محفوظ ہے۔ اب وہ اپنی ماں کے پاس ہے۔

وہ رکی اور ارمان بھرے انداز سے دیکھ کر آہستہ سے دُہرانے لگی" اپنی ماں کے پاس"

اس کو کیا معلوم کہ اس کام کا مقصد کیا تھا...... وہ بہت کمسن تھی۔ .. تاہم ایک چڑیا کے لئے.... ایک ننھی چڑیا کے لئے یہ بہت اچھا ہوا۔

(عزیز احمد)

"بیجو باورا"

(ڈاکٹر اعظم کریوی)

بیجو باورا کا نام ہندوستانی موسیقی کی دنیا میں بہت مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ جب وہ اپنے گانے میں محو ہو جاتا تھا تو شیر اور ہرن اس کے قریب آ جاتے تھے پتھر پگھل جاتا تھا، ممکن ہے کہ ان باتوں میں مبالغہ بہت ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ موسیقی کا زبردست استاد تھا، بیجو باورا کو اس دنیا سے گذرے ہوئے چھ سو برس سے زیادہ گذر چکے ہیں پھر بھی اس کا نام مشہور ہے، اور جب تک موسیقی کا رواج دنیا میں رہے گا، اس کا نام ہمیشہ عزت اور احترام سے لیا جائے گا، کچھ عرصہ ہوا "سرستی" میں بیجو باورا کی سوانحعمری شائع ہوئی تھی یہ مضمون اس کا ملخص ہے۔

بیجو باورا کی سوانحعمری سے اس کے والدین کا نام یا ان کی تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا، تیرھویں صدی کے اخیر میں بندرابن کے ایک جنگل میں ایک تارک الدنیا سادھو کا بڑا شہرہ تھا، ان کا نام "برج لال" تھا، ان کے وطن یا ذات پات کا حال کسی کو معلوم نہ تھا، وہ اپنی کٹی سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ گوشہ نشینی اختیار کر رکھی تھی وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے، بلکہ جو کوئی ان سے ملنے جاتا وہ اُس کو بھگا دیتے، یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سادھو سنت دنیاوی خیالات کے لوگوں سے بچنے کے لئے اُن کے ساتھ پاگلوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں، برج لال بھی مجذوب تھے، لوگ انہیں پاگل سمجھنے لگے اور ان کا نام بیجو بادلا یا بیجو باورا پڑ گیا، جو اب تک مشہور ہے۔ ان میں یہ ایک وصف تھا، کہ وہ جانوروں کی آواز کی ایسی عمدہ نقل اتار لیتے تھے کہ اصل و نقل میں تمیز کرنا سخت دشوار تھا، ایک مرتبہ گھنے جنگل میں بیٹھے تھے۔ وہاں اُنہوں نے شیر کی گرج سنی، بیجو باورا نے فوراً اس کی پوری نقل اوتار لی، شیر ان کے پاس آ گیا، لیکن وہ خاموش بیٹھے رہے تھوڑی دیر کے بعد شیر چلا گیا، اس کے بعد بیجو نے پرندوں کی بولیاں بول کر ان کو اپنے پاس بلا لیا (ان میں کے متعلق بھی اس قسم کی باتیں مشہور ہیں۔ اعظم)

ایک مرتبہ بیجو نے ہرن اور شیر کو ساتھ بٹھا کر گانا سنایا وہ دونوں اُن کے گانے میں اتنا محو ہوئے کہ ایک دوسرے کو بھول گئے۔ بیجو کی کٹی گو شہر سے بہت دُور ایک غیر آباد جنگل میں تھی، پھر بھی ان کا گانا سننے کے لئے لوگ بہت دُور سے آیا کرتے تھے۔

جس زمانے میں شہنشاہ علاؤالدین نے دیوگری کو فتح کیا، اور مہاراشٹر میں شورش پیدا ہوئی تو وہاں سے ایک موسیقی کا ماہر گوپال اپنی بیوی اور اکلوتی لڑکی "میرا" کو ساتھ لے کر برج منڈل میں آ گیا، گوپال کے بارے میں صرف یہی ایک بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ مہاراشٹر کے رہنے والے تھے۔ بندرابن میں آ کر وہ بیجو سے ملے۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز، تھوڑے ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے دوست ہو گئے، گوپال سنگت کی راگ اور راگنیوں میں بہت مشتاق تھے۔ انہوں نے بیجو کو ہرانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ رفتہ رفتہ اس کوشش نے گوپال کے دل میں دشمنی پیدا کر دی۔ ایک دن انہوں نے بیجو سے سوال کیا۔

سا - را - گا - ما - پا - دھا - نی - چوتال وتتالہ

کھرج کہاں سے رکھب کہاں سے
کہاں سے اپجو سُر گندھار
مدھم کہاں سے پنچم کہاں سے
دھیوت ــ نکھاد ــ نار
آروہ کہاں سے اور وہ کہاں سے مورچھنا
کہاں سے گیت سنگیت کی دھار
کہیں لال گوپال سنیئے بیجو باورناد
اتھاہ جا کی گت اگم اپار

بیجو نے اس گانے کو سن کر اُس کے جواب میں یہ گانا گایا:-

کوشکی - چوتال

مینڈھکی سُر کھرج رکھب سُر چھاگری
داؤر سُر ہے ری گندھار
مدھم تیچر سُر پنچم کوکل سُر کے کی
سُر دھیوت نکھاد کچار
آروہ ہنس سر اور وہ برکھب سو مورچھنا
سرپ سو گیت سنگیت کی دھار
کہیں بیجو باور سنیئے گوپال لال کینئے
گن بچھڑے کہوں پائیو نادکی پار

ممکن ہے کہ ان راگ راگنیوں کا ہر ایک کو لطف نہ آئے۔ لیکن جن کو خدا نے موسیقی کا ذوق عطا کیا ہے، وہی بیجو اور گوپال کے سوال و جواب کا لطف اٹھا سکتے ہیں کہ مشکل سوال کا بیجو نے کس خوبی سے جواب دیا ہے۔ اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جو شخص سنگت کے مقابلہ میں ہار جاتا تھا اُس کو فتحمند کا غلام بننا پڑتا تھا، کہیں کہیں تو صرف غلام ہی نہیں بننا پڑتا تھا بلکہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ تاریخ میں اس قسم کے کئی واقعات ملتے ہیں۔

گوپال نے اسی طرح ہار کر بیجو کی غلامی اختیار کی، لیکن وہ اُسے اپنی بے عزتی سمجھتے تھے اور دوسروں کے سامنے بیجو کو اپنا استاد ماننے کے لئے [illegible] ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں گوپال کی عورت مر گئی اور گوپال بھی [illegible]

کے ساتھ بیجو کی کٹی کے قریب ہی ایک جھونپڑی میں رہنے لگے، اس طرح سے ۵-۶ برس گذر گئے، بیجو کی غلامی میں رہنا گوپال کو پسند نہ تھا، ان کے دل میں کسی دوسرے شہر یا دارالسلطنت میں جاکر اپنی استادی کا ڈنکا بجانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے بیجو سے اجازت طلب کی، بیجو نے بڑی خوشی سے اُس کو اجازت دے دی۔

شہنشاہ علاؤالدین کا دربار اہلِ کمال کا مرکز تھا - اس کے دربار میں ہر ماہر فن کی انتہائی قدر و منزلت کی جاتی تھی، شہنشاہ کی قدردانی کا حال سن کر گوپال نے دہلی میں رہائش اختیار کی تھوڑے ہی عرصہ میں اُس کی موسیقی کا شہرہ بلند ہوا، لیکن وہ اپنے گرو کا نام کسی کو نہ بتاتے تھے، جب شہنشاہ کو گوپال کے کمال کا پتہ چلا تو اُس نے گوپال کو اپنے دربار میں طلب کر کے اُس کا گانا سنا اور خوش ہو کر اُس کو "نایک" کا رتبہ عطا کیا، ملک بھر میں گوپال کی شہرت ہو گئی، جب گوپال سے کسی نے ان کے گرو کا نام دریافت کیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ میرا کوئی استاد نہیں، میری قابلیت خداداد ہے۔

اتفاق سے کچھ عرصے بعد بیجو سیر کرتے ہوئے دلی پہونچے، وہاں اُنہوں نے [illegible] کے بعد ایک عظیم الشان موسیقی کا جلسہ ہوگا جس میں ہندوستان کے تمام گویا طلب کئے گئے ہیں اسی جلسہ میں شاہی درباری کا "نایک" گوپال بھی اپنی موسیقی کا کمال دکھائے گا، آخر کار جلسہ کا دن آگیا، خود سلطان علاؤالدین اپنے درباریوں کے ساتھ [illegible] تھا، ہندوستان کے تمام مشہور گویئے اپنا گانا سنا چکے تو "نایک" گوپال کی باری آئی، تمام جلسہ میں سناٹا چھا گیا، گوپال کی سریلی تان سن کر مجمع کی کوئی پروا نہ کر کے کئی ہرن جلسہ میں گھس آئے، اور گوپال کے نزدیک کھڑے ہو کر گانا سننے لگے - ہرنوں کا آنا گوپال کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی، کیونکہ اس سے پہلے بھی ایسا [illegible] ہو چکا تھا، لیکن اتنے بڑے مجمع میں ہرنوں کے آنے کی کسی کو [illegible] اُسی وقت ایک [illegible] سادھو نے بڑھ کر گوپال کی پیشانی کا بوسہ لے کر اسے آشیرباد دی اور کہا "شاباش بیٹا! تم نے بہت اچھا گایا" یہ سادھو [illegible] تھے، اُن کو دیکھ کر گوپال کے ہوش اڑ گئے، تو وہ تعظیم کے لئے اٹھے اور [illegible] کو سلام کیا [illegible] سلطان نے گوپال سے [illegible] کا حال دریافت کیا [illegible]

[illegible] اس لئے [illegible] [illegible] جواب سے سلطان [illegible] خود بیجو سے دریافت کیا - بیجو نے مسکرا کر جواب دیا "گوپال [illegible] [illegible] اس [illegible] یہاں آگیا [illegible]

جب گوپال اپنے گانے میں اتنا کمال رکھتا ہے تو اس کا گرو علم موسیقی کا بادشاہ ہی ہوگا، سلطان کی تیوریاں چڑھ گئیں، اور اس نے گوپال سے کہا "موسیقی میں کچھ سیکھا، تم کو اتنا غرور ہوگیا ہے کہ اپنے گرو کی کوئی ہستی ہی نہیں سمجھتے۔ خیر اب گرو اور چیلے کی آزمائش ہوگی - اگر تم اس امتحان میں ہار گئے تو تم جھوٹے قرار دیئے جاؤگے اور اپنے گرو کی ہتک کرنے کی سزا میں قتل کردیئے جاؤگے - بادشاہ کے سامنے جھوٹ بولنے والا قتل کردینے کے قابل ہے" شاہی حکم کی تعمیل ضروری تھی، گوپال نے یہ ملتانی راگ گایا :-

(از دھرپد سور لیپ - حصہ اول)

دلی پت سکندر شاہ جا کے ڈر سے دھرنی یہ ہل ہلایو
ول شاہ نہما اپار اگا وہ جہاں گنی جن ودیا تہاں کرت چھایو
نانہ ودیا گاوے سن سالم دھاوے دن دُنی کے تم ہی اوتار آیو
کہت نایک گوپال چرن جیو رہو بادشاہ گہن تے آئے مرگ دھایو

گانا سن کر ایک ہرن اس جلسہ میں گھس آیا، اس کے گلے میں ایک مالا ڈال دی گئی، گانا ختم ہوتے ہی وہ ہرن چلا گیا۔ اس کے بعد سلطان نے بیجو کی طرف گانے کے لئے اشارہ کیا - بیجو نے سمجھ لیا کہ میرے گانے کا کیا انجام ہوگا، وہ دل ہی دل میں ہنسا، لیکن شاہی حکم سے مجبور تھا - اس نے کہا :- "موت کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا"

بیجو نے گانا شروع کیا، گوپال دل ہی دل میں اپنے انجام پر سہم رہا تھا لیکن بظاہر لاپروا نظر آتا تھا - گانا شروع ہوتے ہی قریب کے ہرن شیر اور پرند وغیرہ جلسہ میں آکر جمع ہوگئے، ان میں وہ مالا دھاری ہرن بھی تھا - آہستہ آہستہ بیجو کی تان بلند ہونے لگی - حاضرین جلسہ پر محویت طاری ہوگئی تمام در و دیوار وجد میں آگئے - یہاں تک کہ صحن کا پتھر پگھل گیا - اس وقت بیجو نے اپنے ہاتھ کے "کرتال" پھینک کر گانا ختم کیا - گانا ختم ہوتے ہی پتھر کڑا ہوگیا، اور بیجو کی کرتال اسی میں جم گئی - سلطان نے اتنا مکمل اور لاجواب گانا کبھی نہیں سنا تھا اور نہ ایسا عجیب و غریب تماشا اس نے کبھی دیکھا تھا - اس نے گوپال سے کہا "تم

ان [illegible] پر کوئی [illegible] ہے [illegible] لیکن [illegible] مرحوم [illegible] میں کسی تغیر و تبدل کا اختیار نہیں اسلئے [illegible] اعظم کریوی

اپنی موسیقی پر مغرور ہو تم کو اپنے گانے سے اس پتھر کو پگھلا کر تال نکالنی پڑے گی، ورنہ سخت سے سخت سزا کے لئے تم کو تیار رہنا چاہیئے" گوپال نے اپنے گانے میں اپنا تمام کمال صرف کر دیا، لیکن جس طرح بیجو کے گانے سے پتھر پگھل گیا اسی طرح اُس کے گانے سے نہ پگھلا اور وہ کرتال کو نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکا، اس زمانہ میں اس قسم کے مجرم کو سزائے موت دی جاتی تھی - چنانچہ کہا جاتا ہے کہ گوپال قتل کر دیا گیا - بیجو نے اپنے پیارے شاگرد کو بچانے کی بہت کوشش کی - لیکن کچھ نتیجہ نہ حاصل ہوا - گوپال کی لڑکی "ہیرا" نے اپنے باپ کی کریا کرم کی اور لاش کو جمنا میں پھینکتے وقت رو رو کر وہ ملّار گانے لگی، کہا جاتا ہے، کہ اُس کے گانے کے اثر سے لاش میں حرکت پیدا ہو گئی تھی +

اب "ہیرا" یتیم ہو گئی - شہنشاہ علاؤالدین نے اس کی سرپرستی کی "ہیرا" نے بخوشی مذہب اسلام قبول کر لیا، شہنشاہ نے نہایت عزت و احترام سے بڑی شان کے ساتھ اس کی شادی کسی شریف امیر کے یہاں کرا دی - کہا جاتا ہے کہ "ہیرا" ہی کے خاندان کی کسی لڑکی سے "تان سین" کی شادی ہوئی +

شاگرد کی موت کے بعد رنج و غم سے بیجو نے پھر کبھی کسی موسیقی کے جلسہ میں شرکت نہیں کی - انہوں نے اپنی تمام زندگی خدا پرستی میں بسر کر دی - تاریخ موت کا کچھ پتہ نہیں، لیکن خیال کیا جاتا ہے، کہ وہ گوپال کی موت کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہے +

ایک آرزو

کاش کسی پہاڑی کے دامن میں میرا مسکن ہوتا - شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ میرے کانوں کو تسکین دیتی - خوشنما ندی جس کے کنارے پر سبز مجنوں کے درخت ہوتے میرے مسکن کے روبرو خوش خرامی سے بہتی ہوئی ترنم ریز ہوتی -

کبھی کبھی میرے مسکن کے قریب ابابیل اپنے آشیانے میں چہچہاتی -

کوئی بھولا بھٹکا مسافر میرے دروازہ کی زنجیر کھٹکھٹاتا اور میں اُس کا میزبان بنتا - میرے دروازہ پر خوشنما پھولوں کی بیلیں ہوتیں اُن پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمکتے - اور پیاری نیلگوں پیراہن سادہ چادر اوڑھے میرے سادہ گھر کی دنیا ہوتی درختوں کے جھنڈ میں گاؤں کی مسجد جہاں بچپن میں سب سے پہلے میں نے اپنے اللہ کا نام لینا سیکھا تھا، اذان کی صدا سے فضا کو معمور کیا کرتی اور اس کی سادہ گنبدیاں آسمان کی طرف بلند ہوتیں۔ (ماخوذ) (سید برہان الدین احمد متعلم فوقانیہ عثمانیہ گلبرگہ (دکن)

اچانک اک طرف پڑی نگاہ دیکھتا ہوں کیا — سرے پر ایک گاؤں کے بنا ہی ایک باغ سا
اسی چمن میں ایک سمت سبز سبز گھاس پر — نظر ٹھٹک کے رہ گئی ہجوم اہلِ یاس پر
یہ چند عورتیں تھیں اور کچھ ضعیف مرد تھے — ملال سے رُندھے ہوئے تھے دل تو چہرے زرد تھے
انھی میں ایک چیز پائی میں نے جاذبِ نظر — رہا سہا قرارِ دل رہا نہ جسکو دیکھ کر
وہ چیز کیا تھی میرے بیقرار دل کا نور تھی — وہ نور کیا تھا لن ترانیوں میں برقِ طور تھی
انہیں کے درمیاں تھی میری پیاری تاج جلوہ گر — ترس رہے تھے جسکی دید کے لئے دل و جگر

وہ دل فریب چہرہ اس کا تھا ذرا اُداس سا — کہ جس کو دیکھتے ہی ہو گیا میں بدحواس سا

جھکی ہوئی نگاہ غرق تھی کسی خیال میں — لگے ہوئے تھے چار چاند حسن اور جمال میں
اُسی کے پاس تھے مرے حمید اور جمیل بھی — خموش ماں کے لب پہ بندھ رہی تھی جنکی ٹکٹکی
یہ دو وہ گل ہیں جنکی تازگی اسی کے دم سے تھی — یہ دو وہ دل ہیں جنکی زندگی اسی کے دم سے تھی
یہ منظرِ عجیب دیکھ کر میں تلملا اُٹھا — چراغِ آرزو مری بغل میں جھلملا اٹھا
نگاہ بن گئی زبان فرطِ اضطراب سے — مخاطب اس طرح ہوا میں اپنے ماہتاب سے
حمید اور جمیل چھوڑ کر تجھے مِلا ہے کیا — رُلا رُلا کے اتنا مجھ کو تو نے پا لیا ہے کیا
کہاں کہاں اداس پھر رہی ہے مجھ سے روٹھ کر — یہ تیرے ننھے ننھے پاؤں کب ہیں درخورِ سفر

ترے بغیر زندگی کا خاک بھی مزا نہیں — کہاں کی زندگی کہ موت کا بھی آسرا نہیں

یہ تیرا حسن دل فروز ہو تو دل لگی بھی ہو — جسد میں روح کا نشان ہو تو زندگی بھی ہو
بس اتنی دیر کرنے پایا تھا ابھی میں گفتگو — کہ بجھ گیا ہوا کی موج سے چراغِ آرزو
ہوا جو قہر میرے دل پہ آہ! کوئی کیا کہے — ڈھلک کے گرم گرم اشک میرے مُنہ پہ آ رہے
بُرا ہو آنسوؤں کا مجھ کو خواب سے جگا دیا — جگا کے جنت نظر کو خاک میں مِلا دیا

بچھڑنے والا مل کے دو گھڑی نہ پاس رہ سکی　　میں اپنا دکھ نہ کہہ سکا وہ اپنا دکھ نہ کہہ سکی

نہ تاب تھی نہ روبرو کی گفتگو کا لطف تھا　　نہ گل تھا سامنے نہ اسکے رنگ و بو کا لطف تھا

خیالِ حسن دل فریب بھی نظر میں آ گیا　　چھدے ہوئے جگر پہ ابر برچھیاں چلا گیا
اٹھی ہوئی تھی موج اشک روکنا محال تھا　　نہ آنسوؤں کا قحط تھا نہ خون کو زوال تھا
رُندھا ہوا تھا، دل نے آبشار بن کے رو لیا　　تپش کے خوف سے تمام پیرہن بھگو لیا
سحر نے اپنی شورشوں سے خلق کو جگا دیا　　مجھے بھی خوفِ کشفِ رازِ غم نے چپ کرا دیا

اسی طرح تمام ہوگی شوق کی یہ زندگی　　تڑپ لیا کروں گا اسکی یاد میں کبھی کبھی

غم سے

(محترمہ صفیہ بیگم بنت الرشید)

اے یادِ دوست ہاں رگ و پے میں سمائے جا　　بے کیف دل کو چاشنیٔ غم چکھائے جا
آ! حسرتوں سے جانِ حزیں کو کھائے جا　　آ! دل میں حسنِ دوست کا سکّہ بٹھائے جا
ویرانۂ حیات میں بستی بسائے جا

ظاہر میں گو کہ بیخودی و بیحسی رہے　　قلب و جگر میں آگ سی لیکن لگی رہے
دل جاہ و عیش و لطف سے اپنا غنی رہے　　سینے میں اپنے درد کی دنیا بسی رہے
آ! درد ہی کو زیست کا حاصل بنائے جا

تو نے ہی دل کو کعبۂ فضیلت بنا دیا　　اصل وفا و مہر و مروّت بنا دیا
قصے کو میرے قصۂ حسرت بنا دیا　　صبحِ سرور کو شبِ فرقت بنا دیا
آ شمعِ زندگی کو بھی آ کر بجھائے جا

دُنیا

جناب ملوک چند محروم

نقش بر سطحِ آب ہے دُنیا — بلکہ موجِ سراب ہے دُنیا
ایک حالت پہ رہ نہیں سکتی — پیکرِ انقلاب ہے دُنیا
شبِ غفلت ہے زندگی اپنی — اسمیں نیرنگِ خواب ہے دُنیا
چند روزہ ہے اور فانی ہے — پھر بھی کیا لاجواب ہے دُنیا
ہوشیار اس سے بچ کے رہتے ہیں — کہ نہائت خراب ہے دُنیا
تا جوانی ہے دلکشی اس میں — ہیچ بعدِ شباب ہے دُنیا
ہم سمجھتے ہیں خوب اے محرومؔ — جائے صد پیچ و تاب ہے دُنیا

تاریکی میں روشنی کا ظہور

اندر جیت شرما جھرہ ضلع میرٹھ

اوّل تو تماشے ہی اس رب کے نرالے ہیں — کھیلوں کے طریقے پھر اُن سب کے نرالے ہیں
ہے اُس کا رواں سکہ دنیا کے سمندر پر — طوفان کو قابو سے کرتا وہ نہیں باہر
دنیا میں بہت گہری تاریک جو کانیں ہیں — صنّاعِ دو عالم کی حکمت کی مثالیں ہیں
اے نیک سیہ بندو! کیوں پڑتے ہو مشکل میں — ہے ابر سیہ کا کیا اب خوف و خطر دل میں

محدُودِ تخیل سے تم اس کو نہ پاؤ گے — پچھتاؤ گے اس پر جو ایمان نہ لاؤ گے
قدرت کے کرشمے تم دیکھو گے عیاں ہونگے — آلام کے پردوں میں آرام نہاں ہوں گے
منکر تو کبھی بھیدوں کو جان نہیں سکتا
باتوں میں کوئی اُسکو پہچان نہیں سکتا

(انگریزی نظم کا ترجمہ)

حسنِ تخیّل

(شیخ عبد اللطیف صاحب تپش لیکچرار گورنمنٹ کالج، پٹنہ)

خوں گشتہ دل کو داغِ گلستاں بنا دیا
اِس نشوِ رنگ نے مجھے حیراں بنا دیا

صورت نگارِ حسن کی تجویز کے نثار!
مشتِ غبارِ شوق کو انساں بنا دیا

اللہ رے جلوہ زارِ تصوّر کی شوخیاں
بیداریوں کو خوابِ پریشاں بنا دیا

کیونکر نبھے گی اس دلِ کفر آشنا سے اب
مجھ کو تو ان بتوں نے مسلماں بنا دیا

دستِ جنوں نے خوب یہ کیں پردہ داریاں
چاکِ جگر کو جزوِ گریباں بنا دیا

پروردۂ محیط تماشا سہی، مگر
قطرے کی کیا بساط کہ طوفاں بنا دیا

صرف اِس قدر تھی ہوشِ رمیدہ کی کائنات
نقدِ غمِ حیات کو نسیاں بنا دیا

دِل میں چھپا کے خجلتِ پابوسیٔ عدو
نقشِ جبیں کو اور نمایاں بنا دیا

دے دے کے داغِ صبحِ وطن نے تپش ہمیں
آخر چراغِ شامِ غریباں بنا دیا

کلامِ فیروز

(جناب حکیم فیروز الدین صاحب طغرائی، فیروز)

سیاہ بخت ہوں مجھ کو ضیا سے کام نہیں
وہ صبح کیسی ہو جو شام میری شام نہیں

بقدر حوصلہ و ظرف ہے اجازتِ مے
تجھے حرام ہے واعظ مجھے حرام نہیں

سراب و آب میں جس کو نہ امتیاز رہے
ہیں وہ حریص نہیں ہیں وہ تشنہ کام نہیں

سمندِ عمر بھی ہے مطلق العناں کیسا
کسی کا رام یہ رہوارِ تیز گام نہیں

خدنگِ آہ سے چھلنی ہے سینۂ گردوں
غلط غلط کہ اسے خرق و التیام نہیں

فروتنی کی زمیں آسماں نہیں رکھتی
کہ اس مقام سے اعلیٰ کوئی مقام نہیں

گروہِ خاص سمجھتا ہے حرزِ جاں اس کو
میرا کلام بلا سے پسندِ عام نہیں

بہا کے لے ہی گئی بحرِ غم کی رو دِل کو
یہ سیل وہ ہے کوئی جس کی روک تھام نہیں

نہ پوچھ خُم کدۂ عشق کی بلا نوشی
بغیر خونِ جگر آبروئے جام نہیں

شجاع خاں ہے سلیم المذاق اے فیروز
یہ خاص چیز نصیبِ گروہِ عوام نہیں

غزلیات تازہ

جلیل قدوائی، بی اے

طاری ہیں دل پہ کیفیتیں اضطرار کی — کیا شوخیاں ہیں اس نگہِ سحر کار کی

دولت لئے ہوں دل میں غمِ عشقِ یار کی — کیا فکر مجھ کو گردشِ لیل و نہار کی

باقی رہا کسی کو نہ پھر دل پہ اختیار — آئی تھی اک موج نسیمِ بہار کی

ہے تار تار پیرہن اب کے بہار میں — یارب! ہو خیر پیرہنِ تار تار کی

جب سے سنا ہے آئیں گے وہ مجھکو دیکھنے — حالت عجیب سی ہے مرے قلبِ زار کی

بیٹھا ہوا ہوں دیدۂ دل وا کئے ہوئے — لذت اٹھا رہا ہوں غمِ انتظار کی

اب شوق سے کیا کرو وعدہ خلافیاں — عادت سی ہو گئی ہے مجھے انتظار کی

آشوبِ عشق ہی میں ہے پوشیدہ رازِ عشق — تلخی سے ہے بیان بادۂ ناخوشگوار کی

سرمہ سمجھ کے اسکو لگاؤں میں آنکھ سے — [illegible] ملے جو خاک ترے رہگذار کی

مجبور ہو کے رسم و رہِ عشق سے جلیل — کم بخت دل نے راہِ وفا اختیار کی

جناب مولانا ذوالفقار علی صاحب گوہر رامپوری

شہیدِ حسن و احسان تیرے یارب ہر طرف دیکھے — جدھر دیکھے تیرے اخلاص والے سر بکف دیکھے

نگاہِ لطف سے ساقی اگر تو اس طرف دیکھے — تو اپنے رنگ میں رنگیں [illegible] کی صف دیکھے

بنے ہیں نقشِ حیرت تیری صورت دیکھنے والے — تجلی دیکھ کر تیری کوئی پھر کس طرف دیکھے

بدل لے اپنی قسمت اس سے تو اے اشکِ پُرحسرت — [illegible] قطرہ فلک سے گر کے آغوشِ صدف دیکھے

کوئی ایسا نہ دیکھا رازِ دل ہم جس سے کہہ دیتے — کہ تیرے چاہنے والے ہیں [illegible] جس طرف دیکھے

تقابل سے کہے گی انقلابِ قوم کی حالت — سلف دیکھے ہوا [illegible] اب وہ احوالِ خلف دیکھے

پتہ کیا پاسکیں افراط اور تفریط [illegible] — [illegible] دیکھے

نگاہیں پاک کر لے پہلے اپنی آپ کو [illegible] — کسی کا [illegible] پھر ہر طرف دیکھے

حضرت مسرور کپور تھلوی

دیدہ و دل میں موجزن - کیوں نہ ہو نور عشق کا — آیا ہوں میں ابھی ابھی جلوۂ یار دیکھ کر
اُن کو بہار حسن پر ناز ہے گر - ہوُا کرے — مست ہوں میں خیال کے نقش و نگار دیکھ کر
آئے ہیں مستیوں کے دن - بادہ پرستیوں کے دن — سجدے میں کیوں نہ گر پڑوں روئے نگار دیکھ کر
دل کی یہ کیفیت ہوئی - آج غم نگار میں — دشمن جاں بھی رو دیئے حالت زار دیکھ کر
قصّہ کلیم و طور کا - ٹھیک تو ہے - یُونہی تو ہو — اُڑتے ہیں ہوش اسی طرح جلوۂ یار دیکھ کر
بیٹھا ہوں راہ عشق میں جاؤں یہاں سے کس طرح — جلوۂ آشکار کے نقش و نگار دیکھ کر
ہائے وہ مستیوں کے دن - بادہ پرستیوں کے دن — دل پہ چھری سی چل گئی نقش بہار دیکھ کر
ایسے ستم شعار کے عشق میں مبتلا ہوئے — رحم نہ کھائے جو کبھی - حالت زار دیکھ کر
جلوؤں نے کیسے پیار سے - مجھکو گلے لگا لیا — سجدے میں جب میں گر پڑا روئے نگار دیکھ کر
سینہ فگار دل فگار - آنکھوں میں آنسوؤں کا تار — ایسے میں کوئی کیا کرے حسن بہار دیکھ کر
تاب کہاں گذارش شوق و نیاز کر سکوں — اُڑتے ہیں ہوش تابش روئے نگار دیکھ کر
ہونے لگی ہیں دل پہ پھر جلوہ فشاں تجلیاں — سجدے میں کیوں نہ گر پڑوں روئے نگار دیکھ کر

عنائت اللہ صاحب شوق سوجانپوری

عشق اپنے داغوں سے عمر جاوداں بردوش — حسن خود پرستی سے مرگ ناگہاں بردوش
پھر رہی ہے آنکھوں میں نامرادئ منزل — یاس جب سے دیکھی ہے سعی رائگاں بردوش
عشق کی ہوائیں بھی کیا بہار پرور ہیں — دیکھ دل کی دنیا کو داغ گلستاں بردوش
کس ادا سے آیا ہوں آج اُن کی محفل میں — چشم چارہ گر بر دل دست راز داں بردوش
پاسباں کا ڈر بھی تھا اور شوق سجدہ بھی — لے چلا ہے دیوانہ سنگ آستاں بردوش
ماجرا شب غم کا پوچھتا ہے کیا ہمدم — گریہ موج خوں در دل آہ آسماں بردوش
تا کہ سیکھ لے کوئی درس کامرانی کا — عشق اُٹھ سے پھرتا ہے فرد امتحاں بردوش
بخت اہل دنیا کا کچھ سمجھ نہیں آتا — کوئی قصر و ایواں میں کوئی خانماں بردوش

تجھ کو اپنی غفلت میں اس کا کب خیال آیا
حسن! تیرے ہاتھوں سے عشق ہے فغاں بردوش

خوابگاہِ دنیا میں آنکھ کھل نہ پائی تھی
عشق میرا جاگ اُٹھا وردِ جاوداں بردوش

اپنے دل کے زخموں سے ہوگیا ہوں مالامال
تیر میرے سینے میں آیا ارمغاں بردوش

آج کل میں گلشن کو آگ لگنے والی ہے
آہ لے کے اٹھی ہے برقِ گلستاں بردوش

مجھ کو قید خانے میں دیکھنے کو اُٹھا ہے
برق کے تبسم سے شعلہ آشیاں بردوش

آج اُن کی محفل میں لے چلے نہ ہوں اُسکو
دوستوں کا مجمع ہے شوقِ نیم جاں بردوش

ابر انصاری احسنی گنوری

دھو سکا دل سے نہ گردِ غمِ جاناں کوئی
صاف دیکھا نہ کدورت سے بیاباں کوئی

بال کھولے نہ دمِ سیرِ گلستاں کوئی
یونہیں تفریح میں ہوتا ہے پریشاں کوئی

قیدیوں میں نہ کرے ذکرِ گلستاں کوئی
لے کے اُڑ جائے نہ گلزار میں زنداں کوئی

کیا کہا تم نے کہ ہم کیوں نہ سنواریں گیسو
اور رہ جائے اگر ہو کے پریشاں کوئی

داغہائے دلِ ویراں پہ تعجب نہ کرو
بس بھی جاتا ہے کسی وقت بیاباں کوئی

پھول کھلتے ہیں پھٹی پڑتی ہے گلشن پہ بہار
ہائے کس وقت ہوا داخلِ زنداں کوئی

تنگ ہے عرصۂ دنیا سے مرا جوشِ جنوں
حسبِ وحشت نہ ملا اس کو بیاباں کوئی

شدتِ ہجر نے فطرت ہی بدل دی دل کی
نالہ ہو جاتا ہے جو بنتا ہے ارماں کوئی

کھا گئی جیسے زمانہ کی نظر وحشی کو
نہیں آباد زمانہ میں بیاباں کوئی

چاہیے دستِ جنوں جامہ نہیں ہے نہ سہی
تن عریاں میں بنا لے گا گریباں کوئی

سختیٔ راہ طلب سے وہ ہوا دل غمگیں
ابر وہ چھوڑ چلا جادۂ عرفاں کوئی

خان امین الحق شاطر غزنوی لاہور

ہجر میں تیری یاد نے دل کو عجب مزا دیا
خار سا اِک چبھو دیا۔ تیر سا اِک چلا دیا

ذکرِ رقیب چھوڑ کر لی ہیں جگر میں چٹکیاں
آپ کی ہو گئی ہنسی اور مجھے رُلا دیا

بڑھ گئی اب وہ بے خودی کھو گیا امتیاز بھی
جو سرِ راہ مل گیا قصۂ دل سنا دیا

جلوہ فروغِ حسن کا رہ نہ سکا حجاب میں
ایک جھلک نے طور کو شمع صفت بنا دیا

اہلِ نظر کا شوقِ دید حد سے فزوں جو ہو گیا
پردہ حریمِ ناز کا یار نے خود اٹھا دیا

جوشِ جمال سے کھلی بندِ نقاب کی گرہ
میری نگاہِ شوق نے یا مجھے کچھ دکھا دیا

بارشِ ناوکِ مژہ کر گئی لطفِ غم سوا
زخمِ جگر میں لطف تھا درد نے بھی مزا دیا

حشر کا دن بھی آئے گا کچھ ہے ستم کی انتہا
بے کسے دلِ غم آشنا خنجرِ غم چلا دیا

جناب ثاقب جالندھری

پھر دلفریبیوں کا نظارا کرے کوئی
پہلے مری نگاہ تو پیدا کرے کوئی

لبریز درد سے ہو ہر اک نغمہ عشق کا
دل کے شکستہ ساز کو چھیڑا کرے کوئی

وہ سنگِ در تو وقف ہی سجدوں کیواسطے
محرومیٔ جبیں کو مگر کیا کرے کوئی

ایک ایک خار دشت لہو میں نہا گیا
رنگینیٔ جنوں کا نظارہ کرے کوئی

جلوؤں نے بڑھ کے آگ لگا دی نقاب میں
اور اہتمام پردۂ بے جا کرے کوئی

معذورِ گفتگو نہ سمجھ لیں وہ اس لئے
خاموشِ زندگی کو سراہا کرے کوئی

واعظ نے کہدیا کہ قیامت قریب ہے
اب انتظارِ وعدۂ فردا کرے کوئی

بربط نوازیوں کا دکھایا کرے اثر
چاروں طرف اک آگ لگایا کرے کوئی

یہ چاہتا ہوں میں دلِ ایذا پسند کو
لطف آفریں نظر سے نہ دیکھا کرے کوئی

رہرو میں اور راہنما میں نہ ہو تمیز
طے اس طرح سے وسعتِ صحرا کرے کوئی

نظریں کسی کی مجھ سے کہکر پلٹ گئیں
نیرنگیٔ جہاں کا نظارا کرے کوئی

منت پذیر جس کا ہے ثاقب اُسی کا ہے
احسان بے سبب نہ جتایا کرے کوئی

دنیائے اُردو

اِس عنوان کے تحت ہر ماہ مشہور موقت الشیوع رسائل کے مضامین پر ایک نظر ڈالی جایا کرے گی۔ اس مشکل کام کا بیڑا ہمارے دوست تبسّم صاحب نے اُٹھایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کا بے لاگ تبصرہ پسند کیا جائے گا۔ حفیظ

جنوری ؁ "اُردو" دکن

اس رسالے میں "حافظ کی فارسی شاعری کی ابتدا پر ایک مبسوط مضمون شائع ہؤا ہے جو بشیر احمد صاحب ڈار بی اے۔ لاہور کی کاوش طبع کا نتیجہ ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اِس مضمون کے اِس حصّے کو جو آرگس صاحب کی تنقید حافظ مندرجہ "نگار" سے متعلق ہے نہائت محققانہ لکھا ہے، اور آرگس صاحب کے تمام دلائل کی مستند تاریخی شواہد سے تغلیط کی ہے۔ اور ان کو با در ہوا ثابت کیا ہے۔ اپنے دلائل کو استوار کرنے کے لئے حافظ کے دیوان سے وہ اشعار بھی پیش کئے ہیں جو تمام جھوٹی روایات اور افسانوں کی تردید کرتے ہیں۔

"جامعہ"

اِس رسالے کا بہترین مضمون برنارڈ شا کا ہے جو مدیر رسالہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں انہوں نے برنارڈ شا کے صرف وہ سوانح حیات لکھے ہیں۔ جن سے شاعر کے ذہنی ارتقا اور مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ خیالات کی نشوونما کے تمام ضروری مدارج پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی ضمن میں برنارڈ شا کی شاعری اور فلسفۂ حیات پر مختصر سی تنقید بھی آگئی ہے۔ برنارڈ شا دورِ حاضرہ کے بہترین ڈرامہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا جمالیاتی نظریہ یہ ہے کہ آرٹ مقصود بالذات نہیں بلکہ تمدنی اور اخلاقی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ مذہبًا وہ پوٹیسن ہے اِس لئے وہ سوسائٹی کے عام رسوم و اخلاق کا شدید مخالف ہے۔ اسکے ڈرامے مغربی تمدن و معاشرت کی زبردست تنقید ہیں۔

"معارف"

اِس رسالے میں دو مضمون خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا مضمون "قرآن مجید اور سائنس" خواجہ عبد الوحید صاحب ناظم اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ لاہور کا ہے۔ یہ مضمون پچھلے سال اورنٹیل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور میں انگریزی میں پڑھا گیا تھا۔ اِس مضمون میں یونانی فلسفہ کی کم مائیگی پر بحث کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ عہدِ وسطےٰ میں جو یورپ کے لئے دورِ تاریکی یا عہدِ جاہلیت تھا، مسلمانوں کی تمام علمی سرگرمیاں قرآنی تعلیمات کا نتیجہ تھیں، کیوں کہ اس مقدس کتاب میں انسان کو

مطالعۂ فطرت، مشاہدہ وتجربہ، تفکر وتدبر کی جس پُرجوش طریق سے تلقین کی گئی ہے، اِس کی نظیر دنیا کی کوئی علمی کتاب تو کیا الہامی کتاب بھی نہیں کرسکتی"۔ یہ مضمون بہت سی قیمتی معلومات کا ذخیرہ ہے۔ نوجوان مسلمان طلبا کے لئے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہوگا +

دوسرا مضمون "لیٹن رسم الخط" آقا سیّد محمّد علی پروفیسر نظام کالج کا ہے، اس میں انہوں نے فارسی رسم الخط کی حمائت میں بعض نہایت قابل قدر دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ اِس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ چیز خالی از فائدہ نہ ہوگی

"مجلّۂ عثمانیہ"

جناب عبدالقیوم خان صاحب باقی ایم اے کا مضمون "غالب کی فارسی غزلیں" خوب ہے۔ اِس میں لٹریچر کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے مضمون نگار نے فارسی علم ادب کی متفرق اقسام کی توضیح کی ہے، اور بعد میں شاعرانہ ادب یا اصناف شاعری کی تاریخ پر مختصر سا تبصرہ کیا ہے، آخیر میں میرزا غالب کی قوت ایجاد وتخلیق اور فلسفہ حیات پر ایک اتفاقی نظر ڈالی ہے اور بطور مثال کے لئے غزلیات سے اشعار پیش کئے ہیں۔ جزئی اختلافات کے باوجود ہمیں اس بات کا اعتراف ہے، کہ مضمون نگار بڑی کاوش اور محنت سے اس کام کو سرانجام دے رہے ہیں۔ اُن کا یہ مضمون ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مقالہ "محاسن کلام غالب" اور مولنا حالی مرحوم کی یادگار غالب کے بعد یقیناً سب سے پہلی کوشش ہے۔ جس میں میرزا مرحوم کی فارسی شاعری کو صحیح رنگ میں ناظرین کے سامنے پیش کیا گیا ہے +

[illegible] مضمون نگار سے ایک جگہ لغزش ہوئی ہے +

عنوان زیر بحث میں انہوں نے صفحہ ۶ پر "اِنَّ اللہ خلق آدم علیٰ صورتہ" کو آیۂ کریمہ سمجھا ہے، حالانکہ یہ بھی "من عرف نفسہ فقد عرف ربّہ" کی طرح قول ہے۔ آیت نہیں +

صفحہ ۵۷ پر "براہ راست" کی جگہ "بالراست" لکھا ہے جو غلط ہے +

اِسی رسالے میں قافلہ تاریخی کی طرح پر میرزا غالب مرحوم کی ایک نظم قادرنامہ کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اسکو شائع کرنے والے پروفیسر سید سجاد صاحب ایم اے ہیں۔ انہوں نے اس پر ایک چھوٹا سا نوٹ لکھا ہے۔ اور تعجب ظاہر کیا ہے کہ میرزا مرحوم کے سوانح نگار اس نظم کا کہیں ذکر نہیں کرتے، ہمیں خود اس بات کا تعجب ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب موصوف نے اس کے نادرالوجود ہونے کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اس سے ہمیں اور بھی تعجب ہوا۔ کیونکہ یہ نظم نہ صرف ایام غدر یا اس کے تھوڑے عرصے بعد تک لوگوں میں رائج تھی بلکہ اب بھی دہلی اور اس کے نواح کے دیسی مکاتب میں بچوں کے نصاب میں شامل ہے۔ اور اس کے لئے کئی شہادتیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ چند روز ہوئے، جب ہم نے اپنے لیکچر میں

اِس کتاب کا ذکر کیا تو میرے طلبہ نے اس کتاب کے متعدد اشعار مجھے سُنائے ۔ میں حیران رہ گیا +

اِس رسالے میں "کاوشِ حیات" کی نظم کا ایک شعر ہے :-

نہ کہ فنا دگیٔ دِل صدائے درد بن گئی ۔۔۔ یا حسرتِ دلِ حزیں نوائے درد بن گئی

دوسرے مصرعہ کے "ابتداء" میں "یا" ساقط الالف ہے ۔ بالغ نظر مدیروں کی اس لغزش پر حیرت ہوتی ہے +

دوسرا مضمون "بہارِ دانش" پر شیخ چاند مدیر رسالہ کا فاضلانہ مقالہ ہے ۔ جو تحقیق و تفتیش اور ٹھوس معلومات کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہے ۔ اس میں کتاب کے ماخذ اور اُس کے مختلف تراجم پر بحث کی گئی ہے +

"زمانہ"

"بنے پتر کا" اور "شاہی تمناؤں کا مدفن" دونوں مضمون خوب ہیں بنے پتر کا تلسی داس کی ایک مشہور تصنیف ہے، منشی شمبھیشر پرشاد صاحب منور لکھنوی نے اس پر ایک ناقدانہ تبصرہ لکھا ہے +

"شاہی تمناؤں کا خون" مانڈو (علاقہ مالوہ) کے حسرتناک کھنڈرات کا مرثیہ ہے مسٹر جے ۔ آر ۔ رائے نے اِس خطہ کے مختصر سے تاریخی واقعات اور اِس کے موجودہ کھنڈرات کے حالات بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کئے ہیں ۔ پڑھنے کی چیز ہے +

"تبسم"

اردو کا ایک جدید قاعدہ

میاں علاؤ الدین صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ انڈسٹریل سکول قصور نے اُردو کا ایک بہت ہی مفید اور صلاح یافتہ قاعدے ہمارے پاس ریویو کے لئے بھیجا ہے ۔ ہم نے اسے تمام رائج الوقت قاعدوں سے ممتاز اور بچوں کیلئے بیحد آسان پایا ۔ ہم محکمہ تعلیم اور ٹیکسٹ بک کمیٹی کی توجہ اس اعلےٰ درجے کے قاعدے کی طرف منعطف کراتے ہیں تاکہ مصنف کی قدر افزائی ہو ۔ اور بچے بھی آسانی سے اُردو سیکھ سکیں +

حفیظ

تبصرے

کتابیں

القضاء فی الاسلام

مصنفہ مولنا عبدالسلام صاحب ندوی۔

مولنا شبلی مرحوم کی زندگی کے شاندار کارناموں میں غالباً سب سے اہم اور مفید دار المصنفین "اعظم گڑھ" کا قائم کرنا تھا ارکان دار المصنفین نے اپنے استاد محترم کی روایات کو جس خوش اسلوبی اور تندہی سے زندہ رکھا ہے، وہ ہندوستان کے کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ہمدردانِ قوم کی یہ مختصر سی جماعت اپنے محدود وسائل کے باوجود ملک و قوم کی جو خدمت کر رہی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔

مولنا عبدالسلام ندوی اس سلسلے میں خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ [illegible] کے نحیف و زار جسم کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ وہ غور و تفکر کا ایک پتلا ہے، ایک شعر ہے عمل سے بیگانہ لیکن اُن کے علمی [illegible] موں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، وہ ہر موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں، ہر سال دو تین تازہ کتابوں کا شائع کرنا [illegible] زندگی میں شامل ہے۔

حال ہی میں انہوں نے القضاء فی الاسلام کے نام سے ۹۲ صفحے کی ایک کتاب لکھی ہے، جس میں طریقہ شہادت اور فصل مقدمات کے متعلق اسلامی قوانین کی تشریح کی ہے، اس مختصر سی کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی عہد حکومت میں ادارۂ قضا کی کس قدر اہمیت تھی، اور اس کے لئے مسلمانوں نے کس قدر مکمل نظام عمل ترتیب دیا تھا مولانا موصوف نے مختلف موضوع قائم کر کے مثلاً منصب قضا، قاضی کا تقرر، قاضی [illegible] الاقضیہ منصبیہ، سماعت مقدمات، شہادت وغیرہ وغیرہ تمام [illegible] بحث کی ہے، اور قرآن و حدیث و فقہ سے استدلال کیا ہے۔ آخیر میں اسلام [illegible] کے ماخذ پر مختصراً کچھ لکھا ہے اور فقہ و اجتہاد کے جواز پر خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے دبی زبان میں اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ فقہ اسلامی کی مروجہ مصنفات اور ان کے وسیع دائرہ معلومات و تشریح

کے ہوتے ہوئے کسی زائد اجتہاد کی ضرورت نہیں +

بہرحال اس کتاب کا مطالعہ عوام کے لئے بیحد مفید ہوگا، ہمیں امید ہے کہ مولٰنا آئندہ اس امر کی طرف توجہ مبذول فرمائیں گے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت میں غیر اقوام کے مقدمات کے فیصل کرنے کے لئے کون سا طریق رائج تھا اور اس کی مکمل صورت کیا تھی۔ کتاب کی قیمت بارہ آنے (۱۲؍) ہے دار المصنفین اعظم گڑھ سے مل سکتی ہے +

کردار اور افسانہ

مصنفہ مولوی عبدالقادر صاحب سروری۔ ایم اے، ایل ایل، بی،

یہ کتاب مولوی صاحب موصوف کی اسی نوع کی دوسری تصنیف "دنیائے افسانہ" کا دوسرا حصہ ہے، اس کتاب میں اشخاص قصہ، اور کردار نگاری کے بعض ضروری فنی مسائل پر بحث کی گئی ہے، اخیر میں اردو کے بعض افسانوں کے کردار پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ شروع میں فہرست مضامین اور اخیر اشاریہ بھی شامل ہے، کردار نگاری افسانہ، ڈرامہ یا ناول کا ایک ضروری حصہ ہے اس کے بغیر کسی افسانہ یا ناول کا مکمل ہونا ناممکن ہے۔ بہترین افسانہ نگار وہی ہے جو اشخاص قصہ کے کردار کو نہایت خوبی سے نمایاں کر سکے، یہ بات مسلم ہے کہ اس اہم فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے کسی کتاب کی ضرورت نہیں، کیونکہ کا انحصار افسانہ نگار کی اپنی فطری ذہانت، مطالعہ نفسیات اور ذاتی مشاہدات پر ہے۔ تاہم کتاب زیر بحث بہت سے فنی مسائل کی مشکلات کا ازالہ کرتی ہے، اور مؤلف کی محنت اس بارے میں قابلِ داد ہے، یہ کتاب اُن لوگوں کے لئے بیحد مفید ہے جو افسانہ نگاری کو اپنا شعار بنانا چاہتے ہیں، ہماری اردو زبان میں کتابوں کی ابھی کمی ہے۔ ایسی حالت میں جزئی اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی ہم ایسی کتابوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے، مؤلف کتاب بڑے باغ نظر ہیں، ان کی اس کاوش کا ملک کو ممنون ہو جانا چاہیئے +

ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت عہ مکتبہ ابراہیمیہ۔ اسٹیشن روڈ۔ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے +

سیرۃ المحمود

مؤلفہ مولوی محمد عزیز میرزا صاحب مرحوم

یہ کتاب سلاطین بہمنیہ یعنی نظام شاہ اور محمد شاہ ثانی کے وزیر الوزراء خواجہ جہان عماد الدین محمود گاواں کی سوانح عمری ہے، خواجہ جہان اُن چند برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے علمی وادبی اور سیاسی کارناموں سے تاریخ اسلام کو چار چاند لگا دیئے۔ یقیناً ہندوستان میں اُن کا وہی پایہ ہے جو ایران میں نظام الملک طوسی، رشید الدین فضل اللہ کا۔ ایسے بزرگوں کے حالات ہمارے نوجوانوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتے ہیں بلاشبہ ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے جو ملک کے

کے سامنے ہمارے اسلاف کے کارناموں کو پیش کرکے آئندہ نسل کے دل میں ان کی صحیح عظمت و بزرگی کا سکہ بٹھائے، تاکہ وہ اپنی زندگی میں اس کو اپنا لائحہ عمل بنا سکے ✣

یہ کتاب آج سے تقریباً ۴۳ برس پیشتر لکھی گئی تھی، اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن زیر تبصرہ ہے، جو مؤلف کے فوٹو اور چند ضروری نقشوں اور تمام دیگر کے ہمراہ شائع ہوا ہے، ہر نوجوان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے، لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ ہے۔ صفحات ۱۱۸ قیمت عہ/ - نظامی پریس بدآیوں سے مل سکتی ہے ✣

دنیا کے بہترین افسانے

مؤلفہ منصور احمد جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں لاہور

اس کتاب کے مؤلف ان نوجوانوں میں سے ہیں جو بغیر کسی بلند آہنگی کے خاموشی سے اپنا کام کیے جاتے ہیں ان لوگوں میں استقلال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے دنیا کے مختلف ممالک کے افسانہ نگاروں کے ان افسانوں کو اردو زبان میں منتقل کیا ہے جو ان کے نزدیک بہترین ہیں، انگریزی زبان میں ایسے بہت سے انتخابات شائع ہو چکے ہیں، اردو میں ان چیزوں کی ابھی کمی ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کو ترتیب دے کر اس کمی کو بڑی حد تک پورا کیا ہے ✣

انتخاب کا کام بہت مشکل ہوا کرتا ہے، لیکن ہمیں دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مؤلف کا انتخاب بہت اچھا ہے اور یہ ان کے مذاق سلیم کی دلیل ہے، ترجمہ صاف اور شستہ ہے انداز بیان سادہ اور مؤثر ہے۔ اکثر افسانے دلآویز ہیں بعض انگریزی کو اردو لباس پہناتے ہیں تو یہ ونشتر ہیں مترجم واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتابت وطباعت دونو دیدہ زیب ہیں صفحات ۳۲۰ ۔ اسلامک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱ لاہور سے طلب کیجئے ✣

امور خانہ داری وتربیت اولاد

مصنفہ کونٹنس ای پارسنز

مترجمہ آئی - سی نندا - پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

ہمیں پروفیسر صاحب موصوف کا ممنون ہونا چاہیئے، کہ انہوں نے ایسی اہم کتاب کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ ہماری مستورات کو ان کتابوں کے مطالعہ کی اشد ضرورت ہے، یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے میں ہائی مکان کے محل وقوع اور اس کے گرد ونواح پر بحث ہے، دوسرے میں گھر کے سامان اور لباس، تیسرے میں جسمانی صحت ونشوونما اور چوتھے میں تربیت اطفال ... پر کتاب میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ نوجوانوں امور خانہ داری میں

سب سے زیادہ سادگی اور صفائی کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ سادہ طرز زندگی حقیقی خوشی کا موجب ہوتی ہے، اس اصول کے ماتحت مصنفہ نے اُن تمام اُمور پر بحث کی ہے جن کا ایک عورت کو اپنی زندگی میں جاننا از بس ضروری ہے، کتاب کی زبان بہت آسان ہے اور انداز بیان بھی بالکل سادہ ہے، ہماری رائے میں اس کو ایک نظر دیکھنے سے ہماری لڑکیوں کی معلومات میں ایک گران قدر اضافہ ہوگا، پروفیسر صاحب کی محنت قابل داد ہے۔

کتابت وطباعت کے اعتبار سے بھی کتاب بہت عمدہ ہے۔ ضخامت ۱۷۱ صفحات، قیمت درج نہیں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، بمبئی، مدراس، کلکتہ یا لاہور سے خریدیئے۔

کائنات ادب

مرتبہ محمد عبدالحمید حمید میرٹھی۔ سابق ایڈیٹر نظارہ میرٹھ

یہ کتاب میٹرکولیشن یعنی دسویں جماعت کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں مؤلف نے ہندوستان کے قدیم وجدید انشاء پردازوں، اور شاعروں کے مضامین نظم ونثر کا انتخاب درج کیا ہے، اس انتخاب میں زیادہ تر طلبہ کی دلچسپیوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ابتداء میں چند مستند اصحاب قلم کے خطوط شامل کر دیئے ہیں، جن میں فن انشاء کے علاوہ بعض مفید ادبی معلومات بھی ہیں، کتاب کے اخیر میں اہل قلم کے سوانح [illegible] ہیں، اس سے انتخاب کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مؤلف نے پنجاب کے اہل قلم میں سے صرف ڈاکٹر اقبال کو لیا ہے اور شاید یہ بھی محض اس لئے کہ کتاب کو پنجاب میں بھی پہنچانا مدنظر تھا۔ یہ طریق یو۔ پی کے اہل قلم میں عام ہے۔ بہرحال مؤلف کی محنت قابل داد ہے۔ امید [illegible] کے لئے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی، لکھائی چھپائی عمدہ ہے، ضخامت [illegible] قیمت درج نہیں۔ ایجوکیشنل بک [illegible] رسول لائنز علی گڑھ سے [illegible] کریں۔

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ دو کتابیں [illegible] اور رسالے [illegible] ہو چکی ہیں، چونکہ کتابیں زیادہ اہم ہیں اس لئے ان پر سرسری تبصرہ نہ ہو سکا، امید ہے کہ آئندہ پرچے میں درج ہوگا۔

رسالے

چاند

[illegible] منشی کنہیا لعل صاحب [illegible] کی ادارت میں [illegible] شائع ہوا ہے

اور ہندی رسالہ چاند کا اُردو ایڈیشن ہے، تاریخی، اَدبی اور اخلاقی مضامین اور نظموں کا دلآویز مجموعہ ہے، اڑھائی سو صفحات میں ۲۵ تصاویر ہیں جو بعض رسالوں کی طرح بے معنی نہیں، بلکہ کسی نہ کسی مضمون سے تعلق رکھتی ہیں۔ ملک کے اچھے اچھے مضمون نگاروں نے اِس میں لکھا ہے۔ امید ہے کہ رسالہ ترقی کرے گا +

سرورق رنگین۔ سالانہ چندہ آٹھ روپیہ، ششماہی پانچ روپیہ +

ہونہار

بچوں کا یہ ماہوار مصوّر رسالہ جناب فیاض حسین صاحب نسیم کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ نظم و نثر دونوں کا انتخاب خاصا اچھا ہے، ہونہار معلوم ہوتا ہے اگر اِسی روش پر چلتا رہا تو یقیناً ترقی کریگا +

سرورق رنگین صفحات تقریباً ۴۸۔ لکھائی، چھپائی بہت عمدہ ہے۔ قیمت سالانہ للعہ پتہ:۔ مینجر رسالہ ہونہار دہلی

ساقی

یہ ماہوار رسالہ سید انصار علی دہلوی کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوا ہے، رسالہ کا دوسرا نمبر زیر تبصرہ ہے۔ مضمون نگاروں میں ہمارے ملّا رموزی صاحب، پروفیسر عندلیب شادانی، اور جناب ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام نظر آتے ہیں، ظاہر ہے کہ اُن کے قلم سے جو کچھ نکلے گا اچھا ہی ہوگا۔ جناب قاری سرفراز حسین صاحب نے ایک ناول شروع کر رکھا ہے، جو دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ رسالانہ چندہ عہ ہے + پتہ:۔ رسالہ ساقی۔ کھاری باؤلی۔ دہلی،

اعجاز

یہ ماہوار رسالہ بارہ بنکی سے شائع ہوا ہے، جناب رئیس اور ناظر صاحب اِس کے مدیر ہیں، اور لسان الملک جناب ریاض خیر آبادی اس کے نگران۔ زیادہ تر ادبی مضمون درج ہیں۔ افسانے زیادہ ہیں، غزلوں میں زبان کا چٹخارا ہے۔ کاغذ عمدہ۔ لکھائی اچھی نہیں۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ سالانہ قیمت للعہ روپے ششماہی عہ

پتہ:۔ مینجر ناظر حسین جعفری۔ بارہ بنکی۔

کوثر

یہ ماہوار رسالہ بھی دہلی سے شائع ہوا ہے، ایڈیٹر جناب ظفر تابان ہیں، اِس کے اغراض و مقاصد مسلمانوں کی مذہبی تعلیمات کی اشاعت اور اُردو زبان کی خدمت ہے۔ جو لوگ مذہبی اُمور سے دلچسپی رکھتے ہیں، اسے مفید پائیں گے، خط باریک ہونے کے باعث ۶۴ صفحوں میں کافی مواد جمع ہوگیا ہے۔ لکھائی چھپائی صاف ہے کاغذ زیادہ اچھا نہیں۔ سالانہ چندہ صرف عہ ہے:۔ پتہ۔ رسالہ کوثر دہلی۔

ضیاء القریش

یہ رسالہ جناب حکیم محبوب الٰہی صاحب زبدۃ الحکماء کی ادارت میں گوجرانوالہ پنجاب سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے اجراء کا مقصد بھی مذہبی تبلیغ و اشاعت ہے بعض مضامین طب سے متعلق ہیں۔ رسالے کی ظاہری صورت ابھی قابلِ اصلاح ہے۔ البتہ مضامین میں تنوّع ہے، امید ہے ترقی کرے گا۔ صفحات ۴۸ قیمت سالانہ [illegible] دفتر ضیاء القریش گوجرانوالہ سے طلب کیجیے ۔

خیالات

ڈوبتے ہوئے سورج نے پوچھا "کیا کوئی ایسا ہے جو میرے فرائض کو اپنے ذمہ لے" مٹی کے چراغ نے جواب دیا "آقا۔ میں حتے الامکان آپ کے فرائض کو انجام دے سکتا ہوں"

بارش کے قطروں نے فرطِ محبت سے زمین کو چوم لیا۔ اور آہستہ سے اسکے کان میں کہا "اماں ہم تیرے بچھڑے ہوئے بچے ہیں۔ جو تجھ سے ہم آغوش ہونے کی خاطر آسمان سے آئے ہیں۔

فضا میں ستارے درخشاں ہیں لیکن آہ میرے ہی کلبۂ احزاں میں ننھا سا چراغ بجھ گیا ہے۔

رات ڈھلتے ہوئے دن کا بوسہ لیتی ہے، اور آہستہ سے کہتی ہے "میں موت ہوں تیری ماں ہوں۔ میں تجھے نئی زندگی عطا کرتی ہوں"

(ٹیگور)

سید برہان الدین، متعلم فوقانیہ عثمانیہ
گلبرگہ (دکن)

بہترین ادبی کتابیں

ادبستان :- یہ کتاب حضرت خلیقی دہلوی کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے خلیقی صاحب کی انشائے لطیف ایسی ندرت کاریوں کی حامل ہے جن کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیئے لطافت بیان کے ساتھ سلاست زبان آپ ہی کا حصہ ہے اکثر مضامین کو اصلاح اخلاق و معاشرت کے مقصد کے ماتحت ایسے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا تحسین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تدبیر منزل، حریص قفس، مجبور گناہ، ذرہ موت، ندرتِ ذوق و نظر، سوز بیوگی، نسائیت و شعریت تو خاص طور پر ایسے مضامین ہیں کہ بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی اور ایسا گداز پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اصلاح نقائص کی بروقت ضرورت محسوس کرتا ہے۔ پانچ تصاویر اور حضرت اختر شیرانی مدیر "خیالستان" لاہور کا ایک دلکش مقدمہ شریک اشاعت ہے جس میں انہوں نے مختلف نقاطِ نظر سے مصنف کی ادبی خصوصیات پر تنقید کی ہے۔ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بھی یہ ایک قابل دید کتاب ہے ارباب ذوق نے اسے اس قدر پسند کیا ہے کہ مدیر صحیفہ "ہمایوں" لاہور نے ادبستان کی اشاعت کو ایک گرانقدر خدمت قرار دیتے ہوئے مہتمم کتب خانہ ناشر العلوم لاہور کو ان کے ذوقِ انتخاب پر مبارکباد دی ہے **قیمت** مجلد سنہری ۱۲؍

میری داستان حیات یعنی امریکہ کی عجوبۂ روزگار اندھی، بہری، گونگی گریجوایٹ خاتون مس ہیلن کیلر کی خود نوشت سوانحعمری کا اردو ترجمہ از مسٹر خادم محی الدین بی اے۔ بی ٹی ایم ای ڈی ڈلیڈز جس میں مس ہیلن کیلر کے ان حیرت انگیز کمالات کا ذکر ہے جو اس نے مختلف علوم و فنون میں اپنے بہترین حواس زائل ہونے کے باوجود صرف چھونے کی قوت کی تربیت اور مشق سے حاصل کئے مس ہیلن کیلر کی زندگی اور کارناموں نے قوائے انسانی تربیت کے بارے میں نیا باب کھول دیا ہے اس کتاب کے مطالعہ سے عام پبلک اور مدرسین کو ایسی معلومات حاصل ہونگی جن سے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ یہ کتاب سکول لائبریری کے لئے انسپکٹر صاحب مدارس لاہور ڈویژن نے منظور فرمائی ہے **قیمت** مجلد ۱۲؍

دنیا کے بہترین افسانے :- اس کتاب میں دنیا کے تمام ممالک مثلاً ہندوستان، انگلستان، روس، فرانس، امریکہ، جرمنی، اٹلی، یونان، ہالینڈ، بلجیم، بلگیریا، رومانیہ، پولینڈ، یوگوسلاویہ، یوگوسلافیہ، عرب، یہودی، ترکی، ایران، چین اور جاپان کے ۳۴ بہترین افسانے درج کئے گئے ہیں، کتاب کی خوبیوں کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس کے مرتب و مترجم منصور احمد ایڈیٹر "ہمایوں"

(محصول ڈاک بذمہ خریدار) **ملنے کا پتہ: مہتمم کتب خانہ ناشر العلوم لاہور** (اس رسالہ کا حوالہ ضرور دیں)

ہیں جن کے طرزِ تحریر کو ادبی دنیا میں خاص وقعت حاصل ہے۔ ان کی نظرِ انتخاب صرف انہی افسانوں پر پڑی ہے جو موجودہ و گزشتہ زمانے کی افسانہ نگاری کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ کتاب نہایت اعلیٰ کاغذ بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ تیار ہوئی ہے قیمت عا مجلد ۱۲ ؏

کامیاب زندگی: ہندوستان میں ہر ایک شخص خواہ وہ مزدور ہو یا سرمایہ دار، تاجر ہو یا کاریگر عام طور پر ناکامی و نامرادی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تنگدستی اور بدحالی سایہ کی طرح ساتھ لگی رہتی ہے اس عام حالت کے خلاف جو نوجوان زندگی کی کشمکش میں کامیاب ہو کر شہرت و عظمت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کی تمنا رکھتے ہیں انہیں چوہدری غلام حیدر خان صاحب سابق مدیر صداقت کلکتہ کی اس جدید کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے جو درحقیقت ایک امریکن ماہر اقتصادیات کی انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ ان کے لئے یہ کتاب ایک مخلص رفیق کا کام دیگی۔ کامیابی اور ترقی کے جو نکتے اور گُر اس کتاب میں درج ہیں۔ ان پر عمل کر کے ناکام نہیں ہو سکتے قیمت مجلد ۱۲ ؏

الہامی افسانے: انبیائے کرام کی زندگیوں کے حالات بہترین اسلوب اور لطیف اردو زبان میں پیش کئے گئے ہیں ہر مسلمان کو اس کتاب سے بہرہ اندوز ہونا چاہئے۔ یہ کتاب حضرت مبکش مدیر روزنامہ انصاف لاہور کی بہترین تصنیف ہے قیمت عسہ ؏

تاریخ المشاہیر مؤلفہ قاضی محمد سلیمان صاحب پنشنر جج پٹیالہ جس میں پچاس نامور بزرگوں، بادشاہوں، وزیروں اور شاعروں کے حالات درج ہیں۔ کتاب مجلد و مطلا ہے قیمت عا

خطبات نبوی: حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام خطبات جو کہ آپ نے مختلف موقعوں پر ارشاد فرمائے مع ضروری حالات و واقعات۔ قیمت ۸ ؏

پارچہ بافی با تصویر - اس کتاب میں زمانہ حال کی فن پارچہ بافی کے متعلق لکھی ہوئی بہترین انگریزی کتب سے روئی کی کاشت سے لے کر سوت تانا، بھرائی کپڑا بننے اور کپڑے کے مختلف ڈیزائن بنانے تک کی جملہ معلومات درج کی گئی ہیں مطالب کو واضح کرنے کے لئے تصاویر بھی دی گئی ہیں قیمت عا مگر کانگرسی ارکان کو کل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سکرٹری کی سفارش پر ۸ ؏

گائے بیل اس کتاب میں گائے بیل کی پہچان خرید اور پرورش کے متعلق بہت مفید معلومات درج ہیں اور ان کے جملہ امراض کے اسباب، علامات اور علاج کے لئے آسان اور سہل الحصول نسخے بھی دئے گئے ہیں مطالب کے متعلق سولہ تصاویر بھی دی گئی ہیں اس کتاب کا مطالعہ عام لوگوں بالخصوص کاشتکاروں اور ان لوگوں کے لئے بہت مفید ہے جن کو رات دن گائے بیل کی خرید و فروخت اور پرورش سے سابقہ رہتا ہے قیمت ۷ ر

رقعات اکبر یہ کتاب مولانا اکبر مرحوم کے رقعات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ہندوستان کے بہترین افراد کے نام لکھے ان رقعات میں حضرت اکبر کی جملہ خصوصیات سادگی زبان، بے ساختہ پن، پرلطف اندازِ بیان، بہترین اشعار وغیرہ نمایاں ہیں سلیس پرمعنی اور لطیف و دلکش انشاء سیکھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے محکمہ تعلیم نے بجا طور پر اس کی قدر کی ہے قیمت ۱ ر

ہفت پیکر یعنی ملک کے نامور شاعر حضرت حفیظ کے سات طبعزاد اور دلکش افسانے جو جبراً تحسین طلب کرتے ہیں قیمت ۸ ؏

(محصول ڈاک بذمہ خریدار) **ملنے کا پتہ مہتمم کتب خانہ ناشر العلوم لاہور** دا... برس کے حوالے ... سگنگ معافی

حجاب زندگی۔ اس کتاب کے متعلق مولانا سالک مدیر "انقلاب" لاہور کی رائے ہے کہ مصنف کتاب سید عابد علی صاحب عابد کا انداز بیان، آپ کی قوت تحریر اور متانت اظہار خیالات نہایت قابل قدر ہے اس مجموعہ میں بعض مضامین تو ایسے ہیں کہ کہ اردو زبان کے سرمائے میں فخر کے ساتھ پیش کئے جائیں۔ داستان پارینہ، انحطاط شباب اور بنائے انشکال (یہ تینوں افسانے حجاب زندگی کے افسانوں میں درج ہیں) معمولی تحریریں نہیں۔ اردو ادب کے نہایت پاکیزہ جواہر ہیں **قیمت** ۱۲ر

ثمربات النحو علم النحو کے متعلق جناب غلام سرور خانصاحب پرسنل اسسٹنٹ دائرکٹر سررشتہ تعلیم صوبہ سرحد کی قابل قدر تصنیف ہے جسے دہلی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں نے امتحان میٹرکولیشن کے لئے بطور ٹیکسٹ بک مقرر کیا **قیمت** عہ

لنگڑا ماموں۔ یہ ایک دلچسپ فسانہ ہے جو سلیس اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ دیو پریوں کے فرضی اور خلاف قیاس کی بجائے اس میں ایک کہانی بیان کی گئی ہے جس کا ظہور میں آنا ممکن ہے۔ انداز بیان ایسا موثر ہے کہ واقعات دل پر نقش ہوتے جاتے ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے حوصلہ، جرأت اور خطرے کے وقت گھبرانے کی بجائے اس سے بچنے کی تدبیر کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ بچوں کے اخلاق و عادات سنوارنے کے لئے بہت مفید ہے **قیمت** ۲ر

ولیم ٹیل یعنی ولیم ٹیل اور سوئٹزرلینڈ کی آزادی کی داستان جس میں ستم رسیدہ محکوموں کے احساس بیداری، اقتدار ملوکیت کے خلاف نفرت و ہیجان، قومی تحریک کی کامیابی اور ملوکیت کی تباہی کی مکمل کیفیت پیش کی گئی ہے **قیمت** ۸ر

شہری اور شہریت۔ یہ کتاب جناب حکیم احمد شجاع صاحب سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی تصنیف ہے جس میں ایک دوسرے کے ساتھ انسانوں کے تعاون، شہروں کے قیام اور تمام شہری ضروریات اور نظام کی ابتدائی تاریخ اور شہروں کے موجودہ نظام اور شہری زندگی کے لوازمات پر بحث کی گئی ہے جس سے واقف ہونا ہر نوعمر بچے کیلئے ضروری ہے ۵ر

زرداد۔ یہ کتاب بھی حکیم احمد شجاع صاحب کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے شہنشاہ بابر کے حالات زندگی اور اس کے ہمت جرأت اور استقلال آموز زریں کارناموں کی کہانی اسکے بچپن کے دوست زرداد کی زبانی نہایت سلیس اور آسان اردو زبان میں بیان کی ہے طبیعت میں حوصلہ، جرأت اور استقلال پیدا کرنے کے لئے اس کتاب کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔ **قیمت** ۶ر

کیوں اور کس طرح۔ اس کتاب میں عام حادثات، واقعات اور مختلف صورتوں کے متعلق جو قدرتی طور پر دن رات ظہور میں آتی رہتی ہیں نہایت سلیس اور آسان اردو زبان میں ان کے واقع ہونے کے اسباب بیان کئے گئے ہیں مثلاً "پروانے کیوں جلتے ہیں"۔ "زلزلے کیوں آتے ہیں"، "دن کو ستارے کیوں نظر نہیں آتے"۔ "ہمیں خواب کیوں یاد رہتا ہے"۔ "مور کس طرح معلوم کرتے ہیں کہ بارش ہونے والی ہے" غرض کہ ایسے بیسیوں مسائل اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔ بچوں کی عام استعداد بڑھانے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے **قیمت** ۵ر

اساس القرآن۔ بچوں کو آسانی سے عربی زبان سکھانے اور قرآن شریف کو صحیح اور آسانی سے پڑھانے کیلئے بہترین قاعدہ ۴ر

متفرقات

بم کا نسخہ مکمل عہ	فلسفہ الہیات عم	کلیات ولی صہ	مثنوی خواب وخیال عام	جاپان اور اسکا تعلیمی نظم ونسق عہ
مشاہیر یونان وروما ۸ہ	دریائے لطافت مجلد عام	طبقات الارض ۸ہ	علم المعیشت مجلد عہ	اسلام و نیشنلزم ۴ر
نپولین اعظم پانچ حصے مکمل ۱۲	حقیقت اسلام ۱۲ر	تاریخ نجد عم	رسالہ نباتات ۴ر	سیرۃ عمرو بن عاص عم
تاریخ فلسفہ اسلام ۸ہ	عربوں کا تمدن عام	صلاح کار عہ	اسباق القرآن ۴ر	سیرۃ النبی قسم اعلیٰ ۱۲
سیرۃ النبی قسم دوم للعہ	کلیات شبلی اردو ۸ہ	الفاروق عام	المامون ۸ہ	ابن الوقت عہ
رویائے صادقہ ۸ہ	مراۃ العروس عم	اصلاح معیشت ۸ہ	مکالمات برکلے ۸ہ	تصوف اسلام عم
فلسفہ جذبات عام	سیرۃ عائشہ صدیقہؓ ہے	بہادر خواتین اسلام ۴ر	سیر الصحابیات ۸ہ	القاب الامم عام
سیرۃ عمر بن عبد العزیز ۸ہ	اسوۂ صحابیات عم	برکلے اور اس کا فلسفہ عہ	بادۂ ناب عم	لسان الغیب یعنی شرح دیوان
تیغ کمال عہ	سمرنا کا چاند ۸ہ	عروس کربلا ۸ہ	طوفان حیات ۸ہ	حافظ ہر حصص فی حصہ عام
صد پارۂ دل عام	شہید وفا ۱۰ر	تاریخ یہود ۸ہ	حروب صلیبیہ عام	مسیح اور مسیحیت عہ
شوقین ملکہ عہ	رومتہ الکبریٰ عہ	ملک العزیز ورجنا ۸ہ	فلورا فلورنڈا عہ	ملکہ زنوبیہ ۱۲ر
قیس ولبنیٰ ۸ہ	سکینہ بنت حسینؓ ۶ر	فردوس بریں عم	خوفناک محبت ۸ہ	درگیش نندنی عم
حسن بن صباح ۶ر	حسن انجلینا عہ	الفانسو ۱۲ر	مقدس نازنین عہ	مفتوح فاتح ۸ہ
جویائے حق ہر دو حصے للعہ	فلپانا عہ	عرب قبل از اسلام ۸ہ	صقلیہ میں اسلام ۱۴ر	لعبت چین عم
شیریں ملکہ عجم ۸ر	بابک خرمی عہ	زوال بغداد عہ	ماہ ملک عام	فتح اندلس ۸ہ
یوسف نجمہ کامل عام	عیب دان دلہن عم	گوہر مقصود ۶ر	سوکن کا جلاپا ۶ر	گلدستہ عید ۱۲ر
سنوتی ۸ر	فسانہ سعید ۱۰ر	الزہرا ۱۲ر	نوحۂ زندگی ۱۲ر	منازل ترقی ۴ر
محبوبہ خداوند ۱۲ر	سراب مغرب ۸ر	در شہوار ۱۰ر	امت کی مائیں عم	شب زندگی عم
منازل السائرہ عم	بنت الوقت ۸ر	صبح زندگی عہ	شام زندگی ۸ہ	تائید غیبی ۸ر
اسلام کا انجام ۶ر	خطوط اکبر عہ	یزید نامہ ۸ہ	سفر نامہ مصر و شام ۸ہ	اولاد کی شادی عم
مکاتیب اکبر عم	حکومت اورنگ زیب ۱۲ر	تجارت ۸ر	دنیا کے عجائبات ۸ر	محبت کا انتقام عم
صبح وطن عام	رستم وسہراب ۸ر	نصیحت کے پھول ۴ر	آئینہ عبرت ۱۲ر	زرین شہزادے ۶ر

(محصول ڈاک بذمہ خریدار) ملنے کا پتہ مہتمم کتب خانہ ناشر العلوم لاہور (اس رسالہ کا حوالہ دینے پر پیکنگ معاف)

دانتوں کا محافظ

"کلینز و ٹوتھ پوڈر"

دنیا کی بہترین ایجاد ہے

قیمت [illegible]

سول ایجنٹس

برائے انڈیا، برما، سیلون

دی ڈینٹل سپلائی ہوس انارکلی لاہور

ملنے کا پتہ

ڈاکٹر عطاء اللہ دندان ساز انارکلی

لاہور

عام طور پر خیال ہے کہ

دانتوں کے برش

جن میں ہڈی اور بال لگے ہوئے ہوتے ہیں بعض مذاہب کے رو سے ان کا استعمال درست نہیں اس دقت کو مدنظر رکھ کر ہم نے دانتوں کے لئے ایسے برش تیار کروائے ہیں جنکا ہینڈل بھی لکڑی کا ہے اور

دانت صاف کرنیوالے

بال اور ریشے بھی لکڑی کے ہیں

جن کو ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی [illegible] ہر مذہب کے ماننے والے بغیر کسی کراہت کے [illegible] یہ برش ہڈی و بالوں کے برش سے خوبصورت بھی زیادہ [illegible] بھی زیادہ اور مضبوط بھی زیادہ ہیں۔ قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ

دی ڈینٹل سپلائی ہوس انارکلی

ڈاکٹر عطاء اللہ دندان ساز انارکلی

لاہور

اردو زبان کا اولین صحیفہ

19/5/20

دورِ جدید

مخزن

لاہور

ایڈیٹر

ابو الاثر حفیظ جالندھری

جملہ حقوق محفوظ
قیمت سالانہ
للعہ ر (چار روپے)
بذریعہ وی پی (سہ۴ للعہ ر)

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۰۹۷
ممالک غیر سے
۹ شلنگ
قیمت فی نمبر ۸ ر

بابت ماہ مئی ۱۹۳۰ء

جلد ۴ — نمبر ۳

رفیق عام پریس لاہور میں باہتمام منظور الزمان پرنٹر چھپا
اور
میاں ظہور الدین مالک و پبلشر نے دفتر مخزن بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا

شذرات

اس اشاعت میں ایک مضمون بعنوان "پہلوی" شائع کیا جارہا ہے۔ یہ مضمون ہمارے کرمفرما منشی دین محمد صاحب بی اے نے اپنی ایک غیر مطبوعہ تصنیف سے عطا کیا ہے۔ منشی صاحب ممدوح عربی فارسی اور اسلامیات سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ اور ان علم دوست اصحاب میں سے ہیں جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ کتاب کا نام پہلوی گرامر ہے اس کتاب میں مؤلف نے پہلوی زبان کے "قواعد" سے بحث کی ہے۔ اور موجودہ فارسی کے قواعد کے ساتھ مقابلہ کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ ان میں باہمی رشتہ کیا اور ان میں مطابقت اور تباین کی نوعیت کیا ہے۔

کتاب کی تمہید میں ایران کی تاریخی زبانوں یعنی قدیم فارسی۔ "اوستا" "پہلوی" اور موجودہ فارسی کے متعلق مختصر بحث ہے۔ جس میں بالخصوص پہلوی زبان کی حیثیت، تاریخ۔ ترکیب۔ رسم الخط، سامی عنصر کی آمیزش اور چند اور متعلقہ امور پر زمانہ حال کی تحقیق کے مطابق روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مؤلف کی تجویز کے مطابق کتاب قریباً مکمل ہو چکی ہے۔ البتہ اس وقت چند دقتیں کتاب کے شائع ہونے میں حائل ہیں۔ لیکن توقع ہے کہ یہ مشکلات طے ہو کر موسم سرما میں بمبئی سے یہ کتاب شائع ہو جائے گی۔

ہم اس وقت کتاب کی تمہید کا وہ حصہ جس کا تعلق پہلوی سے ہے۔ ناظرین مخزن کی دلچسپی کے لئے شائع کر رہے ہیں۔

حفیظ

اس مہینے [illegible]

[illegible] کو مخزن کی قلمی اعانت کے لئے تیار کیا ہے۔

اس لئے توقع ہے کہ مخزن کی آئندہ اشاعتیں [illegible] مضامین سے مزین ہوں گی [illegible] (تبسم)
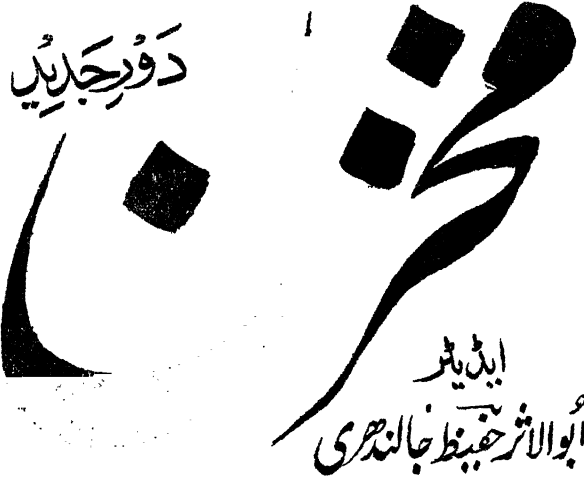
اخبارِ اردو[1]

(از مُلّا رموزی)

وہ جو ایک مرتبہ علیہ الرحمۃ سعدی شیرازی نے فرمایا تھا کہ

؎ ہر کہ بقامت کہتر بقیمت بہتر

سو اُردو کے معاملہ میں یہ قول "صوبہ واللہ چنانچہ" کے ایک ننھے مُنّے سے اخبار "چوکیدار پیلی بھیت" موافق ہے کیونکہ یہ غریب سی صورت کا اخبار تبلیغ و حفاظت اُردو کے سلسلہ میں اُردو کے اُن تمام قطب صاحب کی لمبے لمبے اخباروں سے بہتر ہے جن کے وسیع اور رنگین صفحات اُردو کی حمایت و اشاعت کے مضامین سے ہمیشہ خالی مگر ان شاندار اخباروں کے مقابل ایک یہ "فدوی قسم کا اخبار چوکیدار" ہے۔ جو اُردو پر لکھے بغیر رہتا ہی نہیں اور کہ بہت لکھتا ہے اور موقع ملتا ہے تو لکھتا ہی چلا جاتا ہے مثلاً اس نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۹- مارچ ۱۹۳۰ء کے صفحہ پر "بھرہ اخبار" میں اور کچھ نہ ہو سکا تو اخبار "ہمدم لکھنؤ" سے اتنی ہی خبر نقل کر دی کہ

"ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی کے حکام نے طے کر لیا ہے کہ آیندہ سے ٹکٹوں پر اردو ہندی و انگریزی میں نام مقام اور ٹکٹ کی قیمت درج ہوا کرے گی"

---

[1] قطب صاحب کی لاٹ کے برابر اور سچے بزرگ کے حکم سے عنوان "اخبار اُردو" قائم کیا گیا۔

یہ حقیقت سورج سے بھی زیادہ روشن ہے کہ" ایلبانہ مسائل وحالات" کو ہندوستانیوں کی اجتماعی، تجارتی، تمدنی علمی، ادبی، غرض ہر قسم کے ماہوار، ہفتہ وار اور روزانہ زندگی سے وہی تعلق ہے جو روح کو جسم سے ہوتا ہے۔ مگر زبان کے معاملہ میں خدا جانے ان ریلوے کمپنیوں نے سارے ہندوستانیوں کو انگریز کیوں سمجھ لیا ہے جو وہ ریل کا ہر قسم کا معاملہ انگریزی زبان ہی میں طے فرماتی ہیں۔ ہم کلکتے شریف کی ریل کا حال تو نہیں معلوم مگر ہاں ہندوستان کی تو ایک ایک ریل کو دیکھا ہے جس کے سر سے لیکر پاؤں تک پر انگریزی ہی انگریزی نظر آتی ہے۔ خصوصاً ملا رموزی صاحب کی ریل یعنی جی، آئی، پی کمپنی میں تو اُردو زبان کا "تذکرہ گویا سیدھی گالی کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کی جس کل میں دیکھو انگریزی ہی انگریزی بھری پڑی ہے۔ مگر اس کمپنی کے کسی ایک سفید یا سیاہ رنگ کے اللہ کے بندے کو یہ توفیق حاصل نہیں ہوئی۔ کہ وہ اپنی کمپنی میں ٹکٹوں، اعلانوں، تار کے فارموں، اطلاعات کے تختوں پر اُردو زبان کو اس لئے رواج دے کر جی، آئی، پی بمبئی سے بحد مستقیم پشاور پر جا کر دم لیتی ہے اور یہ ریلوے کے دس ہزار "سائمن کمیشنوں" سے تحقیق کرا دیکھیں نہیں معلوم ہو جائیگا کہ بمبئی سے پشاور تک جتنے مسافر آتے جاتے رہیں۔ وہ پشتو اور عربی کے عوض اُردو ہی بولتے ہیں اور اُردو ہی سمجھتے ہیں۔ اب کہنے کو تو لاہور ہی میں ریلیانہ ٹریڈ یونین" کے ایم، اے، خان موجود ہیں۔ جو آئے دن ریلوں کے ملازمین سے تنخواہوں کے اضافوں کے لئے ہڑتالیں کراتے رہتے ہیں۔ مگر کوئی" اُردو کا ایم اے خان" نہیں جو بمبئی جی، آئی، پی کے ناظم اعلےٰ کے صدر دفتر میں" بغیر اجازت گھس کر" اتنا کہدے کہ براہ کرم اپنے ہاں اُردو کے" پیدائشی حق کو تسلیم فرمالیجئے۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ کسی دن پورے صوبۂ پنجاب کا ایک ایک اللہ کا بندہ تمہاری ریلوں کے سامنے آکر اُردو حمایت وحفاظت کے لئے لیٹ جائے اس لئے کہ تمہاری ریلوں میں ایک سب سے بڑی ریل کو زندہ دِلان پنجاب ہی کے ساتھ نسبت ہے جسے" ریلیانی اصطلاح" میں" پنجاب میل" کہتے ہیں۔ مگر اس پنجاب میل کے کسی ایک ڈبہ پر اُردو کا ایک شعر یا ایک جملہ ہی کوئی لکھا ہوا بتا دے، تو ہم جانیں اور جو لکھا بھی ملے گا تو یہ صحیح جملہ کہ تھوکو نہیں،

پس امید ہے کہ زندہ دلان پنجاب اپنے نام کی نسبت کی لاج رکھنے کے لئے جی۔ آئی۔ پی کے حکام سے اُردو کے رواج کیلئے کوشش کریں گے ورنہ پھر یہ آپ کے" غیر پنجابی دُبلے پتلے ملا رموزی صاحب ساری جی۔ آئی۔ پی میں" اردو کی نمک فرمائی" پر غور شروع کردیں گے۔

حمایت اُردو کے لئے سعی" گاندھی اخبار" جو کیدار نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۳۰ء کے صفحہ نمبر ۳ کالم نمبر ۳ پر ایک بسیط

اور جامع مقالہ شائع کیا ہے۔ جس میں صوبۂ والله بالله میں اُردو کے مقابل ہندی زبان کی ترقی کو ان الفاظ میں دکھایا ہے کہ

جب سے ہمارے صوبے میں اُردو کے برابر ہی ہندی کا خانہ سر انٹونی میکڈانلڈ سابق لفٹنٹ گورنر قائم کر گئے ہیں۔ اسوقت سے اُردو کے خطوط بھی ہندی لیٹر بکس میں ڈالے جاتے ہیں۔ ڈاکخانوں کے فارم اور عدالتوں کے سمن تو برسوں سے اُردو دان عوام و خواص کے نام بھی ہندی ہی میں نکلتے ہیں۔ اور اس سے ناواقفیت کی بنا پر خود راقم تحریر ہذا نے ایک مقدمہ میں سخت نقصان اٹھایا۔ مگر اب چند ترکیبیں اور ایجاد ہوئی ہیں مثلاً مردم شماری کے سلسلہ میں اُردو زبان والوں کی مادری زبان بھی ہندی بتائی گئی ہے۔ سررشتہ تعلیم نے اُردو ریڈرین اس قماش کی جاری کی ہیں کہ اُن میں غیر مانوس ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی طرح امتحانوں کے سوالات میں بھی ہندی کے نا قابل فہم الفاظ دیئے جاتے ہیں۔ جن کے سمجھنے سے طلبہ قاصر رہتے ہیں وغیرہ"

پس جب سررشتہ تعلیم ہی کی یہ حالت ہو تو پھر اُردو کا فاتحہ پڑھ لینا چاہیئے زبان اُردو کی یہ گت اس صوبے میں بنائی جارہی ہے۔ جہاں کی سرزمین کو دعوٰی ہے کہ اس کے کھیتوں میں مولی، آلو، اور گیہوں تک اُردو میں پیدا ہوتے ہیں اور جو آئے دن پنجابیوں کی اُردو پر لکھنوی آوازے کستے ہیں۔ مگر اس اخبار "چوکیدار" نے حمایت اُردو کا حق اس طرح ادا کر کے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد   خدا "پنج لکھنوے" یکساں نہ کرد

ہم نے کئی بار لکھا ہے کہ اُردو کی اشاعت اور حفاظت کے لئے ان مقامات میں زیادہ کوشش کرنا چاہیئے، جہاں اُردو کی ترقی کے ذرائع مفقود ہیں، اس ذیل میں ہم نے کبھی صوبۂ سرحد اور جنوبی ہند کا تذکرہ بھی کیا تھا کہ اس طرف اُردو کی حالت تو روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے اور ہندی ہے کہ برابر ترقی کرتی جارہی ہے۔ پس اس سلسلہ میں صوبۂ برار کے حامیانِ اُردو عموماً اور مقام "اکولہ صوبہ برار" کا اخبار "البرہان" خصوصاً قابل تعریف و ستائش ہے جو اس علاقہ میں زبان اُردو اور تعلیم اُردو کے لئے قابل صد احترام جدوجہد سے کبھی غافل نہیں رہتا +

چنانچہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء کی سرکاری تعطیلات کے زمانہ میں اس علاقے کے باشندوں کے سرکردہ ارکان نے اپنے بے علم بھائیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے ایک زبردست تحریک کا سرانجام کیا ہے جو انگریزی زبان میں "آل برار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے صورت پذیر ہوگئی +

پس اس تعلیمی مجلس کو کامیاب بنانے کے سلسلہ میں اخبار "البرہان" اکولہ جو زبردست تبلیغی خدمات انجام دے رہا تھا اس سلسلہ میں اس نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۰ء کے مقالہ مدیری کی جگہ حضرت محترم سید مبین الرحمن صاحب کا ایک نہایت مبسوط اور علم افزا مضمون درج کیا ہے۔ جس میں محترم سید مبین الرحمن صاحب نے اردو کے متعلق ذیل کے حالات فراہم کئے ہیں:-

> صوبہ کے کسی کالج میں اردو اور عربی کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ یہ دونوں زبانیں یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔ مگر اس کے برخلاف ایم۔اے تک ہندی زبان کی تعلیم کا جبل پور میں انتظام کیا گیا ہے۔ اور مرہٹی زبان کے ایم۔اے کی تعلیم کا انتظام بہت جلد ہونے والا ہے۔ مرہٹی زبان کی بی۔اے تک کی تعلیم کا انتظام تو اس وقت بھی موجود ہے۔ مگر مسلمان طلبہ ایف۔اے میں بھی اردو زبان نہیں لے سکتے ٭

واضح ہو کہ صوبہ برار و متوسط کا احاطہ ایک لاکھ ۱۳۱ ہزار ۹۲ مربع میل ہے، آبادی ایک کروڑ ۹۳ لاکھ ۱۲ ہزار سات سو ساٹھ ہے اس میں قسمت برار کا احاطہ ۱۸ ہزار مربع میل ہے اور آبادی تین لاکھ ۷۵ ہزار تین سو سولہ ہے ٭

برار میں ہائی اسکولوں کی تعداد (۱۶) ہے نارمل اسکول (۳) ہیں۔ ان میں سے دو اردو ہائی اسکول اور ایک اردو نارمل اسکول ہے باقی کے مرہٹی ہیں ٭

اب بتایئے ان حالات کے ساتھ صوبۂ برار پر حکومت کرنیوالی جماعت کو اپنے غم و غصہ کی لال لال آنکھیں دکھائیں یا ہندوستان بھر کے ان ٹھیکہ داروں کو مزا چکھائیں جو جگہ جگہ اردو کی حمایت و حفاظت کے نام سے انجمنیں بنائے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک تو گورنمنٹ یا حکومت نام ہے رعایا کی آواز اور متفقہ آواز کا پس اگر ہندوستانیوں کی مادری زبان کی اس ابتر حالت پر پنجاب، اودھ۔ بنگال، بہار اور سرحد سے ایک ایک نمایندہ ہی صوبۂ برار میں پہنچکر اردو کی حفاظت اور ترقی پر بھرے جلسوں میں تقریر کرتا پھرے تو گورنمنٹ اس وقت اردو کا خیال کرے گی یا اردو کے دو چار اخباروں میں دو چار مضامین لکھدینے سے برار میں اردو پھیل جائے گی ؟ جو حکم ہو تعمیل کی جائے ٭

"ملا رموزی" صاحب کی یہ پہچان ہے کہ وہ جس چیز کی تعریف اور خوشامد میں کبھی کبھی صفحے کے صفحے رنگتے چلے جاتے ہیں اس کی کمزوری اور برائی پر بھی وہ اتنے ہی زور و شور سے دندناتے ہیں۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ ہم آج تک بغیر کسی ادبی منصب اور علمی جاگیر کے مملکت عالیہ اسلامیہ حیدرآباد کی خدمات علم و زبان پر تعریفیں لکھتے رہے ہیں اس لئے آج ہم کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ اس طرف کے ذمہ دار لوگوں کے تغافل پر بھی کچھ کہیں۔ چنانچہ حیدرآباد کا "خاص الخاص

اخبار " رہبر دکن " مورخہ ۶ - اپریل سنہ ۱۹۳۰ء اپنے بحرۂ لطافت میں لکھتا ہے :- کہ

"محکمۂ معارف حیدرآباد نے اس سال مدارس حیدرآباد کے کتب خانوں کے لئے ایک ولائتی اخبار کے سالنامے کی "مبلغ دس ہزار" کا بیان نقد خرید فرمائی ہیں - حالانکہ ان سالناموں کے سمجھنے والوں کی تعداد بھی اتنی نہیں ہے " +

اب حیدرآباد کے علیگڈھ قسم کے لوگ سگریٹ ہاتھ سے پھینک کر جو بڑی سے بڑی دلیل پیش فرمائیں گے وہ یہی کہ اس سالنامے کی خرید اور سرپرستی کا مقصد فقط یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے طلبہ کی انگریزی استعداد و معلومات میں اضافہ ہو بس اس ایک دلیل کے سوا کوئی اور سبب ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا - اس لئے ثابت ہؤا کہ بس سارے حیدرآباد میں یہی ایک سالنامہ ہو سکتا تھا جس کے ذریعہ حیدرآبادی طلبہ کی استعداد میں اضافہ ہوتا اور نہ تو کوئی کتاب کوئی رسالہ اور کوئی انگریزی اخبار ایسا تھا ہی نہیں جس سے اس قسم کا کوئی فائدہ پہنچایا جا سکتا ؟ پس اگر بقول " رہبر دکن " ان دس ہزار سالناموں کی خرید کا یہی ایک مقصد ہے - تو پھر محکمۂ معارف حیدرآباد کے مقابل " اُردو عثمانیہ یونیورسٹی " اور اس کے مقاصد کو جانچ کر بتائیے کہ ان دونوں میں کون اچھا کام کر رہا ہے ؟ ؟ ؟

اور چلیئے علاقہ برار اور حیدرآباد خاص میں اُردو کی حق تلفیوں بعد حیدرآباد کے " ملحقات " میں اردو کی " گت " اور " درگت " کے اندازے کے لئے اخبار خلافت بمبئی " مورخہ ۳۰ - مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کے صفحہ نمبر ۵ پر شائع ہونیوالے مراسلے بعنوان " دکن کے مسلمان اور ان کی مذہبی حالت " کی ایک ایک سطر کو اگر آپ عینک لگا کر پڑھیں گے - تو اس کی " مہین مہین سی سطروں کے بیچ میں آپ کو یہ فقرے نظر آئیں گے :- کہ

" اس طرف کے مسلمان مذہبی لحاظ سے بُری حالت میں ہیں - یہ لوگ اسلامی عقائد سے بالکل ناواقف اُصول و ارکان اسلام سے بے خبر اُردو زبان سے نابلد اور ہندو طرز زندگی اور طریق معاشرت کے خوگر ہیں " +

اب اس عبارت میں ان لوگوں کی مذہبیت اور اعتقادی اصلاح کو تو چھوڑ دیجئے وہ دہلی کے قبلہ مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء پر آپ تو اس میں سے فقط یہ فقرہ لے لیجئے - کہ یہ لوگ " اُردو سے نابلد ہیں " تو اب فرمائیے کہ ملحقات دکن کے باشندوں کا اُردو سے نابلد رہنا اور پھر سارے ہندوستان کو چھوڑ کر صرف حیدرآباد ہی میں " اُردو یونیورسٹی " قائم کر دینا دو منطقی باتیں ہیں - یا عام فہم ؟ اس پر طرفہ یہ کہ وہ جو اورنگ آباد میں لے دے کر فقط ایک قبلہ مولوی عبدالحق صاحب

"انجمن ترقی اُردو" بن کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں بھی بجائے "گشتی اُردو" کے پروفیسر بنا کر اسی یونیورسٹی میں بلا یا گیا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ کبھی کبھار جو مولوی صاحب قبلہ اپنے تبلیغی اثرات اور فیضان سے ملحقات دکن کو فائدہ پہنچاتے تھے۔ اب وہ بھی نہیں تو پھر اگر اخباروں کی چیخ پکار سے کبھی اُردو نے غیر اُردو دان لوگوں کو شدھ کیا ہو تو آپ ہی بتا دیجئے؟

بس اب ایک قبلہ محترم اوستاذی حضرت محوی لکھنوی اور رہ گئے ہیں۔ جو عثمانیہ کالج اورنگ آباد سے نکل کر کبھی کبھی دیہات میں اُردو کے مطلعے عرض کرا دیتے ہیں باقی سب خیریت ہے +

یاد ش بخیر وہ "اہل زبانوں" کا گھر عرف لکھنؤ کبھی کبھی یاد آ ہی جاتا ہے۔ آپ جب چاہیں لکھنؤ کیا بلکہ پورے صوبجات متحدہ کے ترجمان اور ذی اثر اخبارات "حقیقت لکھنؤ، ہمدم لکھنؤ، ہمت لکھنؤ" کے طویل سے طویل اوراق اٹھا کر دیکھ لیجئے ان کا "بہرۂ مقامی" یا "مقامیات کا حصہ"، "بزم ادب، بزم خیال، معین الادب اور دنیا جہاں کی" اُل ادب قسم کی انجمنوں کو اس اطلاع سے خالی نہ ملیگا۔ کہ آج اس انجمن کا مشاعرہ منعقد ہوا اور بس۔ اور ۱۶۔ اپریل ۱۹۳۰ء کے اخبار حقیقت لکھنؤ نے تو اپنے صفحہ نمبر ۴ پر یہ تک لکھدیا کہ "ابوالاُردو حضرت سید جالب دہلوی کی صدارت میں "انجمن اُردو لکھنؤ کے ارکان" تک منتخب ہو گئے۔ جن کے صدر حضرت عبدالماجد صاحب دریابادی بی اے ایڈیٹر اخبار "سچ لکھنؤ" مقرر ہوئے ہیں۔ اس کے سوا بعض لکھنوی رسالے بھی ہیں جو زبان اُردو کی بہترین خدمات بجا لا رہے ہیں۔ بلکہ اُردو کی حفاظت کا جو ولولہ لکھنؤ میں پایا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے نتائج کا مستقبل نہایت کامیاب نظر آتا ہے +

لیکن بعض باتیں اسی لکھنؤ میں ایسی ہو جاتی ہیں جو اُردو کے بڑھتے ہوئے زور کو خواہ مخواہ روک دینے کا سدِ باب ہوتی ہیں۔ اور اسی لئے آج ہم نہایت نیک نیتی کے ساتھ اپنے لکھنوی بھائیوں کے کچھ کہنے چلے ہیں۔ مثلاً قبلہ سید جالب دہلوی ہی کے اخبار ہمت مورخہ ۲۔ اپریل ۱۹۳۰ء کے صفحہ نمبر ۵ کالم نمبر ۳ پر ایک عنوان ہے "باسی سبھا کا عین الدین میلہ" اس عجیب و غریب قسم کے عنوان کی روداد بھی عجیب و غریب ہونا چاہیئے تھی۔ چنانچہ آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ:-

> "اس تقریب میں سنگا کی تعداد دس ہزار تھی۔ پنچایت کی طرف سے سید عین الدین صاحب مجسٹریٹ کو ایک یادداشت انگریزی اور ہندی زبان میں لکھی ہوئی چوکٹے میں جڑ کر اس لئے پیش کی گئی کہ وہ اسے گورنمنٹ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں" +

اب جمع ہو جائیں ذرا دنیا بھر کے مترجمین اور مفسرین پھر وہ سمجھائیں کہ "انگریزی اور ہندی زبان کی یادداشت"

تو کوئی نئی چیز نہیں۔ مگر ہاں اس "اینگلو ہندی یادداشت" کو سید عین الدین نام بزرگ کو سپرد کرنا حامیان اُردو کے لئے ضرور معمہ ہے اب یا تو یہ ثابت کیا جائے۔ کہ دس ہزار شرکا سے لے کر حضرت سید عین الدین صاحب تک کی مادری زبان ہندی تھی یا پھر حضرت عین الدین صاحب نے انگریزی اور ہندی زبان ہی کو گورنمنٹ کے سمجھنے کے قابل تصور فرمایا اور ایک منٹ بھی اُردو کے حق میں اتنا نہ کہا کہ "اور بھائیو وہ اُردو ہے"

کچھ ضروری نہیں کہ اُردو کے معاملات میں ملا رموزی کی معلومات کو "سید جالبانہ معلومات" کے برابر وسیع سمجھا جائے اور لکھنؤ کے چند پرچے دیکھ کر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ یہاں اُردو کے لئے کچھ نہیں یا بہت کچھ ہو رہا ہے۔ پھر بھی یہ معلوم کر کے بیحد مسرت ہوتی ہے کہ لکھنؤ والوں میں زبان اُردو کے لئے ایک زبردست جذبہ موجود ہے۔ چنانچہ لکھنؤ میں "انجمن اُردو کا دیگر احوال" تو معلوم نہیں البتہ یہاں کی "انجمن معین الادب" کے ارکان اور اس کا وقیع رسالہ "مبصر" اس سلسلہ میں بیحد قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے چنانچہ اخبار "ہمت مورخہ یکم اپریل ۱۹۳۰ء" نے اپنے صفحہ نمبر ۳ پر "باقیِ ذَنْبِ قُتِلَتْ" کو عنوان بنا کر اس انجمن کے مشاعرہ کے صدر حضرت گرامی نواب صاحب بہادر چھتاری کا جو خطبۂ صدارت شائع کیا ہے وہ حقیقت میں اُردو کے دور حاضر اس کے اثرات، ضرورت، اور ہندی سے مقابلے کے نتائج وغیرہ امور پر ایک ہزار لائٹنوں سے زیادہ روشنی ڈالتا ہے۔ اس لئے ہم انجمن معین الادب لکھنؤ کے ارکان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اسکے رسالے "مبصر" کی بیحد عزت کرتے ہیں جو تنقید و تبصرے کی بعض نہایت مفید ضروری اور قیمتی خدمات سے اُردو زبان کو ایک بلند پایہ علمی و ادبی زبان بنانے میں سرگرم ہے اور جہاں تک کہ زبانوں میں لغت، صرف و نحو، بیان و کلام اور عروض کے اصول مسلمہ کو دخل ہے ہم ایسے نقادان لکھنؤ کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ ایسے ہی ارباب کا رہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے زبانیں رطب و یابس سے پاک ہو کر دنیا میں علمی زبانیں کہلاتی ہیں۔

لیکن ہم اخبار حقیقت لکھنؤ مورخہ ۳۔ اپریل ۱۹۳۰ء کے بھرۂ لطافت و ظرافت کے ان فقروں سے کبھی متفق نہیں کہ:۔

"پنجابی لوگوں کی اُردو سے متعلق خدمات کا اعتراف کرنے کے بعد یہ کہنا ضروری ہے کہ پنجابی لوگ کبھی صحیح اردو لکھنے پر مائل نہیں ہوتے مثلاً وہ لفظ "سنجیدہ حالت" کو نازک حالت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ سنسنی خیز ایسا غلط لفظ لکھتے ہیں اور اب قادیان کے ایک بھائی نے "سر درد" کی نئی ترکیب

ایجاد کی ہے"۔

ظاہر ہے کہ "ملا رموزی نہ "پنجابیا" ہے نہ "لکھنوا" مگر اسے اس معاملہ میں دونوں طبقوں سے اختلاف ہے ایک سے اس لئے کہ وہ پنجابی ہو کر بھی اُردو کیلئے جو کچھ کر رہا ہے وہ بہت زیادہ ہے اور اس کی جزئی کمی کو اس طرح پورا کرنے سے خواہ مخواہ صوبجاتی جنگ کا خطرہ ہے اور دوسرے سے اس لئے کہ اُسے پہلے اپنے ہی گھر کی خبر لینا چاہیئے مثلاً لکھنؤ والوں کو پہلے اپنے ہی صوبے والوں کی زبان یا تحریر کی اصلاح پر متوجہ ہونا چاہیئے مثلاً اُردو کے دشمن جان میاں سیماب اکبر آبادی جو ظاہر ہے کہ ایک ایسی مہمل اور غلط تر زبان یا تحریر کو رواج دے رہے ہیں اور اکبر آباد میں ایک ایسا "قصر الادب" تعمیر فرما بیٹھے ہیں جس کے اثرات اگر پھیل گئے تو ایک دن ہمیں آپ کو ان کی اس نئی اُردو کے سمجھنے کے لئے "پانا، جانا" کی کتاب از سر نو پڑھنا پڑے گی۔

پھر آپ پنجابیوں پر کچھ لکھنے سے پہلے ذرا یہی کیجیئے کہ شام کے وقت ایک نازک سی چھڑی ہاتھ میں لے کر لکھنؤ کے بازاروں میں نکل جایا کیجئے اور دکانوں پر اعلان و اطلاع کے جتنے ایسے تختے نظر آئیں جو انگریزی اور ہندی میں لکھے ہوں۔ اُن کی جگہ خالص اُردو عبارت کے تختے لٹکا دیا کیجیئے کہ زبان کی اشاعت کا زبردست ذریعہ کبھی یہ دکانوں کے بورڈ بھی بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ انگریزی زبان کی اشاعت کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں اور ہو سکے تو کبھی کبھی امین آباد پارک میں "اُردو کی میلاد شریف کا جلسہ" بھی منعقد فرما دیا کیجیئے کہ لوگ پڑھ کر اتنا مؤثر نہیں ہوتے جتنا سُن کر ہوتے ہیں۔ اب رہا صحت وعدم صحت یا ٹکسالی اور محاوراتی اُردو کا جوش تو اس کے لئے (اللہ میاں) نے "از غیب سے" نیاز فتحپوری صاحب کو مع رسالہ "نگار" لکھنؤ میں بھیج ہی دیا ہے لڑتے رہیئے اور اُلجھتے رہیئے پھر کون مسخرہ ہے جو آپ کو اُن سے یا ان کو آپ سے بچانے کی کوشش کرے (نیاز صاحب معاف فرمانا)

تخیلات

(از عرشی امرتسری)

درآغوشم بخوابِ ناز، جانانِ من است امشب
بہار صد گلستاں درکنارِ دامن است امشب

مگر آہم بگردوں رفتہ تخم شعلہ می پاشد
کہ کشتِ برق را آتش درونِ خرمن است امشب

دلم از ساقی و مطرب در استغناست پنداری
ترنم ریز و، صہبا بار ابرِ بہمن است امشب

بدل تا صبح نقشِ روئے مہ سیمائے می بندم
شبستانِ ابد تاریک ہجراں روشن است امشب

شراب چہرہ افروزیکہ خوردہ مست می آئی
جمالت نزہت آبادِ بہارِ گلشن است امشب

گہے تنگش بہ برگیرم، گہے جامش بنوشانم
رقیب آسا صراحی در فغان و شیون است امشب

الٰہی نیم شب مہ پیکرے را از بغل رفتن
مرا از اضطراب اخگر تہِ پیراہن است امشب

پس از عمرے میسّر گشت لمحے بے خودی عرشی
خیالے از وجودِ خویش چوں صد دشمن است امشب

شانِ تغزّل

(از حکیم الشعراء طغرائی امرت سری)

حسنِ رخ کز نقاب مے ریزد　　　آبروئے حجاب مے ریزد

کیفیتہائے برشگال مپرس　　　بارہا از سحاب مے ریزد

برقِ طور یکہ سوخت ہوشِ کلیم　　　ہم ترا از نقاب مے ریزد

از دہنہائے تنگ غنچہ لباں　　　گُل بگاہ خطاب مے ریزد

دورِ گردوں بکاسۂ ایام　　　بادۂ انقلاب مے ریزد

شکوۂ جورِ آں بُتِ کم سن　　　از لبِ شیخ و شاب مے ریزد

عرقِ افشاں جبین او نگرید　　　اختر از ماہتاب ریزد

حسنت از سرحدِ کمال گزشت　　　از شبابت شباب مے ریزد

از نظرہائے قہر آگینش　　　شعلہا در عتاب مے ریزد

مقتلِ آرزوست بس کہ دلم　　　از مژہ خونِ ناب ریزد

آں نگوں طالعم کہ طغرائی

ساغرِ من شراب مے ریزد

جہانگیر اور نورجہاں

الہ آباد یونیورسٹی کے نامور پروفیسر مسٹر بینی پرشاد ایم اے نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ جہانگیر" میں نہایت عالمانہ بحث کے بعد ان سب واقعات کو غلط قرار دیا ہے جو نورجہاں کی ابتدائی زندگی اور دوسری شادی کے متعلق عام طور سے مشہور ہیں۔ چونکہ پروفیسر ممدوح کی تحقیق کے نتائج اب تک تاریخ کی عام درسی کتابوں میں درج نہیں ہوتے، اور لوگ ان سے ناواقف ہیں۔ اس لئے ہم دلی شکریہ کے ساتھ ان کی کتاب میں سے اس باب کا آزاد ترجمہ یہاں درج کرتے ہیں جس میں انہوں نے بعض زبان زد خلائق افسانوں کی تکذیب کی ہے۔ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ کبوتروں والی کہانی کا جس کو مولانا آزاد مرحوم نے "قصص ہند" میں مزے لے کر لکھا ہے تاریخ میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔

تاج

زمانہ وسطی کی تاریخ ہند میں صرف نورجہاں ایک ایسی شخصیت ہے جس کے نام کے ساتھ نہایت کثرت سے افسانے اور داستانیں منسوب ہیں۔ عہد جہانگیری کے واقعات میں جتنی توجہ جہانگیر اور نورجہاں کی شادی پر کی گئی ہے اور کسی امر پر نہیں کی گئی۔ پورے پندرہ سال تک یہ نامور خاتون تمام مغلیہ سلطنت میں ایسی نمایاں اور با اقتدار ہستی رہی کہ تاریخ ہند میں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔ غالباً اسی وجہ سے اس کی اوائل زندگی کے متعلق طرح طرح کی عجیب و غریب کہانیاں گھڑ لی گئیں۔ ڈاؤ کی تاریخ ہند اور بعض دوسری انگریزی کتابوں میں عموماً اور ان تاریخوں میں جو آئے دن دیسی زبانوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں خصوصاً نورجہاں کے مندرجہ ذیل سوانح حیات پڑھنے میں آتے ہیں:۔

خواجہ ایاس (غیاث بیگ) مغربی تاتار کا رہنے والا تھا۔ تعلیم یافتہ اور نادار۔ ایک [illegible] اپنی ہی سی نادار خاتون سے محبت ہوگئی اور اس سے شادی کرلی جب تنگ دستی نے بالکل مجبور کردیا۔ تو اس نے "ہندوستان" کا عزم کیا۔ جو اس زمانے میں تمام قلاشوں کا ملجا و ماوا تھا۔ اپنی حاملہ بیوی کو ایک مریل گھوڑے پر سوار کیا اور خود ساتھ ساتھ پیدل چل کھڑا ہوا۔ جو تھوڑی بہت پونجی [illegible] تھی، وہ بھی ختم ہوگئی۔ تو سوائے

خیرات پر گزران کرنے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ میاں بیوی سفر کرتے کرتے بے یار و مددگار ان ویرانوں تک آ پہنچے جو تاتار کو حدود قلمروئے دودمان تیموریہ سے جدا کرتے ہیں ٭

بیوی پر تین روز کا فاقہ گزر چکا تھا کہ یہاں اس کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ کئی گھنٹے اس جنگل بیابان میں اس امید پر گزار دیئے کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا راہگیر ادھر آ نکلے جو دستگیری کرے لیکن یہ امید بر نہ آئی۔ رات سر پر آن پہنچی تھی جنگلی درندوں کا دھڑکا لگا تھا۔ چنانچہ مجبور ہو کر ارادہ کیا کہ یہاں سے چل دیں۔ تقاضائے بشریت اور اقتضائے وقت میں بڑی دیر تک کشمکش ہوتی رہی۔ مامتا کہتی تھی۔ جو کچھ بھی گزرے بچی کو سینے سے جدا نہ کرے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ بچی کو یہیں چھوڑ کر جدھر منہ اٹھے چل دے۔

جب دیکھا کہ بچی کو ساتھ لے جانا کسی طرح ممکن ہی نہیں تو بے بس ماں اسے ایک پیڑ تلے لٹا کر اس کے جسم کو پتوں [illegible] ہوئی رخصت ہو گئی۔ جب بچی آنکھ سے اوجھل ہو گئی تو ممتا نے جوش مارا۔ [illegible] پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور گھوڑے پر سے گر پڑی۔ میری بچی! میری بچی! کے سوا منہ سے کچھ نہ نکلتا تھا۔ باپ کا دل بھی خون ہو رہا تھا۔ الٹے پاؤں واپس پھرا۔ جب بچی کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک کالا سانپ اس ننھی سی جان کے گرد کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ باپ نے شور مچا کر سانپ کو دھتکار دیا۔ اور بچی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اور لا کر بے قرار ماں کی گود میں ڈال دیا۔

قصہ کوتاہ بڑے مصائب جھیلنے کے بعد لاہور پہنچے۔ یہاں حسن اتفاق سے ایک پرانے شناسا سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مرزا غیاث کو شہنشاہ اکبر کے دربار میں پیش کر دیا۔ اکبر نے مرزا غیاث کو ملازم رکھ لیا۔ اور وہ ترقی کرتا کرتا تھوڑے ہی دنوں میں [illegible] لیا۔

بچی کا نام مہر النساء رکھا گیا تھا۔ جب جوان ہوئی۔ تو چندے آفتاب چندے ماہتاب نکلی۔ عرب و عجم کی کوئی عورت بھی حسن میں اس کی برابری نہیں کر سکتی تھی۔ موسیقی۔ رقص۔ شاعری۔ مصوری۔ شگفتہ مزاجی اور حاضر طبعی میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ کوئی آرزو تھی تو یہ کہ کسی طرح شہزادہ سلیم کے دل کو موہ لے۔ چنانچہ ایک جشن کے موقع پر اس نے اپنے ناز و ادا اور شوخ طبعی سے شہزادہ سلیم کو مسحور کر لیا۔ لیکن ابھی بہت دن نہ گزرنے پائے تھے [illegible] شیر افگن ایران کے امرا میں سے تھا [illegible] جب جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ تو اس نے [illegible] پر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے ٭

شیر افگن نے جہانگیر کا کوئی داؤں نہ چلنے دیا۔ ایک مرتبہ اس پر ایک بہت بڑا شیر چھوڑا گیا۔ لیکن نہتّے شیر افگن نے اسے چیر کر رکھ دیا۔ پھر ایک گرانڈیل ہاتھی سے لڑایا گیا۔ اس امید پر کہ ہاتھی اسے کچل ڈالیگا لیکن شیر افگن نے اس کی سونڈ کاٹ کر اسے بے بس کر دیا۔ پھر بردوان میں خفیہ احکام شاہی کے مطابق چالیس آدمی اس پر مامور ہوئے کہ رات کے وقت اس کا کام تمام کر دیں۔ لیکن شیر افگن نے ایک ایک کر کے سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آخر کار حاکم بنگالہ یعنی جہانگیر کے منہ بولے بھائی قطب الدین نے اسے ملاقات کے لئے بلایا۔ اسے ان کی نیت کا علم تھا۔ انھوں نے حملہ کر کے اسے قتل کر ڈالا۔ مرتے مرتے بھی اس نے دو ہی وار میں اس کے کئی ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیا۔

مہر النساء کو جب شاہی سپاہیوں نے گرفتار کیا۔ تو اس نے یہ جھوٹ گھڑا کہ شیر افگن نے اپنا انجام دیکھ کر خود مجھ سے کہہ دیا تھا کہ شہنشاہ کا کہا مان لینا۔ لیکن شہنشاہ کو اپنے رضاعی بھائی کی موت کا اتنا صدمہ ہوا تھا کہ وہ مہر النساء کی صورت تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اسے اپنی راجپوت ماں کی خدمت پر مقرر کر دیا۔ چالاک اور ہوشیار مہر النساء نے جہانگیر پر ڈورے ڈالنے شروع کئے اور آخر چار سال بعد اپنے ارادے میں پورے طور پر کامیاب ہو گئی۔

یہ داستان دلچسپ تو بے شک ہے لیکن تاریخ سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں۔ رنگ آمیزیوں سے پاک اصلی واقعات خواہ اتنے رنگین نہ ہوں لیکن فطرت انسانی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ان میں دل بستگی کا سامان بہت کافی موجود ہے۔

نورجہاں کا دادا خواجہ محمد شریف ایران کے صوبہ خراسان میں تاتاری سلطان تکلو بیگی کا وزیر تھا۔ اپنے آقا کی وفات پر وہ اس کے فرزند اور جانشین قزاق خاں کے دربار میں وزارت کی خدمات سر انجام دیتا رہا۔ قزاق خاں بھی مر گیا۔ تو شاہ طہماسپ نے اسے وزیر یزد کے اعلیٰ عہدہ پر متمکن کر دیا۔ [illegible]ھ میں خواجہ کا انتقال ہو گیا۔ اور آنکھیں بند کرتے ہی اس خاندان پر ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں۔ اس کے بیٹے مرزا غیاث الدین محمد کے لیے جو عام طور سے غیاث بیگ کے نام سے مشہور ہے۔ وطن میں عزت اور آبرو سے گزر کرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کو ہجرت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ اس کے دو بیٹے شریف اور ابوالحسن، ایک بیٹی اور حاملہ بیوی پانچوں ایک قافلے کے ساتھ جس کا سالار ایک شخص ملک مسعود تھا ہندوستان روانہ ہو گئے۔ ایران سے ہندوستان کا راستہ ان دنوں بے حد خطرناک تھا۔ اور قافلے کی معیت تک بھی کسی مسافر کے

جان و مال کی حفاظت کی ضامن نہ ہوسکتی تھی۔ چنانچہ غیاث بیگ آدھا سفر بھی طے نہ کرنے پایا تھا۔ کہ جو اثاثہ ساتھ لے کر چلا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ لٹ گیا۔ اور تمام مویشیوں میں سے دو خچروں کے سوا اور کچھ باقی نہ بچا۔

قندھار میں اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوگئی۔ افلاس کے ہاتھوں اتنا پریشان تھا کہ زچہ اور بچے کی نگہداشت گراں گزرنے لگی۔ پریشانی کے عالم میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ رحم دل ملک مسعود کو اس کی زدہ حالت دیکھ کر ترس آگیا۔ اور اس نے بڑی فراخ دلی سے اس کی امداد کی۔ اور میل ملاقات پیدا ہو گئی۔ جب ملک مسعود نے تاڑ لیا۔ کہ شمشیر زنگ آلود مگر جوہردار ہے۔ تو تعلقات بڑھتے بڑھتے دوستی کے مرتبے تک جا پہنچے۔ ہندوستان پہنچ کر ملک مسعود نے اپنے دوست کو فتح پور سیکری میں شہنشاہ اکبر کے دربار میں پیش کردیا۔ شہنشاہ نے اسے ملازم رکھ لیا۔

مرزا غیاث کے ہاں ایسی نیک اختر بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ کہ پیدائش کے ساتھ ہی باپ کے بھی دن پھر گئے۔ مرزا غیاث ذی علم اور تربیت یافتہ شخص تھا۔ خطوط نویسی میں اُسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ باتیں کرتا۔ تو گویا منہ سے پھول جھڑتے تھے طبیعت پر ایسا قابو حاصل تھا کہ باید و شاید۔ "زنجیر کوڑے اور دشنام سے اُس کا گھر نا آشنا تھا۔" بہ نفس اس میں ضرور تھا۔ کہ حریص تھا۔ لیکن پھر بھی طبیعت کا نرم اور دل کا سخی تھا۔ کام۔ انتظام اور سلیقے کا تو اسے جنون تھا۔ زندگی بھر فرائض ملازمت بڑی محنت اور جانفشانی سے انجام دیتا رہا۔ چنانچہ مرتبے اور اقتدار میں بھی ترقی کرتا چلا گیا۔ ۱۵۹۵ء میں اسے سہ صد کا منصب حاصل تھا۔ اور دیوان قابل کے اہم عہدے پر سرفراز تھا۔

قندھار میں اس کے ہاں جو بچی پیدا ہوئی تھی۔ اس کا نام مہرالنساء رکھا گیا تھا۔ یہ بچی اس اثنا میں جوان ہوچکی تھی حسین بھی تھی۔ اور ذہین بھی سترہ سال کی عمر کو پہنچی۔ تو اس کی شادی ایران کے ایک قسمت آزما نوجوان علی قلی استجلو سے کردی گئی۔

علی قلی خان ایران کے شاہ اسمٰعیل ثانی کے ہاں ۱۵۷۶ء۔ ۱۵۷۸ء میں سفرچی تھا۔ ٹھیک طور پر معلوم نہیں۔ کہ شاہ اسمٰعیل اپنی موت مرا تھا۔ یا مار ڈالا گیا تھا۔ بہرحال آقا کے مرنے کے بعد علی قلی خان کو ہجرت کرنے ہی بنی۔ مدتوں بیابانوں کی خاک چھانتا پھرا۔ اور زمانے کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھا۔ ہوتے ہوتے قندھار کے راستے ملتان آن پہنچا۔ یہاں ان دنوں عبدالرحیم خان خاناں بہت فوج لے کر ٹھٹھ

کو فتح کرنے جا رہا تھا۔ علی قلی خان اس کے ہاں ملازم ہوگیا۔ لڑائی میں اپنی شجاعت، دلاوری۔ اور
اولوالعزمانہ جوانمردی کے باعث اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ اور افسرِ اعلیٰ کے دل میں گھر کر لیا۔ کمانڈر
نے جو خطوط شہنشاہ کو بھیجے۔ ان میں علی قلی کا تذکرہ کیا۔ اور اسے منصب دار بنوا دیا۔ لڑائی ختم ہوگئی
تو خان خاناں علی قلی خان کو اپنے ساتھ لاہور لے آیا۔ جو اس وقت شاہی دار الخلافہ تھا۔ اور ۱۵۹۴ء میں
یہاں کے نامی امراء میں اس کا تعارف کرایا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد غیاث بیگ کی بیٹی سے اس کا نکاح
ہوگیا۔ ۱۵۹۹ء میں اکبر نے سلیم کو میواڑ پر فوج کشی کرنے کو بھیجا۔ تو علی قلی خاں کو افسروں کے دستے
میں شامل کر کے اس کے ساتھ روانہ کیا۔ کہتے علی قلی خان نے ایک موقع پر ایک شیر کا کام تمام کرنے میں
اپنی بے نظیر ہمت اور مردانگی کے جوہر دکھائے۔ سلیم نے اس کی یہ شجاعت دیکھی۔ تو اُسے شیر افگن کا
خطاب دیا۔ بعد میں جب سلیم نے اکبر سے بغاوت کی تو شیر افگن کچھ عرصے تک سلیم کا طرف دار رہا۔ مگر بعد
میں اسے چھوڑ کر اکبر کے ساتھ جا ملا۔ جب سلیم جہانگیر بن کر تخت پر بیٹھا۔ تو اُس نے عالی ظرفی سے کام لیکر
شیر افگن کی گزشتہ بے وفائی کو معاف کر دیا۔ اور اسے بنگالہ میں بردوان کے مقام پر عہدہ اور جاگیر بخشی۔

ان دنوں بنگالہ میں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اور یہ صوبہ تمام باغی اور
شورش پسند پٹھانوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ شیر افگن پر بھی بڑا شبہ تھا۔ کہ وہ بادشاہ کے خلاف اندر ہی اندر
سازشیں کر رہا ہے۔ مان سنگھ کے بعد ۱۶۰۶ء میں قطب الدین بنگالہ کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ تو اسے ہدایت
کی گئی۔ کہ شیر افگن کو لاہور بھیج دے۔ اور اگر شیر افگن کچھ پس و پیش کرے۔ تو جو سزا مناسب معلوم ہو
دی جاوے۔

مارچ ۱۶۰۷ء میں قطب الدین خود بردوان پور گیا۔ شیر افگن کو ملاقات کے لئے اپنے خیمہ میں مدعو
کیا۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ اپنے ٹھکانے پر بلا کر اُسے آسانی سے گرفتار کرے۔

۳۰ مارچ کے روز شیر افگن اپنے دو خدمتگاروں کو ساتھ لے کر صوبہ دار سے ملنے کو چلا۔ خیمہ میں
داخل ہوا ہی تھا۔ کہ شاہی فوج کے سپاہیوں کو حکم دیا۔ کہ اسے گھیر لیں۔ قطب الدین کی عیاری کو دیکھ کر
شیر افگن کا لہو کھول اُٹھا۔ جو کچھ ہونے والا تھا۔ سب تاڑ گیا۔ غیظ و غضب کے عالم میں قطب الدین
سے کہا۔ کہ یہ کیا حرکت ہے؟ قطب الدین بات سمجھانے کو آگے بڑھا۔ شیر افگن غصے کے مارے دیوانہ
تو ہو ہی رہا تھا۔ تلوار نکال کر صوبہ دار کے پیٹ میں بھونک دی۔ اس کی انتڑیاں باہر نکل پڑیں۔ صوبہ دار

بھی بڑا حوصلہ والا مرد تھا۔ اُس نے اپنی انتڑیوں کو تو ہاتھوں سے سنبھالا اور شیر افگن کے قتل کا حکم دیا۔ پر اس کے حکم دینے سے پہلے ایک کشمیری درباری امبا خاں شیر افگن کے سر پر وار کر چکا تھا۔ اس کے جواب میں شیر افگن نے بھی اس پر ایک ایسا وار کیا کہ امبا خاں وہیں کا وہیں ٹھنڈا ہو گیا اب اکیلے شیر افگن پر ہر طرف سے وار ہونے لگے۔ اور ذرا سی دیر میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے گئے لیکن وہ اپنا انتقام لے چکا تھا۔ امبا خاں تو وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ قطب الدین چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ختم ہو گیا۔

قطب الدین کی موت کی خبر سن کر جہانگیر کو بے حد صدمہ ہوا۔ جس شخص کو وہ فرزندِ دلبند۔ برادر عزیز اور یارِ غار کہتا تھا۔ وہ یوں بُری طرح مارا جائے۔ تو کون سے لفظ ایسے ہیں۔ جو غم و الم کا اظہار کر سکیں۔ وہ اس حرکت کے لئے شیر افگن کے نام پر لعنت بھیجتا رہا۔

شیر افگن کی بیوہ اور اس کی بیٹی لاڈلی بیگم پایۂ تخت کو روانہ کر دی گئی۔ جہاں اس کا باپ اعتماد الملک اعلیٰ عہدے پر سرفراز تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مہر النسار سلطانہ سلیمہ بیگم کی خاص کنیز مقرر ہو گئی ۱۶۱۱ء کے موسم بہار میں مینا بازار لگا۔ تو اس میں اتفاق سے جہانگیر کی نظر مہر النسار پر جا پڑی۔ اور اس پر فریفتہ ہو گیا۔ مئی کے اخیر میں ان کی شادی ہو گئی۔

اس مشہور اور اہم شادی کی کل داستان یہ ہے۔ جو اوپر بیان کر دی گئی۔ عام طور سے جو یہ واقعات مشہور ہیں۔ کہ جہانگیر اکبر کی زندگی ہی میں مہر النسار کو چاہنے لگا تھا۔ پر اکبر نے اس تعلق کو منظور نہ کیا۔ اور مرزا غیاث کو مجبور کر دیا۔ کہ مہر النسار کا نکاح شیر افگن سے کر دے۔ اور یہ کہ مایوس شہزادے نے صاحب اختیار بنتے ہی نہایت کمینہ طور پر اپنے کامیاب رقیب کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش شروع کر دی نیز یہ کہ خود دار مہر النسار اپنے شوہر کے قاتل کا پیام چار سال تک نہایت نفرت سے رد کرنے کے بعد کہیں شادی پر رضامند ہو سکی۔ ان واقعات کے متعلق اس زمانے کی تاریخ میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔

کہا جا سکتا ہے۔ کہ جہانگیر اگر مجرم تھا۔ تو اپنے اس قسم کے کسی شرمناک جرم کا اعتراف کیوں کرنے لگا تھا + یہ بے شک صحیح لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اگر شیر افگن کے قتل میں اس کا ہاتھ ہوتا۔ تو اس جرم کے بعد اسے ہرگز حوصلہ نہ پڑتا۔ کہ اس واقعہ کی طرف کسی قسم کا اشارہ تک کرے۔ پر برخلاف اس کے اس کی قلم سے کئی ایسے فقرے نکلے ہیں۔ جن کو بیباک جا کر کے پڑھنے سے شیر افگن کی

زندگی اور موت کی داستان مرتب ہوتی ہے۔

معتمد خاں نے جہانگیر کے عہد حکومت کی تاریخ شاہ جہان کے عہد میں ختم کی تھی۔ کامگار حسینی نے بھی شاہ جہان کے زمانہ میں اپنی تصنیف مرتب کی تھی۔ چونکہ نورجہاں اور شاہجہان کے تعلقات مخاصمانہ تھے۔ اور شاہ جہان ان دونوں مؤرخوں کا مربی تھا۔ اس لئے یہ دونوں مؤرخ بھی نورجہان کے مخالفوں میں شمار ہوتے ہیں۔ پر ان دونوں نے ایسے واقعات کی طرف اشارۃً تک نہیں کیا۔ جن کی بنا پر نورجہان کی زندگی بہت بُرے رنگ میں پیش کی جاسکتی تھی۔ عبدالحمید لاہوری اور شاہجہان کے عہد کے دوسرے مؤرخوں نے نورجہاں کے متعلق اپنی تاریخ کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان سے بھی کسی نے اس امر کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ کہ اس نے اپنے پہلے شوہر کے قاتل سے شادی کی تھی۔

کہا جاسکتا ہے کہ درباری مؤرخ اس قسم کے کسی واقعہ کی طرف بھلا کیونکر اشارہ کرسکتے تھے جس سے خاندان بھر کی آبرو پر حرف آنے کا احتمال تھا۔ لیکن دوسرے ممالک کے جو سیاح اس زمانے میں ہندوستان آئے۔ انہیں تو اس قسم کی مروتوں سے کچھ سروکار نہ تھا۔ مروت کا کیا ذکر۔ انہیں تو مغلوں کے متعلق طرح طرح کی شرمناک افواہیں سُننے اور لکھنے میں خاص لُطف آتا تھا۔ جہاں کوئی اُڑتی اُڑاتی ایسی خبر سُنی۔ جس سے کسی بڑی شخصیت کی اخلاقی حالت کے متعلق بُری رائے قائم کی جاسکے۔ فوراً اس پر ایمان لے آئے۔ اور اُسے صحیح مان کر لکھ دیا۔

جہانگیر کے زمانہ شہزادگی کے متعلق اُنہوں نے بڑی شرمناک افواہوں کو تسلیم کر لینے میں تامل نہ کیا۔ یہاں تک لکھ گئے۔ کہ جہانگیر کو اپنی سوتیلی ماں سے محبت تھی۔ نورجہاں کے متعلق یہ لکھ مارا کہ اسے اپنے سوتیلے بیٹے شاہجہان سے اُلفت تھی لیکن ان مہربانوں میں سے بھی کسی کو یہ گمان کرنے کا موقع نہ ملا۔ کہ جہانگیر نے اپنی لڑکپن کی اُلفت کی خاطر شیر افگن کا کام تمام کر ڈالا۔ پھر یہ نہیں۔ کہ ان لوگوں نے نورجہان کا تذکرہ ہی نہ کیا ہو۔ اس کی ابتدائی زندگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے شوہر کی خوفناک موت کا حال بھی لکھا ہے۔ نورجہاں اور جہانگیر کی شادی کا واقعہ بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ نورجہاں کا جہانگیر پر بہت اثر تھا۔ لیکن جہانگیر کے لڑکپن کی الفت کا تذکرہ یہ لوگ کنایتہً بھی نہیں کرتے۔ اور نہ اس طرف کوئی اشارہ کرتے ہیں۔ کہ پہلے شوہر کی موت میں کسی طرح دوسرے شوہر کا ہاتھ تھا۔ ان میں سے ہاکنز ترکی زبان سے واقف تھا۔ چنانچہ یہاں کے حالات تفصیل سے معلوم کرنے میں اُسے بڑی سہولت حاصل تھی۔ یہ شخص مغلیہ دربار میں پہنچا۔

بھی اسی زمانے میں۔ کہ شیر افگن کی موت کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا منصبداروں کی صف میں جگہ پائی۔ بہت سے لوگوں سے تعلقات پیدا کر لئے۔ اور جہانگیر و نور جہاں کی شادی ہو چکنے کے بعد یہاں سے رخصت ہوا۔ سر طامس رو اور ایڈورڈ ٹیری برسوں مغل دربار میں رہے۔ اور اس زمانے نور جہان کا طوطی بول رہا تھا۔ اور ہر زبان پر اسی کا نام تھا۔ ولیم فنچ کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی قوت مشاہدہ بڑی باریک بین تھی۔ یہ شخص بھی تقریباً اسی زمانہ میں ہندوستان وارد ہوا۔ پیٹر ڈیلا ویلے اگرچہ ہند کے مغربی ساحل پر سفر کر رہا تھا۔ لیکن جہانگیر کے عہد کے کئی اندرونی واقعات اسے معلوم ہو گئے تھے۔

اگر جہانگیر کے ایما پر شیر افگن کا قتل ہوا ہوتا۔ تو ایسی حالت میں بھلا کیونکہ مانا جا سکتا ہے۔ کہ ان سب سیاحوں میں سے کسی کو بھی اس جرم کا پتہ نہ لگنے پاتا۔ ایسی خبریں تو آگ کی طرح ہر طرف پھیل جایا کرتی ہیں۔ کہیں ممکن ہے کہ اس قسم کا شرمناک واقعہ ظہور میں آئے جس سے ایک شہنشاہ اور اس کی ملکہ کسی سنگدلانہ قتل کے شریک قرار دئے جاسکیں۔ اور یہ بات گھر گھر مشہور نہ ہو جائے۔ اور ایسے لوگوں کے کان تک پہنچنے سے رہ جائے جنہیں تلاش ہی اس قسم کے واقعات کی رہتی ہے۔

اگرچہ یہ لوگ زیادہ تر اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے لیکن انھوں نے اپنے سفرناموں میں کئی موقعوں پر دوسری باتوں اور دلچسپ اور اہم سیاسی واقعات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ خسرو کی موت کے متعلق قرائن سے داستان بنا کر لکھ دی ہے۔ شاہجہان کی بغاوت کا تذکرہ کیا ہے۔ مہابت خاں کی فوج کشی کا بیان لکھا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کی تحریر میں یہ بات نظر نہیں آتی کہ شیر افگن کی بیوی حاصل کرنے کو جہانگیر نے اُسے مروا ڈالا۔

سر طامس ہربرٹ جس وقت ہندوستان آیا۔ جہانگیر کا عہد حکومت ختم ہونے کو تھا۔ پیٹر منڈی اس سے چند سال بعد آیا۔ دونوں نے جہانگیر اور نور جہاں کے متعلق بہت سے واقعات لکھے لیکن ان کی شادی کے متعلق کسی شرمناک واقع کا ایک لفظ ان کے قلم سے نہیں نکلا۔ برنیر صرف ایک پشت گزرنے کے بعد ہندوستان آیا تھا۔ اور اس نے دربار کے کئی امرا سے تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ اس شخص نے شاہجہاں۔ جہاں آرا اور روشن آرا کے متعلق ایسی ایسی فحش افواہوں کو سچ مان لیا ہے جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اُس نے جہانگیر اور نور جہاں کا ذکر بھی کیا ہے۔ نور جہاں کے اثر و اقتدار کا حال بھی لکھا ہے۔ لیکن شیر افگن کے واقعہ کے متعلق اس شخص نے بھی کچھ نہیں لکھا۔ غرض اپنا یا بیگانہ ایک بھی ایسا ہمعصر نہیں جس نے شیر افگن کے قتل کا الزام جہانگیر پر لگایا ہو۔

یوں تو شہادت کی عدم موجودگی ہی قطعی رائے قائم کر لینے کے لئے بہت کافی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ جہانگیر اور نور جہان کے تعلق کی جو داستان عام طور سے بیان کی جاتی ہے خود اسی میں کئی ایسے واقعات و امکانات نظر آتے ہیں۔ جو اپنی تردید آپ کرتے ہیں۔

اول تو یہی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آخر وجہ کیا تھی جو اکبر نے مہرالنساء اور سلیم کی شادی روک دی۔ مہرالنساء ایران کے ایک عالی نسب خاندان سے تھی۔ اس کا باپ دربار میں بلند مرتبہ پر سرفراز تھا۔ ادھر مغلوں کا یہ حال تھا کہ نسبتاً کمتر درجہ کے لوگوں سے رشتے کرنے میں بھی مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔ پھر ایک عالی خاندان لڑکی سے رشتہ ہونے میں آخر کس بنا پر اعتراض کیا جا سکتا تھا؟

دوسرے اگر اکبر نے واقعی اپنے بیٹے کو مایوس اور برافروختہ کر دیا تھا۔ اور غیاث بیگ کو مجبور کیا تھا۔ کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی شیر افگن سے کر دے تو اس کا کیا جواب کہ ۱۵۹۹ء میں شیر افگن کو سلیم ہی کے ماتحت بطور ایک ذمہ دار افسر کے میواڑ بھیجا گیا؟ کیا اکبر ایسی غلطی کر سکتا تھا۔ کہ دو رقیبوں کو فوج میں یکجا کر دے؟

پھر یہ کہ سلیم نے اپنی چہیتی مہرالنساء کے شوہر کو اعزاز و اکرام کیوں بخشا؟ تخت نشین ہونے کے بعد اُسے کیا پڑی تھی۔ کہ وہ اپنے رقیب کی یہ خطا نظر انداز کر دیتا۔ کہ اسی نے بغاوت میں مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ اور اس کو مرتبہ اور جاگیر بخشا؟ اگر جہانگیر واقعی مہرالنساء کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تو ہرگز ایسے بے ڈھنگے اور خلاف مصلحت طریقے عمل میں نہ لاتا۔ جو عام طور پر اس سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ نور جہاں کی سیرت کے متعلق ہمیں جو معلومات حاصل ہیں۔ اُن سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر اسے علم ہوتا۔ کہ جہانگیر کے ہاتھ اُس کے شوہر کے خون سے رنگین ہیں۔ تو وہ ہرگز اس سے شادی کرنا یا اس کی ماں کی کنیز بننا گوارا نہ کرتی۔ سب مانتے ہیں کہ شادی کے بعد نور جہان نے جہانگیر کی محبت کا جواب انتہائی محبت سے دیا۔ نور جہاں جیسی خود دار عورت سے یہ توقع ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کہ وہ اپنے شوہر کے قاتل سے ایسی وفا اور محبت سے پیش آ سکتی۔

کئی مورخوں نے بغیر کسی دلیل یا وجہ کے خواہ مخواہ ہی یہ سمجھ لیا ہے کہ قطب الدین محض اس غرض سے بنگالہ بھیجا گیا تھا۔ کہ کسی طرح مہرالنساء کو اپنے آقا کے لئے حاصل کرلائے۔ ایک بھی تو ایسا واقعہ نہیں جس کی بنا پر یہ رائے قائم کی جا سکے۔ بات اصل یہ تھی۔ کہ جہانگیر اور مان سنگھ صوبہ دار بنگالہ کے تعلقات عرصے سے بالکل منقطع ہو چکے تھے۔ اکبر کی وفات کے بعد بظاہر دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔ لیکن دلوں میں میل باقی تھا۔ جاننے والے جانتے تھے۔ کہ کوئی وقت جاتا ہے۔ کہ جہانگیر اپنے ہمراز عزیز کوکا کی مانند مان سنگھ کی قوت بھی سلب کرے گا۔ لیکن اسی

میں جہانگیر کے بیٹے خسرو نے بغاوت کردی - اور جہانگیر کو اس طرف توجہ مبذول کرنی پڑ گئی - بس اس بغاوت کے فرو ہونے کی دیر تھی - جہانگیر نے فراغت پاتے ہی مان سنگھ کو بنگالہ کی صوبہ داری سے الگ کر دیا - ظاہر تھا - کہ مان سنگھ کے بعد شہنشاہ کا کوئی خاص معتمد ہی اس عہدہ پر فائز کیا جاسکتا تھا - آخر یہ عزت قطب الدین کو نصیب ہوئی +

شیر افگن پر بغاوت اور سازش کا جو شبہ کیا گیا - ممکن ہے - وہ اصل میں غلط ہو - لیکن بہرحال شبہ ایسے حالات میں پیدا ہوا - کہ انوکھی بات قرار نہیں دیا جاسکتا - بنگالہ اس زمانے میں سازشوں بغاوتوں اور فریب کاریوں کا مرکز بنا ہوا تھا - اس واقعہ سے کچھ عرصہ پہلے وہاں عثمان ایک زبردست بغاوت کر چکا تھا اور جلد ہی ایک اس سے بھی زبردست بغاوت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا - وہاں کی فضا ایسی خطرناک بن چکی تھی - کہ ہر لمحے یہ اندیشہ تھا - طوفان اب آیا - کہ اب آیا - ایسے موقعہ پر بیحد حزم و احتیاط سے کام لینے کی ضرورت تھی - چنانچہ اس میں تعجب کیا - کہ ایک قسمت آزما ایرانی پر جو اس سے پہلے ایک مرتبہ سلیم سے بیوفائی کر چکا تھا - دغا کا شبہ ہو گیا - اور اسے بدامنی کے مرکز سے ہٹا لینے کی تجویز بنائی گئی - اب قطب الدین کی مصلحت نااندیشی تھی کہ اس سلسلے میں ایسا قابل افسوس واقعہ پیش آگیا - جس کے باعث کئی جانیں ہلاک ہوگئیں - اس نے بغیر کسی سوال یا جواب یا تنبیہ کے شیر افگن کو حراست میں کر لینا چاہا - ایسے سلوک پر لازمی تھا کہ شیر افگن بھڑک اُٹھتا - ظاہر ہے کہ شیر افگن کی موت کے بعد نور جہاں دارالخلافہ ہی کو جا سکتی تھی - جہاں باپ اور اس کے بھائی بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے، اگر اتنا تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے - کہ وہاں سلیم کی ماں کی کنیزوں میں شامل ہوگئی - مینا بازار میں جہانگیر کی نظر اُس پر پڑ گئی - اور دونوں کی شادی ہوگئی +

اِن واقعات کے متعلق تقریباً دو پشتیں گذر جانے کے بعد طرح طرح کی داستانیں بنائی جانے لگیں - جہانگیر پر ایک مرتبہ یہ الزام لگنے کی دیر تھی - کہ وہ شیر افگن کی بیوی حاصل کرنا چاہتا تھا - کہ فوراً یہ واقعہ بھی گھڑ لیا گیا - کہ وہ باپ کی زندگی ہی میں اس کو چاہنے لگا تھا +

محمد صادق تبریزی کے بعد خافی خان نے خیال آرائیاں شروع کر دیں اور ان کے بعد سجان رائے اور دوسرے مصنفین نے رنگ آمیزیاں کیں - اور داستانیں بن گئیں - کہ شہزادہ سلیم اور مہرالنسا بچپن میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے شہزادہ کو اس سے محبت ہوگئی - اکبر کو حال معلوم ہوا تو اس نے غیظ و غضب کے عالم میں یہ رشتہ منظور کرنے سے انکار کر دیا - پھر جہانگیر نے قطب الدین سے کہا کہ کسی طرح مہرالنساء مجھے حاصل کر دو - شیر افگن کو ان ریشہ دوانیوں کی خبر

ہوگئی۔ اور وہ استعفیٰ دے کر اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ جس روز قطب الدین اور شیر افگن کی خوفناک ملاقات ہوئی۔ اسی روز شیر افگن کی ماں نے اس سے کہا کہ اس سے پہلے کہ میں تیرے لئے آنسو بہاؤں۔ تو اپنے دشمن کی ماں کے آنسو نکلوائیو۔ شیر افگن حملہ آوروں کے نرغے میں سے ایک مرتی جان لے کر گرتا پڑتا بیوی کا کام تمام کرنے کو گھر پہنچا دروازے پر تھا کہ ساس نے اس سے کہا۔ تیری بیوی نے خودکشی کر لی ہے۔ اور تو گھر سے باہر ہی رہ کر اپنی مرہم پٹی کی فکر کر۔ اور یہ سنتے ہی وہ بڑے اطمینان سے جان بحق ہوگیا*

یہ داستانیں بنتے ہی دُور و نزدیک پھیل گئیں۔ سترھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں اس داستان کا سراغ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد ہر نشست میں اس داستان کو ہر جگہ دھرایا گیا ہے۔ فارسی مؤرخ اسے اِدھر اُدھر کی تفصیل دے کر بیان کرتے ہیں۔ راجپوت شاعر اس کی صداقت پر قسم کھاتے ہیں۔ اطالوی سیاح منوچی اس صدی کے آخر میں اس داستان کو مزید رنگ آمیزی سے بیان کرتا ہے*

اٹھارھویں صدی میں اس داستان میں طرح طرح کی اتنی ترمیمیں ہوگئیں۔ کہ یہ کچھ کی کچھ بن گئی۔ اور اچھی خاصی ٹانگوں کی سی کہانی معلوم ہونے لگی۔ انیسویں صدی میں الفنسٹن نے خافی خان کے بیان کو لے کر تاریخ ہند کی درسی کتابوں میں شامل کر دیا۔ اور یہ ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر پہنچ گئی*

مستند ہمعصر مورخین کی تاریخی کتابوں کو غور سے پڑھنے اور تسلیم شدہ واقعات پر غور کرنے سے اس تمام داستان کی عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔ اور نورجہاں اور جہانگیر کی شخصیتوں کے متعلق زیادہ صحیح اندازہ ہوتا اور ان کی سیرت محبوب تر نظر آنے لگتی ہے*

تمت بالخیر

پہلوی

(از جناب دین محمد صاحب بی۔ اے)

پہلوی زبان عہدِ ساسانی میں مذہبی، ملکی اور علمی زبان تھی

(۱) عہدِ اشکانی کے آخری ایام اور عہدِ ساسانی میں (سنہ ۲۲۶ء سے سنہ ۶۲۵ء) پہلوی ایران کی مذہبی ملکی اور علمی زبان تھی۔ اسوا اوستا کے قدیم پارسی مذہبی اور علمی سرمایہ تمام اسی زبان میں پایا جاتا ہے۔ اس زبان کو اصل قدیم فارسی تسلیم کی گئی ہے۔ چنانچہ پہلوی فارسی کی اصل مانی گئی ہے۔ اس کو فارسی متوسط بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کا دورِ حیات قدیم فارسی اور ایران کی موجودہ زبان یعنی فارسی کے درمیانی زمانہ میں ہوا ہے گو یہ زبان اسلامی حکومت کے قیام کے بعد صدیوں تک پارسیوں میں مروج رہی اور بعض اہم پہلوی تصانیف اسلامی زمانہ کی ہیں لیکن عہدِ ساسانی کے خاتمہ پر پہلوی ایک ملکی زبان کی حیثیت کھو چکی تھی۔

پہلوی میں تصانیف کی قلت۔

(۲) باوجود پہلوی کے طولِ حیات کے اس زبان میں تصانیف بہت کم ملتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یزدگرد کے زمانہ سے کراب تک تیرہ سو سال کے عرصہ میں ایرانی علمی تصانیف کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے لیکن اس زمانہ میں تعلیم و تعلم یا تصنیف و تالیف کا موجودہ یا اسلامی زمانہ سے مقابلہ کرنا غلطی کا موجب ہوگا۔ ہندوں کی طرح پارسی بھی چار طبقوں میں تقسیم تھے۔ علماء، سپاہی، کسان اور دستکار جن کے فرائض اور حقوق جداگانہ اور مقرر تھے تعلیم نہایت کم تھی اور صرف ان افراد کی اولاد کو درس گاہوں میں لیا جاتا تھا جن سے بعد میں مذہبی جنگی یا ملکی خدمت لینا مقصود تھا۔ کتب عبادت گاہ کا ایک حصہ اور معلم مذہبی جماعت کا رکن ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں لکھنا پڑھنا عام نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عام ہونا ایران کے نظامِ معاشرت کے منافی تھا یہی وجہ تھی کہ تعلیم یافتہ جماعت نہایت محدود تھی اور کتابیں نہایت کم۔

پہلوی کے نقائص

(۳) ان تمام باتوں کے علاوہ پہلوی کے اندر بحیثیت زبان اس قسم کے اسباب موجود ہیں جو علمی ترقی میں مانع ہیں۔ رسم الخط پیچیدہ اور مشکل ہے اور جب تک زبان پر کافی دسترس نہ ہو اس میں پڑھنا اور لکھنا

اس مضمون کے متعلق ضروری نوٹ شذرات میں ملاحظہ فرمائیے

آسان نہیں - ایسی زبان مقبولِ عام نہیں ہوسکتی نہ علوم وفنوں ترقی کرسکتے ہیں اور نہ ہی کتابیں بکثرت ہوسکتی ہیں
خود پارسیوں نے پہلوی کے ... کیا اغتنا کیا اس کی داستان یہ ہے کہ اگرچہ جاں نثارانِ دین کی مٹھی بھر جماعت
نے دین کی حفاظت میں وطنِ عزیز سے مفارقت کرلی تھی مگر چند صدیاں نہ گذرنے پائی تھیں کہ خود ملک اور
مذہب کی زبان کو بالکل بھول گئے - ملک کے ساتھ زبان اور زبان کے ساتھ رسم الخط کو بھی ترک کردیا - اب
ہندوستانی پارسی دینی کتابوں میں بھی پہلوی زبان گجراتی حروف میں لکھتے ہیں +

مذہب اور رسم الخط

(۴) اس موقعہ پر پارسیوں کے رسم الخط کو ترک کردینے کا ذکر ہم نے ایک خاص مقصد سے کیا ہے
کیونکہ مشرق میں بمقابلہ زبان کے رسم الخط کے ساتھ مذہب کا تعلق زیادہ مانا گیا ہے + بدھ مذہب کے ساتھ
ہندوستان میں پالی زبان اور پالی رسم الخط کا دور دورہ ہوا - لیکن جب بدھ مذہب ہندوستان سے نکال دیا
گیا تو ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت مردہ ہوچکی تھی مگر ناگری حروف ملک میں رائج ہوگئے + آج بھی اس ملک
کی دو بڑی جماعتوں میں اپنے اپنے رسم الخط کی ترویج بنارِ فساد ہے +

جب شام میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور وہاں کی زبان عربی قرار پائی تو شامی عیسائی ایک عرصہ تک
عربی زبان سریانی حروف میں لکھتے رہے اور اس میں بہت سی کتابیں شائع کیں + اس کتابت کو کرشونی کہتے
ہیں - بلادِ اسلامیہ کے ارمنی اور یونانی عیسائی اخبار اور کتابیں ترکی زبان میں شائع کرتے ہیں لیکن رسم الخط
اپنا اپنا ہوتا ہے - ہسپانیہ کے عرب جو عربی بولنا بھول گئے تھے ہسپانوی زبان میں کتابیں عربی حروف
میں لکھتے تھے - یہودی جس ملک میں رہتے ہیں وہاں کی زبان اختیار کرلیتے ہیں لیکن رسم الخط عبرانی برتتے
ہیں - چنانچہ عربی، جرمنی، فرانسیسی، ہسپانوی، وغیرہ وغیرہ عبرانی حروف میں لکھتے ہیں اور کتابیں اور اخبار
انہی حروف میں شائع کرتے ہیں + مصر اور شام کے یہودی قدیم الایام سے عربی کو عبرانی حروف میں لکھتے آئے
ہیں - ایران کے یہودیوں کے پاس معتدبہ علمی سرمایہ ہے جس کے الفاظ فارسی اور حروف عبرانی ہیں -

دینی کتابوں میں پارسیوں کا پہلوی کی بجائے گجراتی حروف اختیار کرنا ایک نرالی مثال ہے - مانا کہ پہلوی
کتابت مشکل ہے اور عربی حروف کا استعمال پسند نہیں مگر اوستا رسم الخط جو نہ صرف دیکھنے میں خوشنما بلکہ
ہر طرح موزوں ہے یہ خدمت بوجہ احسن ادا کرسکتا تھا - موجودہ زمانہ میں اس کی نظیر صرف ترکوں کی اس جماعت
میں ملتی ہے جو آج برسرِ حکومت ہے اور جو اپنے اور اپنے اسلاف کے دینیات کی ایک ایسی دیوار منہدم کرنا

چاہتے ہیں کہ نام نیک رفتگاں ضائع ہو جائے۔ یہ جماعت یورپ کی کورانہ تقلید میں غربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط رائج کر رہی ہے۔

پہلوی کی وجہ تسمیہ

(۵) اس زبان کا نام پہلوی کیوں ہے؟ اس کے کئی وجوہ بیان کئے جاتے ہیں۔

(۱) پہلو پسر سام بن نوح اور پارس کے باپ کا نام ہے۔ پارس کی طرف فارسی زبان منسوب کی جاتی ہے۔ اور پہلو کی طرف پہلوی۔

(۲) پہلوی کلمہ پہلو سے مشتق ہے جو رے سپاہاں، ہمدان، ہماوند اور اس کے مضافات کا نام ہے اس علاقہ کو پہلہ بھی کہتے ہیں۔

(۳) پہلو کے معنی شہر کے ہیں اس لحاظ سے پہلوی سے مراد شہری زبان ہوئی۔ ذیل کے شعروں میں یہ لفظ انہیں معنوں میں آیا ہے:-

ز پہلو برون رفت کاؤس شاہ	بہ ہر سو ہمے گشت گرد سپاہ	(فردوسی)
یکے لشکر آمد ز پہلو بدشت	کہ از گرد ایشاں ہوا تیرہ گشت	(فردوسی)
ہمے بود با یک زباں شہریار	ز پہلو برون شد ز بہر شکار	(فردوسی)

(۴) لفظ پہلوی بزرگ، قوی، خوب، پسندیدہ، توانا، دلاور، دلیری اور بہادری کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے ان شعروں میں

چو بشنید بابک فرو ریخت آب	ازاں چشم روشن کہ او دید خواب	
بیاورد پس جامۂ پہلوی	یکے اسپ با آلت خسروی	
بدو گفت بابر بگرما بہ شو	ہمی باش تا خلعت آرند نو	(فردوسی)
بیامد ہم اندر زماں بیدرفش	گرفتہ بدست اندرش آن درفش	
نشستہ براں بارہ پہلوی	بپوشیدہ آن جوشن پہلوی	(فردوسی)
شہ ترک تا گہ سیہ بنگرید	کشاورز مردے تناور بدید	
ستادہ بداں دشت ہیچو ہیون	بتن ہمچو کوہ و بہ چہرہ چو خون	
قوی گردن و سینہ و بر فراخ	بتن چون درخت و بازو چو شاخ	

بداں پہلوی بازوان دراز | ہمے شاخ بشکست آں سرفراز | (فردوسی)
پرستندۂ سوئے دربنگرید | بباغ اندروں چہرۂ جم بدید
جوانے ہمہ پیکرش پہلوی | فروزاں ازو فرۂ خسروی | (اسدی)
ہستند گاہِ بخشش و کوشش غلام او | جانم بزرفشانی و رستم بہ پہلوی | (ابن یمین)

اس زبان کا نام پہلوانی بھی آیا ہے۔ جیسے ان اشعار میں

اگر پہلوانی نداني زباں | بتازی تو اروند را دجلہ خواں
بسے رنج دیدم بسے گفتہ خواندم | ز گفتار تازی و از پہلوانی
بہ چندیں ہنر شصت و دو سال بودم | کہ گوشہ برم ز آشکار و نہانی | (فردوسی)
نہم است در پہلوانی زبان | بر سے فزوں زانکہ دشت و مان | (فردوسی)

پہلوانی بلاشبہ پہلوان کا اسم منسوب ہے اور پہلوی کا مترادف ہے۔ اس کے معنی دلاور، توانا، قوی جثہ، ضابطہ اور حاکم کے ہیں۔

بیا یک چنیں گفت زاں پس جوان | کہ من پور ساسانم اے پہلوان
سرافراز پور یل اسفندیار | ز گشتاسپ اندر جہاں یادگار | (فردوسی)
فرستاد نزدیک شاہ اردوان | فرستادۂ بابک پہلوان | (فردوسی)

پہلو بھی پہلوان کے معنوں میں آیا ہے۔

چو نزدیک رستم فراز آمدند | بہ پیشش ہمہ در نماز آمدند
بگفتند کاے پہلو نامدار | نشاید ازیں جا ت کردن گذار | (فردوسی)

مستشرقین یورپ کی رائے اس امر میں

(۶) مستشرقین یورپ جن کی رائے فارسی اور عربی تصانیف پر مبنی معلوم ہوتی ہے اس بارے میں متفق نہیں۔

ڈاکٹر [illegible] کی رائے میں: پہلو اور پرتھو ایک ہی ہیں اور اس کے معنی عظیم اور وسیع کے ہیں۔

انکی [illegible] پہلوی کو پہلہ سے مشتق مانتا ہے۔

مارٹن ہوگ کو اس قول سے اتفاق ہے۔ دکارمیر فرانسیسی کا قول ہے کہ پہلو ارشداد کی خاندان کے بانی ارشک اعظم کے جانشینوں کا شاہی لقب تھا۔ اور چونکہ ارشدادی ایک بہادر اور جنگ جو قوم تھی۔ اس لئے پہلو، پہلوی اور پہلوان سے مراد بہادر اور جنگ آزما ہوئے۔

چند اور رائیں اسی مضمون پر

(۷) "پہلو ایک کم مرتبہ فرقہ کھتریوں کا ہے یہ راجہ سگری کا رعایا ہے اپنے ولی نعمت کو بہت ستایا اور اس کی بد دعا سے یہ پھل پایا۔ اس فرقہ کے اکثر لوگ ہندوستان کے جنوب میں آباد ہیں کسی زمانہ میں فارس کے کسی علاقہ سے آئے تھے ان کے ملک کا نام پہلو تھا اور زبان پہلوی تھی، نہیں معلوم وہ علاقہ کہاں تھا"
(سخندان پارس)

رامائن، مہابھارت اور منو کے قوانین میں بھی ایک غیر ملکی قوم کا ذکر آیا ہے۔ جس کا نام پہلو تھا۔
(سخندان پارس)

پہلوی سے مراد شہری زبان لینا صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۸) بلاشبہ پہلوی، پہلوان اور پہلوانی لفظ پہلو سے مشتق ہے اور مختلف معنوں میں سے اگر پہلو سے مراد شہر یا علاقہ مانا جائے تو سب سے زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ یہ مسلم ہے کہ پہلوی اہل علم اور اہل دربار کی زبان تھی۔ جو شہروں میں رہتے تھے۔ زبان کا نام عموماً شہر یا علاقہ کے نام پر ہوتا ہے جس میں وہ بولی جاتی ہے۔ جیسے عربی، چینی، جاپانی، انگریزی، جرمنی، ملتانی اور سندھی۔ اگر کوئی زبان کسی خاص علاقہ یا دوسرے ملک میں رائج ہو جائے تب بھی اس کا اصلی نام قائم رہتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی زبان کا نام انگریزی اور مصر کی زبان کا نام عربی ہے۔ کبھی کسی زبان کا نام بعض خصوصیات پر ہوتا ہے۔ مثلاً سواحلی کہ یہ افریقہ کے ساحل پر بولی جاتی ہے۔ اور اردو کہ یہ لشکر کی زبان تھی۔ ممکن ہو سکتا ہے کہ اس زبان کا نام پہلوی اس وجہ سے ہی ہو کہ یہ اہل دربار اور طبقہ اعلیٰ میں رائج تھی جن کو پہلوان کہتے ہیں۔

پہلوی سے مراد لغت یا لہجہ ہی لیا گیا ہے

(۹) اس رائے کی تائید کہ پہلو سے مراد شہر یا علاقہ لیا جائے۔ اس سے بھی ہوتی ہے کہ اصطلاح میں پہلوی سے مراد لغت، لہجہ اور بولی بھی لی جاتی ہے[۱] حمد اللہ مستوفی نزہتہ القلوب میں

[۱] مثلاً آذری مولفہ سید احمد کسروی تبریزی مطبوعہ طہران سنہ ۱۳۰۴ھ میں ہے:۔
"دریں دو ریاست کہ نام آذری از میان رفتہ دیگر آں نام در کتابہا دیدہ نشود و زبان

کوشت وھو اللحم بالعربیۃ کتب بسرا و یقراہ کوشت علی ھذا المثال لـــ در
لسـ واذا اراد ان یکتب نان وھو الخبز بالعربیۃ کتب لحما و یقراہ
نان علی ھذا المثال لـ ہے سـ وعلی ھذا کل شئ ارادوا ان یکتبوا
الا اشیاء لا محتاج الی قلبھا تکتب علی اللفظ

زوارش صرف مفرد الفاظ تک ہی محدود نہیں بلکہ مرکب الفاظ بھی اسی طرز پر آتے ہیں
یہ کتابت ہم کو کیسی ہی بھدی اور مصنوعی معلوم ہو لیکن بقول پروفیسر براؤن ایسے لوگوں کے لئے آسان اور عام بات ہے جو ابھی تک *dearer ams* کے عادی ہیں اور بجائے کان کے آنکھ اور قوت فکر سے زیادہ کام لیتے ہیں +

یہ خصوصیات بھی ایک وجہ تھی کہ پہلوی کے متعلق گمان ہوا کہ ایک مصنوعی زبان ہے جو ہندوستان کے پارسیوں کی ایجاد و اختراع ہے۔ لیکن اس رائے کی کوئی اصلیت نہیں اور محض ناواقفیت پر مبنی ہے

ایران اور سامی اثر

(۱۱) ایران میں سامی اثر ہمیشہ رہا ہے - ایران کا قدیم یعنی میخی رسم الخط اشوریا اور بابل کے رسم الخط سے ماخوذ ہے + دسویں صدی قبل مسیح میں ارامی خط باقی تمام سامی خطوں کے مقابلہ میں جو ایران کی شمال مغربی سرحد پر رائج تھے زیادہ باوقعت اور اہم مانا جاتا تھا - یہ پہلوی اور اوستا رسم الخط کی بنیاد ہے + عرب حکومت کے قیام پر ایک اور سامی یعنی عربی رسم الخط مروج ہوا اور اب تک ہے - گو ایران سے اب یہ آواز آنے لگی ہے کہ آرین لاطینی حروف اختیار کئے جائیں - اس مجوزہ تبدیلی کی بنا موجودہ عربی رسم الخط کے نقائص بیان کئے جاتے ہیں - لیکن اصل مدعا ترکوں کی تقلید ہے عربی تفوق کی رہی سہی یادگار کو مٹانا ہے - ہمارے خیال میں اگر عربی رسم الخط کو ایران سے خارج کرنا ہی مقصود ہے تو لاطینی کی بجائے اوستا رسم الخط ہر پہلو سے افضل و انسب ہوگا +

ارامی زبان

(۱۲) یہ ارامی زبان کیا تھی جس کا اثر پہلوی پر اس درجہ غالب تھا - فلسطین و سوریہ کے ان حملہ آوروں کی زبان تھی جو شمال کی جانب پیش قدمی کر کے ارام یعنی سطح مرتفع پر آباد ہو گئے تھے - یہ زبان عبرانی اور کلدانی زبانوں سے بہت مشابہ ہے - عہد عتیق ... میں ارامی ان علاقوں کے شمال میں بولی

بانی تھی جہاں کی زبان عبرانی تھی - مگر فینیقیا کے زوال پر آہستہ آہستہ مصر اور مغربی ایشیا کی تجارتی اور سیاسی زبان بن گئی ۔ توراۃ کے بعض صحیفے اسی زبان میں ہیں اور حضرت مسیح کے زمانہ میں گلیلی اور فلسطین کی زبان تھی اور عبرانی صرف علما تک محدود تھی ۔

پہلوی اور فارسی آرین زبانیں ہیں

(۱۳) پہلوی پر ارامی اور فارسی پر عربی اثر کی نوعیت میں فرق ہے جس کا صحیح صحیح سمجھنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ ارامی الفاظ صرف کتابت میں آتے مگر ان کی جگہ ہم معنی ایرانی الفاظ بولے جاتے ہیں - یہ الفاظ پہلوی زبان میں جذب نہیں ہوئے اور ان کی حقیقت ایک اجنبی مہمان کی ہے - لیکن عربی کلمات فارسی کا جزو بن گئے ہیں - اور اسی طرح مستعمل ہوتے ہیں گویا ایرانی ہیں ۔

مگر باوجود سامی اثر کے دونوں زبانوں کی اصلیت اور حقیقت آرین ہے اس حقیقت میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا - اور فارسی صرف و نحو جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا - پہلوی قواعد پر مبنی ہے

پہلوی کتابت

(۱۴) جیسا ہم نے دوسری جگہ بیان کیا ہے اوستا اور پہلوی حروف دونوں ارامی سے ماخوذ ہیں اور دائیں طرف سے بائیں جانب لکھے جاتے ہیں ۔ اوستا کے حروف تعداد میں پچاس کے قریب ہیں مگر پہلوی میں صرف چودہ حروف سے کام لیا گیا ہے - یہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ہم مخرج یا قریب المخرج حروف کی آوازوں کے لئے جہاں اوستا میں جدا جدا حروف ہیں پہلوی میں صرف ایک ہی حرف ہے مثلاً پہلوی میں ؟ ج چ اور ... کا مقام ہے مگر اوستا میں ان کے لئے علی الترتیب ... دو علامات ہیں - حرکات ثلاثہ یعنی ضمہ، فتحہ اور کسرہ اوستا میں مستقل اور علیحدہ علیحدہ حروف سے ظاہر کی جاتی ہیں - مگر پہلوی میں یہ صورت نہیں ۔

اس قسم کا رسم الخط کیوں اختیار کیا گیا ہے ؟ اس سوال کا صحیح جواب دینے کے لئے ہماری معلومات کافی نہیں - لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس نوع کے رسم الخط سے علوم کی تحصیل آسان نہیں ہوتی اور یہ اس مقصد کے عین مطابق تھا کہ تعلیم صرف چیدہ طبقہ کے افراد تک محدود رہے اور علم کے فوائد اور برکات اور اس کے ساتھ سیاسی قوت سے صرف ایک جماعت بہرہ مند ہو - اس ملک میں بھی ایک زمانہ میں جب برہمنوں کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا تعلیم گو بالکل نہیں تو بالعموم ان کے اپنے طبقہ تک محدود تھی اور

ملک کے دوسرے طبقوں کو جاہل اور کمزور رکھنے کے خیال سے علم کی نعمت سے محروم رکھا جاتا، بلکہ اس بارہ میں پرلے درجہ کی تنگ دلی اور تشدد سے کام لیا جاتا تھا۔

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ پہلوی میں تمام آوازوں کے ادا کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ حروف تہجی نہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک حرف بعض اوقات دو یا تین بلکہ اس سے بھی زیادہ آوازوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔

حرکاتِ ثلاثہ کے ظاہر کرنے کے لئے پہلوی میں کوئی علامت نہیں۔ جب تک کوئی زبان مروج اور عام استعمال میں ہے + حروف کی قلت اور حرکات ثلاثہ کے لئے علامات کی عدم موجودگی زیادہ مشکل کا موجب نہیں ہوتی۔ کیونکہ مسلمہ تلفظ سے واقفیت یہ کمی پورا کر دیتی ہے۔ مگر جب ایک زبان بولنے میں نہ آئے تو الفاظ کا صحیح صحیح تلفظ معلوم کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے

عبرانی بھی جب تک زندہ زبان رہی اس میں ضمہ، فتحہ اور کسرہ کے لیئے کوئی علامت نہ تھی لیکن جب اس کا نام زندہ زبانوں کے دفتر سے خارج ہو گیا اور صحیح تلفظ محفوظ رکھنے میں دقت محسوس ہوئی۔ تو چند علامات حرکاتِ ثلاثہ وغیرہ کے اظہار کے لئے تجویز کی گئیں جو اب تک مروج ہیں + پہلوی کے لئے بھی اسی صورت میں اس قسم کی کوشش کی گئی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ بعض حروف کی مختلف آوازوں میں تمیز کی جائے۔ مگر ان علامات کا استعمال عام نہ ہوا +

غرض اس قسم کی مشکلیں تھیں جن کی وجہ سے پہلوی میں لکھنا پڑھنا اور اس زبان کی کتابوں سے فائدہ اٹھانا دقت کا باعث رہا + فخری گرگانی کے یہ شعر مثنوی "ویس ورامین" کے پہلوی نسخہ کے متعلق بالکل حسب حال ہیں :۔

ولیکن پہلوی باشد زبانش	نداند ہر کہ برخواند بیانش
نہ ہر کس آں زباں نیکو بخواند	وگر خواند ہمی معنی نداند
فراواں وصف چیزے برشمارد	چو برخوانی بسے معنی ندارد

یہ بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلوی کلمات کا تلفظ قدیم فارسی، اوستا اور موجودہ فارسی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اور اس بارے میں سنسکرت پر بھروسہ کرنا درست معلوم نہیں ہوتا گو آرین زبانوں میں سنسکرت کی حیثیت کچھ ہی ہو۔ لیکن قدیم فارسی، اوستا اور فارسی کے مقابلہ میں پہلوی اور سنسکرت

کا رشتہ پھر بھی دور کا ہے۔

پہلوی اور فارسی میں اختلاف اور یگانگت

(۵) ایک عرض۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ پہلوی اور فارسی میں مابہ الامتیاز سوائے رسم الخط کے اور کچھ نہیں تو دوسری طرف یہ رائے بھی ظاہر کی گئی ہے کہ پہلوی مردہ زبان ہے اور ایران کی موجودہ زبان یعنی فارسی سے اس کو وہی تعلق ہے جو سنسکرت کو ہندی اور لاطینی کو اٹالین سے ہے۔ یہ دونوں رائیں افراط و تفریط سے خالی نہیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ پہلوی اور فارسی رسم الخط ایک نہیں لیکن ان دو زبانوں میں فرق یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ نہ ہی پہلوی اور فارسی دو مختلف زبانیں ہیں اور نہ پہلوی کی زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہے اور نہ وہ مردہ زبانوں کے زمرہ میں داخل ہے۔ گو عہد ساسانی کی پہلوی زبان اور اس کی موجودہ شکل یعنی حال کی فارسی میں فرق ہے لیکن یہ فرق اس زمانہ کے امتداد کا نتیجہ ہے جو ان دونوں میں حائل ہے اور نہ اس فرق کی وسعت اور نوعیت ایسی ہے کہ پہلوی اور فارسی دو علیحدہ زبانیں قرار دی جائیں۔ اس کتاب کے آخری باب میں ہم نے اس مضمون پر مفصل بحث کی ہے۔

کتبوں اور کتابوں کی پہلوی۔

(۱۶) پہلوی کتبوں اور سکوں کے حروف کتابوں کے رسم الخط سے مختلف ہیں اور اس قدر مشکل اور مبہم نہیں۔ یہ رسم الخط دو طرح کا ہے ایک کا نام کلدانی پہلوی ہے اور دوسرے کو ساسانی پہلوی کہتے ہیں۔ دونوں میں اٹھارہ اٹھارہ حروف ہیں۔ اول الذکر خط نسبتاً زیادہ قدیم ہے اور کلدانی سے مشابہ ہے اور یہ مشابہت اس نام کا باعث ہوئی ہے۔ دوسری قسم کے حروف ساسانی عہد میں کتبوں اور سکوں پر زیادہ استعمال ہوتے تھے اور انہیں حروف نے آہستہ آہستہ بدل کر کتابی پہلوی کی شکل اختیار کی۔ پہلوی کتبے ساسانی عہد کی ابتدا سے گیارھویں صدی عیسوی تک ملتے ہیں۔ سب سے قدیم نقش رستم و نقش رجب کے کتبے ہیں جو اردشیر اور شاہ پور (۲۲۶ء – ۲۷۲ء) کے عہد کی یادگار ہیں۔ یہ دو زبانی، کلدانی پہلوی اور ساسانی پہلوی میں ہیں۔ حاجی آباد کا مشہور کتبہ کلدانی پہلوی اور ساسانی پہلوی میں ہے۔ اور غالباً بہرام ثانی (۲۷۶ء – ۲۹۳ء) کے بعد کا ہے اور بعض کتبے صرف ساسانی پہلوی میں ہیں۔

ایران میں عرب حکومت کے ابتدائی زمانہ میں نہ صرف پہلوی سکے مروج رہے۔ بلکہ بعض عرب عمال کے عہد حکومت میں بھی سکے اسی زبان میں مضروب ہوئے۔ طبرستان کے خود مختار حکمرانوں کے عہد میں جن کو سپہبد یا اسفہبد کہتے ہیں پہلوی سکے رائج تھے۔ یہ صورت خلیفہ عبد الملک کے عہد تک رہی جس نے عربی سکہ کا رواج دیا۔

ہندوستان میں بھی پہلوی کتابت کے آثار ملتے ہیں۔ نویں صدی عیسوی میں مالابار کے ساحل پر شامی عیسائیوں کو کچھ زمین عبادت گاہ کے ساتھ بطور جاگیر ملی تھی جس کی سند تانبے کی پانچ تختیوں پر منقوش ہے۔ اور جن پر ۲۵ دستخط ہیں۔ گیارہ کوفی عربی خط میں، دس ساسانی پہلوی اور چار ہمدانی اور فارسی میں۔ بمبئی کی نواح میں جزیرہ سالسٹ کے زیر زمین بدھ مندروں میں کچھ پہلوی عبارت کندہ ہے۔ جو گیارھویں صدی عیسوی کی بتائی جاتی ہے۔

پہلوی علم ادب اور طرز تحریر

(۱۷) اگرچہ پارسی مذہب کے بنیادی اصول اوستا میں قلمبند ہیں مگر اس کے فقہی مسائل، رسوم اور روایات کے معلوم کرنے کا ذریعہ پہلوی تصانیف ہیں ان تصانیف کو اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) اوستا کے پہلوی ترجمے جن میں وہ ترجمہ بھی شامل ہیں جن کی اصل اوستا اب ناپید ہے

(۲) دینیات

(۳) تاریخ

(۴) اخلاق

(۵) متفرق مضامین

پہلوی کتابیں جو اس زمانہ میں قریباً سات سو سال طویل مدت میں وقتاً فوقتاً تصنیف ہوئیں اور یہ زمانہ ایک زبان کے ارتقا اور عروج کے لئے کافی ہونا چاہئے مگر باوجود اس کے پہلوی طرز تحریر پھیکی اور بھدی ہے اور فارسی کی روانی اور سلاست کا اس میں نام نہیں ہے۔ بعض کتابوں کی عبارت نہایت ہی ادق معلوم ہوتی ہے۔ ابو علی سینا کی حکمت فارسیہ اور تاریخ طبری مترجمہ بلعمی کی عبارت سے پہلوی طرز تحریر کا ایک حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔

فارسی رسم الخط

(۱۸) جب ایران عربی حکومت کے تحت میں آیا تو اس زمانہ میں عرب میں کوفی خط مروج تھا اور یہی خط ایران نے اختیار کیا بعد میں یہ خط فارسی نستعلیق کی صورت میں تبدیل ہوا۔ قرائن اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ فارسی نستعلیق خط میں پہلوی رسم الخط کا اثر بھی ہے +

صاحب الفہرست کا قول ہے کہ فارسی رسم الخط قرآن کے خط سے ماخوذ ہے جس کا نام فیر اموز ہے لیکن افسوس ہے کہ فیر اموز خط کی کوئی مثال موجود نہیں اور نہ ہی اس لفظ کا مفہوم معلوم ہے +

پہلوی رسم الخط اور حروف تہجی کے نقائص کا خیال رکھتے ہوئے فارسی رسم الخط بہ ہمہ وجوہ بہتر اور افضل ہے اور اس کا اختیار کرنا ایران کی علمی اور ادبی ترقی کا موجب ہوا ہے جو ممکن نہ تھی اگر پہلوی رسم الخط ملک میں رائج رہتا +

ایران اور اسلامی دنیا

(۱۹) مشرق بالخصوص اسلامی دنیا نے ایران کی تہذیب اور روایات کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور عربوں نے ایرانی طرز حکومت، نظم و نسق اور حسن سیاست میں ایران کی فوقیت کو تسلیم کیا ہے اور اہل ایران کی طباعی، ذہانت، سلیقہ، نفاست پسندی اور اخلاق قابل تقلید خیال کئے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے علوم و فنون اور روایات پر ایرانی اثر سے انکار نہیں ہو سکتا۔ جام جمشید، ماران ضحاک، درفش کاویانی، تاج کیانی اور کلاہ خسروی ہماری نظم و نثر کا مایۂ ناز ہیں۔ مذہبی دنیا میں ایرانی کلمات مثلاً خدا، فرشتہ، پیمبر، نماز، بہشت، دوزخ، درود وغیرہ ہماری زندگی کا جزو ہیں + جمشید، فریدوں، رستم اسفندیار، دارا، نوشیرواں عادل، بہرام گور، مانی، بہزاد، شیریں وفرہاد کے نام سے کون واقف نہیں؟ کیا ابن المقفع، بوعلی سینا اور البیرونی کے بغیر اسلامی دنیا نادار نہ ہوتی۔ اور کیا فردوسی، خاقانی، انوری، عمر خیام سعدی اور حافظ ایران کی سرزمین سے پیدا نہیں ہوئے +

گو صدر اسلام میں قدیم ایران کی تاریخ اور روایات کو زندہ رکھنے پر اسلام بجا طور پر فخر کر سکتا ہے لیکن اب کچھ عرصہ سے مسلمانوں کی ہمہ گیر پستی اور جمود نے قومی علوم و فنون کے ساتھ ایران کے قدیم علوم سے بھی غافل کر دیا۔ ایک رنجدہ عمل جو ہماری تحقیقات کے راستہ میں حائل ہے وہ یہ غلط خیال ہے کہ ایران کا قدیم علمی سرمایہ قابل اعتنا نہیں اگر ایک طرف آرین قومیں اپنی برتری اور تفوق کے راگ وقت بے وقت

الاپتی رہتی ہیں تو دوسری طرف عجم کے مقابلہ میں ہر بات میں عرب کی ترجیح کرنے والے یہ کہنے سے دریغ نہیں کرتے کہ فارسی زبان علمی زبان نہیں اور یہ کہ ایران میں اسلام سے پہلے شعر کا وجود نہ تھا۔

ان غلط خیالات کی تردید کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اس بیسویں صدی میں اس امر کے احساس کی ضرورت ہے کہ جو سعی اور موشگافی اس قسم کی لاطائل بحث پر صرف ہوتی ہے اگر فارسی زبان کے ماخذ، اصول اور تاریخ کے لئے وقف ہوتی تو علمی دنیا کو بدرجہا زیادہ فائدہ ہوتا۔ اب یہ صورت ہے کہ فارسی کا مطالعہ پہلی دو منزلیں قطع کئے بغیر آخری یعنی تیسری منزل سے شروع کرتے ہیں۔ میں نے اس کتاب میں کوشش کی ہے کہ یہ علمی سفر دوسری منزل سے شروع ہو۔ مجھ کو امید ہے کہ میری یہ محنت اسی بات کا دیباچہ ہوگی کہ ایرانی علوم کی واقفیت میں ہم ایک قدم اور آگے بڑھیں۔ اور یہ ناچیز اوراق اس مضمون پر بہتر اور مفید تر تصانیف کا پیش خیمہ ہوں۔

آہنگِ تپش

(پروفیسر عبداللطیف تپش)

بل کھا رہے ہیں کس پر یہ گیسوئے خمیدہ — پھانسی کا مستحق ہے کب یہ گلو بریدہ

سجدے ہیں آسماں پھر گرنے کو ہے زمیں پر — پھر سر اٹھا رہا ہے وہ قامتِ کشیدہ

بلبل بھی چھوڑتا ہے بے فصل کے شگوفے — سمجھا ہے اُس نے شاید مجھ کو خزاں ندیدہ

ہوتی ہے بات پھیکی الٹو بھی اب نمکداں — منہ آ رہا ہے کیا کیا زخمِ دہن دریدہ

نقشِ قدم کی تیرے اللہ رے رازداری — ہر غنچہ سرنگوں ہے ہر شاخ ہے خمیدہ

کب بے خلش کٹے گی عمرِ برہنہ پائی — گردش یہ میری اک اک چھالا ہے آبدیدہ

مرنے کو جی رہا ہے ناشاد مانِ ہستی — جینے یہ کیا مرے گا ذوقِ فنا چشیدہ

کام آئی اب حرم کی وہ صورت آشنائی — بیٹھے ہیں بت کدے میں بن کر خدا رسیدہ

پیغامِ مرگ کو بھی دشمن کی چال سمجھے
ہوگا تپش نہ کوئی تم سا بھی خوش عقیدہ

(از ظفر قریشی دہلوی)

تاریخ اب قرطاس و قلم کی بجائے کدال پھاوڑوں سے لکھی جا رہی ہے یعنی زمین کھود کھود کر قدیم شہر، مقبرے اور آثار عتیقہ بیان کئے جا رہے ہیں، ہزارہا سال کی پوشیدہ تہذیبیں (جن کے تذکرے تک نہ بھی کتابوں میں موجود تھے اور وہ بھی بہت ناکافی) اب تاریخی حقایق بن کر منظر عام پر لائی جا رہی ہیں قارئین نے خود ہندوستان میں الیورا کے غاروں اور سندھ میں "ہڑپا منہجو دارو" کی کھدائیوں کے حالات بالتفصیل پڑھے ہونگے، اسی قسم کی ایک پرانی تہذیب کے آثار کو محققین آثار قدیمہ و ماہرین ارضیات نے حال ہی میں دریافت کیا ہے جسے کلدانیوں کی تہذیب کا گہوارہ ہونے کا فخر حاصل ہے یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا شہر "اُر" ہے۔

توراۃ میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کلدانیوں کے اُر سے نکالا، "گو اس جملہ کے مطلب میں اختلاف رہا ہے مگر عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اُر ایک شہر کا نام ہے جو عراق میں مقبر کے نام سے مشہور ہے۔ محققین آثار قدیمہ کو اس شہر کی بہت عرصہ سے جستجو تھی چنانچہ ان کی کوششیں کامگار ثابت ہو رہی ہیں۔

یہ شہر جو کسی زمانہ میں ایک وہمی اور روایتی مقام تصور کیا جاتا تھا اب ایک تاریخی اور جغرافیائی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اُر خلیج فارس اور بغداد کے عین درمیان واقع ہے۔ آج کل دریائے فرات جس سمت بہتا ہے اس سے دس میل مغرب میں ہے۔ نیز اس ریلوے لائن سے ڈیڑھ میل پرے جو بصرہ اور عراق کے دار الحکومت کو باہم ملاتی ہے۔

سنہ ۱۸۵۹ء سے پہلے کسی شخص کو خیال نہ ہو سکتا تھا کہ اس عظیم الشان میدان کے نیچے ایک عظیم شہر دبا پڑا ہوگا جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ تھا۔ برطانوی قنصل نے سب سے پہلے اس نواح میں چند عجیب انوکھے کتبے برآمد کئے تو معلوم ہوا کہ اس میدان کے نیچے، ریت کے تودوں اور مٹی کے ٹیلوں کے نیچے ایک ایسے شہر کے محلات، معابد و مقابر دبے پڑے ہیں جو کسی زمانہ میں ایک آباد اور متمول شہر تھا۔

"نوادر خانہ برطانیہ" (برٹش میوزیم) کے ارباب حل وعقد اس فکر میں تھے کہ اس علاقہ میں مستقل، مسلسل اور باقاعدہ کھدائی شروع کی جائے اور اس شہر کو سطح زمین کے اوپر لایا جائے مگر جنگ عظیم سے پہلے اس قسم کی کوئی مہم نہ بھیجی جاسکی۔ اس زمانہ میں جب عراق میں برطانوی افواج داخل ہوئیں تو وہاں اُر کی کھدائی بھی شروع کردی گئی لیکن بروقت روپے کی کمی کی وجہ سے دفعتہً بند کرنی پڑی۔

آخر کار ۱۹۲۲ء میں ڈاکٹر جی بی، گورڈن صاحب جو "پنسلوانیا" کی یونیورسٹی میوزیم کے پروفیسر ہیں۔ برطانوی نوادر خانہ کے ارباب اختیار تک پہنچے اور ایک متحدہ مہم کی تجویز پیش کی، چنانچہ یہ رائے ہوئی کہ عراق میں کھدائی شروع کردی جائے اور اس کے لئے اُر کا مقام مخصوص ہوا۔

سی لیونرڈ وولی صاحب اس "متحدہ مہم" کے نگران کار (ڈائرکٹر) تھے اور انہوں نے سات سال کی مسلسل و باقاعدہ سائنٹیفک تحقیق و تفتیش کے بعد ایک کتاب تحریر کی ہے جس کا عنوان "کلدانیوں کا اُر" ہے اور یہی ایک کتاب ہے جو اُر کے متعلق تمام معلومات یکجا پیش کرتی ہے۔ ان سطور میں بھی اس کتاب سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہر انگریزی کتب فروش سے ۲ شلنگ ۶ پنس میں مل سکتی ہے۔

مصنف جو اس مہم کے ساتھ تھا لکھتا ہے کہ "دنیا کے قدیم ترین شہر کی کھدائی ہر سال سرما میں بہت شدومد کے ساتھ شروع ہوتی تھی اور گرما کے ابتدائی ایام تک جاری رہتی تھی" شہر اُر سطح زمین کے چند سو میٹر نیچے سے دبا ہوا نکلا ہے جس میں سولہ مکانوں کی بنیادیں اور پانچ عام رہگذریں ہیں۔ تمام مکانات خشتی ہیں مگر کچے۔ جو مکانات حوادث زمانہ کی دستبرد سے بچ گئے ہیں ان کی دیواریں پانچ یا چھ میٹر بلند ہیں نیز چند چھتیں اور ستون بھی باقی رہ گئے ہیں جو زبان حال سے داستان پارینہ بیان کر رہے ہیں۔ اس زمانہ کے ہر مکان میں ایک بڑا صحن ہوتا تھا جس کے گرد پھولوں اور بیل بوٹوں کے لئے کیاریاں لگی ہوتی تھیں چنانچہ کئی مکانوں میں ٹوٹی ہوئی کیاریاں اور روشیں ملی ہیں۔

بعض مکانوں کی کھدائی سے فرشوں کے نیچے مردہ بچوں کی ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اُر کے باشندے اپنے مردہ بچوں کو اپنے مکانوں میں دفن کردیا کرتے تھے۔ ایک مکان میں ایک قیمتی کتب خانہ بھی برآمد ہوا ہے جو تمام تر ٹھیکروں پر لکھا ہوا ہے۔ اس کتب خانہ میں جملہ فنون ادب ریاضی اور تاریخ کی کتابیں ہیں۔ اور انہیں پڑھا جا رہا ہے جس سے توقع کی جاتی ہے کہ عہد عتیق کے ایک

زبردست علمی خزانہ پر دسترس ہو جائے گی۔

مکانوں سے کچھ فاصلہ پر ایک قبرستان بھی ملا ہے اس کی چھان بین سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُر کے باشندے اپنے مردوں کو کفن پہنا کر دو چٹائوں کے درمیاں رکھ کر قبر میں لٹا دیتے تھے اور اس کے سرہانے اشیائے خوردنی مثلاً شراب، گوشت، کھجور، پنیر وغیرہ رکھ دیتے تھے ان قبروں میں سے تانبے اور امرا کی قبروں سے چاندی سونے کے اوزار او ہتھیار دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ ہتھیار اور ظروف بہت خوبصورت نقش و نگار سے مزین ہیں۔

اس سلسلہ میں ملکہ شبعاد کی قبر نے بہت شہرت حاصل کی ہے۔ اس قبر اور دیگر امرا کی قبروں سے جو خزانے دستیاب ہوئے ہیں ان کی قدر و قیمت مشہور فرعون مصر طوطخ آمن کے مقبرہ کی دولت سے بھی بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ مصنف نے اس ملکہ کی قبر سے دستیاب شدہ اشیا کی تفصیل بتانے میں بہت سے صفحات وقف کئے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب بابل و نینوا جیسے شہر صفحۂ ہستی پر نمودار بھی نہ ہوئے تھے اُس وقت اُر کیسا بارونق، متمول، اور کتنے ٹھاٹ باٹ کا شہر ہوگا۔

ڈاکٹر کٹر نے ملکہ کی قبر کے جو حالات قلمبند کئے ہیں مختصراً یہ ہیں:۔

"چوبی تابوت کے باقی ماندہ حصہ کے ایک طرف ملکہ کی نعش رکھی ہوئی تھی، ہاتھ کے قریب سونے کا پیالہ تھا۔ لاش کا بالائی حصہ کلیتاً سونے، چاندی، پکھراج، نیلم، سنگ سلیمانی، یشب وغیرہ قیمتی پتھروں کے دانوں اور منکوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ منکے ایک چغے کی طرح بنے ہوئے تھے جو گلے سے لے کر کمر تک پہنچتا تھا اس چغہ کے سروں پر نیلم، پکھراج اور سونے کے مثلثی ٹکڑوں کی ایک خوشنما چوڑی گوٹ بطور حاشیہ لگی ہوئی تھی۔"

"دائیں بازو پر تین لمبی لمبی سوئیاں تھیں جن کی گھنڈیاں نیلم کی تھیں، نیز مچھلی کی شکل کے تعویذ بھی جن میں دو سونے کے اور ایک نیلم کا تھا بندھے ہوئے تھے۔ ایک سونے کا تعویذ اور بندھا ہوا تھا جن پر دو بیٹھی ہوئی ہرنیاں دکھائی گئی تھیں۔"

ملکہ کے سر کا لباس بہت خوبصورت اور قیمتی تھا، جلو کی دیگر عورتوں کے لباس سے بہت ممیز تھا۔ اس لباس کی شکل تاج کی سی ہوتی تھی جس میں قیمتی پتھروں کی لڑیاں، سونے کے چھلّے اور پھول جڑے ہوتے تھے، دیگر قبروں سے بھی اس سے کم قیمتی، سامان آرائش، مثلاً گیسوگیر، کنگھیاں، زیورات اور دیگر قسم کے

ہتھیار اور ظروف برآمد ہوئے جن کی تفصیل بخوف طوالت چھوڑی جاتی ہے۔

جو چیز سب سے زیادہ خوفناک اور ہولناک ہے وہ یہ تھی کہ جب خاندان شاہی کا کوئی فرد مرجاتا تھا تو قبر میں اس کے ساتھ تمام درباری اور امرا بھی بالجبر مرنے پر مجبور کر دیئے جاتے تھے اور انہی کے ساتھ مدفون ہو جاتے تھے چنانچہ ملکہ شعباد کی قبر کے گرد پچپن رفقا اور ساہ "آبارجی" (جو غالباً اس کا خاوند تھا) کے گرد چونسٹھ دیگر لوگوں کی لاشیں ملی ہیں۔ ان لاشوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہیں کسی وجبر و اکراہ سے مارا گیا تھا بلکہ رضا و خوشی کا اظہار ہوتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ کسی منشی شے مثلاً افیون یا بھنگ وغیرہ کا اثر ڈال کر انہیں اس طرح مرنے پر مجبور کیا جاتا ہوگا یا ممکن ہے کہ لوگ خود مرنا قبول کر لیتے ہوں کیونکہ اس زمانہ میں بادشاہ اور ملکہ خدا متصور ہوتے تھے اور وہ لوگ ان کے ساتھ دفن ہونا ابدی مسرت اور نجات کا موجب خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ماہرین کی رائے ہے کہ یہ لوگ ... کے اثر میں زندہ درگور ہو جاتے تھے جس جگہ یہ دفن کئے جاتے تھے انہیں "غار موت" کہتے تھے، مرنے سے پہلے تمام مرنے والے سرخ جوڑے پہنتے اور طرح طرح کی رسوم و آداب مذہبی ادا کرتے تھے

"اُر" کی اثریات اس وجہ سے اور بھی قابل ذکر ہیں کہ وہ ایک ایسی تہذیب کا انکشاف کرتے ہیں جو موجودہ تحقیقات کے علم میں دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ سیمرین نسل (یعنی اُر کے بادشاہوں کی نسل) کی تہذیب مصری، بابلی عبرانی ... وغیرہ تہذیبوں کی معلم اول تھی بلکہ یونان بھی اُرہی کا خوشہ چین تھا گویا اس سلسلہ سے اُر مغرب کی ... تمدن کا پیشرو سمجھنا چاہئے۔

اُر کے قریب جو تازہ ترین کھدائیاں ہوئی ہیں ان میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مکان بھی نکلا ہے۔ یہ کوئی معمولی یک منزلہ مٹی کا مکان نہیں ہے بلکہ :۔

"ہم نے دریافت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں مکان اس طرح بنائے جاتے تھے کہ دیواروں کی نچلی جڑیں پختہ اینٹوں کی ہوتی تھیں اور اوپر کا حصہ کچی اینٹوں کا مگر اس مصالحہ کی دو گانگت کو چھپانے کے لئے پلستر و قلعی کر دی جاتی تھی۔ مکان کے بیچ میں ایک بلند چبوترہ کے گرد تیرہ چودہ کمرے ہوتے تھے ... ان تمام طرف ہوا اور روشنی کی بہم رسانی کرتا تھا ———— غرض یہ ہے کہ عبرانی پیغمبر (ابراہیمؑ) کے متعلق ہمیں اپنے ان خیالات کی اصلاح کرنی چاہئے کہ وہ ایک بوسیدہ

مکان میں خراب وخستہ زندگی گزارتے تھے بلکہ ان کا مکان زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ ان کی زندگی آرام اور چین بلکہ عیش ونشاط میں گزر رہی تھی۔"

یہ مختصر حالات ہیں اس شہر کے جو آج سے پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ کا عرصہ ہوا آباد تھا اور جو آج ایک تودہ خاک اور چند منتشر انباروں پر مشتمل ہے۔ درس عبرت ہے ان لوگوں کے لیئے جو اپنی مادی ترقی اور فلک بوس سنگین عمارتوں اور عالیشان شہروں کی ترقی پر اتراتے ہیں [illegible] سکسپیر۔ نہیں جانتے کہ ایک **طاقت** ہے جو ہماری زندگیوں کو بناتی اور بگاڑتی رہتی ہے

شوخیٔ تقریر

(جناب محمد رفیق صاحب شوکت از بغداد)

بڑھ کے ہے اندازِ حیرت شوخیٔ تقریر سے
کوئی سن لے داستانِ دل مری تصویر سے

ہم نوا حیراں ہیں میری شوخیٔ تقریر سے
میں کیا کرتا ہوں باتیں آپ کی تصویر سے

ہم کریں گے سعیِ پیہم ناخنِ تدبیر سے
کیا عجب کھل جائے قسمت کی گرہ تقدیر سے

جب گرہ کھلتی نہ دیکھی ناخنِ تدبیر سے
آج ہم دست و گریباں ہو گئے تقدیر سے

گلشنِ حسنِ عمل میں گل بدامن ہم صفیر
واسطہ ہم کو پڑا ہے خارِ دامنگیر سے

جانتی ہے ماسوا کے واسطے ملنا گناہ
وہ زباں جو کر چکی باتیں تری تصویر سے

ہم نے یہ مانا کہ پہلو میں ترازو ہو گیا
حسرتِ ذوقِ خلش نکلی نہ تیرے تیر سے

خط انہیں لکھنے تو بیٹھا ہوں مگر یہ خوف ہے
میرا مطلب وہ نہ پا جائیں مری تحریر سے

حلقہ زن کل تیرے در پر تھا دلِ شورش پسند
آج ہے ہنگامہ آرا حلقۂ زنجیر سے

ہے اساسِ عیش و عشرت تیشۂ خارا شگاف
بوئے خوں آتی ہے اے پرویز جوئے شیر سے

کیا جہاں سے اُٹھ گیا کوئی گرفتارِ بلا
شور و واویلا اٹھا کیوں خانۂ زنجیر سے

خود فریبی پر تری شوکت بلائیں لے رہی ہیں
خواہشِ مشکل کشائی اور چرخِ پیر سے

عقل گم کردہ مذہب رہ ست آب حیات [illegible]
آرزو ہے بوسۂ جانِ پرو. گل تصویر سے

ملہ قرآن پاک نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق مخلوق کہنے کا کہیں ذکر نہیں کیا علاوہ ازیں [illegible] ایک نبی کی شان میں گستاخی ہے۔ ایڈیٹر

شاہکار

(ایک از بغداد)

انگریزی اصطلاح ماسٹرپیس ([illegible]) کا توڑ جس نے اُردو میں شاہکار تراشا - اس کی رسائی ذہن کا کیا کہنا - لفظ نہایت زوردار ہے اور مختصر - آسانی سے زبان پر چڑھ سکتا ہے ہر چند پُرہیبت ہے - مگر کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کی اکڑ بکڑ کے آگے انگریزی اصطلاح بیرنگ ہے - اور اگر معاملہ برعکس ہوتا یعنی انگریز شاہکار کا ترجمہ ماسٹرپیس کرتے - تو ماننا پڑتا - کہ وہ ترجمے کا حق ادا نہیں کر سکے - باقی رہا مفہوم - وہ ایک ہے یعنی کسی استادِ فن کی بہترین صنعت گری یا سگرف کاری فن کی قید نہیں مصوّری نقاشی - موسیقی - شاعری معماری نجاری - غرض سبھی کچھ پر حاوی ہے - اہلِ یورپ اس اصطلاح کو صرف ایسے دستی یا دماغی اظہارِ کمال کے متعلق استعمال کرتے ہیں - جو تنقید و تدقیق کی تمام منازل طے کر کے قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہو - اور ہم خیال کرتے تھے - کہ ہندوستان میں بھی قریب قریب ایسا ہی ہوگا - مگر ع خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم - ! ہمارے ہنّیوں نے جس طرح اس شریف لفظ کی مٹی خراب کی ہے - ذرا اس کی کیفیت ملاحظہ ہو *

ہمارے اخباروں و رسالوں میں تیبر سے بالو دواؤں کے اشتہار ہوتے ہیں - یا شاعروں کے شاہکار - جس مقدس سرزمین پر ہم آجکل وارد ہیں - یعنی بغداد شریف اور جس کو کسی زمانے میں یونانی فن طب کے احیا کا شرف حاصل ہوا اب وہاں اطبا، یونانی کی طرف رجوع کرنا - یا بطور خود یونانی ادویہ استعمال کرنا قانوناً جرم ہے - اِس لئے اُردو صحائف کا اول الذکر حصّہ تو ہمارے لئے محض بیکار رہے - باقی رہے شاعروں کے شاہکار - اگر شاہکار کا مفہوم حضرات شعرا کے نزدیک تخیل کی ایسی بلند پروازی ہے کہ "وادی عنقائے معنی سے پرے لاکھوں کوس" نکل جائیں - تو اِس سلسلے میں بھی ہمارا چندہ بمد خیرات ہی متصوّر ہونا چاہیئے *

اس وقت ایک سالنامے میں "تازہ ترین شاہکار" بصیغۂ مع ہمارے پیش نظر ہیں - ہم ایک ایک شعر کو پڑھتے ہیں لفظ لفظ پر غور کرتے ہیں - بآواز بلند پڑھتے اور سوچتے ہیں - دل ہی دل میں پڑھتے اور سوچتے ہیں - بائیں کلائی میز پر قائم کر کے اُلٹے ہاتھ سے ٹھوڑی کو سہارا دیتے اور چھت کے شمالی مشرقی گوشہ میں نشست باندھتے ہیں کہ شاید عنقائے معنی کہیں وہیں دبکا ہو - سر سہلاتے ہیں - کان کھجاتے ہیں - القصہ ہر وہ آسن آزماتے اور ہر وہ حرکت کرتے ہیں جو دماغی

مصیبت پڑ جانے پر پڑھے لکھے لوگ ضرور کرتے ہوں گے۔ جن سے ہم براہِ راست تو کیوں ملنے لگے تھے کہ ذاتی تجربہ ہوتا۔ بڑے بڑے مفکرین کی تصاویر البتہ دیکھی ہیں۔ اور ہم کو انہیں نقوش کی نقالی کا فخر ہے۔ تبھی تو فرمایا ہے :۔ ؎

ہمنوا حیراں ہیں میری شوخیٔ تقریر سے　　　میں کیا کرتا ہوں باتیں آپ کی تصویر سے

مگر وہ شاہکار ہی کیا جو ہم ایسوں کی سمجھ میں آ جائے۔ سنیئے مطلع ارشاد ہوتا ہے :۔ ؎

تمہیں کو بس چاہتے ہیں دنیا و دیں کا اب امتیاز کیوں ہو　　　بہشتِ عشق و وفا ہے منزلگہ نشیب و فراز کیوں ہو

تبراً و آپ کا خیال نہ فرمایئے۔ بات صاف ہے۔ یعنی جب صرف تمہیں کو چاہتے ہیں تو دنیا اور دین کا امتیاز یعنی چہ ہ لیکن چاہنے کون ہیں۔ اور چاہنے سے دین و دنیا کا امتیاز کیوں اُٹھ گیا۔ بس یہ نہ پوچھیئے۔ یہی تو شاہکاری کا راز ہے اگر کہا جائے کہ دوسرا مصرع اس دعویٰ کی دلیل ہے۔ تو لگتے ہاتھ ان چھوٹے میاں سبحان اللہ کی مزاج پرسی بھی کرتے چلیئے اگر بہشتِ عشق و وفا باضافت پڑھا جائے تو شعریت وہ بیز نظر نہیں آتی۔ جیسے بہشت عشق و وفا کہا گیا ہے۔ اگر بلا اضافت پڑھیں یعنی بہشت ہی کو عشق و وفا سمجھیں یا عشق و وفا کو بہشت۔ تو یہ منزلگہ نشیب و فراز کیا چیز ہے جو بزعم مولنا کسی زمانے میں عشق و وفا یا بہشت خیال کئے جاتے ہوں گے۔ علاوہ ازیں نشیب و فراز کے لئے منزلگہ تعمیر کرنا ایجادِ بندہ نہیں تو اور کیا ہے۔ آج تک منزلگہ کی ضرورت ایسی چیزوں کے لئے مانی جاتی رہی ہے۔ جن میں منیت مکانی یا زمانی پائی جائے۔ جیسے ؎

خبرم نیست کہ منزلگہ مقصود کجاست　　　ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

مگر نشیب و فراز میں نہ یہ ہے نہ وہ۔ پھر ان کی منزلگہ کیسی۔ مجموعی طور پر شعر کا وزن باون تولے پاؤ رتی ہے ردیف و قافیہ سے لیس۔ معنی مطلب کی کمی کچھ ایسی کمی نہیں۔ بڑھیئے اور جھومیئے :۔ ؎

مٹا بھی لے اہلِ عشق کو ہاں وفا کی ایسی تمیز ہی کیا　　　ابھی سے اے جانِ کفر نیری نگاہِ الفت طراز کیوں ہو؟

"مٹا بھی لے" کی فصاحت میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ "ہاں" نے تو اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ مگر آپ ذرا الفاظ کا پردہ اٹھا کر شاہد معنی سے جمال سے آنکھیں سینکنے کی کوشش فرمائیے۔ مولنا معشوق کو اہل عشق کے مٹا چکنے کی رشہ دیتے ہیں۔ اہلِ عشق قاطبتہً! اور ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ وفا اور بیوفائی کی تمیز کی بھی ضرورت نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ عشق تو بیوفا ہونے ہی نہیں۔ بیوفا ہوں تو اہلِ ہوس ٹھہریں گے۔ پھر یہ تمیز اور بے تمیزی کی تلقین کیسی؟ دوسرے مصرع میں نگاہ کی ہ کے نیچے زیر نہایت نمایاں طور سے لگی ہے۔ اگر یہ کاتب صاحب کی کارگذاری ہے تو ہم انہیں معاف کئے دیتے ہیں اور اگر یہ کسرہ بھی مولنا کے تبحر کا کرشمہ ہے تو ان سے معافی مانگتے ہوئے دریافت کرتے ہیں کہ "نگاہِ الفت طراز" کیوں کیا ہو؟ جانِ کفر" نہایت پیاری ترکیب ہے اور اس سے معشوق کافر الکفر بھی بن گیا۔ مگر حاصل

کیا ہؤا۔ بحث عشق و وفا سے ہے نہ کہ دین و ایمان سے کہ اُن کے مٹا دینے والے کو جان کفر کا خطاب دے کر دل ٹھنڈا کیا جائے ۔

گلوں میں ہنسنا تو حسن پیکر [illegible] آ کے مست شباب ہونا
بھلا تم اس درجہ خود نمائی پہ خلوت آرائے راز کیوں ہو؟

گلوں میں ہنسنا نہیں سمجھ گئے۔ کہ پھولوں کی شکل میں ظاہر ہونا تو ہنسنا۔ حالانکہ اس مطلب کے لئے الفاظ کافی نہیں۔ مگر آگے چل کر "یہ حسن پیکر" کونسا چولا ہے؟ کیا باضافت مقلوبہ پیکر حسن مراد ہے؟ بہر صورت مست شباب ہونے سے خود نمائی ثابت نہیں ہوتی [illegible] شعر کی جان ہے۔ کیونکہ ایک فعل اضطراری ہے۔ دوسرا اختیاری ۔

ہمیں پہ اندوہ عشق کیسا تھ کس مہربان کی ہے مصیبت
وہ زینت [illegible] بزم عشرت خراب سوز و گداز کیوں ہو؟

یہ شعر نہایت بلیغ واقع ہؤا ہے [illegible] بے اعتنائی۔ مگر ان رموز کو ہمیں سے نکتہ رس پہنچ سکتے ہیں۔ ورنہ [illegible] قائم کر دیجیے اور اس "سوز و گداز" کے تو واللہ ہم قائل بلکہ گھائل ہو گئے [illegible] صرف ہوئی ہے۔ یعنی اگر معشوق ہمارے متعلق دریافت حال کرے تو اُسے رنج و الم ہوگا۔ مگر وہ ایسا کیوں کرنے لگا "خراب سوز و گداز ہونا" بمعنی شکار رنج و الم ہونا یہ ہے ہماری کی تباہکاری ۔

پرستش ہر ادائے خوبی تو ہمنفس کچھ ہمیں سے ہوگی
ہزار کرتا رہے وہ بے مہریاں مگر بے نیاز کیوں ہو؟

جی ہاں۔ بے نیاز کیوں ہو۔ کیوں نہ پرستش کے صلہ میں ہماری خوش آمد درآمد آؤ بھگت کرے۔ سبحان اللہ کیا اچھوتا خیال ہے!

عبث ہیں دیر و حرم کے قصے مرے سکوت فنا میں چھپ جا
جو [illegible] ہر زبان سے [illegible] وہ تیری الفت کا راز کیوں ہو؟

مرے سکوت فنا میں چھپ جا [illegible] بیٹھنے کا مقام ہے [illegible] فنا۔ الفت کا راز۔ دیوانی ہنڈیا۔ مجذوب کی بڑ۔ یہ ہیں بلاغت بلیغہ کے کرشمے [illegible] یہ تو پورا عجائب گھر ہے کہاں ہیں مدعیان فنا فی اللہیت۔ آئیں [illegible] فنا ہو جانے کی دعوت کس طرح دی جاتی ہے۔ لیکن اس بات کی ضمانت ہم نہیں کرتے کہ اس [illegible] کا راز ہر زبان سے رسوا نہ ہوگا۔ اس کے متعلق مولانا سے براہ راست خط و کتابت کیجیے ۔

کچھ اس قدر حسن سے رنگے ہیں مظاہر کائنات اس نے
ہر ایک صورت پکارتی ہے مری حقیقت مجاز کیوں ہو؟

افسوس صد افسوس! اسی تسلسل میں ہمیں یہ شعر بھی لکھنا پڑا۔ اس میں اگر کچھ قصور ہے تو صرف اس قدر کہ یہ

شاہکار کی اس تعریف میں نہیں آتا جو مولٰنا کی مزعومہ ہے۔ طبیعت چاہتی ہے کہ اس ایک شعر کے صدقہ میں جو کچھ لکھا جا چکا دھو ڈالیں۔ اور ہمارے مذاق سخن کی جو توہین باقی اشعار سے ہوئی ہے اس کے متعلق سننا شہ اٹھالیں +

مگر ہزار افسوس۔ لیجیئے فرماتے ہیں۔

کہیں سمجھ کر مجاز ہم شوق میں تمہیں کو نہ چھیڑ بیٹھیں   چھپاؤ ان جلوہ ریزیوں کو حریف دست دراز کیوں ہو؟

کیوں حضرات۔ اس "چھیڑ بیٹھیں" پر اعوذ و استغفار کے سوا اور کیا کیا جائے؟

مقطع صاف ہے دوسرے شاہکار کا مطلع ملاحظہ ہو:۔ ؎

لذتِ زندگی میں وہ دل کو مزا انہیں کا ہے   کچھ یہ مرا نصیب بھی دام بلا انہیں کا ہے

اِس میں تو لذت ہی لذت اور مزا ہی مزا ہے۔ مگر یہ "دل کو مزا انہیں کا ہے" ہے کس ملک کی زبان؟ مصرع ثانی میں آپ کا نصیب جوان کا دام بلا بنا ہے۔ تو اس سے تو امید رکھنی چاہیئے۔ کہ وہ جلد یا بدیر اس کے پھندوں میں پھنسیں اور پھر پھنسیں۔ مضمون واقعی انوکھا ہے:۔ ؎

جام شراب دیں ہمیں ڈھونڈ کے اور جبر سے   جوشِ عطا انہیں میں ہے دستِ سخا انہیں کا ہے

"ڈھونڈ کے اور جبر سے" داد طلب ہے +

لاکھ وہ خوبرو سہی سب ہے ہماری بے بسی   کرتے ہیں ظلم بیدھڑک جیسے خدا انہیں کا ہے

یعنی اگر ہم بے بس نہ ہوتے تو ایسی چپت رسید کرتے کہ بچا جی کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ اور "دھڑک" نے تو فصاحت و بلاغت کی کمر ہی توڑ دی۔ کیوں نہ ہو۔ شاہکار جو ہؤا +

بزم میں گر ہلاک شوق جلکے بجھے تو کیا ہوئے   جو ترے نام پر مٹیں جوشِ فنا انہیں کا ہے

سچ ہے ع مرنے والا تو فقط بات پہ مرجاتا ہے۔ یہ مقام فنا کی باتیں ہیں۔ دم مارنے کی گنجائش نہیں + ؎

وعدۂ لطف سے نہال کم نگہی سے پائمال   وہ بھی انہیں کا تھا کرم یہ بھی کیا انہیں کا ہے

فرہنگ۔ کم نگہی۔ یعنی دھند۔ جالا۔ رتوندھ وغیرہ امراض چشم +

جذبۂ عشق کا اثر اور مری طاقتِ نظر   جلوہ ہر ایک چیز میں پردہ کشا انہیں کا ہے

جذبۂ عشق کا اثر تو جو ہوگا سو ہوگا۔ مگر "طاقتِ نظر" بمعنی دقت نظر یا تاب نظارہ یاد رکھنے کی چیز ہے۔ دوسرے مصرع میں "پردہ کشا" کے متعلق بجز اس کے اور کیا کہا جائے۔ کہ خدا سب کا پردہ ڈھکا رکھے۔ کہیئے آمین!

ہاتھ میں زلفِ مشکبو لب پہ فسونِ آرزو — یعنی جو اُن کے سر ہوئے بختِ رسا اُنہیں کا ہے

فسونِ آرزو بمعنی حرفِ مطلب یا راز و نیاز کی باتیں یعنی ایجاد بندہ "جو اُن کے سر ہوئے" یعنی معشوق سے دست و گریبان ہوئے سواہ وا واہ! - اُن کے بختِ رسا کا کیا کہنا! اگر آج غالب مرحوم زندہ ہوتے تو اپنا یہ شعر دیوان سے نکال ڈالتے :-

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اُسکی ہیں — تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں

معشوق کے سر ہونے کی اس مرحوم کو بھی نہ سوجھی!——————

باقی دو شعر ذرا صاف ہیں +

ناظرینِ کرام شائد شاہکار کے معنی اب اچھی طرح سمجھ گئے ہوں - بس یہی کہ بے معنی الفاظ اور لایعنی تراکیب کی ایسی ملمع کاری جسے عروسِ معنی نے ٹھکرا دیا ہو +

حضرات! اس ہرزہ سرائی سے کسی کا دِل دکھانا ہرگز مقصود نہیں - نہ زیرِ بحث شاہکاروں کے فاضل مصنف سے ہمیں شرفِ نیاز حاصل ہے - جو کچھ عرض کیا گیا محض خلوصِ نیت پر مبنی ہے - ہمارے خیال میں اس قسم کی مہمل اشاعات پبلک کی کھلی توہین ہیں - ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کی چیستان نویسی آج کل نہایت سرعت کے ساتھ رواج پا رہی ہے اور اگر یہی لیل و نہار ہیں - تو وہ دِن دُور نہیں - کہ اُردو زبان گورکھ دھندا ہو کر رہ جائے گی - اور ہندوستانی کو حیوانِ ناطق کی صف سے نکل کر حیوانِ مطلق کے دوش بدوش کھڑا ہونا پڑے گا - ع پھر نہ کہنا کہ ہم نہ کہتے تھے! +

راقم ——— دراک

از بغداد ——— ۱۴ - اپریل ۱۹۳۰ء

غزل فارسی

(تبسم۔ ایم۔ اے)

دلِ مضطر چو در کنارِ من است
بر قہا خفتہ در مزارِ من است

ہر کرا از درُو ہمے نگرم
دانم البتہ رازدارِ من است

تشنۂ برقِ عافیت سوزم
ہر کجا دشنئے است یارِ من است

جادہ پیمائے منزلِ عشقم
آسماں گردِ رہگذارِ من است

قدرِ انداز تیرِ فریادم
عرش و کرسی زبوں شکارِ من است

کعبۂ عاشقاں شود روزے
ہر کجا نقشِ پائے یارِ من است

یک دلِ تست فارغ از عالم
ورنہ یک شہر غمگسارِ من است

واعظا تن زن از فسانۂ خلد
شاہدِ شوخ در کنارِ من است

بر درِ کیستم جبیں فرسائے
جبۂ ماہ داغ دارِ من است

تا بیادِ تو اشکبار شدم
گریۂ ابر شرمسارِ من است

از عملہائے ما چہ مے خیزد
عفو از لطفِ کردگارِ من است

طائرِ نخلِ سدرہ و طوبیٰ
نغمہ پیرائے شاخسارِ من است

می شناسم دلِ تبسم را
در غمِ عشق رازدارِ من است

(مصر قدیم کا ایک افسانہ)

(ترجمہ - از سید حسن متعلم بی - اے کلاس پٹنہ کالج پٹنہ)

شفقتاح - شاہی کتبہ نویس محل کے اندر اپنے خاص کمرہ میں بیٹھا ہوا خاندان فراعنہ کے سب سے جلیل القدر بادشاہ طاح دوم کے عہد سلطنت کی تواریخ مرتب کر رہا تھا - اتنے میں ایک شاہی قاصد نے کمرہ میں داخل ہو کر بادشاہ کی طلبی کی خبر سنائی بادشاہ شفقتاح کی گوناگون خوبیوں کی وجہ سے اُس کی بہت قدر کرتا تھا - اور غلام و آقا کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے "طاح" حد درجہ کا ظالم و بے رحم تھا - روز روز کے کثیر التعداد واقعات قتل ایک انسان کو اُس سے خائف و متنفر بنا دینے کے لئے کافی تھے - لیکن ان واقعات کی طرف شفقتاح نے کبھی بھی دھیان نہ دیا - وہ اپنے دل میں کہتا "مجھے بادشاہ کے جور و ستم سے کیا سروکار - اور اگر سروکار بھی ہو تو میرے بس ہی میں کیا ہے - بھلا فرعون مصر کے خلاف دم مارنے کی کس کو مجال ہو سکتی ہے" اپنے متعلق اُسے اطمینان کلی حاصل تھا - کیوں کہ اُس کے ساتھ بادشاہ کا سلوک دوستانہ تھا - اور چونکہ وہ تمام کتبہ نویسوں کا سردار تھا - اس کو یقین تھا کہ بادشاہ میری ہلاکت کی طرف قدم نہیں اُٹھا سکتا - کیونکہ اس کے مرجانے سے بادشاہ کا بہت ہرج ہو جاتا - لہذا جب قاصد نے آ کر طلبی کی خبر سنائی تو شفقتاح ذرا بھی ہراساں نہیں ہوا - اگر اس کی بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو ڈر کے مارے اس کا بُرا حال ہو جاتا اور سوچنے لگتا کہ کل صبح وہ طلوع آفتاب کا منظر دیکھنے کے لئے دنیا پر زندہ رہے گا یا نہیں - خوف و تردد کی بجائے شفقتاح نے نہایت اطمینان کے ساتھ آخری جملہ کی کتابت کی اور پھر اُٹھ کر قاصد کے ساتھ ہو لیا +

جس وقت وہ شاہی خلوت خانہ میں داخل ہوا بادشاہ بالکل تنہا تھا - اُس نے آگے بڑھ کر اپنی پیشانی زمین پر ٹیک دی اور رسم کے مطابق تعظیم بجا کر "بادشاہ زندہ باد" کا ایک نعرہ لگایا +

"**شفقتاح**" بادشاہ نے اس کی جانب دیکھ کر کہا "میں اس وقت تجھ سے ایک اہم کام لینا چاہتا ہوں - اس کام کو تجھ سے بڑھ کر کوئی انجام نہیں دے سکتا" +

"**عالیجاہ** حضور اپنی خواہش کا اظہار فرمائیں - میں تعمیل کے لئے بسر و چشم موجود ہوں"

بادشاہ نے آنکھیں کتبہ نویس کے چہرے پر گڑا دیں - اس کے لب پر ایک تبسم تھا - یہ تبسم دوسروں کے

حق میں زہر ہلاہل کا حکم رکھتا تھا مگر شفتاح اس سے بالکل بے فکر تھا۔ بادشاہ نے دفعتہً پوچھا "تمہیں میرے خزانہ گھر کی بھی خبر ہے؟"

عالیجاہ کا خزانہ گھر! شفتاح نے ہکلا کر کہا۔ وہ حیرت زدہ ہو رہا تھا۔ آخر اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "جی ہاں۔ ضرور۔ عالیجاہ کا خزانہ گھر ملک مصر کی ساری زمین اور وہ ممالک ہیں جن کے باشندوں پر مصر کا قانون چلتا ہے"۔

بادشاہ پھر مسکرایا۔ "شفتاح۔ تو ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن میرا ایک عجیب خزانہ گھر بھی ہے جس کا راز صرف مجھ کو معلوم ہے"۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اُس نے پھر دہرایا۔ "ہاں صرف مجھ کو" میرے سوا کسی کو بھی اس راز کا علم نہیں"۔ اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھ کر کہا "کہ میرا خزانہ کہاں مدفون ہے۔ میں تجھے اس اہم راز سے آگاہ کرتا ہوں۔ تاکہ تو اس راز کو لکھ ڈالے۔ پیپرس (بھوج پتر) پر نہیں جس کا لکھا ایک ہی رات میں ملیا میٹ ہو جاتا ہے بلکہ مٹی کی تختیوں پر جو سالہا سال تک باقی رہے۔ میں ابھی تجھے اس راز سے آگاہ کرتا ہوں اور تو اُسے اپنی صنعت کے ذریعے چیدہ چیدہ الفاظ لوح پر منتقل کر ڈال"۔

شفتاح ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے یکے بعد دیگرے اُسے بتلایا کہ کس طرح اس نے بے شمار زر و جواہر جمع کئے اس اندوختہ کو اُس نے کہاں مدفون کیا ہے اور کیوں کر ایک انسان کی وہاں تک رسائی ہو سکتی ہے اس نے اخفاء راز کی وجہ یہ بتلائی کہ وہ نہیں چاہتا ہے کہ اُس کے زمانہ حیات میں کوئی شخص۔ حتیٰ کہ اُس کا بیٹا بھی اس راز سے باخبر ہونے پائے۔ اس لئے اُس نے اس راز کو تختیوں پر لکھوا کر رکھنا چاہا تاکہ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ان تختیوں کو پڑھ کر باپ کے دفینہ کا پتہ لگائے اور اُس کو مصرف میں لائے۔

شفتاح کو بادشاہ کا ہمراز بننے پر بڑا فخر ہو رہا تھا۔ وہ نہایت ہی تندہی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ بادشاہ نزدیک بیٹھا ہوا چپ چاپ اُس کو کنکھیوں سے دیکھتا اور مسکراتا جاتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ ایک تلخ مسکراہٹ تھی جس کو شفتاح اس وقت محسوس کرنے سے معذور تھا۔ آخر کار کتابت پوری ہو گئی اور مٹی کی ایک تختی جس کی صاف صاف تحریر شفتاح کی چابکدستی کی داد دے رہی تھی بادشاہ کے سامنے میز پر پڑی تھی۔

"ایک اور ضروری کام رہ گیا ہے" بادشاہ نے ایک بار تختی کا معائنہ کر کے کہا "اور تب میری غرض پوری ہو جائے گی۔ میں نے ابھی تجھ سے کہا کہ میرے سوا کوئی بھی اس اہم راز سے واقف نہیں۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج تک خزانہ محفوظ نہ رہ سکتا۔ جب میں خزانہ گھر کی تعمیر کرا رہا تھا تو مجھے معمار و مزدور لگانے پڑے تھے ان کو اس راز کی خبر لگ گئی

تھی۔ لیکن وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے۔ اور اب ہم دو آدمیوں کے سوا تیسرا اس بھید سے واقف نہیں" بادشاہ ایک معنی خیز طریقہ پر مسکرایا اور اپنی نگاہیں شفتاح کے چہرے پر جما دیں +

جیسے اندھیری رات میں بجلی کی چمک سے اجالا ہو جاتا ہے اور اس روشنی میں ایک تھکا ماندہ مسافر یہ دیکھ کر کہ وہ ایک عمیق غار کے کنارے کھڑا ہے۔ بدحواس ہو جاتا ہے ویسے ہی بادشاہ کی اس گفتگو سے شفتاح پر جس کے دل میں ابھی تک کسی قسم کا خوف و ہراس نہ تھا۔ ساری حقیقت روشن ہو گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو موت کے غار کے کنارے کھڑا پایا۔ جس سے چھٹکارا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ وہ بادشاہ کی اس سزائے موت کا شکار ہو رہا تھا۔ جس کی بدولت ہزاروں معصوم انسان ملک عدم کو سدھار چکے تھے۔ وہ شدت ہراس سے زرد پڑ گیا +

طاح نے ایک چاندی کی گھنٹی جو سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی بجائی۔ فی الفور نصف درجن غلام کمرے میں داخل ہو گئے بادشاہ نے کچھ کہے بغیر شفتاح کی طرف اشارہ کیا وہ جانتے تھے کہ شفتاح کا بازو تھام لیں کہ معاً کسی خیال کے پیدا ہوتے ہی اُس نے جلدی سے لپک کر میز سے لوح اُٹھالی اور اپنے آہنی قلم کی ایک ضرب سے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کے بعد وہ ہاتھ باندھ کر غلاموں کی طرف مڑا +

لوح کو ٹوٹتے دیکھ کر بادشاہ غضبناک ہو گیا۔ انتہائے غضب میں اُس کی آواز حلق میں پھنسی پھنسی معلوم ہوتی تھی۔ اسی آواز میں اُس نے رُک رُک کر شفتاح کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ کتابت کرے +

لیکن شفتاح بت بنا کھڑا رہا۔ موت کی صورت اس کی آنکھوں تلے پھر رہی تھی۔ اپنی موت کا یقین ہوتے ہی وہ بادشاہ کے حکموں کی خلاف ورزی کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ شفتاح کی اس جرأت پر بادشاہ کا غصہ اور بھڑک اٹھا۔ اس نے اپنی مہیب آواز میں کڑک کر کہا "لے جاؤ۔ کال کوٹھڑی میں لے جاؤ اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کرو۔ تاکہ وہ میرا حکم ماننے کو تیار ہو جائے" +

غلام شفتاح کو کشاں کشاں لے چلے۔ اُس کی آدھی روح کال کوٹھڑی کے نام ہی سے فنا ہو چکی تھی وہ رستہ بھر سوچتا جاتا تھا کہ اس سزا اور خاصکر سزائے موت سے کیونکر نجات مل سکتی ہے۔ جس وقت وہ کال کوٹھڑی کے قریب پہنچا وہ یک بیک چلتے چلتے رُک گیا اور پکار اُٹھا "اے غلامو بس رحم کرو۔ میں بادشاہ کے حکم کی تعمیل کیلئے موجود ہوں"

اُس کے ہونے والے جلاد مایوس سے ہو گئے۔ ان کی زبانیں طاح نے بدگوئی سے بچنے کے لئے بہت قبل کٹوا ڈالی تھیں۔ اِس لئے وہ بول تو نہ سکتے تھے۔ مجبوراً شفتاح کو پھر بادشاہ کے سامنے لے آئے +

طاح نے چلا کر پوچھا "کیا تو تیار ہے؟" کیا؟

"بسر وچشم - عالی جاہ" شفقاح نے جواب دیا "کال کوٹھری کے نام ہی سے میری روح پرواز کرتی۔ میں تیرے فتویٰ کے خلاف نہیں کرسکتا۔ راز کو پھر ایک بار لکھ دیتا ہوں۔ اس کے بعد مرنے کو تیار ہوں"۔

یہ کہہ کر شفقاح نے ایک دوسری تختی اُٹھالی اور اُسکو چکنا کر کے ایک گھنٹہ تک راز کو از سرِ نو لکھتا رہا۔ تیار ہونے پر اس نے تختی بادشاہ کے ہاتھ میں دے دی۔ اور حسرت بھری نظروں سے دیکھکر بولا "اب میں مرنے کو تیار ہوں"۔

طاح کا غصّہ کچھ فرو ہو چکا تھا۔ "شفقاح" اُس نے کہا "میری عین خوشی تھی کہ تو بچ جاتا۔ لیکن کیا کروں۔ تو خزانہ کا بھید جانتا ہے۔ تجھ کو بچانا میری قدرت سے باہر ہے۔ لہٰذا مرنے کیلئے تیار ہو جا۔ لیکن میں تیری موت خوشگوار کردوں گا۔ اتنی خوشگوار جیسے صبح کی نیند"۔

بادشاہ نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ شفقاح کو معبد کے نیچے والے تہ خانہ میں بند کردیں۔ تاکہ وہ فاقہ کشی کی تکلیف سے مرجائے۔ اور اس تہ خانے میں ایک پیالہ زہر سے لبریز کر کے رکھدیں۔

"شفقاح" اس نے کتبہ نویس سے مخاطب ہو کر کہا "جب تجھ کو بھوک اور پیاس کی شدید تکلیف محسوس ہونے لگے تو زہر کا پیالہ اُٹھا کر پی لینا۔ اس وقت موت تیرے لئے ایک خوشگوار خواب بن جائے گی۔ ہاں تیرے لئے تہ خانے کے اندر مٹی کی تختیاں بھی رکھ دی جائیں گی۔ جب تک بھوک اور پیاس کی تکلیف کو برداشت کرسکے اُن تختیوں پر مصر کی تواریخ کی کتابت جاری رکھنا۔ مجھے افسوس ہے کہ آج میں اس اہم کام میں مخل ہوا"۔

اس کے بعد زبان بریدہ غلاموں نے شفقاح کو شاہی حکم کے مطابق لیجا کر تہ خانے میں بند کردیا اسوقت سے پھر مصر میں کسی نے شفقاح کا نام تک بھی نہیں سنا۔ عرصہ دراز کے بعد جب طاح دوم کے مرنے پر اس کا بیٹا تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے کتبہ نویسوں کو بلوا کر لوح کی عبارت پڑھوانا چاہا۔ مگر وہاں چند مہمل اشعار، مذاقیہ جملوں اور طاح کے نام شاید گالیوں کے سوا اور کوئی ایسی تحریر نہ تھی جو خزانہ گھر تک رہنمائی کرسکتی۔ جملے بھی ایسے خبط و بے ربط تھے کہ اُن سے معنی نکالنا ناممکن تھا۔ اس بادشاہ نے دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے چند کتبہ نویسوں کو مروا بھی ڈالا۔ مگر تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور فرعون کے خزانہ گھر کا راز ہمیشہ کیلئے پوشیدہ رہ گیا۔

(۲)

پروفیسر شوکت اپنی لائبریری میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میز پر متعدد مٹی کی تختیاں پڑی ہوئی تھیں

اِن تختیوں کے دو ڈھصبر تھے ایک اس کی بائیں جانب اور دوسرا اُس کی دائیں طرف۔ اور اس کے ٹھیک سامنے ایک بڑی مستطیل تختی رکھی ہوئی تھی۔ اور پاس ہی ایک تختہ کا غذ رکھا ہوا۔ نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ اس تختی پر جس کو پروفیسر نہایت غور کے ساتھ اپنی سنہری کمانی والی عینک کے اندر سے مطالعہ کر رہا تھا۔ عجیب و غریب نقوش واشکال بنے ہوئے تھے۔ جس کو مصریات کا طالب علم بتا سکتا تھا کہ یہ قدیم مصری حروف سے لکھی ہوئی ایک تحریر ہے +

پروفیسر شوکت مصریات کا بڑا ماہر گنا جاتا تھا۔ اس کی شہرت کا سکہ تمام عالم میں جما ہوا تھا۔ ممی کی جستجو اس کا خاص مشغلہ تھا۔ اور اس سلسلہ میں وہ ملک مصر کے جملہ اہرام پر یکے بعد دیگرے چڑھ چکا تھا۔ اور اس نے اپنی عینک لگا لگا کر مصر قدیم کی ان پراسرار یادگاروں کو بخوبی مطالعہ کیا تھا +

پروفیسر شوکت کی شہرت کو دیکھ دیکھ کر اس کے بہت سے حریف بھی پیدا ہو گئے تھے۔ بلکہ ایک حریف نے اپنے سفر تحقیقات کے سلسلے میں ایک قدیم مصری معبد میں جو ریگستان میں ریگ کے اندر مدفون تھا ایک عجیب انکشاف کیا تھا۔ اس معبد میں وہ ایک راستہ سے ایک تہ خانہ کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ جہاں اس نے ایک انسانی ڈھیر پڑا دیکھا اس ڈھیر نے اپنی استخوانی انگلیوں میں ایک آہنی قلم پکڑ رکھا تھا۔ اور اس کے اس پاس متعدد مٹی کی تختیاں مصری خطوط سے بھری ہوئی پڑی تھیں۔ چاندی کا ایک خالی پیالہ بھی اس تہ خانہ میں پڑا ہوا ملا تھا +

ان تختیوں کو حفاظت سے بکس میں بند کر کے تاکہ ان کی تحریروں کو نقصان نہ پہنچے۔ پروفیسر شوکت کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ ان تحریروں کو پڑھنے اور ترجمہ کرنے میں شوکت کو انتہائی ذہانت وذکاوت سے کام لینا پڑا تھا۔ آج صبح سے بشرے سے پتہ چل رہا تھا کہ اُس نے کوئی غیر معمولی چیز دریافت کی ہے۔ وہ بار بار سامنے پڑی ہوئی تختی پر کی لکھی ہوئی تحریر کو پڑھتا اور سادہ کاغذ پر اُردو میں لکھتا جاتا تھا۔ جب اُس کا لکھنا ختم ہو گیا تو وہ اپنی کرسی پر پیچھے کی جانب ٹک گیا اور کاغذ کو اُٹھا کر ذرا آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کا ترجمہ یہ تھا:۔

"سلام اس انسان پر جو میرا پیغام پڑھے چاہے وہ کوئی ہو۔ میں شاہی کتبہ نویس شنفتاح ہوں، اور عنقریب فرشتۂ اجل سے دوچار ہونے والا ہوں۔ میں مردوں کی دنیا میں جا رہا ہوں کیونکہ فرعون نے کسی کو بھی زندوں کی دنیا میں نہیں چھوڑا۔ خداوند اوسیرس مجھ پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ ہاں تو میں شنفتاح ہوں جس پر فرعون مصر نے موت کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ میں تجھے فرعون کے خزانہ گھر کا راز بتلاتا ہوں۔ شہر سمناہ سے تقریباً پچاس میل مشرق کی جانب ایک عظیم الشان ہرم

ہے - اس ہرم کے اندر فرعون کا بیش بہا خزانہ مدفون ہے - خزانہ تک پہنچنے کے لئے بہت سے دروازے ہیں - لیکن ان دروازوں میں سے صرف ایک ہی دروازہ ایسا ہے جس سے انسان سلامتی کے ساتھ اندر داخل ہوسکتا ہے باقی دروازے مرگ ناگہانی ہاں فوری موت کے دروازے ہیں بادشاہ نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ بدنیت اور چور اپنے کئے کی سزا پائیں بس ایک ہی دروازہ سلامتی کا دروازہ ہے - اس دروازہ کے پتہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص چھ گھڑی رات گذرے ہرم کے اندر روشندانوں سے آسمان کی جانب دیکھے تو ایک روشندان سے اس کو قطب ستارہ چمکتا ہوا نظر آئے گا - اس روشندان کے نیچے مطلوبہ دروازہ پوشیدہ ہے بدمعاشوں کو فریب دینے کے لئے بہت سے روشندان بنے ہوئے ہیں - مگر قطب ستارہ صرف ایک روشندان سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے - فرعون سے یہ میرا انتقام ہے - جا اے اجنبی جا اور فرعون کی دولت کو قبضہ میں کر - خدا تیری مدد کرے"۔

"فرعون کا خزانہ!" شوکت نے استعجاب کرتے ہوئے دبی زبان سے کہا "خدایا! کیا یہ ممکن ہے"؟ وہ بے اختیار اُٹھ کھڑا ہوا اور حالت اضطراب میں کمرے کے اندر ٹہلنے لگا - اُس وقت گھڑیال نے ایک بجایا کلاک کی آواز رکتے ہی اُس کا ملازم طشت میں اُس کا کھانا لئے ہوئے داخل ہوا - یہ ملازم مصری تھا اور شوکت نے اپنے سفر مشرق کے دوران میں ملازم رکھ لیا تھا - ملازم طشت لئے ہوئے میز کی طرف بڑھا اور کچھ دیر تک رکابیوں اور قابوں کو میز پر سجاتا رہا - سجانے میں اُس نے معمول سے زیادہ دیر لگا دی حتٰے کہ شوکت اس تاخیر سے گھبرا اٹھا اور بولا "بس حسن - رہنے دو - کافی ہے"۔

حسن ایک فرشی سلام کر کے کمرے سے نکل گیا۔

(۲)

جہاں تک نظر کام کرتی تھی ریت ہی ریت تھی - یہ سرزمین افریقہ کا صحرائے اعظم تھی - آفتاب پوری تمازت کے ساتھ آسمان پر جلوہ گر تھا - اُس کی گرم گرم شعاعیں ریت کے ذرّوں سے منعکس ہو رہی تھیں - ناگہاں افق مشرق پر ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوا - اس کے بعد ایک دوسرا اور پھر تیسرا نقطہ بھی نظر آیا - یہ تینوں نقطے حرکت کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے - اور ایک ہی سیدھ میں تھے - آدھ گھنٹہ کے بعد ان تینوں نقطوں نے تین سانڈنیوں کی شکل اختیار کر لی - جو بہت تیزی سے گام زن تھیں سب سے اگلی سانڈنی پر ایک مصری سوار تھا - اور اسکے ہاتھ میں باقی دونوں کی مہار تھی یہ مصری

سفید سوتی لباس میں ملبوس تھا +

جیسے جیسے ریگستان کی جھلسا دینے والی گرمی بڑھتی گئی - سانڈنیوں کا یہ قافلہ بھی صحرا کے اندر آگے بڑھتا گیا - قریب شام سامنے کی طرف ایک ہرم کی ایک عظیم الشان عمارت دکھلائی دی - مصری نے اس ہرم کی طرف اپنی سانڈنی کا رخ پھیر دیا، اور ایک طویل سفر کے بعد اُس نے اس ہرم کے دامن میں پہنچکر دم لیا - جو صدیوں سے اِس لق و دق صحرا میں کھڑا ہُوا فراعنۂ مصر کی یاد دلاتا رہا تھا - مصری اپنی سانڈنی سے اُتر پڑا اور اپنے جانوروں کو غذا دے کر خود کھانے کی تیاری کرنے لگا - کھانا کے تیار ہونے تک رات آگئی - آسمان پر تارے چھٹک گئے اور رات کی خنک و خوشگوار ہوا ریگستان میں بہنے لگی +

کھانا کھا کر مصری اٹھ کھڑا ہوُا - اُس نے ایک متجسّسانہ نگاہ ہرم پر ڈالی - ہرم کا باریک سرا رات کے نیلگون آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور تاروں کے درمیان ایک سیاہ سا خلا پیدا کر رہا تھا - وہ ہرم کے چاروں طرف گھومنے لگا - اکثر وہ اُس کا بغور معائنہ کرنے کے لئے ٹھہر جاتا - یہ پُر اسرار قدیم عمارت انسانی آبادی سے کوسوں دُور ریگستان کی ہولناک فضا میں تنہا کھڑی تھی - اس کے دیکھنے سے انسان کے دل پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی - اور عجیب و غریب خیالات دماغ میں آنے لگتے تھے - "کاش مجھے کچھ اور زیادہ وقت ملتا" اس نے ایک بار ہرم کی طرف دیکھکر کہا "تو میں اپنا کام کل صبح تک کے لئے ملتوی کر رکھتا - مگر لوگ میرا تعاقب کر رہے ہوں گے - اب دیر کرنے کا بالکل موقع نہیں" +

یہ کہکر وہ جلد جلد ہرم کے زینوں کو طے کرنے لگا - نصف بلندی پر پہنچکر وہ تھم گیا - یہاں ایک دروازہ بنا ہوُا تھا جس سے آدمی ہرم کے اندر داخل ہو سکتا تھا - یہ دروازہ بند تھا - اور صحرا کی ریت اُڑ اُڑ کر اُس کے سامنے جمع ہو گئی تھی جس سے داخلہ کی راہ مسدود ہو گئی تھی - مصری نے ایک کارتوس کے ذریعے دروازہ کو پاش پاش کر دیا - کارتوس کی بلند آواز نے صحرا کی خاموش فضا میں ایک ہولناک اثر پیدا کر دیا - لیکن اس اثر سے بالکل نہ متاثر ہو کر اُس نے اندر کی طرف جھانکا - اندر اندھیرا گھپ تھا - وہ جھجکا - وہ اپنے ساتھ ایک لالٹین لایا تھا - اسکو روشن کرکے اس نے اندر کی طرف روشنی ڈالی - اس روشنی کی مدد سے وہ فرعون کی اس عظیم الشان یادگار کے اندر داخل ہو کر آگے بڑھا - چند قدم چلنے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو ایک تنگ کمرے میں پایا - یہ کمرہ ساخت میں مربع تھا اور چاروں طرف سے بند تھا - اس میں اس دروازے کے سوا جس سے وہ ابھی داخل ہوُا تھا اور کوئی دروازہ نظر نہ آتا تھا فرش سے تقریباً دس فٹ کی بلندی پر متعدد چھوٹے چھوٹے روشندان بنے ہوئے تھے جن سے تازی ہوا کے جھونکے

آرہے تھے، یہ روشندان بھی شکل میں مربع تھے اور ہر دیوار میں دو دو تھے +

اِن روشندانوں سے مصری آسمان دیکھ سکتا تھا جس میں تارے جھلملا رہے تھے - چند لمحہ تامل کرنے کے بعد وہ اپنی لالٹین اونچی کرکے دیواروں کا بغور معائنہ کرنے لگا - بظاہر دیوار بالکل مستحکم تھی - اور کوئی بھی سوراخ معلوم نہ ہوتا تھا - لیکن چند منٹ کے بعد مصری نے اپنے بازؤں کو ایک خاص انداز سے جنبش دی +

"سمنٹ سے پلاستر کر دیا ہے" وہ خود بخود بڑبڑایا - "تاکہ دروازے نظر سے پوشیدہ ہو جائیں - مگر الحمد للہ کہ بیچارے شفتاح نے ساری باتیں من وعن لکھدیں اور پروفیسر بھی قدیم زبانوں کا ماہر ہے - کبھی کوئی چوک نہیں ہوسکتی جس روشندان سے رات کی اس ساعت میں قطب ستارہ چمکتا نظر آئیگا - اُسی کے نیچے تو وہ دروازہ نہاں ہے جو فرعون کے خزانہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے +

اب اُس نے روشندانوں میں سے جو شمالی دیوار میں بنے ہوتے تھے ایک کی طرف رُخ کیا - دائیں طرف کے روشندان سے قطب ستارہ کی روشنی کمرے میں آرہی تھی - مصری نے اپنی کمر سے ایک رُکھانی اور ایک ہتھوڑی نکالی جنہیں وہ اپنے ساتھ لیتا آیا تھا - فوراً ہی وہ خاموش کمرہ اُن ضربوں کی آواز سے گونجنے لگا جو مصری پے بہ پے دیوار کے پلستر پر لگا رہا تھا - پلاستر کافی موٹا تھا - اس کے بڑے بڑے ٹکڑے دیوار سے چھوٹ چھوٹ کر فرش پر گر رہے تھے - آخر چند منٹ کی محنت کے بعد ایک پوشیدہ دروازہ نمودار ہوا - جو بند تھا +

مصری نے اس دروازہ کو بھی کارتوس کی مدد سے پاش پاش کر دیا - یہ وہ دروازہ تھا جو پچاس صدی سے بند تھا - وہ باہر کھڑا ہوا فرطِ جوش سے کانپ رہا تھا - آخر اُس نے اپنی لالٹین اُٹھالی اور اس کی روشنی ڈال کر اندر کی طرف نگاہ کی - اندر ایک مختصر سا تنگ راستہ تھا جو آگے جا کر زاویہ قائمہ بناتا ہوا ایک طرف کو مڑ جاتا تھا یہ راستہ بالکل صاف تھا - لیکن موڑ کی اس طرف کیا تھا؟ وہ یہ جاننا چاہتا تھا - چنانچہ وہ تھوڑی دیر تک لالٹین اونچی کئے ہوئے بغور دیکھتا رہا، لیکن وہاں سے کوئی چیز نظر نہ آئی جو اس کو خطرہ سے مطمئن کر دیتی - شفتاح کے الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے" خزانہ گھر کے اندر داخل ہونے کے لئے کئی دروازے ہیں - لیکن ان میں صرف ایک ہی ایسا ہے جس سے انسان سلامتی کے ساتھ داخل ہوسکتا ہے، باقی دروازے ناگہانی اور فوری موت کے دروازے ہیں"۔

وہ کھڑا سوچ رہا تھا، اس کی غلطی کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ ذراسی چوک بھی جان لیوا ثابت ہوگی - لیکن قطب شمالی روشندان سے چمکتا ہوا صاف صاف نظر آرہا تھا - نہیں یقیناً کوئی غلطی نہیں ہوسکتی" رات کی خنک ہوا روشندانوں سے آرہی تھی - خاموشی ہولناک تھی اور تنہائی وحشت خیز، اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیتے جی دفن کر دیا گیا ہے ہرم اس کا مقبرہ ہے اور اُس کے

چاروں طرف پھیلا ہوا ریگستان ابدیت کا منظر پیش کر رہا ہے +

وہ کھڑا ہوا سوچتا اور لرزتا تھا - اب اُسے کیا کرنا چاہیئے تھا؟ باہر نکل کر صبح کا انتظار کرے؟ لیکن اس کے تعاقب کرنے والے سراغ لگاتے ہوئے نزدیک آ چکے ہوں گے - صبح تک بہت ممکن تھا کہ ہرم تک آ پہونچتے، اگر وہ دولتمند بننا چاہتا ہے تو فی الفور کارروائی شروع کر دینا چاہیئے +

"ہر لمحہ سونے سے وزنی ہو رہا ہے" اُسے ایک فیصلہ کن انداز میں اپنے کو مخاطب کر کے کہا - اگر میں اُس کو ہاتھ سے نکل جانے دوں گا تو دولت بھی ہاتھ سے نکل جائیگی" +

(۴)

دوسری صبح کو گرم آفتاب چمکتا ہوا طلوع ہوا - اور ریگستان کا جھلسا دینے والا دن پھر شروع ہو گیا - ہرم کا سیاہ سایہ ریت پر پڑ رہا تھا - پچاس کوس کے حلقہ میں صرف یہی ایک سایہ دار چیز تھی +

ٹھیک دوپہر کے وقت اونٹوں کا ایک قافلہ صحرائے اعظم میں گامزن نظر [illegible] ہنیوں کے قافلہ کی طرح ہرم کی جانب رواں تھا - سب سے اگلے اونٹ پر پروفیسر شوکت اپنی سخت اور پتلی ناک پر سرنے کی کمانی والا چشمہ چڑھائے بیٹھا ہوا تھا - کئی سائینس دان چند مصری پولیس اور ایک پولیس افسر دوسرے اونٹوں پر سوار ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے سانڈنیوں پر نظر پڑتے ہی اس قافلہ نے اپنے اونٹوں کی رفتار تیز کر دی +

"وہ ہم لوگوں سے بہت آگے نکل گیا ہے" پروفیسر نے پولیس افسر کو مخاطب کر کے کہا -

جی ہاں، بجا ہے،" افسر نے اپنی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا: "لیکن ہم لوگ وقت پر آ پہونچے ہیں - واپسی سفر میں وہ ہم لوگوں سے آگے نہیں نکل سکتا - اُسے ہمارے ساتھ ہی لوٹنا ہو گا" +

ہرم کے پاس پہنچکر پولیس کے لوگ الگ الگ جماعت میں منقسم ہو کر ہرم کے چاروں طرف گشت کرنے لگے کہ راہ فرار مسدود ہو جائے، پروفیسر، افسر اور سائینس دان حضرات ہرم کی سیڑھیوں کو طے کر کے اور اُسی دروازے سے داخل ہو کر جس سے کل مصری داخل ہو چکا تھا - مربع کمرے میں پہونچے - یہاں ان لوگوں نے ایک مجلس مشورت منعقد کی کمرے میں انہیں جو چیز نظر آئی وہ پلستر کے ٹکڑے تھے جنہیں گذشتہ رات مصری نے اپنے اوزارت [illegible] اُکھاڑا تھا - دروازہ بند تھا - کسی نے بھی اسکے کھولنے کی جرأت نہ کی، لوح کی خونناک [illegible] کے بعد بھلا اتنی ہمت

"حضرات" پروفیسر نے ایک سنجیدہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ ہم لوگ ایک ناواقف سرزمین پر ہیں۔ اس زمانہ ماضی کی جو جوروستم کے واقعات سے پر ہے ایک یادگار کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ہمیں خوب ہوشیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارا ہر غلط قدم فوری موت کا باعث ہوسکتا ہے۔ ہم لوگوں کو رات کے ہونے تک انتظار کرنا چاہیئے۔ اس وقت ہم ستاروں کو دیکھ کر پتہ لگاسکیں گے کہ کون دروازہ ہماری صحیح رہنمائی کرسکتا ہے۔ اس اثناء میں ہمیں اس دروازہ کی بھی دیکھ بھال کرنا چاہیئے۔ جسے معلوم ہوتا ہے کہ حسن نے اپنے لئے منتخب کیا ہے"۔

گھنٹے پر گھنٹے گذرتے گئے۔ یہاں تک کہ شام ہونے کو آئی۔ مصر کی مدہم تاریکی تمام فضائے بسیط پر مسلط ہوگئی۔ آسمان میں خاموش و ساکت ستارے جگمگانے لگے اس وقت پروفیسر نے روشندانوں سے یکے بعد دیگرے جھانکنا شروع کیا۔ جس دروازے کو حسن نے کھولا تھا اُس کے اوپر والے روشندان سے قطب شمالی چمکتا ہوا صاف نظر آرہا تھا شوکت چند لمحوں تک دروازہ کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھتا رہا۔ قطب شمالی پورے آب و تاب کے ساتھ آسمان پر جلوہ گر تھا"۔

صرف ایک ہی روشندان سے قطب شمالی چمکتا ہوا نظر آتا ہے" شوکت نے اپنے حافظہ سے کام لیا۔ لوح کے الفاظ کو دہرایا۔ کیوں کہ لوح کے خبردار کرنیوالے الفاظ اس کے دماغ پر مرتسم ہوگئے تھے" تو بس یہی صحیح دروازہ ہے"۔ اس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھکر کہا" حسن یقیناً اِس کے اندر فرعون کے خزانہ کے درمیان پوشیدہ ہے، دیکھو قطب شمالی دروازے کے اوپر والے روشندان سے صاف دکھائی دیتا ہے آؤ دروازہ کو کھول کر اندر داخل ہوں"۔

ایک ہلکا سا دھکا کھاتے ہی دروازہ بالکل کھل گیا، دو تین لالٹینوں کی روشنی سے جس کو اس چھوٹی سی جماعت کے چند ممبر ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھے" تاریک رستہ روشن ہوگیا پروفیسر نے اندر کی طرف جھانک کر دیکھا۔ لیکن وہاں کچھ نہ تھا"۔

"یہ رستہ چند قدم تک ہرم کے اندر چلا گیا ہے" اُس نے اپنے ساتھیوں سے اطلاعاً کہا" اور تب یکایک بائیں طرف کو مڑ گیا ہے۔ رستہ بالکل صاف معلوم ہوتا ہے۔ آیئے پتہ لگائیں کہ یہ رستہ کدھر کو جاتا ہے"۔

ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں ایک ریوالور تھا۔ شوکت نہایت ہوشیاری اور آہستگی سے اندر کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کے ساتھی روانہ ہوئے۔ موڑ پر پہنچکر وہ سب بائیں طرف مڑے، دفعتہً خوف و دہشت کی ایک بلند چیخ پروفیسر کی زبان سے نکل گئی اور وہ لڑکھڑا کر اپنے پیچھے آنے والے ساتھیوں پر گرا چاہتا تھا۔ اُس کے ہاتھوں سے لالٹین چھوٹ کر زمین پر گر پڑی اور بجھ گئی۔ ایک روشنی کے گم ہوجانے سے دھندلاہٹ میں اضافہ

ہوگیا تھا +

پروفیسر کے ساتھی جنہیں اس کی کچھ خبر نہ تھی کہ شوکت نے کیا دیکھا۔ اور جن کا دماغ اس سراپا حیرت ناک مہم کی پراسرار کیفیت، رات کے تاثرات، وحشت انگیز تنہائی اور غیر محفوظ مقام کے خیال سے پہلے ہی وحشت زدہ ہو رہا تھا ایک ذری ہیبت سے کانپ گئے۔ لیکن شوکت نے بہت جلد ان الفاظ میں ان کی تشفی کر دی +

"بھائی! مجھے معاف کرنا، کہ میں نے تمہیں دہشت زدہ کر دیا۔ لیکن موقعہ کی کہانی کیفیت نے مجھے ہراسان کر دیا۔ ذرا گوشہ سے پرے ہٹ کر دیکھو، وہاں ایک ایسا خوفناک منظر ہے جس سے یکبارگی دوچار ہو جانے سے انسان کا ہیبت زدہ ہو جانا یقینی امر ہے" +

سب کی نظریں ایک ساتھ اُٹھ گئیں، رستہ چند قدم آگے جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ آگے پتھر کی ایک مضبوط دیوار تھی اور اُسی کے نزدیک ایک آدمی مرا پڑا تھا، اُس کی لاش ٹھنڈی اور سخت ہو چکی تھی +

"یہ بیچارا حسن ہے، جہاں وہ خزانہ کی جستجو میں آیا ہوا تھا۔ وہاں اُسے فرشتۂ اجل سے دوچار ہونا پڑا۔ آج پانچ ہزار برس کے بعد بادشاہ طاح دوم نے ایک نیا شکار کیا" +

پولیس افسر کا خوف لاش دیکھ کر گم ہوگیا تھا اور چونکہ کوئی ما فوق الفطرت بات نہ تھی اس لئے ڈر کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ وہ لاش کا معائنہ کرنے کے لئے جُھک گیا +

"اوہو" اُس نے کہا "اُسے چھرے سے زخمی کیا گیا ہے جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے ایک پہلو سے دوسرے پہلو تک پیوست ہوگیا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسے زخمی کیا تو کس نے؟ معلوم ہوتا ہے کہ صحرا کا کوئی آوارہ بدمعاش چھپ کر اس کے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچا اور اس کا کام تمام کر گیا"

یہ کہتے ہوئے وہ لاش پر ایک بار اور ٹخنوں کو زمین پر رکھ کر جھک گیا۔ اُس کے جھکتے ہی ایک کھٹکے کی آواز ہوئی جیسی سپرنگ کے دبنے سے ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک آبدار فولادی تیغہ بغل والی دیوار سے بجلی کی سرعت کے ساتھ نکل پڑا۔ اگر افسر سیدھا ہوتا۔ تو یہ تیغہ ٹھیک اس کے پہلوؤں میں پیوست ہوگیا ہوتا۔ لیکن چونکہ وہ جھکا ہوا تھا اسکے سر کے چند بالوں کو کاٹتا ہوا آگے بڑھ گیا اور پھر اسی تیزی کے ساتھ دیوار میں گھس کر نظروں سے غائب ہوگیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نے اسے میان میں کر لیا ہو +

دہشت کی ایک بلند چیخ سب کے منہ سے نکل گئی۔ پولیس کا افسر جھٹ پیچھے ہٹ گیا وہ بدحواس ہو رہا تھا۔ جب کچھ ہوش بجا ہوئے تو اُس نے سر کھجاتے ہوئے فرش کی ایک جگہ کو انگلیوں سے بتلا کر کہا "دیکھئے یہاں ایک اسپرنگ

پوشیدہ معلوم ہوتا ہے - کیونکہ جب میں نے یہاں تختہ رکھا تو اس وقت یہ دبتا ہوُا معلوم ہوُا - تمہارے ملازم نے اُسپر قدم رکھا ہوگا - اور چونکہ وہ سیدھا کھڑا ہوُا ہوگا - تیغہ دیوار سے نکلکر اپنا کام کر گیا - خدا نے مجھے خوب بچایا کہ چند بالوں کی حجامت ہی تک نوبت پہنچی"+

"کوئی حیرت کی بات نہیں" پروفیسر نے اطمینان کے لہجہ میں کہا - تختی تو صاف صاف بتا رہی ہے کہ باقی دروازے ناگہانی اور فوری موت کے دروازے ہیں - شفتاح نے سب کچھ لکھ دیا ہے" تاہم" اُس نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "جو چیز مجھے حیرت میں ڈال رہی ہے وہ یہ کہ غلط دروازہ کیونکر ہوسکتا ہے، حالانکہ اس ساعت میں قطب شمالی اس کے اوپر والے روشندان سے چمکتا نظر آرہا ہے - شفتاح کا تو بیان ہے کہ صرف وہ دروازے جن کے اوپر والے روشندانوں سے قطب شمالی نظر نہیں آتا - موت کے دروازے ہیں - اُسے ضرور دھوکا ہوُا ہوگا - طاح نے ہر دروازہ کی حفاظت کا یکساں انتظام کر رکھا ہوگا - لیکن یہ بات میری بڑی خوش قسمتی کا باعث ہوئی کہ حسن نے تختی چرائی ورنہ اسکی جگہ میں ہی آج اس فولادی تیغہ کا شکار بن گیا ہوتا"+

"مصر کے قدیم باشندے بڑے دغاباز تھے جناب" پولیس افسر نے انداز حقارت میں کہا "اس بھیانک منظر کے دیکھنے کے بعد اب تو میں کسی دروازہ پر بھی بھروسہ نہیں کرسکتا - چاہے اسکی صحت کے متعلق ہزاروں تختیاں ہی کیوں نہ اطمینان دلائیں"+

میرا خیال ہے کہ تم صحیح کہتے ہو" پروفیسر نے سراسیمگی کی حالت میں کہا "لیکن مجھے اس کا افسوس ہے کہ میری عقل کچھ کام نہیں کرتی"۔

اس گفتگو کے بعد یہ مختصر سی جماعت لوٹ لوٹ کر چھوٹے کمرے میں چلی آئی - مزدوروں کو دروازہ پر پلستر کر دینے کا حکم دے کر پروفیسر اور اس کے ساتھی سب کے سب باہر نکل آئے - اور اس طرح ہرم کو جو اس وقت فرعون مصر کا خزانہ گھر اور بد قسمت حسن کا مزار بن رہا تھا - اپنی حالت پر چھوڑ کر ناکامیاب لوٹے+

. . . .

گذشتہ واقعہ کے چند مہینے بعد شوکت معمول کے مطابق اپنے شاگردوں کے درمیان مصریات پر لکچر دے رہا تھا - ناگہاں ایک خیال اس کے دماغ میں بجلی کی طرح دوڑ گیا، شاگردوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی - جب وہ دیوانوں کی طرح چیخ چیخ کر بکنے لگا "ستارہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا، ستارہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا - جب اُس کے حواس کچھ درست ہوئے تو کلاس کو برخاست کر کے اپنی لائبریری میں چلا آیا +

"خدایا!" جب وہ آرام کرسی پر لیٹ کر منہ پر سے ایک تار کا فارم کھینچ رہا تھا چلا کر بولا "میں بھی کیسا بیوقوف ہوں۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات بالکل نہ آئی۔ کہ پانچ ہزار کی طویل مدت میں تو نواقب بھی اپنی جگہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ شمالی ستارہ بھی اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں دھوکا ہؤا، ہرم کی شمالی دیوار میں دو روشندان تھے۔ شفتاح کے زمانے میں ستارہ بائیں طرف والے روشندان سے چمکتا ہؤا نظر آتا ہوگا، لیکن پانچ ہزار کا عرصہ گذر جانے پر ستارہ نے اپنی جگہ بدل دی اور اب وہ یقیناً دائیں جانب چمکتا ہوگا۔ حسن اور میں دونوں کو دھوکا ہؤا۔ اب میں نے حقیقت کا پتہ لگا یا۔ شفتاح کا بیان بالکل ٹھیک ہے"

پروفیسر اپنی اس حیرتناک دریافت کے چند ہفتوں کے بعد پھر ایک جماعت کے ساتھ ہرم کی طرف رواں تھا جہاں فرعون کی دولت مدفون تھی۔ وہ ریگستان میں بہت دُور تک گھُستا چلا گیا۔ لیکن ہرم کا کوئی پتہ نہ تھا، ریگستان کے باشندوں نے اُسے خبر دی کہ چند مہینے بیشتر صحرا کی طرف سے ایک زبردست زلزلہ آیا تھا، بہت ممکن ہے۔ کہ اس زلزلے کی وجہ سے زمین پھٹ گئی ہو۔ اور وہ ہرم اپنے سارے خزانہ اور حسن کی لاش کے ساتھ زمین میں سما گیا ہو۔ خیر جو کچھ بھی ہو وہ ہرم اس طرح غائب ہؤا۔ گویا اس سے قبل کہیں موجود ہی نہ تھا۔

اب بھی رات کے وقت صحرائے اعظم پر قطب شمالی آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہے۔ لیکن اُس کی روشنی اس ہرم کے اندر پہونچنے سے معذور ہے۔ جہاں راستہ میں ایک انسان کی لاش پڑی ہوئی ہے اور جس کی دیوار میں ایک تیغہ چھپا ہؤا اپنے شکار کا انتظار کر رہا ہے اور انتظار کرتا جائے گا۔ فقط

سید حسن
متعلم بی اے کلاس۔ پٹنہ کالج، پٹنہ

اُردو خانم کی نالش

(از کرپا رام شرما ناظم بی اے)

۳۰ مارچ سنہ ۳۰ء کو ٹاؤن ہال امرت سر میں ہمیں ایک عظیم الشان مشاعرہ میں شریک ہونا پڑا۔ اس مشاعرے کی صدارت ہمارے محترم بزرگ اور اُردو زبان کے سب سے بڑے خادم آنریبل جسٹس شیخ سر عبدالقادر مدظلہ اور مشہور علم دوست راجہ نیرندرا ناتھ صاحب نے فرمائی۔ ذیل کا مضمون بر سر مشاعرہ خاص طور پر شیخ صاحب قبلہ کو مخاطب کر کے پڑھا گیا تھا۔ مشاعرے میں اس مذاقیہ مضمون نے جو رنگ پیدا کیا اور جو برجستہ جواب حضرت شیخ صاحب نے دیا اس سے شرکاء مشاعرہ بیحد محظوظ ہوئے۔ چونکہ اس مضمون میں خادمان اُردو کیلئے بہت ہی کام کی باتیں ہیں اسلئے ہم نے مشاعرے کے اختتام پر شیخ صاحب قبلہ کی وساطت سے اسے مخزن کیلئے حاصل کرنے کی کوشش کی اور ہم دل ممنون ہیں کہ حضرت قبلہ نے یہ مضمون ہمارے لئے حاصل کر کے اور اُس پر اپنی طرف سے ایک عدالتی نوٹ بڑھا کر ہمیں عزت بخشی *

بعدالت جناب معلی القاب آنریبل خان بہادر جسٹس سر عبدالقادر صاحب جج ہائیکورٹ آف جوڈیکیچر لاہور

اُردو خانم دختر اہل زبان خان قوم ہندی ساکنہ شاہ گنج
مستغیثہ

بنام

مولوی مدیر احمد ولد مولانا ابواللغات قوم رہنما پیشہ گمرہی ساکن روزنامہ آباد
و بابو اڈیٹر پرشاد ولد پنڈت امرکوش قوم لیڈر پیشہ شکم پری ساکن اخبار نگر
و مسٹر الم غلم ولد مسٹر نیم ٹر ذات بہروپیہ پیشہ امیدواری ساکن دفتر پورہ پرگنہ دربدر کوٹ
مستغاث علیہم

استغاثہ زیر دفعات $\frac{۳۹۴}{۳۲۶}$ و ۴۲۰ و ۴۰۶ و ۵۰۶ تعزیرات ہند

جناب عالی

سائلہ مستغیثہ حسب ذیل گذارش کرتی ہے

اوّل یہ کہ۔ مستغیثہ مرحوم شاہنشاہان مغلیہ کے عہد عروج میں شہر دہلی میں تولد ہوئی اور ان کی نوازش سے

کرم گستر و معدلت پرور کے سائے میں پل کر عہد شباب کو پہونچی۔ اور اُن کے دریائے فیض و سخاوت و ابر جود و کرم کے تصدق نہ صرف ہندی خزانوں کی ہی واحد مالک قرار دی گئی۔ بلکہ وقتاً فوقتاً عربی، ایرانی، ترکی و عراقی جواہرات سے بھی مالا مال ہوتی رہی۔ اور اپنی قابلیت اور خداداد خوبی کے عوض آخرکار دربار شاہی میں رسائی ہونے سے مستغیثہ شاہی کارخانوں کی کارفرمائی پر مامور ہوئی۔ جب مغلیہ اقتدار کچھ کم ہوا تو اودھ کی سرکار میں کار مختار کے عہدے پر سرفراز ہوئی سائلہ کے عروج و اقتدار کے ثبوت میں اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ خاندان مغلیہ کی آخری یادگار مرحوم ابوظفر بہادر شاہ سائلہ کی خدمت کو فخر و ثواب جانتے تھے۔ چنانچہ اس درویش صفت شاہنشاہ نے ایک ضخیم اور نہایت عمدہ دیوان نفیس نفیس اپنی کلک گوہر رقم سے لکھ کر سر دربار مجھے مرحمت فرمایا۔ خلد آشیان محمد شاہ کے دربار کے امیرالامرا نواب آصف جاہ نظام الملک بہادر سائلہ کے اس قدر معتقد اور خدمتگذار تھے کہ آج تک ان کی اولاد یعنی سرکار نظام الدولہ میں سائلہ ہی مختار الملک کے عہدے پر سرفراز ہے +

۵۷ء کے قیامت آفریں ایام کے بعد ملکہ وکٹوریا نے ہندوستان کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی غالب۔ حالی۔ آزاد وغیرہم معجز بیان و سحر نگار شاعر و ادیب میری خدمت کیلئے مامور و مقرر فرمائے۔ اور خود اپنے دربار سے پروانہ کار مختاری مملکت ہند صادر فرمایا۔ اور اس کے ساتھ اطلس فرنگی کی ایک بیش بہا خلعت اور بے شمار انگریزی۔ ولندیزی۔ فرانسیسی و پرتگالی جواہر شاہوار مجھے عنایت کئے۔ چنانچہ گورنر۔ کورٹ۔ فیشن۔ ریلوے سٹیشن ٹمبرلنس۔ کانفرنس۔ میونسپلٹی۔ پریزیڈنٹ۔ انجن۔ موٹر۔ تھرمامیٹر وغیرہ کئی رنگا رنگ کے آبدار گوہر مجھے اسی سرکار سے دستیاب ہوئے۔ میں نے انہیں بسر و چشم قبول کیا۔ اور سرکار و دربار میں ان سے اپنی زینت اور آرائش کی +

دوم یہ کہ مستغاث علیہم میرے لڑکے ہیں۔ مگر اس کلجگی اولاد کو میری یہ روز افزوں ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ چنانچہ یہ سب فرداً فرداً اور مجموعی طور پر اس فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مجھ بیکس کو ٹھکانے لگا کر میری اس تمام جائیداد پر قابض ہو جاویں اور اس سے گلچھرے اڑادیں +

سوم یہ کہ سائلہ مستغیثہ نے مستغاث علیہم کو اپنی اولاد جان کر اپنے تمام خزانوں کی چابیاں اُن کے سپرد کر رکھی ہیں اور یہ مستغاث علیہم مذکور آنکھ بچا کر موقع پا کر چوری چکاری کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اور بازپرس کرنے پر سائلہ کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اور جانچ پڑتال کے وقت مستغیثہ کی آنکھ میں دھول ڈال کر ہیرو کی جگہ پر کانچ کے ٹکڑے اور موتیوں کی بجائے سنگریزے رکھ دیتے ہیں اور اس طرح ڈاکہ سرقہ اور خیانت مجرمانہ اور ترہیب وغیرہ جرموں کے مرتکب ہوتے ہیں +

چہارم یہ کہ سائلہ کو یقین ہے کہ مستغاث علیہم مذکور یہ سب کام دیدہ دانستہ اور ایکدوسرے کی سازش سے کرتے ہیں ٭

پنجم یہ کہ مستغاث علیہ نمبرا مولوی مدیر احمد مذکور نے کچھ عرصے سے میرے فرنگی جواہرات خورد برد کردئے ہیں اور ان کی جگہ سائلہ کو چند غیر مانوس بدشکل بدنما عربی سنگریزے ہندی دھاگے میں پرو کر زیب تن کرنے پر مجبور کر رہا ہے - اور مستغاث علیہ مذکور کا منشا اور غرض علاوہ اپنے ذاتی مفاد کے اور اپنے آپ کو مشتہر کرنے کے میرے نادان بھولے بھالے پنجابی بچوں کو غلط فہمی اور بدظنی کا شکار کرنا بھی ہے - مثلاً جب مستغاث علیہ مذکور پریزیڈنٹ میونسپلٹی کو صدر بلدیہ کے نام سے پکارتا ہے تو غریب پنجابیوں کو اصلی مفہوم تک پہنچنے سے پہلے دو غلط فہمیاں ہونے کا اندیشہ ہے - ایک تو یہ کہ وہ صاحب ممدوح کو لفظ بلدیہ کے استعمال کی وجہ سے آگ لگانے والوں کی انجمن کا رکن اعلٰے تصور کریں اور دوسرے یہ کہ وہ ان کو ناگوری بیلوں میں سے سب سے بڑا سانڈھ سمجھ بیٹھیں اور جب وہ کانفرنس کو مؤتمر کے نام سے یاد کرتا ہے تو معصوم پنجابی ہیضہ اور پلیگ کے خیال سے سہم جاتے ہیں ٭

عالیجاہا سائلہ یہاں پر یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتی ہے کہ چند ایک الفاظ مستغاث علیہ مذکور نے اس قسم کے وضع کر رکھے ہیں جن سے درپردہ مفسدانہ اور باغیانہ خیالات کی اشاعت ہو اور مستغاث علیہ مذکور اپنے اعمال کی سزا بھگتنے سے بھی بچ رہے - مثلاً اپیل کا نام مرافعہ اُس نے اس خیال سے رکھدیا ہے کہ سیدھے سادے پنجابیوں کو یہ دھوکا ہو کہ جابجا بڑی بڑی سرکاری عدالتیں محض عدل کو رفع دفع کرنے کے خیال سے قائم کی گئی ہیں - نہ کہ دادرسی اور انصاف بانٹنے کی نیت سے - جب مستغاث علیہ مذکور سرکاری ہوائی جہازوں کو اڑتے ہوئے دیکھتا ہے تو طیارہ طیارہ کرکے شور و غل سے آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے - تاکہ پنجابی نوجوانوں کو یہ شبہ ہو کہ سرکاری ہوائی جہازوں کے مقابلے کے لئے اس کے پاس ہوائی جہاز طیار رہیں - اور وہ لوگ خواہ مخواہ جبر و تشدد پر آمادہ ہوں - حالانکہ سائلہ علفیہ بیان کرتی ہے کہ ابھی کل شام کو ہوا میں اُڑتے ہوئے ایک ناچیز مچھر نے اس مردود کا ناک میں دم کر دیا اور یاں ہمہ طیاری اس کی اس مچھر کے سامنے کوئی پیش نہ چلی - گرچونکہ یہ معاملہ سرکار دولتمدار سے متعلق ہے - اِس لئے سائلہ اِس میں دخل نہیں دیتی - محض ضمناً عدالت میں عرض کیا گیا ہے - اس ناہنجار کی بداعمالیاں حضور کی چشم اخبار بین سے پوشیدہ نہیں ہوں گی اس لئے سائلہ ان ہی مثالوں پر اکتفا کرتی ہے ٭

حضور والا - سائلہ اس جگہ یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتی ہے کہ مستغاث علیہ مذکور ایک جرائم پیشہ فرقے سے متعلق ہے اور اس کے علمی بزرگ پہلے بھی معصوم اور کم عمر پنجابی بچوں کی جان کے لاگو رہے ہیں اور ان کے مظالم

میں سے کئی ایک آج تک رواجاً جاری ہیں۔ مثلاً مدرسوں میں ریاضی کے کرے ذوضعاف اقل وحشیانہ بربریت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان غریبوں کو ڈراتا ہے۔ سائینس پڑھنے وقت کشمکش انابیت شعری اب بھی جونک کی طرح اُن ناکردہ گناہوں کا خون چوستی ہے اور اگر ان تمام الجھنوں کے باوجود یہ غریب پڑھ لکھکر مدرسہ سے چھٹی پاکر دنیا کے کاروبار میں لگ جاویں تو بھی اس فرقے سے رہائی ناممکن ہے۔ ابھی کل کا ذکر ہے۔ کہ ہمارے محلہ میں کسی بات پر بول چال ہوگئی اور نالش کی نوبت آئی۔ مگر اس قوم کی بدولت عدالت میں بنا بنایا مقدمہ خاک میں مل گیا۔ جج صاحب نے جو کہ اسی فرقے کے چیلوں چانٹوں میں سے ایک ہیں غریب سائلوں کی فریاد سننے کی بجائے بھری عدالت میں مرحوم فارسی شاعر عرفی کی حیثیت کی جانچ پڑتال شروع کردی۔ حالانکہ اس کو مرے ہوئے بھی پانچسو سال سے زیادہ گذر چکے ہیں۔ سائلان نے چیخ پکار کی کہ حضرت عرفی طرفین مقدمہ میں سے نہیں ہے اور اُسکی حیثیت سے ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ مگر حاکم صاحب کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ غریب اپنا سا منہ لیکر گھروں کو لوٹ آئے۔ پنچوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح صفائی کرادی مگر اس فرقے کے طفیل ان لوگوں کا سرکاری عدالتوں پر سے اعتبار بالکل اُٹھ گیا۔

ششم یہ کہ مستغاث علیہ نمبر ۲ بابو ایڈیٹر پرشاد مذکور مستغاث علیہ نمبر ۱ مذکور کا چھوٹا بھائی ہے اور بفحوائے سگِ زرد برادر شغال۔ اس نے بھی اس کی دیکھا دیکھی وہی لچھن اور وہی چلن اختیار کر لئے ہیں۔ مستغاث علیہ نمبر ۱ کو فرنگی جواہرات پر دست تطاول دراز کرتا دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا ہے اور اس نے میرے مشرقی خزانوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ آبدار موتی جو کہ شاہان مغلیہ نے بڑی محنت اور کوشش سے خلیج فارس اور بحیرۂ عرب سے میرے لئے منگوائے تھے۔ اس کمبخت نے ہمدی کھرل میں ڈال کر پیسنے شروع کر دئے ہیں اغلب ہے کہ اس کشتۂ مروارید سے اس کی گئی گذری ہوئی جان میں کچھ سکت آجاوے مگر سائلہ کے قلاش و نادار ہو جانے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

عالیجاہا مستغاث علیہ نمبر ۲ سے دریافت کیا جاوے کہ اب لفظ قبول میں کون سے ایسے کیڑے پڑ گئے ہیں جو مستغاث علیہ مذکور نے اس کو سوبکار کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ سائلہ نے اپنی زندگی قوم کی خدمت کیلئے وقف کر رکھی تھی۔ مگر اب مستغاث علیہ مذکور سائلہ کو اپنا جیون اس کے بھائی بند پوربیہ برادری کی ہوا کیلئے اَرپن کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ مستغاث علیہ مذکور نے پرسوں ایک خوشنوا گویے کو بھجینک لکھ مارا تاکہ ... ہم کے دلوں میں ابھر جلسے میں اس گانے والے کے آتے ہی بھاگڑ پیدا ہونے کا شک پیدا ہوا اور آئندہ اُس کے روزگار کی لسلہ وار ازنیا

ہو ۔ نیز ایک مشہور تاجران عطریات کے اشتہار میں خوشبودار کی جگہ سگندھت کا لفظ جڑ دیا ۔ تاکہ تعریف کے ساتھ ذم کا پہلو بھی پیدا ہو اور بدبو اور تعفن کے خیال سے لوگ اس کے خریدار نہ بنیں مستغاث علیہ مذکور کی سیاہ باطنی کا اندازہ لگانے کے لئے اس کا اپنے مربی اور محسن اشتہار بازوں سے یہ سلوک بالخصوص قابل غور ہے +

عالیجاہا مستغیثہ کو اس امر کا پورا یقین ہے کہ یہ کمبخت ان ولائتی میووں کی جگہ سائلہ کو محض اس لئے پرانے اخروٹ کی گریاں کھلانے پر مجبور کر رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح سائلہ بیمار ہو کر مر جاوے اور مستغاث علیہ مذکور اس حیلے سے قتل کے جرم کی سزا پانے سے بھی بچ رہے +

ہفتم یہ کہ مستغاث علیہم نمبر اور ۲ مذکور علاوہ قابل ہونے کے کچھ بارسوخ بھی ہیں اور ملک میں ان کا کچھ اثر و اقتدار بھی ہے اور اس کے علاوہ وہ پرلے سرے کے چالاک اور ہشیار ہیں انہوں نے مستغیثہ کے خدمتگاروں اور بہی خواہوں کو دھوکا اور فریب دینے کی نیت سے اپنے ان تمام کارناموں کا نام زباندانی اور توسیع اشاعت زبان اُردو وغیرہ رکھ چھوڑا ہے اور اگر مستغیثہ کا کوئی خادم یا معاون ان کی قلعی کھولنے پر کمربستہ اور آمادہ ہوتا ہے تو ہر طرح سے اُس کی بدنامی بُرائی اور تضحیک کرتے رہتے ہیں ۔ حتیٰ کہ وہ شکستہ دل ہو کر اپنے نیک ارادوں سے باز رہے ۔ اور اگر اس طرح ان کی دال نہ گلے تو خطرۂ مذہبی کا ڈھونگ کھڑا کر کے اپنے ان پڑھ ۔ جاہل ۔ کندۂ ناتراش معتقدوں اور پیروؤں کو ورغلا بھڑکا کر فساد پر آمادہ کر کے امن عامہ میں خلل ڈالتے ہیں ۔ حالانکہ مستغیثہ سینکڑوں بار کہہ چکی ہے کہ میرا تمہارے مذہبوں سے کوئی واسطہ یا تعلق نہیں +

ہشتم یہ کہ مستغاث علیہ نمبر ۳ مسٹر الم غلم مذکور مستغاث علیہم نمبر ا و ۲ کا چھوٹا بھائی ہے اور مثل مشہور ہے کہ جتنا چھوٹا اتنا ہی کھوٹا ۔ اس ناشدنی نے ننھی سی عمر میں میرا کلیجہ پکا دیا ہے ۔ شیر خوارگی میں ہی بیحد ظلم و ستم مجھ پر توڑے ہیں ۔ میرے تمام ہمدردوں کو غیر مہذب ۔ دقیانوسی ۔ لکیر کے فقیر وغیرہ خطابات سے یاد کرتا ہے اُس کی روزمرہ گفتگو سے ہی ایک اجنبیت کا عالم ٹپکا پڑتا ہے یہاں تک کہ خود مجھ کو اس کے رشتے پر شک ہونا شروع ہو گیا ہے ۔ اس کا رویہ اس کے روزانہ مشاغل سے ہی عدالت پر ظاہر ہو جائیگا ۔ مورننگ کو اٹھے باتھ روم میں گئے ۔ واش اور باتھ کے بعد بریک فاسٹ کھائی ساتھ ہی ڈیلی پیپر سے سکیپ کیا ۔ بوٹ پالش کروائے ۔ ڈریس پہنی ہیٹ سر پر رکھی ۔ سٹک ہاتھ میں لی اور آفس کو روانہ ہوئے واک کرتے ہوئے وہاں گئے ۔ صاحب سے ہینڈ شیکنگ کرنے کے بعد ۔ ڈیلی روٹین کے مطابق ورک شروع کر دیا ۔ دوپہر کو لنچ کھایا اور پھر آفس کے کمرے میں ۔ جب آفس کلوز ہوا گھر میں آکر آفٹرنون ٹی پی ۔ ڈریس سوٹ اور ایوننگ ہیٹ سجائی شوز بدلیں ۔ سٹرول کرنے

ہوئے کلب میں پہونچے وہاں فرینڈز کے ساتھ ڈرنکس سموک اور کارڈز پر دل بہلایا۔ انجوائے منٹ اور انٹرٹین منٹ کے خیال سے میوزک سنا سنایا۔ اور ایک آدھ ڈانس میں حصّہ لے لیا۔ بشرطیکہ کوئی پلیٹ پارٹنر مل جاوے۔ گھر پر آئے۔ ڈنر کھایا۔ چارلس گاروِیس کا لیٹسٹ ایشیو سٹڈی کیا اور لیٹ آن دی نائٹ بڈ میں جا گھسے۔ اپنے ان مشاغل میں اس نے میری عمر بھر کی کمائی یک قلم برباد کردی ہے۔ اس کی دستبرد مستغاث علیہما اور ۲ کی لوٹ گھسوٹ سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور اگر اس کی یہی حالت رہی تو گہنا پاتا زیور لتا تو کجا سر چھپانے کے لئے جھونپڑا بچا بھی نظر نہیں آتا۔

عالیجاہا اس کی علمی قابلیت کا یہ حال ہے کہ خود حضور کی عدالت سے دیوالیہ قرار دیا جا چکا ہے۔ اور وہ مثل بھی عدالت میں موجود ہے۔ اس مقدمے میں گذری ہوئی شہادت سے حضور پر روشن ہو جائیگا کہ ذوق شاعری سے بے بہرہ۔ نثر فہمی میں بالکل کورا اور علمیت سے محض ناآشنا ہے۔ مگر پھر بھی میری حمایت کا مدعی اور میری خدمت کا دعوے دار رہے +

حضور والا مستغاث علیہ نمبر ۳ مذکور علاوہ مالی نقصان پہنچانے کے مجھ پر جسمانی حملے کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ ابھی کل ہی کا ذکر ہے کہ اس نے فارن پاؤڈر سے وائٹ واش کرکے میرے حسن ملیح و دلآویز کا ستیاناس کردیا۔ اور پھر بھرے جلسے میں اپنے احباب کے سامنے مجھے رسوا کیا۔ مستغیثہ کی گذارش ہے کہ اگر کسی وجہ سے عدالت کے خیال میں مستغاث علیہم نمبر ا و ۲ کسی قسم کی نرمی رعایت یا رحم کے مستحق خیال بھی کئے جاویں تو مستغاث علیہ نمبر ۳ سے ہرگز کوئی رعایت یا نرمی روا نہ رکھی جاوے۔ اور اسکو ضرور زندان کی ہوا کھلوائی جاوے۔ اور اگر یہ کسی وجہ سے ناممکن ہو تو اسے کالجی ہوس میں ہی بھیجدیا جاوے۔ اور اگر عدالت کے خیال میں یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس نیم ٹر کے گدھے کو سرکاری اصطبل میں بندھوا دیا جاوے تاکہ آئندہ اپنی نجاست سے میرا صحن پلید نہ کرسکے +

تہم یہ کہ مستغاث علیہم پر چوری۔ ڈاکہ۔ فریب۔ دھوکا۔ ترہیب۔ ایذارسانی۔ خیانت مجرمانہ و سازش وغیرہ تمام جرم خود مستغاث علیہم کی تحریروں اور تقریروں سے پایہ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں۔ اس لئے مستغیثہ مزید شہادت پیش کرکے عدالت کا وقت ہرج کرنا نہیں چاہتی۔ مستغاث علیہم اپنی تحریروں یا تقریروں سے منکر نہیں ہیں وہ ان کو درست اور صحیح تسلیم کرکے اپنے جرم کا اقبال کر چکے ہیں۔ تاہم عدالت کی تسلی اور تشفی کے لئے مسٹر ایل ایجی ڈی، ماہر تحریرات کی رائے شامل استغاثہ کردی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحریریں واقعی مستغاث علیہم کی ہیں نیز کرنل تھرڈ بے بینڈ آئی۔ ایم۔ ایس۔ سول سرجن کا سارٹیفکیٹ بایں مطلب، ساحر عدالت کیا جاتا ہے کہ مستغاث علیہم نے بقائمی ہوش و حواس اقبال جرم کیا ہے اور چونکہ مستغاث علیہم کے سابقہ بیانات جو کہ شامل مثل ہیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

کے سامنے ہوتے ہیں۔ اس لئے ناجائز اثر یا دباؤ ڈال کر اقبال جرم کرانے کا شک بھی نہیں ہو سکتا۔ اندریں حالات کسی قسم کی صفائی کی شہادت مستغاث علیہم کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ وہ محض مقدمہ کو طول دینے کی نیت سے ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ سائلہ التماس کرتی ہے کہ زیر دفعہ ۲۵۷ ضابطہ فوجداری ان کو اس امر سے باز رکھا جاوے اور جلد حکم صادر فرما کر انہیں کیفر کردار کو پہنچایا جاوے +

دہم یہ کہ سائلہ محض تنگدستی کی وجہ سے ان تمام سنگین جرموں کے مقدمات کو ایک ہی درخواست کے ذریعے پیش کر رہی ہے اور اگر عدالت کی رائے میں یہ صحیح اور درست نہ ہو تو ہر ایک مستغاث علیہ پر ہر ایک جرم کا علیحدہ علیحدہ مقدمہ چلایا جاوے +

یازدہم یہ کہ بوجہ عالی خاندانی مستغیثہ سائلہ کو اصالتاً عدالت میں حاضر ہونے سے زیر دفعہ ۲۰۵ ضابطہ فوجداری معاف فرمایا جاوے +

دوازدہم یہ کہ جملہ مستغاث علیہم اسی علاقے کے باشندے ہیں۔ نیز مستغیثہ بھی اسی جگہ بود و ماند رکھتی ہے اس لئے عدالت کو سماعت مقدمہ کا اختیار ہے اور چونکہ عدالتہائے ماتحت میں بوجہ اثر و رسوخ مستغاث علیہم سائلہ کو دادرسی کی کوئی امید نہیں اس لئے براہِ راست عدالت عالیہ میں استغاثہ دائر کیا گیا ہے +

عرض

اُردو خانم مستغیثہ سائلہ مذکورہ
مورخہ ۳۰-۳-۳۰

نقل حکم عدالت مورخہ ۳۰-۳-۳۰

یہ استغاثہ جو مسماۃ اُردو خانم کی جانب سے [illegible] کیا ہے۔ اس پر سر دست یہ عدالت کوئی حکم صادر نہیں کر سکتی اوّل تو یہ یقینی نہیں کہ مستغیثہ کو براہ راست عدالت عالیہ میں استغاثہ دائر کرنے کا حق حاصل ہے۔ بیشک اس کو بعض مجبوریاں ہیں جن کی بنا پر اس نے عدالت سے رجوع کیا ہے لیکن عدالتیں ضابطے کی پابندی پر مجبور ہیں۔ اس وقت مستغیثہ کے فاضل وکیل نے یہ زبانی درخواست پیش کی ہے کہ فی الحال عارضی طور پر ایک حکم امتناعی مستغاث علیہم کے نام جاری کیا جائے جس میں یہ ہدایت ہو کہ وہ ایسی حرکات سے جن کا ذکر استغاثہ میں کیا گیا ہے تا فیصلۂ مقدمہ باز رہیں۔ مگر کوئی ایسا حکم

بھی بغیر اس امر کے فیصلے کے کہ یہ مقدمہ یہاں چل سکتا ہے نہیں دیا جا سکتا - نیز دوسرے فریق کے نام نوٹس جاری ہونا از روئے قانون ضروری ہے - اِس لئے یہ مقدمہ کسی آئندہ تاریخ کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے اور اس اثنا میں فریق ثانی کو اطلاع دی جائے گی کہ اُن کے خلاف مندرجہ بالا الزامات لگائے گئے ہیں - وہ جو عذرات قانونی یا واقعاتی پیش کرنا چاہیں حاضر ہو کر پیش کریں اور بتائیں کہ کیوں یہ مقدمہ اُن کے برخلاف نہ چلایا جائے - اس مرحلہ پر میں کوئی رائے ان شکائتوں کے متعلق ظاہر نہیں کرنا چاہتا - جو مستغیثہ کو اپنے لڑکوں سے ہیں لیکن میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مستغیثہ کے فاضل پیروکار کی قابلیت کا اعتراف کروں کہ انہوں نے اپنی مؤکلہ کا استغاثہ بہت مدلل طریق سے لکھا ہے اور اُس کی تکالیف کے اظہار میں اپنی ذہانت اور حالات زمانہ سے واقفیت کا ثبوت دیا ہے +

دستخط جج ہائی کورٹ ۳۰-۴-۳

جذبات

(مولنا محمد جمیل احمد خان صاحب کوکب شاہجہانپوری)

آنسو مریضِ عشق کا حرفِ دُعا ہوا
آنکھیں تو کام آئیں اگر لب نہ وا ہوا

نالہ اگر رُکا تو بنا کاروانِ اشک
جتنا بھی میں نے جوش کو دابا سوا ہوا

دیدار سے تو اور بڑھا اضطرابِ دل
میں کس خیال میں تھا مگر ہائے کیا ہوا

اللہ ری لذّتِ خلشِ زخمہائے دل
درماں طلب نہ پھر دلِ درد آشنا ہوا

کیسا پھر امتیاز فراق و وصال میں
جب ترکِ مدعا ہی مرا مدعا ہوا

تیغِ نظر نے ایک کے سو دل بنا دیئے
میرے لئے کرم ستمِ نا روا ہوا

اِک اِک نفس شمار کروں روزِ حشر تک
اچھا علاجِ دردِ دلِ مبتلا ہوا

کیوں کر بیاں ہو اُس کی ستم آفرینیاں
جب لب پہ آتے آتے گِلہ مرحبا ہوا

ہر کشتۂ ادا کو نئی زندگی ملی
پانی تمہاری تیغ کا آبِ بقا ہوا

حاصل ہوئی جو معرفتِ آشنائے روح
دِل سارے آشناؤں سے نا آشنا ہوا

منزل بعید راستہ معدوم تھا، مگر
کوکب خود اُس کا عشق مرا رہنما ہوا

تبصرہ

فارسی قاعدہ باسلوب نو وطریق راست

یہ فارسی قاعدہ مولوی ابوالمحاسن محمد حسن خان متین مدرس فارسی وسطانیہ دارالشفاء سرکار عالی (دکن) نے ترتیب دیا ہے - جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے - مؤلف نے اس کتاب کو طریق راست یا دوسرے الفاظ طریق بلاواسطہ یعنی *Direct Method* کو ملحوظ رکھ کر لکھا ہے - یہ طریق ہر اس زبان کی تدریس میں مفید ہے - جس کے تدریسی مقاصد حسب ذیل ہوں :-

۱ - طلبا اس زبان کو پڑھ سکیں اور پڑھ کر سمجھ سکیں *

۲ - طلبا اس زبان میں گفتگو کر سکیں *

۳ - طلبا اس زبان میں لکھ سکیں *

تمام دیسی زبانوں اور غیر زبانوں میں سے انگریزی زبان کے تدریسی مقاصد یہی ہیں - اس لئے اُن کی تدریس وتعلیم کے لئے اس سے بہتر اور زیادہ موزوں طریق اور کوئی نہیں - لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فارسی زبان کو جو ہندوستان میں اس وقت کلاسیکل زبان کی حیثیت رکھتی ہے - داخل نصاب کرنے کے مقاصد یہی ہیں جو دیسی زبانوں کے ہیں - اگر جواب نفی میں ہے تو یقیناً مؤلف کا طریق راست کو اختیار کرنا بے معنی ہے *

ہندوستان کے اکثر صوبوں میں فارسی زبان صرف اس لئے پڑھائی جاتی ہے کہ طلبا اس کی قدیم ادبی کتابوں کو پڑھ کر سمجھنے کے قابل ہو جائیں - فارسی تحریر وتقریر میں خیالات کا اظہار کرنا ہمارے مقاصد سے باہر ہے - یورپ [illegible] بھی کلاسیکل زبان کی تدریس کے لئے طریق راست استعمال نہیں کیا جاتا ہے کیونکہ ہم طریق راست کو [illegible] سے تدریسی فارسی سے وابستہ کر رہے ہیں - کہ یہ جدید تحقیقات کے مطابق تعلیمی [illegible] تدریس خیال کیا جاتا ہے - حالانکہ اس کا مصرف محض مادری اور دیسی زبانوں کی تدریس ہے - جن میں گفتگو کرنا - اور تقریر وتحریر کے لئے ان کو اپنا ذریعہ اظہار بنانا نہ صرف ضروری ہے بلکہ اولین مقاصد میں شامل ہے اگر دکن میں تدریس فارسی کے عملی مقاصد یہی ہیں تو اس قاعدے کے مفید ہونے میں کلام نہیں *

اِس کتاب میں کبیس درس ہیں۔ اِس کے بعد نو مشقیں اُردو سے فارسی ترجمہ کے لئے درج ہیں۔ مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی اخیر میں شامل ہے۔ ہر درس مصوّر ہے۔ سبق کے تقریباً تمام جملوں کا تعلق تصاویر سے ہے۔ یہ تصاویر یا توضیحات اسباق کو سمجھنے میں بڑی حد تک ممد ہوتی ہیں۔ اور طلبہ کی ذہنی تفریح اور دلچسپی کا باعث بھی ہیں۔ عام طور پر انہی الفاظ و فقرات کو لیا گیا ہے جو ہمارے روزمرہ استعمال میں آتے ہیں۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے یہ بات بہت کچھ قابل ستائش ہے کہ کتاب کا املا اور رسم الخط ایرانی ہے۔

ہم اس بات میں مؤلف سے متفق ہیں کہ غیر زبان زیادہ تقلید اور مشق سے آتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ فارسی زبان میں یہ تقلید کہاں تک ممکن ہے۔ مؤلف کا یہ خیال کہ تدریس فارسی میں گرامر مصطلحات اور مجرد قواعد کو طلبہ کے ذہن نشین کرانا غیر مفید ہے۔ بالکل صحیح ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ان قواعد کو ہمیشہ مضمون نگاری اور ترجمے کے ساتھ استعمال کیا جائے کلیۃً درست نہیں گرامر کے اصولوں کو اسباق کے فقرات میں لاکر واضح کرنا زیادہ موزون ہے۔ یعنی ہر سبق کسی خاص گرامر کے موضوع پر مبنی ہو۔

بہرحال مؤلف کی محنت قابل قدر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ آئندہ ہماری ان تجویزوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے آئندہ کتاب کو زیادہ مفید بنانے کی کوشش فرمائیں گے۔ ہم اس سلسلے کی دوسری اعلے کتابوں کے منتظر ہیں۔ قیمت ۱۲؍

گلشن گفتار

یہ اُردو شعرا کا قدیم ترین تذکرہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا ہے جس کو مولوی سید محمد ایم اے نے مولوی علی رضا صاحب معلم فارسی سے لے کر مقدمہ اور اشاریہ شامل کرکے مکتبہ ابراہیمیہ کی مطبوعات کے سلسلہ میں شائع کیا ہے یہ تذکرہ جیسا کہ مؤلف کے ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۱۶۵ھ ہجری میں لکھا گیا۔ قدامت کے علاوہ اس تذکرے میں مؤلف نے بعض مفید معلومات جمع کی ہیں۔ جو کم و بیش اس عہد کے لکھے ہوئے دوسرے تذکروں میں مفقود ہیں مثلاً شعراء کے حالات کسی قدر تفصیل سے درج کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے کلام کے انتخاب میں اپنی سلیم المذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ انتخابات میں صرف متفرق اشعار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض جگہ پوری غزلیں درج کی ہیں۔ اکثر شعرا کے حالات مثلاً عادل شاہی دربار کے ملک الشعرا ملا نصرتی اور ولی دکنی کے دو شاگردوں اشرف گجراتی اور محمد رضی حمد آبادی کے حالات بھی درج کئے ہیں جو دوسرے تذکروں میں نایاب ہیں یا بہت مختصر طور پر بیان کئے

گئے ہیں۔ شعرا کے حالات میں بعض ایسی تفصیلات بیان کی ہیں جن کے ذریعے دکن میں بعض غیر معروف اُردو مراکز کا پتہ چلتا ہے ٭

سید محمد صاحب موصوف نے ہر شاعر کے حالات کے ضمن میں دوسرے تذکروں مثلاً نکات الشعراء، چمنستان الشعراء اور بعض غیر مطبوعہ تذکروں یعنی تذکرہ فتح علی گردیزی، تحفۃ الشعرا اور گلزار ابراہیم سے بعض نہایت ضروری معلومات نیچے حاشیئے میں درج کر دی ہیں۔ تاکہ پڑھنے والے کو تقابل و تطابق سے صحیح حالات کے دریافت کرنے کا موقعہ مل سکے اگرچہ یہ تذکرہ مختصر سا ہے اور ۲۰×۳۰/۱۶ کے تقریباً ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے تاہم معلومات کے اعتبار سے اُردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ ہمیں سید موصوف کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ کہ اُنہوں نے نہایت عرق ریزی سے اس کتاب کو پبلک کے سامنے پیش کر کے اردو علم و ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے ہم سید صاحب موصوف اور مکتبہ ابراہیمیہ کے کارکنوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ قیمت بارہ آنے (۱۲؍) ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد دکن ٭

"تبسم"

18-11-30
مخزن

ہر لحظہ ہر جا
اطمینان
کرنے کیلئے آپ مشہور عالم اکسیر اعظم ہر مرض کے واحد علاج
رجسٹرڈ
"امرت دھارا"
AMRITDHARA
پر اعتماد کر سکتے ہیں کیونکہ بہ فضل ایزدی یہ ۹۰ فیصدی تو
مرض کو فوراً آرام دیتی ہے۔ وگرنہ مرض کو روک تو ضرور دیتی ہے۔ اس کو کوی ولوذ ویدبھوشن
پنڈت ٹھاکردت شرما ویدنے ایجاد کیا ہے۔ اور جس کو لاکھوں استعمال کرکے فائدہ
اٹھانے والوں میں سے ۳۶ ہزار کے خطوط وصول ہو چکے ہیں یہ انسانی جسم کی تقریباً جملہ امراض
کا واحد علاج ہے۔ یہ بنی نوع انسان کے لئے نعمت ثابت ہوئی ہے۔ ادویات کے بھاری بکس اسکی صرف
ایک شیشی کے سامنے ہیچ ہیں۔ آپ بھی ایک اپنے ساتھ رکھیں وقت بے وقت کام دے گی ؛
قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے نصف شیشی ایکروپیہ چار آنہ۔ نمونہ صرف آٹھ آنے
ترکیب استعمال کی کتاب شیشی کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہندوستان کی جس زبان میں چاہئے خط میں لکھدیں!
مفصل حالات کیواسطے رسالہ امرت منگوادیں۔ کارخانہ کی دیگر چارسو ادویات کی فہرست اور طبی کتب مصنفہ پنڈت صاحب
کی فہرست اور رسالہ امراض مخصوصہ مردمان بھی جس کو ضرورت ہو ملنگنے پر مفت بھیجے جاتے ہیں ؛
خط وکتابت و تار کا پتہ:۔ امرت دھارا ۔ لاہور
المشتہر
مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا پوسٹ آفس لاہور

جملہ حقوق محفوظ
قیمت سالانہ
للعہ ر چار روپے
بذریعہ وی پی (للعہ)

مخزن
دورِ جدید

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۰۹۷
ممالک غیر سے
۹ شلنگ
قیمت فی نمبر ۸/

جلد (۴) | ماہِ ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۰ء | نمبر (۴، ۵)

فہرست مضامین

مرکنٹائل سٹیم پریس لاہور میں باہتمام میاں ظہور الدین پرنٹر چھپا۔ اور میاں ظہور الدین مالک، ایڈیٹر، پبلشر نے دفتر مخزن بھاٹی گیٹ سے شائع کیا

سوز وساز

(از جناب گمنامؔ)

جو حقیقتوں کی بہار تھی کبھی چشمِ اہلِ نیاز میں
تیرے رازِ حُسن کے پھول تھے جو کھلے ہیں آ کے مجاز میں

نہ ہوا پنی آنکھ جو حُسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو وہی خم ہے زلفِ ایاز میں

میری بیخودی نے غضب کیا کہ مٹا دی لذتِ عاشقی
وہ جلن نہیں وہ مزا نہیں میرے سوز میں تیرے ساز میں

ہمہ تن تصوّرِ دید ہوں طرب آشنائے نوید ہوں
کہ ترانہ کش ہیں خموشیاں میرے دِل کے پردۂ راز میں

پسِ مرگ داد وفا ملی جو مراد دستِ دعا ملی
کہ تری وفا نے اُٹھا لئے میرے پھول دامنِ ناز میں

نہ عروج ہے نہ نزول ہے یہ خیال و وہم فضول ہے
جو بلندیاں ہیں نشیب میں وہی پستیاں ہیں فراز میں

جو بنا یہاں وہ ہی مٹ گیا جو مٹا یہاں وہی بن گیا
یہی..... ایک نئی رسم ہے رہِ عشق شعبدہ باز میں

مقطع ... کاٹا گیا۔

محو جمال

حسن صلاح
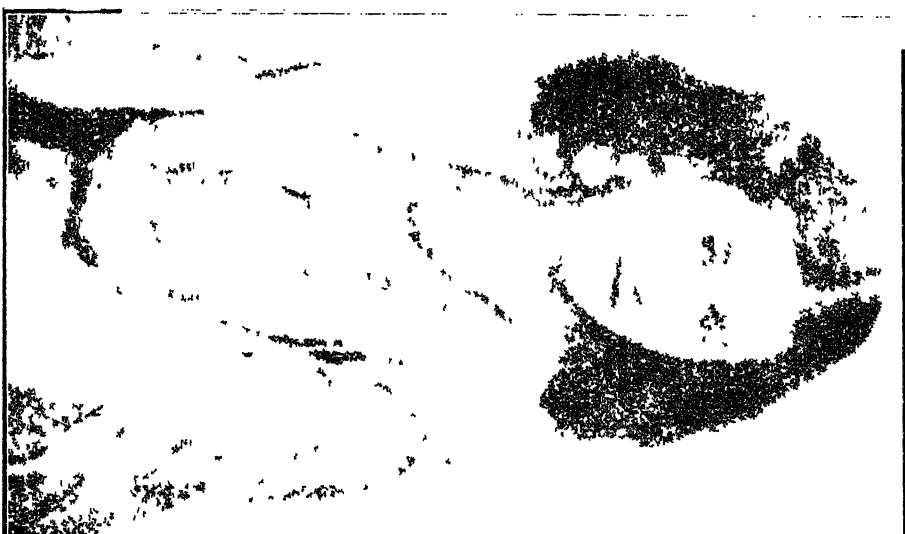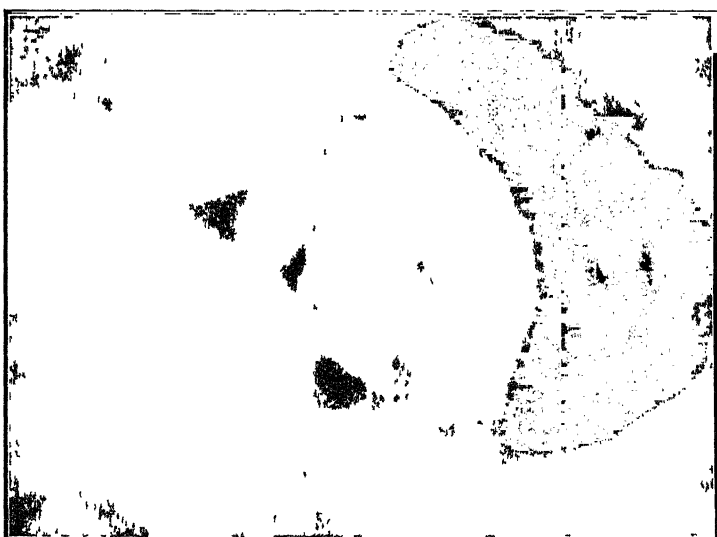
شذرات

ہمیں افسوس ہے۔ کہ اس مرتبہ "مخزن" کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ اور باوجود امکانی مساعی کے جون۔ جولائی۔ اگست کا رسالہ شائع نہ ہو سکا۔ شروع سے ہماری یہ کوشش رہی ہے۔ کہ رسالہ کی اشاعت میں اس نوع کی بے ضابطگیاں نہ ہونے پائیں۔ اور پابندیٔ وقت کا خاص خیال رکھا جائے۔ مگر سچ ہے۔ کہ یہ کوئی ضروری نہیں۔ کہ انسان کی تمام آرزوئیں شرمندۂ تکمیل بھی ہو جائیں۔ تاخیر اشاعت کی اہم وجوہ ہمارے کرمفرما مولوی رشید احمد (خاں رشید مولانا ظہور الدین مالک و مدیر رسالہ المخزن) کی طویل اور خطرناک علالت اور جناب حفیظ جالندھری کی گوناگوں مصروفیتیں تھیں انشا اللہ اگر حالات نے مساعدت کی تو ہم تلافیٔ مافات کی پوری کوشش کریں گے۔ ہم اپنے معاونین خصوصی۔ اور ناظرین کرام سے عفو خواہ ہیں۔ کہ نہیں

زحمت انتظار گوارا کرنا پڑی۔ اور ادارۂ "مخزن" کو اس بے قاعدگی کی طرف بار بار ترش و تند الفاظ میں توجہ دلانی پڑی۔ اور بعض کرمفرماؤں نے تو "چندہ ہضم" کی تعریفیات و تضحیکات سے بھی اجتناب نہ فرمایا۔ خدا ہمیں اس سوءظن کے ازالہ کی قدرت عطا فرمائے اور ہمارے کرمفرماؤں کو "ظن المومنین خیرا" پر عمل کرنے کی توفیق بخشے *

"مخزن" کے کرمفرمائے خصوصی مولوی رشید احمد صاحب کو دو تین مہینے ہوئے موٹر کے مہلک حادثہ سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ کو شدید ضربات آئیں۔ آپ ابھی تک صاحب فراش اور بہت زیادہ نقل و حرکت سے مجبور ہیں لیکن بفضل خدا اب معتد بہ افاقہ ہے۔ ہم خدائے عزّ و جل سے شفاء عاجل کی دعا کرتے ہیں۔

رسالہ کے متعلق ہم ذیل کی اصلاحی تجاویز پر جلد سے جلد عمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

(۱) وقت پر اشاعت۔ ستمبر کا پرچہ وسط اکتوبر میں شائع ہوگا۔ اکتوبر کا انشاء اللہ آخر اکتوبر میں۔ نومبر کا وسط نومبر میں۔ اور دسمبر کا آغاز دسمبر میں نکلے گا۔ اس کے بعد سے ہر مہینہ کا پرچہ اس مہینے کے پہلے عشرہ میں شائع ہوجایا کرے گا۔

(۲) حجم میں اضافہ کا خیال ہے۔

(۳) کاغذ اور سرورق پہلے سے بہتر ہوگا۔

(۴) مضامین کا معیار بڑھانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہندوستان کے چوٹی کے ارباب قلم کی قلمی اعانت حاصل کی جائے گی۔ نومبر کے پرچہ سے بالالتزام ایک مضمون یورپ یا امریکہ کے کسی فاضل کا جو خاص مخزن کے لئے لکھا گیا ہو۔ شائع ہوا کرے گا۔

(۵) ہر ماہ ایک ایسا افسانہ جو متانت اور گہرائی کے اعتبار سے ادب عالی میں شمار کیا جاسکے۔ چھپا کرے گا۔

(۶) نئے مضمون نگاروں کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

(۷) نظم کے حصّہ میں انتخاب کا معیار اور زیادہ بلند کردیا جائیگا نظمیں کم مگر عُمدہ چھپا کریں گی۔

(۸) تصویروں کے متعلق معقول انتظام کیا جائے گا۔

انگلستان کا مشہور مصنف ح۔ج۔ ویلز اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "تاریخ اسلام" کے خاتمۂ سخن پر "مذہب اور تعلیم کے تعلق پر یوں رقمطراز ہے:-

" روح انفرادی و اجتماعی ہیں جن قوتوں نے ہمارے خونخوار۔ کمینہ اور شخصی ہیجانوں کے خلاف جہاد کر کے اس پر تسلّط حاصل کیا ہے۔ وہ مذہب اور تعلیم کی قوتیں ہیں۔ مذہب اور تعلیم کے باہمدگر مربوط اثرات ہی نے اس وسیع انسانی جماعتوں کے وجود کو ممکن بنایا جن کی نشو ونما سے تاریخ عالم عبارت ہے۔ اور اس وسعت پذیر تعاون انسانی کی عظیم الشان داستان میں یہی فاعلانہ قوتیں رہی ہیں۔ ہم نے انیسویں صدی کے ذہنی اور دینی تنازعات میں تعلیم سے مذہب کی اس عجیب علیحدگی کی وجہ معلوم کی ہے۔ جو ہمارے زمانہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور ہم نے دیکھا کہ اس مذہبی نزاع و انتشار کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسیات بین الملی نے پھر مجنونانہ قوم پرستی کی طرف منہ موڑا۔ اور صنعتی اور کاروباری زندگی نے شدید خودغرضانہ نفع کی طرف رجعت قہقری کی ...... لیکن تعلیم و مذہب کی یہ جدائی ایک وقتی چیز ہے۔ اور ہم توقع کر سکتے ہیں۔ کہ خدمت کی عالمگیر آرزو اور قیود ذات سے رہائی جو گذشتہ ۲۵ صدیوں کے تمام بڑے مذاہب کا اصول کار رہی ہے اور جو ستر اسّی سال کی مادی خوشحالی۔ کاہلی۔ اور تشکیک کی وجہ سے بین طور پر زوال پذیر ہو گئی ہے۔ پھر تمام آلائشوں سے پاک ہو کر اپنی سادہ شکل میں رونما ہو گی۔ اور اسے پھر جماعت انسانی کے بنیادی تعمیری قوت کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے گا"

اس خیال کا اکثر اعادہ کیا جاتا ہے۔ کہ یورپ کا موجودہ تمدن تباہ ہو جائے گا، چونکہ اس کی بنیادیں مادیت پر قائم ہیں۔ اور اس کا خمیر روحانی اجزا سے بالکل خالی ہے۔ اور یہ قطعی ہے کہ حیات اجتماعیہ میں یہ عدم توازن ہمیشہ تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ لیکن یورپ کے موجودہ نظام میں ایک جدید عنصر کا اضافہ شروع ہو گیا ہے۔ اور یہ اخلاقی اور روحانی عنصر ہے۔ جس نے جنگ عظیم کے بعد کافی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اگر یہ عنصر موجودہ طمع اور خودغرضی پر غالب آ گیا۔ تو یورپ کے زوال کی پیشگوئیاں

محض خواب ثابت ہونگی۔ لیکن یہ طے کرنا کہ یورپ ان اصولوں کو تسلیم کرکے خود کو تباہی سے بچانے گا۔ اس کا بہتر جواب صرف مستقبل دے سکتا ہے۔ ح۔ج۔ ویلز یورپ میں اس روحانی تحریک کے وجود کے قائل ہیں۔ آپ کا خیال ہے۔ کہ اس وقت مغرب تباہی سے صرف اس لئے بچ سکتا ہے۔ کہ وہاں ایک زبردست روحانی تحریک جاری ہے۔ یہ کس قدر حیرت ناک بات ہے۔ کہ اب متشکک یورپ پھر مذہب کے فردوس گم گشتہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کیا ہم اہل مشرق اس سے سبق اندوز نہیں ہو سکتے؟

رسالہ" ایسٹ اینڈ وسٹ" میں ہندوستان کے مشہور عالمؒ پروفیسر رادھا کرشن کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جو تمام اہل علم اور اہل تعلیم کے لئے قابل غور ہے۔ پروفیسر صاحب کے اس قول سے ہر سمجھدار آدمی اتفاق کرے گا۔ کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا مقصد وسعت خیال اور آزادی نظر پیدا کرنا ہے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ لوگوں کو اپنی تنقید آپ کرنے کی تعلیم دے۔ یہ بھی پروفیسر صاحب نے بالکل بجا فرمایا۔ کہ کسی قوم کی صحیح تعلیم کی بنا اس کے قدیم تمدن کے مطالعہ پر ہونا چاہیئے۔ اس غرض سے نہیں۔ کہ کل روایات کو آنکھ بند کرکے قبول کر لیا جائے۔ بلکہ اس لئے کہ ناقدانہ نظر سے اصل اور فرع جوہر اور عرض میں فرق کیا جائے۔

مگر پروفیسر صاحب کا یہ کہنا کہ ہندوستان کی علمی زبان انگریزی ہی رہنی چاہیئے۔ کیونکہ اس نے ملک میں قومیت و وطنیت کے جذبات کو ابھارا ہے۔ عجب طرح کا استدلال ہے۔ اس منطق کے مطابق یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں ہمیشہ انگریزوں کی حکومت رہنی چاہیئے۔ کیونکہ اس حکومت نے ہندوستانیوں میں آزادی کی خواہش پیدا کی ہے۔

اس میں شک نہیں۔ کہ قومی زبان کا مسئلہ بہت مشکل ہے۔ اور آسانی اسی میں نظر آتی ہے کہ انگریزی زبان اختیار کر لی جائے۔ لیکن آسان طریقے اکثر بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ پروفیسر صاحب اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ کہ انگریزی کا ملک کی آبادی کے ہر طبقے میں پھیلنا ناممکن ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ" اونچے" طبقے کی علمی زبان ہو سکتی ہے۔ مگر" اونچے" اور" نیچے" طبقوں کے فرق کو بڑھانے

سے قوموں کی زندگی میں ایسا انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ جو انہیں برباد کئے بغیر نہیں رہتا۔ اگر ہم اب تک اس پر متفق نہیں ہو سکے ہیں۔ کہ دیسی زبانوں میں سے کون سی زبان "قومی زبان" بنائی جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ذہنی کاہلی سے مجبور ہو کر اس مسئلہ پر غور ہی کرنا چھوڑ دیں۔ اور انگریزی محض اس لئے اختیار کر لیں۔ کہ اس میں "آسانی" ہے۔

ملک میں آج کل سیاسی تحریک کا زور ہے۔ بنگال کے مشہور قائدین .... رہا ہو چکے ہیں۔ پنجاب کے محترم بزرگ مولانا عبد القادر قصوری کی رہائی بھی عمل میں آچکی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو رہا ہو کر گرفتار ہو چکے ہیں .... اس کے بعد نہ معلوم تحریک کی رفتار کیا ہو گی۔ بہرحال ان رہا شدہ زعماء کے اخباری بیانات پڑھ کر یہ ضرور محسوس ہوتا ہے۔ کہ ان میں گرمی اور حرارت نہیں ہے۔ کاش سر سپرو اور مسٹر جیکار کی مساعی مصالحت کا بہتر انجام ہوا ہوتا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ تعمیر کے لئے تخریب بسا اوقات نہایت ضروری ہوا کرتا ہے۔ مگر محض تخریب پر اتر آنا بھی قوموں کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ زعماء قوم کی شعلہ مقالی، اور سیاسیات کی ہنگامہ زائی بالکل مسلم! لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ قوم کے تعمیری لائحہ عمل کو نظر انداز کر دیا جائے۔ آج ہم میں "لیڈروں" کی کمی نہیں ہے۔ "کچھ بسنے بسانے والے" درکار ہیں۔

رباعی

دلا نارائی پروانہ تا کے
نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را بسوز خویشتن سوز
طواف آتش بیگانہ تا کے

اقبال

میخانہ بدوش

(جناب حفیظ الرحمٰن صاحب حفیظ فرخ آبادی)

رندوں کی طلب پہ جب ساقی کو بھی جوش آیا — پیمانہ بکف آیا، میخانہ بدوش آیا

میخانہ کی جانب سے اک بادہ فروش آیا — برہم کنِ صبر آیا، غارتگرِ ہوش آیا

حسرت نے کہا چپ ہو، ارمان ہوئے بیخود — جب نزع کے عالم میں پیغامِ خموش آیا

اٹھ خوابِ عدم سے اٹھ! اب حشر بپا ہوگا — وہ مستِ مئے خوبی خود صور بدوش آیا

شیشے جھکے ساغر پر، ساغر کفِ ساقی میں — میخانے میں رند آئے ہنگامِ خروش آیا

وہ آئے بھی اور آ کر رخصت بھی ہوئے ہم سے — اب آنکھ کھلی اپنی اب ہوش کو ہوش آیا

اللہ کے گھر میں بھی، ایمان رہا قائم — میں کعبہ کے اندر بھی بت خانہ بدوش آیا

اسلام اور مسئلہ نسل

(محمد شریف صاحب بُتنی بی اے رکن اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ لاہور)

دنیا کے نئے نقشے نے اکثر دوراندیش مبصروں اور ماہرین سیاست کے دل میں ایک سوال پیدا کر دیا ہے۔ کہ آئندہ جنگ عظیم کب اور کس جگہ ہوگی۔ اور آیا وحشیانہ طاقتوں کے ذریعے سے نسل انسانی کی سیاسی تفریقات کا انسداد کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس ہنگامہ خیز طریق علاج کو کوئی بھی دیرپا خیال نہیں کرے گا۔ لیکن ساتھ ہی اس طریق علاج کے حامی اور کسی طریقہ کو مستحسن بھی خیال نہیں کرتے۔

امن قائم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ مسئلہ نسل پیدا کرتا ہے، جو لوگ زبان۔ تہذیب اور قومیت کی پیدا کی ہوئی تفریق کو باہم سمجھوتہ سے قابل حل خیال کرتے ہیں وہ بھی مسئلہ نسل کو ایک پرانا اور لا علاج مرض تصور کرتے ہیں نسل کی خصوصیات ایسی ہیں جن سے انسان اپنی پیدائش کے وقت سے لے کر موت تک خلاصی نہیں پا سکتا۔ دنیا کی آبادی کی روز افزوں ترقی اور مختلف اقوام کا باہمی قرب مستقبل قریب میں ہونے والی زبردست اندرونی جنگ کی بیّن دلیل ہیں

علم نسل انسانی ابھی اپنی ایسی ابتدائی منازل میں ہے کہ وہ اس مسئلہ کے حل کے لئے کوئی واضح اصول پیش نہیں کر سکتا۔ علم تشریح الابدان، علم عمارات اور علم اللسان کے موجودہ ماہرین اور علم نسل انسانی کافی طور پر اس کی رہنمائی کرتے ہیں، مگر باوجود اس کے وہ ابھی پختگی کے درجہ تک نہیں پہنچا۔ جو معیار اس نے قائم کر رکھے ہیں۔ ہر روز تبدیل ہو رہے ہیں۔ اور ماہرین علم نسل انسانی کے متعلق متفقہ طور پر کوئی نقشہ تیار نہیں کر سکتے۔ مسئلہ نسل کے علمی پہلو پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے ماہرین فن بھی اس معمہ کو آسان تر بنانے کے لئے رنگ کی تفریق کو معیار قائم کرتے ہیں۔ اور جن میں سے کئی سفید آدمی کے لئے زرد، بھورے۔ سُرخ اور سیاہ رنگ کی نسلوں کی طرف سے خائف کر دینے والے مناظر پیش کرتے ہیں، اور اس قدر بھیانک شکل میں پیش کرتے ہیں۔ کہ ان کے مقابلے میں انسانی دنیا کے دوسرے ہر قسم کے موازنے بالکل ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔

بڑی بڑی قابل ہستیوں نے آنے والے خطرات کے انسداد کے لئے جو وسائل تجویز کئے ہیں۔ وہ افراط کے درجہ تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اور وہ سفید رنگ کی نسلوں کو یا ان نسلوں کو جن کو وہ قریب تر خیال کرتے ہیں سب پر

ترجیح دیتے ہیں، اور ان کے نقطۂ نظر سے نسل انسانی کے اس حصہ کی محافظت پر باقی تمام نسلوں کو بھینٹ چڑھا دینا چاہیے۔ ہمارے خیال میں اگر اعلےٰ نسل کی طرف سے ایسا رویہ اختیار کیا گیا۔ تو وہ دنیا میں نسلوں کے قیام کے لئے ایسی ہنگامہ خیز جنگ کی بنیاد ہو گی۔ جس کے مقابلے میں گذشتہ جنگ عظیم بازیچۂ اطفال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھے گی۔ تاہم اگرچہ ہم کو ایسے وسائل سے جو وحشیانہ اور ناقابل عمل ہیں اجتناب کرنا چاہیئے۔ ہمیں ان خیالات کے اشخاص سے مسئلہ نسل کو اقوام یورپ کے مابین سیاسی توازن قائم رکھنے کے مسئلہ سے بھی ہراسان کن خیال کرنے میں تامل نہیں +

اِن حالات کے ہوتے ہوئے ہر شخص تاریخ کی رہبری کا متلاشی ہے۔ کیوں کہ مسئلہ نسل صدیوں ہی سے حل طلب چلا آرہا ہے۔ اسلام ایسا بین الاقوامی مذہب اس مسئلہ کے حل میں یقیناً ہماری راہبری کر سکتا ہے +

اب ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ اصول اسلام کو پیغمبر اسلام ؐ کی تعلیم سے وہی نسبت ہے، جو ایک بہت بڑے درخت کو اس بیج سے ہو سکتی ہے۔ جس سے وہ پیدا ہوا ہے۔ اور اس اسلامی شجر کے پھلنے پھولنے میں قریباً تین صدی کا عرصہ صرف ہوا۔ اسلام کے ان مبلغوں نے جنہوں نے اس زمانہ میں اسلامی ممالک مثلاً عرب، مصر، شام۔ عراق اور ایران میں تحریر و تقریر سے اس تعلیم کی تبلیغ کی، اگرچہ ظاہر میں وہ اس الہامی قانون کے شارح تھے۔ مگر حقیقت میں انہوں نے قانون سازی کا کام سر انجام دیا۔ ان کا ایمان اس قدر پختہ تھا۔ کہ وہ فرضی روایات کے ذریعے بڑی جرأت سے سب کچھ پیغمبر اسلام ؐ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور وہ وہی چیز تھی جو اگر ان کے وقت تک آنحضرت ؐ موجود ہوتے تو خود کہتے۔ اِس لئے جب کبھی بھی پیغمبر اسلام کی ذاتی رائے معلوم کرنا ہو تو ہمیں قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جو الہامی حقائق و معارف و بصائر کا مجموعہ ہے، اسلامی نظام قانون، خواہ وہ غیر فانی ہو یا عقائد سے متعلق اس نے مسلمانوں کی انفرادی، اجتماعی اقتصادی اور سیاسی زندگی کے واسطے ہمیشہ کے لئے اصول مرتب کر دیئے ہیں دسویں صدی عیسوی میں وہ انہی تمام خصوصیات کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس قانون کی جزئیات و تفصیلات میں ہمیشہ اختلاف رائے رہا۔ اِس کے علاوہ بھی اگرچہ اسلامی سوسائٹی میں حقیقی اصول اور معاشرت کے طریقوں میں امتیاز قائم رہا تاہم تمام دنیا کے مسلمان بہت سے معاملات میں نمایاں طور پر متفق ہیں۔ مسلمانوں کے متفقہ طور پر اس عالمگیر نظام عمل کو اپنا بین الاقوامی مطمح نظر بنانے کی اہمیت کے متعلق جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے +

پیغمبر اسلام نے کوئی نیا مذہب پیش نہیں کیا۔ جیسا کہ انہوں نے فرمایا۔ ہمارا مذہب وہی مذہب ہے جو آدم سے لے کر قیامت کے دن تک ایک ہی رہے گا، ہاں یہ وہی مذہب تھا جو ان سے پہلے آنے والے نبیوں نے پیش کیا۔ کئی بار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بڑے زور سے فرمایا ہے کہ اُس نے آنحضرتؐ کو ایک ایسی قوم کا ہادی بنا کر بھیجا ہے۔ جس کے پاس اس سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا گیا تھا۔ قرآن مجید میں لفظ "عربی" گیارہ بار دہرایا گیا ہے۔ اور یہ صرف اس بات کی تائید میں ہے کہ یہ وحی صاف عربی زبان میں نازل کی گئی ہے اور جس کا کوئی لفظ مبہم نہیں +

ان واضح بیانات میں کوئی اختلاف نہیں کہ محمدؐ صلے اللہ تمام دنیا کے لئے ہادی اور رہبر بنا کر بھیجے اور قرآن مجید کی دوسری آیات بھی آنحضرت کو اور ان کی تعلیم کو انسان اور بنی نوع انسان کے لئے اور تمام دنیا کے لئے رحمت ثابت کرتی ہیں،

قدرتی طور پر قرآن مجید کی تعلیمات کا یہ عالمگیر اطلاق نومسلم عربوں کے لئے تسخیر عالم کا باعث ہوا اور ان کی اتنی زبردست فتوحات صرف اسی روح پر مبنی تھی، جو ہادیٔ اسلام نے اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہونے والوں میں پھونک دی تھی مگر اسکے ساتھ ہی مستقبل کے اثرات کا پیغمبر اسلام کو نہ صرف علم ہی تھا بلکہ انکے مجوزہ لائحہ عمل کا یہی ناگزیر نتیجہ بھی تھا +

عیسائیوں اور یہودیوں کی متبرک کتابوں کی طرح اسلام بھی انسان کا سلسلۂ نسب حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواؑ سے شروع کرتا ہے اور باوجود انسانوں کی جداگانہ انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کے مساوات کا سبق دیتا ہے +

قرآن مجید میں اس نے انسانوں کے رنگ اور زبان کی کثرت کو زمین اور آسمان کی تخلیق سے دوسرے درجہ کی اہمیت دی ہے۔ اور اس کو خداوند عالی کی قدرت کاملہ کا زبردست ثبوت قرار دیا ہے۔ لیکن اُس کی علتِ غائی بیان نہیں کی۔ اِس نقطۂ خیال سے پیغمبر اسلام نے نوع انسانی میں باہمی مخاصمت کا مقابلہ کرنا مناسب نہیں سمجھا انہوں نے مساوات کے اصول کو عربوں سے اس فرقہ دار تعصب کو جس نے انہیں بہت سے فرقوں میں تقسیم کر رکھا تھا مٹانے میں استعمال کیا۔ یہی سبب تھا کہ وہ عربوں کی خانہ جنگی کو مٹا دینے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ انہوں نے مساوات کے عام اصول کو سب سے منوا لیا۔ اور حلقہ بگوشانِ اسلام کو اس طریق سے مجتمع کیا کہ دنیا کو حیران کر دینے والے کارنامے ان سے ظہور پذیر ہوئے +

یہ اصول مساوات قرآن مجید میں ملتا ہے۔ جو صاف طور پر باہم جھگڑوں، لعن و تشنیع۔ حقارت اور نفرت

کی مخالفت کرتا ہے اسلام کی تعلیم ہے کہ:۔

"مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اِس لئے آپس میں اتفاق سے رہو اور خدا سے ڈرو۔ شائد کہ تم فلاح پاؤ۔ اے ایمان والو ایک دوسرے پر مت ہنسو۔ . . . .

. . . . اے لوگو ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور تمہیں مختلف گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ تاکہ تم ایک دوسرے میں تمیز کر سکو۔ تم میں خداوند تعالےٰ کو وہی عزیز ہے جو اس سے زیادہ ڈرتا ہے تحقیق اللہ تعالیٰ سب علموں کا جاننے والا ہے۔"

یہاں انسان کا ظاہری اور باطنی فرق قطعی طور پر نہایت سادگی سے بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس سے انفرادی اور اجتماعی امتیازات کے سوا اور کوئی مقصد نہیں اور انسانی بلندی کا معیار خداوند تعالےٰ نے اتقا و اپنے ہم جنسوں کی طرف مخلصانہ جذبات کے اظہار کو قرار دیا ہے +

اسلام کے تمام اصولوں میں اسی اعلےٰ معیار کو قائم رکھا گیا ہے اور اس بنا پر اس نے انسانیت کو تین حصوں میں یعنی مہذب۔ نیم مہذب اور غیر مہذب میں تقسیم کیا ہے جو ہم میں موجود ہیں چنانچہ ۶۵۰ء سے ۱۰۰۰ء تک جو اسلام کی ترقی کا زمانہ ہے تہذیب کا معیار مذہب تھا۔ . . . . پہلے درجہ کے لوگ مسلمان تھے۔ جن کے سینے نور اسلام سے منوّر تھے۔ دوسرے درجہ کے لوگ وہ اہل کتاب تھے یعنی عیسائی اور یہودی جو اسلام کی پیروی نہ کرنے سے ابھی تک تاریکی میں تھے۔ اور جن کو اپنے اخلاق سے متاثر کر کے مسلمان اپنے ساتھ ملا سکتے تھے۔ اور تیسرے درجے کے وہ لوگ تھے۔ جن کو ترغیب سے یا زور سے تہذیب انسانی میں داخل کیا جا سکتا تھا اور برے حالات میں مہذب دنیا کے لئے اُن کو بے ضرر بنایا جا سکتا تھا۔ تہذیب کا معیار مذہب کے بغیر بھی قرار دیا گیا۔ تاکہ دوسرے درجہ کی اقوام میں وہ لوگ شامل ہو سکیں۔ جن کی کتابوں کو اگرچہ اسلام نے الہامی تسلیم نہیں کیا تاہم ان کی اخلاقی بلندی کی وجہ سے ان کو اہلِ کتاب میں شامل کر لیا گیا +

وہ عظیم الشان اسلامی سلطنت جو آٹھویں صدی میں مراکش اور سپین سے لے کر چین کی دیواروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ جس نے بہت سی پرانی سلطنتوں کو اپنے میں جذب کر لیا تھا، اور ابھی جس کی وسعت کی شاندار امیدیں تھیں۔ اور جو جنوبی اور مشرقی یورپ کے لئے ایک مستقل خطرہ خیال کی جاتی تھی۔ قرونِ اولیٰ میں یقیناً اعلےٰ تہذیب کی علمبردار تھی۔ اس وقت اسلام کے لئے لوگوں کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کی اتنی ضرورت نہ تھی جتنی آج دنیا کو خود بخود اس مشن کے اختیار کرنے کی ہے۔

نسل کے اختلاف کے متعلق جو اصول تھا۔ وہ نہ صرف قرآن مجید کی تعلیم کے عین مطابق تھا بلکہ اس کو آنحضرتؐ کی روایات سے جن میں عرب قوم کے علاوہ دوسری اقوام کو بھی ویسی ہی فوقیت دی گئی ہے زیادہ تقویت ملی۔ عرب غیر عرب سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ اس سے زیادہ پرہیزگار نہ ہو۔ ان میں سے ایک روایت ہے جس کو آنحضرتؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے +

اگر ہم اس حیران کن جرأت کو ملحوظ رکھیں۔ جس کا عربوں نے اسلام کی ترقی کے لئے دنیا میں مظاہرہ کیا تو اس اصول کا بار بار دہرایا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ خانہ بدوش قبائل مذہب کی رو سے متحد ہو گئے۔ اور اپنے بنجر علاقوں سے باہر نکل پڑے تو وہ مہذب اقوام پر حکومت کرنے کے قابل ہو گئے، . . . . وہ اس بات کے اہل ہو گئے۔ کہ مفتوح اقوام کے نظام حکومت کو فاتح قوم کے مفاد کے مطابق تبدیل کر کے ان میں سے لاکھوں کو اپنے ہادی کے جھنڈے تلے جمع کر لیں +

عربی زبان نے عرب سپاہیوں سے کچھ کم کام نہیں کیا۔ ممالک وسطےٰ میں اس نے قریب قریب تمام مقامی زبانوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا۔ اور آج تک غیر ممالک کے لوگ اہل شام، اہل مصر، شمالی افریقہ اور عراق عرب کے باشندوں کو عربوں کے نام سے پکارتے ہیں۔ مسلمان ہونا عرب ہونے کے مترادف تھا۔ ریگستان کی اس معجز نما زبان نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنے آپ کو نہایت پیچیدہ مذہبی مسائل۔ علم قانون عدالت۔ فلسفیانہ معموں اور تمام دنیا کی تاریخ جغرافیہ علم اللسان۔ صرف و نحو اور نظم و نثر پر نہایت معیّنت سے بحث کرنے کے لئے ایک زبردست آلہ کار بنا لیا۔

اس زمانے میں مسلمان ہو جانے کا مطلب عرب بن جانے کے مترادف تھا۔ نئے حلقہ بگوشان اسلام عربی نام اختیار کر لیتے تھے۔ اور وہ عربی قبائل کے (Clients) 'موکل' کی حیثیت سے ان میں شامل کر لئے جاتے تھے۔ اور کوشش کرتے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنے آپ کو صحیح النسل عربی بنائیں۔ یقیناً اسلامی حکمت اور علوم عربوں کی بہ نسبت غیر عربوں کے زیادہ غیر مرہون احسان ہیں۔ جب ہم قرون وسطےٰ میں اعلےٰ عربی علوم اور حکمت سے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو ان سے مراد وہ بین الاقوامی علوم و حکمت ہیں۔ جن کا وسیط عربی زبان ہے۔ سب سے پہلے ترکی اور پھر فارسی زبان تھی۔ جس نے عربی سے دوسرے درجہ پر جگہ حاصل کی۔ اور یہ بھی اس وقت ہو سکا۔ جب کہ عربی لغت کا بہت بڑا حصہ ان زبانوں میں شامل ہو گیا۔ مسلمانان ملایا، چین، ہندوستان۔ ایران۔ ٹرکی اور مصر کو اپنی مذہبی تعلیم کے ابتدا میں عربی قرآن مجید کو ٹھیک ٹھیک پڑھنا ہوتا ہے، اور نماز بھی جو کہ ہر روز وہ پانچ وقت ادا کرتے ہیں۔ عربی زبان میں ہے۔ جمعہ کے دن اور ہر سال عیدین کے موقعہ پر ان کو خطبہ بھی عربی زبان

میں سُننا ہوتا ہے - اگرچہ اپنی زبان میں دعا مانگنے کی ان کو پوری پوری اجازت ہے - لیکن مذہبی مواقع پر وہ عربی زبان میں دعا مانگنے کو ترجیح دیتے ہیں - اسلامی دنیا کے تمام بڑے بڑے ممالک میں ایسے لوگ موجود ہیں - جو دنیا کے دوسرے سرے پر کے مسلمان بھائیوں سے عربی زبان میں بخوبی گفتگو کر سکتے ہیں -

اسلامی عالمگیر اخوت و اتحاد کی ایک مثال مسلمانوں کی یہ مشترکہ زبان بھی ہے - نہ تو عام مُسلمانوں کا طرزِ عمل ان عربوں کی نقل ہے جو آنحضرت صلعم کے عہد میں موجود تھے، اور نہ عام عربی زبان ہی قرآن مجید کی اور پرانے شعرا کی زبان سے ملتی ہے - لیکن انسانی زندگی کے وہ عام اوصاف ان عربی تأثرات کا نمونہ ہیں - جو اسلام کی احیاء کے وقت سے لیکر تین سو سال تک اسلامی ممالک کے لئے مخصوص تھے، اور مسلمان خواہ وہ کسی جگہ کے ہوں کسی دوسری دو بین الاقوامی شخصیتوں کی بہ نسبت ہر طرح باہم سمجھوتہ پر بہت جلد پہنچ جاتے ہیں +

نومسلم عربوں کی قابلِ رشک کامیابی ایک ایسا معمّا ہے جو ایک یا دو سبب بیان کر دینے سے حل نہیں ہو سکتا - لیکن ان میں سے سب سے بڑا سبب آنحضرت صلعم کا اپنی پُر معنی تعلیم کو عربوں تک ہی محدود رکھنا تھا - جب حالات نے اس عربی پیغام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کیا - تو اسلام پر اس وقت اس قدر عربیت چھائی ہوئی تھی، کہ غیر عربوں کو اس سے مانوس کرنے اور طبائع کو اس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لئے کسی حد تک زبان .. تبدیل کرنا پڑی

یہ تاریخی ترقی عربوں کے دماغ کو آنحضرت صلعم کی مساوات کی تعلیم سے پورا پورا متاثر کرنے کے لئے کافی نہ تھی - اس پہلی صدی میں اوّلین اسلامی سلطنت واقعی عربی سلطنت کہلانے کی مستحق ہے، محکوم اقوام کے لئے اور خاصکر اُن لوگوں کے لئے جو اسلام سے پہلے تہذیب کی بلندی تک پہنچ چکے تھے، عربی زبان کی فوقیت تعدّی خیال کی جاتی تھی، مگر افراد، خاندان اور اقوام کے بجنسہٖ عربیت کے رنگ میں رنگے جانے سے اس تعدّی کا احساس کم ہوگیا - لیکن اِس کا استعمال محدود تھا، اور تمام نومسلم اس طرح کی تبدیلی کے حق میں نہ تھے - آخر کار اپنی خصوصیات کی بنا پر انہوں نے اپنی برتری یا کم از کم مساوات کا تقاضا کیا، اکثر عرب جن میں مسلمان ہو جانے کے بعد بھی غیر اسلامی اثرات باقی تھے، اس تقاضا کو منظور کرنے کے لئے تیار نہ تھے، اِن اصحاب کے خلاف جنہیں آنحضرت صلعم کی مجلس میں زیادہ تقرب حاصل تھا انہوں نے نہایت نفرت کا اظہار کیا +

لیکن اس کا ردّ عمل ضروری تھا - عباسی خاندان کے دَور ۷۵۰ء کے بعد ایرانی اور ترکستانی اِن پر فوقیت حاصل کر گئے - اسلام کی تیسری اور چوتھی صدی میں نسلی امتیاز کے متعلق زبردست مواد پیدا ہو گیا تھا اور

اب اس دَور ابتلا میں عربی مخصوص حقوق کے مخالف خود مساوات قائم رکھنے پر رضا مند نہ تھے، اور انہوں نے مذہبی اور غیر مذہبی قدیم تاریخ سے عربوں کے ان سے ادنےٰ ہونے کا اعلان کیا، اور اس ہنگامے میں تقریباً تمام نومسلم اقوام نے حصّہ لیا۔ غیر عرب مخالفین نے اپنی بحث کی بنیاد قرآن مجید کی اس آیت کو ٹھہرایا جس میں انسانوں کو شعوب میں تقسیم کرنے کا ذکر ہے، اور اس لفظ کو خاص طور پر غیر عرب نسلوں کی طرف منسوب کیا، اور دوسرے لفظ سے عرب قبیلہ مراد لیا اس لئے نسلوں کے معاملے میں سرگرمی دکھلانے والے غیر عرب (شعوبیہ) کے نام سے موسوم ہو گئے۔ عربانؔ وحبیوںؔ کے اعتراضات کی بڑے زور سے تردید کرتے تھے، اور یہ بڑے لطف کی بات ہے کہ عربی نظم ونثر کے تمام حربے جو دونوں طرف سے استعمال کئے گئے، ضخامت کے لحاظ سے خوش کن اور حقیقت میں خشک لٹریچر سے بڑھ کر نہیں ہیں، اور مزید برآں ان میں سے بعض ایسی شعوبی عربی الاصل ہیں اور بعض بالکل نہیں۔

ادب ان تحقیر آمیز تحریروں کا ایک مجموعہ بن گیا۔ لیکن اس کے پیدا کرنے والے نہ تو عوام ہی تھے اور نہ اہلِ قلم۔ ان تحریروں سے باوجود اس امر کے کہ اسلامی خصوصیات کی بنا پر عربوں کی شرافت تسلیم کی گئی مساوات کا اصول زیادہ پختہ ہوگیا، یہ اصول کسی خلیفۂ اسلام کو جب تک کہ وہ قبیلۂ قریش سے نہ ہو، تسلیم نہیں کرتا تھا، اور یہ قانون جو چھٹی صدی یعنی سلطنت عباسیہ کی زوال پذیر ہونے تک معرض عمل میں آتا رہا محض ایک نظریہ تھا، قانون کے کئی شارح اس بات کے حق میں ہیں کہ کسی عربی عورت کی شادی کسی غیر عرب سے، قریش کی غیر قریش خاندان میں، آل سادات کی کسی عورت کی شادی کسی اور خاندان کے مرد کے ساتھ ناپسندیدہ شئے ہے اور صرف خاص وجوہ کی بنا پر اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، مگر شرافت کا یہ معیار اس قدر اہمیت اختیار نہیں کرسکا کہ وہ عقائد میں شامل ہوسکے۔ مختلف ممالک میں شادی بیاہ کا رواج وطریق تمدنی ومعاشرتی حالات کے مطابق رہا۔ چونکہ عثمانیہ خاندان نے چھٹی صدی میں فوقیت حاصل کرلی تھی۔ اس لئے اہل قلم اور عوام نے بھی غیر قریش بلکہ غیر عربی النسل خلیفہ کی مخالفت ترک کردی۔ آنحضرتؐ کے بعد آپ کے خاندان کے لوگوں نے اس قسم کے رسائل لکھے جن میں اس امر پر بحث کرتے ہوئے کہ کسی شخص کی فوقیت اس کے اعمال وخصوصیات پر مبنی ہے نہ کہ نسب پر تر کی خلفا کی حمایت کی ہے۔

اسلامی ممالک میں عملی طور پر نسب اور رنگ کا سوال لوگوں کے اعلےٰ مناصب پر متمکن ہونے میں حائل نہیں ہوا ایرانی۔ ترک۔ منگول۔ بربری اور حبشی بڑے بڑے علوم کے ماہر ہوئے، اور سلطنت کے معتدد مناصب پر متمکن ہوتے رہے، اسلام نے سب نسلوں کو ایک جیسا موقع دیا اور سب نے اپنی استعداد کے مطابق اس سے فائدہ اٹھایا،

تعلیم کے مواقع پر مکہ معظمہ کی مسجد میں طالب علم اور استاد مختلف رنگ۔ مثلاً سیاہ۔ سرخ زرد۔ اور سفید ہوتے کے باوجود برادرانہ حیثیت میں جمع ہوتے، اور ایسا ہی نظارہ بعض اوقات اہلِ مدینہ نے پیش کیا ہے اور کبھی کبھی تو ایک ہی خاندان سے یہ سب چیزیں ظہور میں آتی تھیں۔ اگرچہ قدیم باہمی منافرت جس کے متعلق قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیت میں بحث ہوئی ہے، ابھی تک پوری پوری دور نہیں ہوئی۔ لیکن مساوات کا اصول قولاً و فعلاً عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مشرقی ممالک میں اہل یورپ کی اصلی حکمت عملی پر بحث کرتے ہوئے اسلامی اخبار اس پر فخر کرتے ہیں، کہ جہاں مغربی استعمار نے رنگ اور نسل کی بنا پر رعایا کی محافظت یا نوآبادیوں کے فلاح و بہبود کے بہانے سے ان اقوام کو غلام بنا لیا ہے، وہاں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ اس نے ایسی تعلیمات کی کبھی حمایت نہیں کی، اور اسلامی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔

تمام بنی نوع انسان کو ایک ہی جھنڈے تلے جمع کرنے میں اسلام کو پوری کامیابی نہیں ہوئی اور اکثر اشخاص نے اس مذہبی اعتقاد کو جو اس قسم کی تہذیب کی بنا ہے تسلیم ہی نہیں کیا۔ قانون اسلامی کے اس حصے نے جس کے ناقابل تبدیل اصولوں سے تمام انسانوں کی زندگی کو باقاعدہ بنانا مقصود تھا، وہ مواقع اور وہ حالات بتا دیئے۔ جن سے اس کے عالمگیر قانون کی صورت اختیار کرنے کی اہمیت پیدا ہوئی۔ باوجود اس اسلامی اصول کے خلفائے اسلام کے اختلاف اور باہمی جنگ و جدل کے باعث ان کی سلطنتیں بہت سی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو گئیں اور یہ اتحاد زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ لیکن اسلام کے قانون نسل نے اس بین الاقوامی شہرت رکھنے والی قوم کی ابتدائی ترقی میں بہت مدد کی۔ اور اس کی عزت کو ہمیشہ کے لئے چار چاند لگا دیا۔

محمد صلعم نے اسلام کے نیا مذہب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور عیسائیت نے جس کو آپ نے اس قدر وقعت دی ہے پہلے ہی سے یہودی اور عیسائی وحشی اور مہذب علاقوں کے باشندوں، عبد و حر کی تفریق کو مٹا دیا تھا۔ لیکن محلس اقوام نے جو آنحضرت ؐ کے اصولوں پر قائم ہوئی تمام بنی نوع انسان کے لئے مساوات کا جھنڈا اس شان و شوکت سے بلند کیا۔ جس سے تمام اقوام کے سر شرم سے جھک گئے۔ اسلامی عہد میں سفید عیسائیوں کے گرجے سیاہ عیسائیوں کے لئے کھلے تھے، مسلمان عام طور پر عیسائیوں کی پس افتادگی اور تنگدلی کی مثالیں پیش کیا کرتے ہیں، کہ فلاں مبلغ سے اس لئے ترک موالات کیا گیا۔ کہ اس نے ایک حبشی عورت سے شادی کر لی تھی۔ یا فلاں شخص کو بلا تحقیق کسی نامعلوم جرم کی پاداش میں مار پیٹ کی گئی۔

اقوام عالم میں اتحاد یگانگت و مساوات و اخوت پیدا کرنے میں جس طرح مسلمان کامیاب ہوئے دنیا کی اور کوئی مہذب سے مہذب قوم نہ ہو سکی۔

قلبِ مُضطر

(اندر جیت شرما ماچھرہ ضلع میرٹھ)

اے میرے قلبِ حزیں تو پیکرِ تنویر ہے
جلوہ گاہِ نازِ حسن و عشق کی تصویر ہے

آشکارا ہو گئی ناداں! تیری وارفتگی
تیرے پہلو میں بجا کرتا ہے سازِ سرمدی

دیوتا خود ہے مگر اسیر بھی بیچارہ ہے تو
جادۂ تاریک میں گمراہ سیّارہ ہے تو

رات کو آراستہ ہوتی ہے جب بزمِ فلک
پردۂ ظلمت سے آتی ہے ستاروں کی جھلک

اشک کا شعلہ جو ہوتا ہے بھڑک کر جلوہ زا
موجزن سینہ میں ہو جاتا ہے دریا نور کا

چپکے چپکے اشک کی لڑیاں پرو لیتا ہے تو
ہارِ اُلفت کا بنا لیتا ہے اِک بہرِ گلو

پردہ دارِ عشق ہو کر ہو گیا رسوائے حُسن
بن کے مجنوں کس لئے پھرتا ہے اے لیلائے حُسن

ہندوستان کی صنعت

موجودہ دور تہذیب و تمدن میں دولتمند ملک وہی ہوگا۔ جس میں صنعت زیادہ ہوتی ہو۔ ملک بے صنعت دیدۂ بے نور ہے، صنعت میں آرام و آسائش کی چیزیں اور ہر قسم کی ضروریات ہوا کرتی ہیں۔ جو ملک اپنے روزانہ کام کی چیزیں بھی نہ بنا سکتا ہو اس کو کوئی حق نہیں ہے، کہ دنیا میں سربلندی کے ساتھ زندہ رہے ٭

ہندوستان اور دنیا کے تمام ممالک کی صنعتیں دو قسم کی کہی جا سکتی ہیں۔ ایک گھریلو جس کو انگریزی میں (Village Domestic Industry.) کہتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ دوسری قسم مشین انڈسٹری ہے۔ یہ خاص خاص مقامات پر جغرافیائی حالت کے ماتحت ترقی کرتی ہے:

ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت بُننے کی چیزوں پر مشتمل ہے روئی، اُون، سن اور سلک مختلف اشیاء ہیں جن سے مختلف مقامات پر مختلف قسم کے کپڑے بُنے جاتے ہیں ٭

روئی:- کے پیدا ہونے کے لئے کافی گرمی اور تری کی ضرورت ہے۔ کالی زمین اس کے لئے بہت مفید ہے ان وجوہ کی بنا پر اس کی اچھی اور زیادہ پیداوار ریاست حیدر آباد۔ صوبہ متوسط اور برار میں ہوتی ہے ہلکی قسم کی روئی پنجاب کے مشرقی، راجپوتانہ کے جنوبی صوبہ متحدہ کے مغربی اور احاطہ مدراس کے جنوبی حصوں میں ہوتی ہے۔ دریائے سندھ کے ڈیلٹا کے جنوبی حصوں میں کچھ اور ہلکی قسم کی روئی پیدا ہوتی ہے٭

صنعت اِس مقام پر ترقی پذیر ہو سکتی ہے۔ جہاں کچا سامان آسانی سے فراہم کیا جا سکے۔ اِس کے بعد قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملک کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت مزدوری کا سستا ہونا اس کی ترقی میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ روئی کی صنعت کے لئے تر ([illegible]) آب و ہوا کی سخت ضرورت ہے، اب ہم آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں کہ ہندوستان میں روئی کی صنعت کن کن مقامات پر ہوگی ٭

صوبہ متوسط، برار اور ریاست حیدر آباد میں روئی کی پیداوار کے سبب، تر آب و ہوا، الیکٹرک کا پاور مل جانے کی وجہ سے شہر بمبئی روئی کی صنعت کیلئے مشہور اور خاص ہوگیا ہے۔ صوبہ بمبئی میں دو اور شہر احمد آباد اور شولاپور بھی اِس صنعت میں خاص ترقی کر رہے ہیں، ہندوستان میں روئی کی ملیں سب سے زیادہ صوبہ

بمبئی ہی میں ہے اور بمبئی صوبہ کا صدر مقام اور ایک عمدہ قدرتی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے اس صنعت کا بھی صدر مقام ہو گیا ہے ۔ مزید برآن یورپ کے قرب کی وجہ سے اور رنگون کی درآمد کی وجہ سے بھی یہ صدر مقام ہو گیا ہے۔ صوبہ متوسط میں ناگپور بھی روئی کی صنعت کے لئے ایک اچھا مقام ہے ۔ پنجاب میں لاہور اور صوبجات متحدہ میں کانپور میں یہ صنعت رو بہ ترقی ہے ۔

بمبئی میں ایک انجمن (Indian Central Cotton Commitee) کے نام سے قائم ہے ۔ وہ ہر قسم کی معلومات ان کاشتکاروں کے لئے فراہم کرتی ہے ، جو روئی کی کاشت کو ترقی دینا چاہتے ہوں ۔ عمدہ قسم کے بیج ان کے لئے مہیا کرتی ہے ۔ اور زمانہ حاضرہ کی نئی تدابیر سے ان کو آگاہ کرتی ہے ۔ بہتر سے بہتر کھاد جمع کرنے کی تدابیر بتاتی ہے ۔ کھاد فروخت کرتی ہے ۔ اگر اس انجمن نے ترقی کر لی اور ہندوستانی کاشتکاروں نے اس کی طرف توجہ کر لی تو ایک دن وہ بہت اچھی روئی پیدا کرنے لگیں گے ، جو امریکہ کی روئی سے کسی طرح ہلکی نہ ہوگی ۔

سن : ۔ روئی کے بعد سن ہی سب سے زیادہ ضروری حصہ صنعت ہے ۔ سن کی پیداوار کے لئے بہت زیادہ گرمی اور بہت زیادہ بارش کی ضرورت ہوتی ہے ۔ میدانوں کے سوا دوسری جگہ بہت کم اگتی ہے ، اس میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ ہر سال مٹی نئی ہونی چاہیئے ۔ انہی وجوہ کی بنا پر یہ سوائے بنگال کے اور دنیا کے کسی حصہ میں پیدا نہیں ہو سکتی ۔ سن کی بوریاں بنتی ہیں ۔ جو گیہوں پیدا کرنے والے ممالک کو کثرت سے بھیجی جاتی ہیں دنیا میں گیہوں کی تجارت کا اندازہ کرو ۔ اور اس کے لئے ان بوریوں کی بھی وہ صنعت ہے جس کے لئے ہندوستان دنیا کے دوسرے ممالک سے ممتاز نظر آتا ہے ۔ لیکن انتہائی بدقسمتی ہے کہ یہ صنعت ہندوستانی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں بالکل نہیں ۔ انگریز سرمایہ دار اس صنعت پر قابض اور متصرف ہیں ۔ بنگال کے قصبہ جات میں عموماً اور کلکتہ میں خصوصاً اس صنعت کے لئے ملیں ہیں ۔

علاوہ ان بوریوں کے اس سے عمدہ قسم کے کپڑے قالین اور کمبل وغیرہ بُنے جاتے ہیں ۔ پہلے سن کا بیشتر خام حصہ ڈنڈی (اسکاٹ لینڈ) کو بھیج دیا جاتا تھا ، لیکن اب یہ برآمد الحمد اللہ کم ہو گئی ہے ۔

جنگ عالمگیر کے دوران میں یہ صنعت زیادہ رو بہ ترقی تھی ۔ کیوں کہ بعض بعض جگہ مٹی کے بورے دریاؤں میں ڈالکر پل باندھے جاتے تھے ، اور بعض جگہ فوج کے اردگرد دیواریں بنائی جاتی تھیں ۔

اون : ۔ یہ صنعت ہندوستان میں اصول کے ماتحت قریب قریب ناپید ہے ۔ کانپور میں صرف دو ملیں ہیں ۔

پنجاب میں بھی ایک دو ملیں ہیں۔ گھریلو صنعت کے طور پر کشمیر میں البتہ یہ صنعت کچھ پائی جاتی ہے۔ پرانے طریقوں سے امرتسر میں بھی اس کا کام ہوتا ہے۔ یہ صنعت زیادہ تر پنجاب ہی میں ہے۔ کیونکہ وہاں کی خشک آب و ہوا بھیڑوں کے لئے مفید ہے، جو اس صنعت کیلئے سب سے ضروری چیز ہے۔

ریشم:- ریشم ایک کیڑے کا لعاب ہے۔ یہ کیڑا شہتوت کے درخت کی پتیاں کھاتا ہے۔ ہندوستان میں میسور اور آسام کے علاقہ میں شہتوت پیدا ہوتا ہے، اور وہیں یہ صنعت ہے۔ لیکن دیہاتی اور گھریلو ہے۔ ہندوستان ہی دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جہاں یہ صنعت پرانے طریقوں سے زندہ ہے، ہندوستان کا ریشم بھی وہ تی کی طرح بڑھیا نہیں ہوتا ہے۔

چمڑا:- چمڑے کی صنعت ان حصص میں ہوگی جہاں ببول کی چھال، ہیڑہ آنولا بہ کثرت پایا جاتا ہو۔ ہندوستان کی فوج اور پولیس پبلک سے زیادہ اس صنعت کی معین و مددگار ہیں۔ چمڑے کی صنعت کے لئے ہندوستان میں دو خاص مقامات ہیں، مدراس جنوبی ہند میں اور کانپور شمالی ہند میں۔ ان دونوں شہروں کے آس پاس ببول کا جنگل ہے۔ ہیڑہ اور آنولا جو دباغت اور رنگنے کے خاص عنصر ہیں یہاں ملتے ہیں، اس وجہ سے یہ صنعت یہاں ترقی پذیر ہے۔ ہندوستان کا سب چمڑا انہی دو مقامات پر جمع ہوتا ہے۔ کانپور کے دریائے گنگ پر ہونے کی وجہ سے اور مدراس کے ساحل سمندر پر ہونے کی وجہ سے پانی نہایت آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ ان مقامات میں مزدوری بھی سستی ہے۔ اور یہی اسباب اس کی ترقی کے ہوتے ہیں۔ صوبہ پنجاب میں بھی اس کی ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔

شمالی ہندوستان میں آگرہ اور لاہور بھی اس میدان میں ترقی کر رہے ہیں۔ جنوبی ہند میں سوائے مدراس کے اور کوئی شہر نہیں ہے جو اس طرف ترقی کر رہا ہو۔

کوئلہ اور فولاد:- اس زمانہ میں سب سے زیادہ قیمتی دھات لوہا اور کوئلہ ہے اور انہی کی صنعت میں دنیاوی ترقی کا راز ہے

خدا کی دین ہے، ہندوستان کے جفاکش کسان دھاتوں کو اپنے کھیتوں میں پیدا نہیں کر سکتے۔ جہاں جہاں خدا نے ان کے خزانے بنا دیئے ہیں۔ انسان انہیں ہی کام میں لا سکتا ہے۔ ہندوستان میں بدقسمتی سے لوہا اور کوئلہ قریب قریب نہیں ملتے، اور یہ صنعت ایسی ہے کہ اگر دونوں کانیں قریب میں نہ ہوں تو چل نہیں سکتی۔ ہندوستان کے کوئلہ کی کانیں نصف دائرہ کی شکل دریائے مہاندی کے ڈیلٹا کے اردگرد

ہیں، اوران کے قریب ہی لوہا بھی ملتا ہے، اس وجہ سے یہ صنعت سوائے جمشید پور کے اور جگہ سے ہی نہیں۔ ریلوے کے ورکشاپ بھی ایک حد تک اسی صنعت کی فیکٹریاں ہیں۔ خاص خاص مقامات جمالپور لاہور اور اجمیر ہیں۔ بمبئی میں جنوبی افریقہ کے کوئلہ سے یہ صنعت کچھ ہوتی تو ہے۔ لیکن یُوں ہی سی + جمشید پور، اجمیر، لاہور اور جمالپور وغیرہ میں جو اشیا بنتی ہیں، وہ اکثر ریلوے کے استعمال کی ہوتی ہیں۔ روزانہ ضروریات کی چیزیں مثلاً چاقو سروتا قینچی وغیرہ مختلف مقامات پر بنتی ہیں +

ہندوستان اس صنعت میں بہت گرا ہُوا ہے۔ کپڑے سینے کی مشینیں، موٹر کاریں، بائیسکل ریلوے کے انجن اور بہت سی چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ باریک کام تو یہاں ہوتا ہی نہیں، سوئی وغیرہ سے مراد باریک کام ہے، اگرچہ ہندوستان میں بعض جگہ (وزیر آباد) چاقو بنتے ہیں، تاہم ان کی بڑی مقدار جرمن اور انگلستان سے آتی ہے۔ اس صنعت پر کسی دوسرے وقت تفصیل سے بحث کی جائے گی +

دوسری صنعتیں۔ — تانبے پیتل اور چاندی کے برتن پرانے شہروں اور ریاستگاہوں میں زیادہ بنتے ہیں۔ پرانے طریقہ پر یہ صنعت چلی آ رہی ہے، اور یورپ کے مقابلہ میں ہندوستان کی پرانی صنعتیں ماند پڑ گئی ہیں لیکن یہ صنعت اب بھی اسی شان سے ہے جیسی انگریزی حکومت سے قبل تھی۔ مرورا، تنجور، جے پور، اور دہلی اس صنعت کیلئے مشہور ہیں۔ مرادآباد اس زمانہ میں خاص طور پر اس تجارت اور صنعت کا مرکز ہو گیا ہے۔ نئے اصول پر کلکتہ اور بمبئی میں بھی یہ صنعت ترقی کر رہی ہے +

کاغذ:- بانسوں سے، درختوں کی چھال سے، گھاس سے اور سڑے گلے کپڑوں سے بنایا جاتا ہے، ہندوستان میں مختلف تجربات اس صنعت کو فروغ دینے کے لئے کئے گئے۔ لیکن اب تک تو ناکامی ہی سے دوچار ہونا پڑا ہے لاکھوں روپے کا کاغذ ہر سال باہر سے آ رہا ہے۔ ہندوستانی بانسوں سے کاغذ تو بنا لیا گیا ہے لیکن وہ امریکن اور یورپین کاغذ سے مہنگا پڑتا ہے تاہم یہ صنعت اب بھی تھوڑی سی ہے ضرور ٹیٹاگڈھ (بنگال) دہلی لکھنؤ اور بمبئی میں اچھے کاغذ بنتے ہیں۔ لیکن کم مقدار میں +

دیاسلائی:- اس کی صنعت کو ہندوستان میں فروغ دینے کے لئے مختلف تدابیر ہو رہی ہیں اور عنقریب ہندوستان اس قابل ہو جائے گا کہ باہر سے دیاسلائی نہ منگائے۔ گندھک کی کمی ہندوستان میں ہے اور رہے گی لیکن پھر بھی جب ترقی کر جائے گی تو یہ صنعت بہت مفید اور کارآمد ثابت ہو گی۔ اس زمانہ میں احمدآباد کے سوا بہت کم یہ صنعت ہے۔ گھریلو دستکاری (صنعت) پر کسی آئندہ اشاعت میں تبصرہ کیا جائے گا +

گمنام

دونوں رخ

(از ملک محمد باقر نسیم رضوانی)

شام کے چھ بجے کا عمل تھا۔ تاریک کمرے کا ایک لیمپ سبز گلوب کے نیچے پوری کدو کاوش کے باوجود مدھم سی شعاعوں سے کمرہ کو روشن کرنے میں بمشکل کامیاب ہو رہا تھا۔ سردی زوروں پر تھی اور اتنے بڑے کمرے میں جہاں وہ آگ کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا گلزار نار سے لالہ ہائے احمریں شکل شعلہ باہر پھینکے جا رہے ہیں۔ یہی وہ سماں تھا۔ جس کا کینیتھ ڈارنٹ اپنے دن کے کام سے فارغ ہونے کے بعد مشتاق ہوتا۔ صبح کو اسے مقدمات کے لئے قانونی کتابوں سے تیاری کرنی ہوتی تھی۔ دن کو موکلوں کے ساتھ عدالت عدالت پھرنا ہوتا تھا۔ صرف یہی دو گھنٹے تھے جو کھانے سے پہلے آرام حاصل کرنے کی خاطر اس نے ادب لطیف کے مطالعہ۔ چائے پینے۔ سگرٹ نوشی بالبعض اوقات نیند کے لئے وقف کر رکھے تھے، وہ اس وقت سرخ سلیپروں اور بھورے لمبے کوٹ میں نہایت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اگر کوئی مصور دیکھ پاتا۔ تو یقیناً اس کی تمنا یا نہ خواہش ہوتی۔ کہ اسکے بھورے سیاہی مائل بالوں، زرد چہرہ اور سیاہ ابروں کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرلے۔ وہ اس وقت تمام دن کی زندگی کے بارے سبکدوش ہوکر اپنی بیٹی کے خیال کو بھی معمول کے مطابق نہایت آسانی سے بھول جاتا۔ البتہ کبھی کبھی وہ طبیعت میں تکان اور انتشار محسوس کرتا +

تین کتابیں والٹیر، سفرنامہ برٹن۔ الف لیلہ سٹیونسن اس نے طاق سے باہر نکال رکھی تھیں۔ ان میں سے اس نے آخری کتاب کو پڑھنے کے لئے اٹھایا۔ اس شام کو وہ کسی خوشگوار اور تسکین دہ چیز کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ عدالت کے اژدہام نے ہوا کو کافی سے زیادہ کثیف بنا دیا تھا۔ اور وہ جب مرطوب گلیوں سے گذر کر گھر پہنچا تھا تو اس کی زندگی میں پہلا موقعہ تھا۔ جب اس نے گھر میں ایک خاص قسم کی تنہائی اور غربت محسوس کی +

اس نے لیمپ کی بتی کو نیچا کرتے ہوئے آگ کی طرف منہ پھیر لیا، اس کا خیال تھا۔ کہ شائد آج نیند کھانے سے پہلے ہی ذہنی اذیت سے نجات دلا دے۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ سکول میں چھٹیاں ہوتیں، اور میری گھر واپس آئی ہوئی ہوتی۔ عرصہ سے رنڈوا ہونے کی وجہ سے وہ.... عورت کی ضرورت سے بے نیاز ہوچکا تھا۔

مگر آج وہ اپنی چھوٹی لڑکی کی معیت کے لئے بیتاب تھا، اس کی شریر اور سیاہ چمکیلی آنکھوں کے لئے۔ مگر بعض آدمیوں کو حیرت انگیز طور پر عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بھائی لارنس نے سب کچھ عورتوں کے پیچھے ضائع کر دیا تھا۔ یہ سب عزم راسخ کا فقدان تھا۔ وہ ایک مفلس، قلاش اور آوارہ مزاج انسان ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کتنا عجیب تھا کہ ایک ماں سے دونو کو وہ طبائع ملی تھیں۔ جن میں نام کو مطابقت نہ تھی۔

اس کے خیالات کی رو تبدیل ہو گئی۔ اور اس کی قانونی رُوح کو تکلیف ہونے لگی۔ اس کا دعویٰ ہمیشہ نہ کبھی متزلزل نہ ہوا تھا۔ لیکن آج اس نے صحیح مشاورت نہیں دی تھی۔ مگر غلط مشاورت دے کر پھر اسے صحیح تصوّر کرنا وکالت کے نزدیک عظیم ترین گناہ ہے اور ایسا آدمی کبھی اور کہیں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کوئی کام کرنے کے لئے شبہات کو بالائے طاق رکھ کر فوراً عمل کرنا چاہیئے۔ اور بعد میں نتیجہ پر غور کر کے محاسن و معائب معلوم کر لینا دانشمندی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہی خیالات تھے۔ جو اُس کے لئے تسکین دہ ثابت ہوئے اُس کے لبوں پر اندرونی ابتہاج کی وجہ سے تبسم کھیلنے لگا۔ جو آگ کی روشنی میں رفتہ رفتہ غائب ہو گیا۔ اور وہ سو گیا . . . .

وہ چونک کر اُٹھا۔ اور اُس نے سر پھیرے بغیر پوچھا "کیا ہے ہ" ایک مدھم سی آواز آئی۔ اور پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ گویا کسی نے سانس روک لیا ہو۔ اُس نے بتی کو اونچا کیا۔ اور پوچھا "کون ہے؟"

دروازے کے باہر کسی نے جواب دیا "میں ہوں۔ —————— لاری"

شائد کچھ اس آواز میں اثر تھا یا نیند سے اچانک بیداری تھی۔ جس نے اُسے کپکپا دیا۔ وہ بولا "میں سویا ہوا تھا اندر آجاؤ"۔

قابل غور بات یہ تھی۔ کہ نہ تو اس نے سر پھیرا۔ اور نہ اٹھا بلکہ نیم باز آنکھوں سے آگ کی طرف دیکھتا رہا حتیٰ کہ اس کا بھائی اندر آگیا۔ لارنس کی آمد یقیناً کسی افتاد کا پیش خیمہ تھی۔ وہ اس کے تنفس کی آواز سن رہا تھا، اور سوچ رہا تھا۔ کہ یہ کمبخت اپنے بڑے بھائی کے پاس آنے کے وقت بھی شراب نوشی سے مجتنب نہیں ہوتا۔ یہ بات اُسکی برداشت سے باہر تھی اور وہ ایک سخت لہجہ میں بولا "کیوں لاری کیا کام ہے؟"

ہمیشہ کوئی نہ کوئی کام ہوا کرتا تھا۔ کیتھ اکثر اپنے اس عجیب رشتہ پر حیران ہوا کرتا تھا۔ جو اس کو اپنے بھائی کی ہر بُری سے بُری خواہش کو بھی پورا کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ شائد یہ برادرانہ تعلق تھا۔ بعض دفعہ وہ اپنے آپ میں یہ کمزوری محسوس کرتا۔ مگر اس کے باوجود وہ اس اوباش کی مدد کرنے پر مجبور تھا۔ شائد لارنس نے حد سے زیادہ شراب پی لی تھی۔ جو وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ اس لئے اُس نے پھر کہا "تم اندر کیوں نہیں آجاتے؟"

وہ اَب دیوار سے ٹکریں کھاتا ہُوا، اور روشنی سے ہٹ کر شیطان کی طرح اندر آ رہا تھا- کینتھ نے پوچھا" کیا تم بیمار ہو"
پھر بھی کوئی جواب نہ دیا گیا، سوائے اِس کے کہ اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا، اور خاموش ہوگیا- شراب کی بُو اب تیز سے تیز تر ہوگئی- کینتھ نے خیال کیا کہ یہ منظر نئے خاندان کے لئے نہایت عبرت انگیز ہوگا- اگر ......
دیوار سے لگی ہوئی ہستی نے ایک لمبی آہ کھینچی- اور کینتھ نے محسوس کیا- کہ اس نے اب تک کیوں اُس سے اس کے سکوت کی وجہ نہ پوچھی- وہ کھڑا ہوگیا، اور اس نے مضطرب لہجہ میں پوچھا" ہاں کیا بات ہے- کیا قتل کرکے آئے ہو- جو یوُں خاموش کھڑے ہو؟"
ایک لمحہ کے لئے کوئی آواز پیدا نہ ہوئی- یہاں تک کہ سانس بھی روک لیا گیا، اور پھر ایک مدہم سی آواز آئی" ہاں"
خود فریبی جو اِن اوقات مایوسی میں ہر ناکام کو ہنگامی طور پر کاذب طمانیتِ قلب بخش دیتی ہے- کینتھ کے کام آئی- اور وہ بولا" خدا کی قسم تم حد سے زیادہ پی گئے ہو"!
مگر یہ خیال اس کے ذہن سے اسی سرعت کے ساتھ نکل گیا- جیسے داخل ہوا تھا- اور وہ بولا" تمہارا اِس سے کیا مطلب ہے- اِدھر آؤ جہاں میں تمہیں دیکھ سکوں لاری کیا معاملہ ہے؟
ایک لڑکھڑاہٹ اور غیر ارادی حرکت سے اس کے بھائی نے سایہ کو چھوڑا- اور کُرسی پر گر پڑا- اور ایک اور آہ اس کے منہ سے نکلی- وہ بولا" کینتھ اور کوئی معاملہ نہیں- یہ بالکل صحیح ہے"
کینتھ جلدی سے آگے بڑھا- اور اس نے بھائی کے چہرہ سے فوراً معلوم کرلیا کہ یہ بالکل صحیح ہے اس کی آنکھوں کا خوف اس کا شاہد تھا- جن کو دیکھنے سے دِل پاش پاش ہوا جاتا تھا- ان سے حقیقی مظلومیت کا اظہار ہو رہا تھا- مگر یکایک اس کے رحم کے خیالات غصّہ میں تبدیل ہوگئے- اور وہ بولا" یہ کیا بیہودگی ہے"
اب کینتھ کی آواز میں ایک خاص خوف پنہاں تھا- اس نے بڑھ کر دروازہ کو ٹٹولا- کہ کھلا تو نہیں- لارنس نے اپنی کرسی آگ کے نزدیک سرکالی- اور کینتھ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:" اچھا لاری ہوش حواس درست کرو، اور میری پریشانی رفع کرو"
"میں تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں- یہ بالکل صحیح ہے- میں نے قتل کیا ہے"
کینتھ بولا" مگر تم یہاں کیوں آئے ہو- اور تم نے مجھے کیوں بتایا ہے"
لاری کا چہرہ بعض اوقات ارضی اشکال سے منّا نہیں ہوتا تھا اسکے چہرہ سے ایک خاص قسم کی روحانیت ٹپکتی تھی- اس نے جواب دیا" مگر میں اور کس کو بتاؤں- کینتھ میں اب تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں- کہ آپ مجھے کیا کرنا

ہوگا ؟ کیا میں اپنے آپ کو ظاہر کردوں"۔

کیتھ کا دل اس تمہید کو سن کر دھڑکنے لگا۔ مگر اس نے اضطراب کو چھپاتے ہوئے پوچھا " مجھے یہ تو بتاؤ۔ یہ معاملہ کیسے ہؤا ؟ اور کب ہؤا ؟"

"کل رات"

لاری کی باتوں میں ہمیشہ بچپن کی سی صداقت ہوتی تھی۔ اور وہ عدالت کے امتحان میں کبھی کسی معاملہ کو چھپانے میں کامیاب نہ رہتا۔ کیتھ بولا "کیسے ؟ کہاں ؟ تم مجھے تمام واقعہ شروع سے سناؤ۔ یہ قہوہ پی لو۔ تمہارے دماغ کو صاف کردے گا"۔

لارنس نے پیالی لے لی اور دم بھر میں خالی کردی۔ " ہاں" وہ بولا " کیتھ واقعہ یوں ہے۔ کہ ایک لڑکی یہاں رہتی ہے۔ جس کو میں چند ماہ سے جانتا ہوں۔ اُس کا باپ پول تھا۔ جو اُس کو سولہ سال کی عمر میں اکیلی چھوڑ کر مر گیا تھا۔ ایک امریکن نے جس کا نام ویلین تھا۔ اور جو اسی گھر میں رہتا تھا، اس سے شادی کرلی اور کچھ عرصہ کے بعد اس کو چھ ماہ کے بچہ کے ساتھ چھوڑ کر کہیں چلا گیا، اب لڑکی کی فاقہ مستی میں کٹتی تھی۔ آخر کار وہ ایک اور آدمی کے ساتھ چلی گئی۔ اور اس کے ساتھ دو سال تک رہی۔ کہ ویلین پھر واپس آگیا۔ اور اُسکو مجبور کرکے پھر گھر واپس لے آیا۔ پاجی اس کو بغیر کسی وجہ کے پیٹا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اُسکو پھر چھوڑ کر چلا گیا۔ جب میں لڑکی سے ملا تھا اس کا بچہ مر چکا تھا۔ اور وہ کسی آدمی کو اپنے ہاں آنے سے منع نہ کرتی تھی"۔

اُس نے یکایک کیتھ کے منہ کی طرف دیکھا۔

" مگر خدا کی قسم میں نے آج تک اس جیسی خوبصورت، وفا شعار اور صادق عورت نہیں دیکھی۔ وہ ابھی بیس سال کی ہے۔ کل رات جب میں اس کے پاس گیا۔ تو وہ وحشی یعنی ویلین پھر اُسکو تلاش کرکے اُس کے پاس پہنچ چکا تھا، اور جب وہ میری طرف مجھے گالیاں دیتا ہؤا حملہ کرنے کی نیّت سے بڑھا۔ یہ دیکھو" اس نے اپنے ماتھے کے خون کے داغ کی طرف اشارہ کیا " تو میں نے اسے گلے سے پکڑ لیا۔ اور جب میں نے چھوڑا ـــــــ "

" تو ؟"

" وہ مر چکا تھا۔ میں نے یہ نہیں دیکھا تھا۔ کہ وہ بھی اس کی پشت سے زور لگا رہی ہے"۔

کیتھ نے پوچھا " تو پھر تم نے کیا کیا ؟"

" ہم دونوں دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے اور پھر میں نے اُس کو کندھے پر اُٹھا کر

گلی کے سرے پر لیجا کر پل کے نیچے لٹا دیا"

"کوئی پچاس گز کے فاصلہ پر"

"کیا کوئی ــــ ــــــــ کیا کسی نے دیکھا تھا؟"

"نہیں"

"کتنے بجے تھے؟"

"تین"

"اور پھر؟"

"میں لڑکی کے پاس واپس چلا گیا!"

"کیوں"

"وہ اکیلی تھی۔ اور ڈر رہی تھی اور اسی طرح میں بھی"

"یہ کس جگہ کا واقعہ ہے؟"

"۴۲ بارو سٹریٹ کا"

"اور پل کہاں ہے؟"

"گلولین کے سرے پر"

"اوہ یہ تو میں نے آج کے اخبار میں بھی دیکھا تھا"

اور اس نے جلدی سے اخبار لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔ "صبح ایک آدمی کی لاش گلولین کے نزدیک سے ہو میں پل کے نیچے پڑی ہوئی ملی ہے۔ گلے کے نشانات سے پتہ چلتا ہے کہ کسی نے مقتول کو گلا دبا کر مار ڈالا ہے، جسم پر کوئی علامت ایسی نہیں۔ جس سے شخصیت کی شناخت ہو سکے۔ جیبیں خالی ہیں"۔

قتل کا واقعی ارتکاب کیا گیا تھا۔ اب کینھ کو اصلیت کا یقین ہو گیا۔ اور وہ بولا "دیکھو یہ تمہارا کارنامہ ہے"

"اگر میں جانتا ہوتا۔ کینتھ اگر میں جانتا ــــــــــــ"

کینتھ نے اسے روک کر پوچھا "کیا تم نے اس کے جسم سے کچھ لیا بھی تھا"

"جب ہم لڑ رہے تھے تو یہ گرا تھا"

"یہ ایک خالی لفافہ تھا جس پر جنوبی امریکہ کی مہر لگی ہوئی تھی، اور لکھا ہوا تھا، "پیٹرک ویلن" ساؤتھمن ہوٹل، نمبر ۹

سٹریٹ لندن"+

کینتھ نے کہا" اسے آگ میں ڈال دو"۔

پھر یکایک وہ آگ پر لفافہ کو نکالنے کے لئے جھکا ـــ مگر نکال نہ سکا، اور وہ بن کھاتا ہوا جل گیا۔ اور اُس نے پھر ایک دفعہ سوال کیا" مگر یہ بتاؤ ۔ کہ تم اب میرے پاس کس لئے آئے ہو؟"

" چونکہ تم وکیل ہو ۔ اِن معاملات سے واقفیت رکھتے ہو ۔ میں اسکو جان سے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں لڑکی سے محبت کرتا ہوں ۔ کینتھ بتاؤ ۔ کہ میں کیا کروں ؟"

لاری کے لئے یہ سوال کر لینا ۔ کہ" میں کیا کروں" اتنا آسان تھا ۔ مگر کینتھ کے دِل سے کوئی اُس وقت پوچھتا کہ وہاں کیا گذر رہی ہے +

وہ بولا تمہارا خیال ہے ۔ تمہیں کسی نے نہیں دیکھا ؟"

"وہ ایک تاریک گلی تھی ۔ اور وہاں کوئی نہ تھا"

" پھر تم لڑکی کو کب چھوڑ کر آئے ہو؟"

" سات بجے کے قریب"

" پھر تم کہاں گئے تھے ؟"

" اپنے مکان پر"

" فنٹزای سٹریٹ میں ؟"

" ہاں"

" کیا تمہیں کسی نے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا"

" نہیں"

" اس کے بعد تم نے کیا کیا ؟"

" وہاں بیٹھا رہا"

" باہر نہیں نکلے ؟"

" نہیں"

"اُس لڑکی کے پاس نہیں گئے ؟" " نہیں"

"تمہیں معلوم نہیں کہ اُس نے اس کے بعد کیا کیا ہے"؟ "نہیں"

"کیا وہ تمہارا نام ظاہر کردے گی"؟ "کبھی نہیں"

"کیا وہ اپنے آپ کو ظاہر کردے گی"؟ "نہیں"

"تمہارے اور اس کے تعلقات سے کوئی واقف ہے"؟ "کوئی نہیں"

"کوئی واقف ہو ہی کیسے سکتا ہے"؟ "کوئی نہیں واقف"

"کیا تمہیں کل رات اس کے پاس کسی نے جاتے دیکھا ہے"؟

"نہیں وہ نچلی منزل میں رہتی ہے۔ اور کنجیاں میرے پاس موجود ہیں"

"وہ مجھے دیدو۔ تمہارے پاس اُس کی اور کوئی چیز ہے"؟ "نہیں"

"تمہارے کمرے میں" "نہیں"

"کوئی تصویر یا خط" "نہیں"

"ہشیار رہنا" "میرے پاس کچھ بھی نہیں"

"کیا تمہیں دوسری دفعہ اس کے پاس کسی نے جاتے دیکھا ہے"؟ "نہیں"

"اچھا ٹھیرو۔ میں اس کے متعلق کچھ سوچ لوں"

وہ کچھ دیر تک پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سوچتا رہا۔ مگر کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہ پہنچا۔ اور اس نے پھر پوچھنا شروع کردیا:

"کیا ولین کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ جب وہ اسے دوبارہ آکر ملا تھا"؟ "ہاں"

"اس لڑکی نے تمہیں بتایا تھا"؟ "ہاں"

"اس نے اُس کی جائے اقامت کو کس طرح ڈھونڈھ نکالا"؟ "یہ میں نہیں جانتا"

"تم نے کتنی شراب پی لی تھی"؟ "دہ میں نے شراب نہیں پی تھی"۔

"تم کہتے ہو کہ تمہارا منشاء قتل کرنے کا نہ تھا"؟

"نہیں خدا گواہ ہے"

"یہ صحیح ہے۔ مگر تم نے پل کو اس کام کے لئے کیوں چنا"

"یہی نزدیک ترین جگہ تھی۔ جہاں تاریکی تھی"

"کیا اس کا چہرہ ظاہر کرتا تھا - کہ اس کا گلا دبا دیا گیا ہے؟"

"اچھی طرح سے یاد نہیں ہے"

"حافظہ پہ زور دو"

"ہاں"

"بہت بگڑ گیا ہے؟" "ہاں"

"کیا تم نے اُس کے کپڑوں کی تلاشی لی تھی؟" "نہیں"

"کیوں؟" "عجیب آدمی ہو - اگر تم ایسا کرنے تو ——————"

"اچھا تم کہتے ہو - کہ اس کا چہرہ بگڑ گیا ہے - کیا پہچان لیا جائے گا؟"

"میں نہیں کہہ سکتا"

"وہ لڑکی اس کے ساتھ پہلے کہاں رہتی تھی؟"

"میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا - غالباً بملیکو میں"

"سوہو میں نہیں؟" "نہیں"

"سوہو میں آئے ہوئے اس کو کتنا عرصہ گذرا ہے؟" "تقریباً ایک سال"

"ہمیشہ اسی مکان میں؟" "ہاں"

"کیا اس کی گلی میں کوئی ایسا ہے - جو اُس کو اس کا خاوند سمجھتا ہو؟"

"میرے خیال میں کوئی نہیں"

"وہ کیا کام کرتا تھا؟" "خدا جانے"

"تمہارے خیال میں پولیس اس کو جانتی ہے" "مجھے علم نہیں"

"اچھا لاری تو سنو - اب تم سیدھے گھر جاؤ - اور جب تک میں تمہارے پاس نہ آؤں کل تک مکان سے باہر نہ نکلنا وعدہ کرو"

"میں وعدہ کرتا ہوں"

"مجھے کھانا کھانے کے لئے ابھی باہر جانا ہے - میں اس پر غور کروں گا - تم شراب مت پینا - کسی سے بات نہ کرنا، اور ہشیار رہنا"

"کینتھ مجھے بہت دیر تک منتظر نہ رکھنا"

"کینتھ نے نہایت مشفقانہ انداز میں لاری کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بولا کہ "حوصلہ کرو" اور پھر معاً اس کو خیال آیا" الٰہی پناہ مجھے خود اب حوصلہ کی ضرورت ہے"*

(۲)

لاری ڈارنٹ نے بھائی کا مکان چھوڑ کر شمال کی طرف تیز، آہستہ اور پھر تیز چلنا شروع کر دیا۔ اُس کی رفتار اس کے خیالات کی متابعت کر رہی تھی۔ جہاں دنیا میں ایسے آدمی ہیں۔ جو ایک وقت میں صرف ایک ہی کام کر سکتے ہیں۔ وہاں ایسی ہستیاں بھی صفحہ ارض پر موجود ہیں جو بیک وقت مختلف مشاغل ہیں اسی دلچسپی سے حصّہ لیتی ہیں۔ جیسے پہلی قسم کے افراد*

لاری جب کینتھ سے رخصت ہؤا تھا، تو اُس نے تہیّہ کر لیا تھا۔ کہ کینتھ کے آنے تک گھر میں خاموش بیٹھا رہے گا۔ مگر ابھی اُس نے تین سو گز کا ہی فاصلہ طے کیا تھا۔ کہ اس نے اپنے آپ کو اتنا ذلیل اور پریشان محسوس کیا۔ کہ اگر اس کے پاس پستول ہوتا تو وہ اپنے آپکو ہلاک کر لیتا۔ یہ خیال اتنا مضبوط تھا۔ کہ اُسے اس وقت وہ لڑکی بھی بھول چکی تھی۔ جس کا وہ والہ و شیدا تھا۔ وہ ایک تنکا تھا۔ جس کو ہوا کی لطیف ترین جنبش بھی ہلائے بغیر نہ رہتی*

اب وہ اس گلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاں اس نے خوف کو عارضی طور پر رفع کرنے کے لئے صبح لڑکی کے ساتھ اظہار محبت کرنے میں گذار دی تھی۔ کیا وہ اندر چلا جاتے ہ؟ اس نے کینتھ سے وہاں نہ جانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے کیوں وعدہ کیا تھا؟ اب اُس پر ڈاکٹر کی دکان کی کھڑکی سے روشنی پڑ رہی تھی۔ اُسے آج سے تین سال پیشتر کے واقعات یاد آ رہے تھے جب اُس نے ڈاکٹر کی ماما کو رسوا کیا تھا۔ وہ بیچاری اس کے غم میں ہلکان ہو کر اس کی بے اتفاقی سے نذرِ اجل ہو چکی تھی۔ کچھ عرصہ آوارہ رہنے کے بعد اب اس لڑکی سے رشتہ منسلک ہو گیا تھا۔ کیا خبر تھی۔ کہ اس کے ہاتھوں یہ قتل اس لڑکی کے لئے ہوگا۔ آہ وہ آدمی جو ایک مکھّی کو بھی تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ آج قتل کا مرتکب ہے*

دکان کی کھڑکی دیکھ کر اُسے ایک گونہ اطمینان حاصل ہو گیا۔ اُسے خیال آیا۔ کہ جب وہ گرفتار ہوگا۔ تو اُس کے لئے رہائی نہایت آسان ہوگی۔ وہ گھر سے باہر جیب میں سفید گولیاں ڈالے بغیر نہ نکلے گا۔ جو اُسکو گرفتاری پر ہر قید و بند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیں گی۔ کتنا دل خوش کن خیال تھا۔ لوگ کہتے ہیں خود کشی نہیں کرنی چاہیئے وہ زندہ رہیں خطرات کا مقابلہ کریں، ذلیل زندگی بسر کریں۔ جس طرح وہ لڑکی کر رہی ہے۔ اور جس طرح اور لاکھوں آدمی

بسر کر رہے ہیں - مگر میرے لئے ذلت سے موت بہتر ہے +

اس نے ڈاکٹر کی دوکان میں داخل ہو کر برومائیڈ طلب کیا، اور جب ڈاکٹر اس کو نکال رہا تھا - تو وہ ایک پاؤں پر کھڑا ہوا سوچ رہا تھا - کہ آخر میں نے اپنی موت خرید لی ہے - زندگی کیا ہے؟ ایک سانس! ایک شعلہ! کچھ بھی نہیں!

ڈاکٹر نے پڑیا باندھ کر لادی اور پوچھا "جناب نیند کے لئے تو نہیں چاہیئے"؟

"نہیں"

ڈاکٹر کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "میں جانتا ہوں - ایک بنتھ دوکاج والا معاملہ ہے"۔ ڈاکٹر کی زندگی بھی کتنی عجیب تھی - تمام دن سفوف گولیوں اور آدمی کی مشین کی درستی میں گذر جاتا ہے - جہنمی تجارت ہے!

اس نے دکان سے باہر نکلتے ہوئے اپنا عکس آئینہ میں دیکھا - اس کا چہرہ اس کے قاتل ہونے پر شاہد تھا اس کے دماغ میں اس وقت متضاد خیالات چکر لگا رہے تھے - وہ اس وقت خلوت و جلوت کا خواہاں تھا - کسی سے ملنا چاہتا تھا - مگر ہر ایک سے خائف تھا - صرف دنیا میں دو ہستیاں اس کے لئے غیر مضر تھیں - لڑکی اور کیتھ - کیتھ بھی نہیں - وہ مادہ پرست تھا - ٹھوس اعمال کا پتلا کیتھ کے نزدیک مجسم عزم راسخ بن جانا، اور مظلوموں سے ہمدردی ظاہر کرنا - بالکل جائز تھا - کیتھ جیسا آدمی دوستی کے قابل نہ تھا - خواہ بھائی ہی کیوں نہ ہو؟ صرف ایک دنیاوی ہستی کی معیت اسے گوارا تھی، اور وہ اس لڑکی کی - جو اس کے جذبات و خیالات سے کماحقہ' واقف تھی، وہ ایک دروازے پر سگرٹ سلگانے کے لئے رکا +

معاً اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی - کہ وہ اس پل سے گذرے - جہاں اس نے لاش کو پھینکا تھا، ایک بیکار خواہش جس سے کچھ مقصود نہ تھا - ایک مجنونانہ خواہش تاریک جگہ کو دیکھنے کے لئے وہ بارو سٹریٹ سے گذر کر تنگ گلی میں داخل ہو گیا - صرف ایک آدمی وہاں دکھائی دیتا تھا - جس کے کندھے پشت کی طرف خمیدہ تھے - منحنی اور چھوٹا سا قد زرد رو - آہ اس کو ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی میں دیکھنا کتنا خوفناک تھا - کیسی ہیبت شکل تھی - ڈاڑھی میں ملفوف چہرہ، دھنسی ہوئی آنکھیں، اور سیاہ دانت کتنے مہیب تھے - وہ چیتھڑے پہنے ہوئے تھا - اس کا ایک کندھا دوسرے سے اونچا تھا - ایک ٹانگ لنگڑی تھی - کیا عجیب مجسمہ تھا، لارنس کے بدن میں اس کو دیکھ کر ایک کپکپی پیدا ہو گئی - آہ - وہ اس سے بھی زیادہ بدقسمت تھا +

اس نے اس سے استفسار کیا "کیوں میاں تم امیر آدمی تو دکھائی نہیں دیتے"؟

تبسم جو اس آدمی کے لبوں پر اس استفسار سے پیدا ہوا، غیر فطری تھا - اور کھیت کے ڈراؤنے پتلے کے مشابہ - وہ بولا " مجھے امارت سے کوئی واسطہ نہیں - میں ناکامیاب رہا ہوں - ہمیشہ ناکامیاب - کیا تم یقین کرو گے - کہ میں کبھی زیر دیہات تھا

لارنس نے ایک شلنگ نکال کر اس کی طرف بڑھایا - مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا +

" تم اپنی دولت اپنے پاس رکھو" اس نے کہا " میں بوثوق کہہ سکتا ہوں - کہ آج میں تم سے زیادہ دولتمند ہوں ' مگر میں تمہاری ہمدردی کا شکر گزار ہوں - جو دولت سے کئی درجہ کسی غریب اور ستم رسیدہ آدمی کیلئے بڑھکر ہے"

"بالکل درست ہے" لاری نے کہا +

" ہاں" گنوار بولا " میں عنقریب مرنے والا ہوں - اب میں خود اعتمادی اور خودداری کھو چکا ہوں - اور میں نہیں سمجھتا کہ ایک آدمی ایک عرصہ سے خودداری کھو کر کیسے زندہ رہ سکتا ہے - بہت عرصہ نہیں تم یقین جانو" اور اُس نے اُسی دہقانی لہجہ میں پوچھا " کیا تم نے قتل کا حادثہ سنا ہے - میں ابھی اس جگہ کو دیکھ کر آیا ہوں"

" اسی طرح میں بھی ————— " کے الفاظ لارنس کے منہ سے نکلے - اور پھر اس کی آواز حلق میں رک کر رہ گئی +

اُس نے اسے شب بخیر کہا، اور عجلت سے چلنا شروع کر دیا، اس نے ایک خوفناک قہقہ لگایا، کیا ہر ایک آدمی اس کے قتل کا تذکرہ کر رہا ہے ؟ کھیت کے پتلے بھی'

---

(۳)

بعض طبائع کی تخلیق عجیب عناصر سے ہوتی ہے - اگر اُن کو دس بجے پھانسی دی جانی ہو تو وہ نہایت اطمینان سے ۸ بجے شطرنج کھیل رہے ہوں گے، اس طرح کے آدمی بام ترقی پر بہت جلد پہنچتے ہیں - یہ نہایت اعلےٰ پادری، ایڈیٹر، مصنف، منتظم، وزیر اور جنرل بنتے ہیں، اور اپنے ساتھیوں کی نسبت ہمیشہ ممتاز رہتے ہیں، وہ ایک روحانی برودت کے مالک ہوتے ہیں - جن میں ان کا نظام عصبی ملفوف رہتا ہے - ان آدمیوں کی فطرت کو فنون لطیفہ، شاعری، تخیل اور فلسفہ سے کم یا بالکل مناسبت نہیں ہوتی، کام کے پتلے، اور نتائج اخذ کرنے میں بلا کے سریع، اپنے جذبات کو عقل و فراست کے تابع رکھتے ہیں، لہلہاتے ہوئے سبزہ زار کو دیکھ کر طائر ان خوشنوا کے سرود و نغمہ کے وقت ان کا خیال کرنا گناہ ہے +

کینتھ ڈارنٹ اِن آدمیوں میں سے ایک تھا، گیارہ بج چکے تھے، جب وہ ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلا - اس نے

گاڑی کرایہ پر نہیں لی کیوں کہ وہ پیدل چل کر سوچنا چاہتا تھا - اس کی حیثیت کتنی ذلیل، وہ ایک قاتل کا رازدار اور بھائی - چند دنوں میں جج بننے والا تھا - وہ اپنے آپ کو ابھی تک دھوکا دینا چاہتا تھا - مگر واقعات اس کے برعکس تھے

وہ ایک تاریک گلی میں مڑا - اس کے روبرو قتل کی تصویر تھی، وہ اس کا شاہد بن رہا تھا - وہ سوچ رہا تھا - لاری نے عمداً قتل نہیں کیا - مگر بہرحال یہ قتل ہے - لاری جیسے اوباش قلاش اور بد اندیش آدمی ہمیشہ ایسا کیا کرتے ہیں - مگر کیا وہ عمداً بھی کرتے ہیں - مانا کہ اس آدمی ویلن کی موت زندگی سے بہتر ہے - مگر لاری نے تو جرم کا ارتکاب کیا ہے - انصاف اس امر کا مقتضی ہے - کہ بدلہ لیا جائے، مگر کیا وہ انصاف کی مدد کرے - بھائی بھائی کو پھانسی دلوائے

اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا - وہ صرف اُسے مشورہ دیگا، کہ بھاگ کر روپوش ہو جائے - شائد اس طرح بچ جائے مگر اس کا دل نہایت مضطرب تھا - لوگ کیا کہیں گے "کیتھ ڈارنٹ کا بھائی، بادشاہ کے وکیل کا بھائی قاتل ہے " عمداً" قتل نہیں کیا گیا - لاش کو اٹھا کر پل کے نیچے رکھدیا تھا - اشتعال کی وجہ سے ایسا ہوا ہے - رحم کے لئے ملتجی ہوں" کیا اس کا بھائی عدالت میں یہی جا کر کہے گا - مگر ——— ——— " حبس دوام بامشقت " کیا یہی جواب تھا، جو عدالت سے ملنے والا تھا ہ کیا یہی مشورہ تھا، جو وہ مجرم لاری کو دینے والا تھا - اور جس سے وہ سزا پا جائے گا *

نہیں ہرگز نہیں - میں یہ مشورہ ہرگز نہیں دونگا - اس نے ماحول کا پتہ لگانے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا - گوشے پر ایک سپاہی کھڑا ہوا تھا، اس کا سخت چہرہ لیمپ کی روشنی میں چمک رہا تھا - کیتھ .... اس کے آگے سے گذر گیا - اُسے سوال کرنے کی جرأت نہ تھی - معاً اس نے بائیں طرف دیکھا تو اسے معلوم ہوا، کہ وہ بارو سٹریٹ میں ہے - چند قدم چلا، اور واپس آ گیا، وہ ۴۲ نمبر کے مکان سے گذرا - سیاہ اور خاموش مکان کی دیوار پر مختلف ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں - ایک کھڑکی میں سے روشنی کی۔ شعاع نکل رہی تھی - وہ سوچ رہا تھا کہ لاری کس راستے سے لاش کو اُٹھا کر آیا ہوگا، اور واپس گیا ہوگا" یہ جگہ ہے" - وہ بمشکل اپنے آپ پر قابو کر کے بولنے والے کی طرف متوجہ ہوا" یہی جگہ ہے جہاں لاش پائی گئی تھی" - ابھی تک قاتل گرفتار نہیں ہوا - کچھ پتہ نہیں چلا - جناب - یہ بالکل تازہ پرچہ ہے *

گفتگو ایک چھوٹے سے لڑکے نے کی - جو چند اخبار ہاتھ میں لئے کھڑا تھا - کیتھ نے اخبار لے کر اُسے دو پنس دے دیئے اور وہ چلا گیا - مدھم روشنی میں اس نے پڑھا " گلولین کا پراسرار حادثہ" - " ابھی تک مقتول کی شناخت نہیں کی جا سکی - لباس سے وہ کسی غیر ملک کا باشندہ معلوم ہوتا ہے" - سپاہی اب پھرتا ہوا اُس کی طرف

آرہا تھا۔ وہ گھبرا کر تن کر کھڑا ہو گیا۔ سپاہی چھاتی ابھارے اُس کے پاس سے گذر رہا تھا۔ کہ اس نے اخبار اٹھا کر سپاہی سے پوچھا "کیا یہی جگہ ہے۔ جہاں لاش پائی گئی ہے"۔

"جی ہاں"

"ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا؟"

"اخبارات کے بیانات ہمیشہ درست نہیں ہوا کرتے۔ مگر جہاں تک میرا خیال ہے۔ اس معاملہ میں ابھی تک کوئی پتہ نہیں چلا"۔

"نہایت تاریک جگہ ہے، کیا یہاں کوئی سویا کرتا ہے"؟

سپاہی نے اثبات میں سر ہلایا "لندن میں کوئی پل نہیں۔ جس کے نیچے آدمی نہ سوتے ہوں"

"مقتول کے کپڑوں سے کچھ نہیں ملا"؟

"ایک دھیلا نہیں۔ جیبیں الٹی ہوئی تھیں"

کینتھ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور شب بخیر کہتا ہوا بارو سٹریٹ میں داخل ہو گیا۔ کچھ دُور جا کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سپاہی ابھی تک پل کے نیچے لیمپ رکھ کر کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ گو یا کوئی راز معلوم کر رہا ہے، بارو سٹریٹ میں اب کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔ تمام دروازے بند تھے۔ کینتھ نے جی کڑا کر کے ۴۲ نمبر کے دروازے پہ جا کر چابی لگائی اور کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے تھوڑا سا راستہ طے کر کے اگلا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔

اسے خیال آیا، اس کوشش سے باز آجائے اور واپس چلا جائے اور لاری سے جا کر کہدے کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ پھر کیا ہو گا؟ لیکن کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے۔ اور یہ سوچ کر اس نے دروازہ پھر کھٹکھٹایا پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اس نے چابیوں کے گچھے سے ایک چابی لگائی۔ اور پھر دوسری۔ کھٹ سے تالا کھل گیا۔ اور وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا، کمرے کی تاریکی سے ایک خائف آواز آئی، "لاری کیا تم ہو؟ تم نے دروازہ کیوں کھٹکھٹایا تھا۔ میں ڈر گئی تھی، روشنی کر لو اور اندر آجاؤ"۔

جب وہ سوِچ (Switch) کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ اس نے اپنی گردن میں نرم و نازک بانہیں محسوس کیں، اور پھر یکایک انہوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ ایک ہلکی سی چیخ نکلی " اوہ تم کون ہو"؟

کینتھ نے جواب دیا "لارنس کا ایک دوست۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں"۔

کینتھ نے روشنی میں مبہوت و ششدر چہرے کو دیکھا۔ اور بولا "تمہیں ڈرنا نہیں چاہیئے۔ میں تمہیں کسی طرح

کا نقصان نہیں پہنچاؤں گا، کیا میں تم سے بیٹھ کر باتیں کر سکتا ہوں" اور اس نے کنجیوں کی طرف اشارہ کیا "یہ دیکھو۔ اگر لارنس
کو مجھ پر اعتماد نہ ہوتا، تو وہ یہ مجھے دیتا؟"

مگر وہ ابھی تک چپ کھڑی تھی۔ کینتھ نے کمرے میں ایک نگاہ دوڑائی، اور پھر بولا "تم بیٹھ جاؤ۔ مجھے افسوس
ہے کہ میں تمہارے لئے تکلیف کا باعث ہوا ہوں"۔

مگر وہ پھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ اور نہایت آہستگی سے بولی "جناب آپ کون ہیں؟"

"لاری کا بھائی" کینتھ نے جواب دیا۔

لڑکی کے منہ سے اطمینان کا سانس نکلا۔ اور وہ ایک میلا کوٹ لپیٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت نہایت
معصوم دکھائی دے رہی تھی۔ کینتھ نے کرسی اس کے نزدیک کھینچ لی۔ اور بولا "میں اس وقت کی تکلیف دہی کے لئے
معافی کا خواستگار ہوں۔ مگر مجبوری تھی، لاری نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے"۔ اس کا خیال تھا۔ کہ وہ ان الفاظ پر چونک
اُٹھے گی۔ اور اضطراب ظاہر کرے گی۔ مگر وہ بالکل مطمئن تھی۔ اور بولی "تو؟"

کینتھ کے دل میں جرم کی عظمت کا پھر خیال آیا "بڑا بھاری جرم ہے"

"واقعی جرم سنگین ہے"

کینتھ بولا "تمہاری عمر ابھی تھوڑی ہی ہے؟"

"میں بیس سال کی ہوں"

"کیا تمہیں میرے بھائی سے محبت ہے؟"

"نہایت درجہ کی"

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں۔ کہ تم کہاں تک اُس کے بچاؤ
میں مدد دے سکو گی۔ جو کچھ میں کہوں اسے غور سے سنو، اور جو کچھ میں پوچھوں اُس کا صحیح جواب دو"۔

وہ بولی "میں ہر بات کا حتی الامکان صحیح جواب دوں گی"

کینتھ نے پوچھا "کیا تمہارا خاوند بُرا آدمی تھا؟"

"نہایت خوفناک آدمی"

"جب وہ کل تمہارے پاس آیا تھا، تو اسے تم سے ملے ہوئے کتنا عرصہ گذر چکا تھا؟"

"اٹھارہ مہینے"

"جب تم پچھلی دفعہ اسے ملی تھیں۔ تو کہاں رہتی تھیں"؟ "پملیکو میں"

"کیا وہاں تمہیں کوئی آدمی مسٹر ویلین کے نام سے جانتا ہے"؟ "نہیں"

"اگر پولیس کو مقتول کا نام معلوم ہو گیا، تو کیا وہ اس کی بیوی کی تلاش کریں گے"؟

"میں نہیں کہہ سکتی۔ مگر اس نے میرا کسی سے ذکر نہیں کیا تھا"

"کیا تمہارے خیال میں اُسے پولیس جانتی ہے"؟ "نہیں وہ بہت عیار تھا"

"تمہارا نام کیا ہے"؟ "وانڈا لونسکا"

"شادی سے قبل کیا تمہارا نام یہی تھا"؟

"وانڈا میرا عیسائی نام ہے۔ اور لونسکا میں کہلایا کرتی ہوں"

"جب سے تم یہاں آئی ہو"؟ "ہاں"

"کیا میرے بھائی نے اس آدمی کو کل سے پہلے بھی کبھی دیکھا تھا"؟

"کبھی نہیں"

"تم نے اس سے اس کے متعلق کچھ کہا تھا"؟

"ہاں۔ اور اس آدمی نے پہلے حملہ کیا تھا"

"کیا تمہارے خیال میں کسی آدمی نے میرے بھائی کو یہاں آتے دیکھا تھا"؟

"میں نہیں کہہ سکتی"

"کیا اُسے کسی نے لاش لیجاتے ہوئے دیکھا تھا"؟ "نہیں گلی بالکل خالی تھی"

"واپس آتے کسی نے دیکھا تھا"؟ "نہیں۔ کسی نے نہیں دیکھا"

"صبح کو بھی نہیں"؟ "میرے خیال میں نہیں"

"کیا تمہارے پاس کوئی نوکر ہے"؟ "ہاں ایک عورت ہے، جو صرف صبح ایک گھنٹے کے لئے آتی ہے"۔

"تمہارا کوئی دوست ملاقاتی ہے"؟

"نہیں جب سے تمہارا بھائی میرے پاس آتا ہے۔ میں کسی سے نہیں ملتی"

"وہ کب سے"؟ "پانچ ماہ سے"

"کیا تم آج باہر گئی تھیں"؟ "نہیں"

"کیا کرتی رہی ہو"؟ "روتی رہی ہوں"

"اچھا یہ بتاؤ۔ کہ اگر حالات بدترین شکل اختیار کر لیں، تو کیا تم راز افشا کر دوگی"؟

"اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اور وہ اُٹھ کر آگ کے نزدیک آگئی، اور بولی:۔" یہ دیکھو میں نے اُس کی دی ہوئی تمام چیزیں جلادی ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی تصویر بھی، اب میرے پاس کوئی چیز موجود نہیں"

کینتھ بھی اٹھ بیٹھا، اور بولا، ایک اور سوال ہے کیا تمہیں پولیس جانتی ہے"؟

"نہیں"

"کیا تمہیں لاری کے گھر کا پتہ معلوم ہے"؟ "ہاں"

"تم اُس کے پاس نہ جانا۔ اور نہ وہ ہی یہاں آئے"

وہ بالکل اس کے قریب آگئی، اور نرم آواز میں کہنے لگی" خدا کے لئے اُسے مجھ سے بالکل جُدا نہ کردینا۔ میں محتاط رہوں گی۔ اور اُسے کوئی ضرر نہ پہنچاؤں گی، اور اگر میں اس سے جدا ہوگئی تو مر جاؤں گی"۔

کینتھ بولا" تم اس کا خیال نہ کرو، اس کا میں خود انتظام کر لوں گا"۔

"مگر آپ مجھ پر رحم کریں" اس نے جھک کر اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اور یکایک وہ پیچھے ہٹ گئی۔ پھر نہایت نرمی سے بولی" سنئے کوئی باہر ہے"۔

باہر دروازہ کھٹکھٹایا جارہا تھا، دونوں ڈر کے مارے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ پھر دروازہ پر زور کی ایک ضرب لگی اور لڑکی نے دروازہ کھول کر پوچھا" کون ہے"؟

ایک آواز جس سے کینتھ کے کان آشنا تھے۔ جواب میں سنائی دی" آپ کا دروازہ کھلا ہؤا ہے اسے بند رکھیئے"۔

لڑکی سپاہی کا شکریہ ادا کرکے واپس چلی آئی۔

کینتھ بولا" میں اب جارہا ہوں۔ تم دونوں ایک دوسرے سے نہ ملنا۔ اگر تمہیں اس کی زندگی عزیز ہے، تو محتاط رہنا"۔

لڑکی نے ایک آہ کھینچی" بہت اچھا"۔

اور وہ باہر نکل گیا۔ وہ راستہ میں رکا۔ کیوں کہ سپاہی سے دوبارہ نہیں ملنا چاہتا تھا، کچھ دیر ٹھہر کر وہ گلی میں داخل ہو کر چلنے لگا۔ اب وہ سٹرینڈ سے گذر رہا تھا۔ یہ وہی گلی تھی جس میں سے ہو کر وہ روزانہ کچہری جایا کرتا تھا۔

بائیں طرف کچہری کی عظیم الشان عمارت نظر آ رہی تھی، سامنے گرجا تھا۔ انجن پوری تیزی سے ایک مہیب شور اور کھڑکھڑاہٹ سے الارم بجاتا ہؤا جا رہا تھا۔ ٹرمیوے کے بند ہونے کی وجہ سے گاڑیاں نہایت سرعت سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز پیدا کرتی ہوئی چل رہی تھیں، دو سپاہی ایک شرابی کو پکڑے ہوئے جا رہے تھے۔ گلی کے سرے پر ایک عورت نے کینتھ کو سلام کیا۔ اور وہ اس کا عندیہ سمجھ کر اس کو جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ تشنج شروع ہوگیا تھا۔ پسینہ کے قطرات اس کے منہ پر جم رہے تھے۔ اُس نے رفتار کو تیز کر دیا۔ اور گھر پہنچ کر جلدی سے سونے کے کمرہ میں داخل ہوگیا+

---

(۴)

کینتھ حسب معمول سب کچھ فراموش کرکے پانچ بجے بیدار ہؤا، اور دارالمطالعہ میں داخل ہوگیا۔ جہاں اس کے لئے قہوہ تیار رکھا ہؤا تھا۔ وہ دماغ پر ایک خاص قسم کا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس نے قہوہ پی کر تین گھنٹے کیلئے معمول کے مطابق آئندہ مقدمات کے لئے تیاری شروع کر دی +

وہ مقدمات کے لئے ایک لفظ بھی نہ لکھ سکتا تھا۔ تمام کام گڈمڈ اور برہم سا ہوگیا تھا۔ آدھ گھنٹہ تک اس کے خیالات منتشر رہے۔ مگر اس خیال سے کہ صبح مقدمات کی پیروی لازمی ہوگی، اس نے خیالات کو بزور مجتمع کیا اور مقدمات کا خلاصہ لکھ کر ساڑھے آٹھ بجے نہانے کے لئے اٹھا۔ اس وقت اس کا ذہن بالکل صاف تھا، اور آخر کار اس کی قوت ارادی کامیاب ہوگئی تھی۔ ساڑھے نو بجے اُسے لاری کے پاس جانا تھا۔ صبح لندن سے ارجنٹائن کو ایک جہاز جا رہا تھا۔ اسے خیال آیا۔ کہ اگر لاری کو فوراً لندن چھوڑنا پڑا، تو روپیہ کا انتظام کرنا ہوگا۔ کھانا کھاتے وقت اُس نے اخبار میں پڑھا:۔

"سوہو کا قتل"

"تفتیش کرنے پر پولیس نے اس مقتول کی شناخت کرلی ہے۔ جو گولیبن کے نزدیک پل کے نیچے پڑا ہؤا ملا تھا۔ ایک گرفتاری عمل میں آئی ہے"

خوش قسمتی سے وہ اس وقت کھانا ختم کر چکا تھا۔ کیونکہ ان الفاظ نے پھر ایک کیفیت اس کے قلب پر طاری کر دی۔ ہو سکتا تھا۔ کہ لاری گرفتار ہوگیا ہو۔ اور اگر وہ گرفتار ہوگیا تو تمام راز افشا ہو جائے گا۔ عورت بھی مجرم ٹھیرائی جائے گی

لوگ کیا کہیں گے، کینتھ کا بھائی قاتل ہے۔ یہی وہ خیالات تھے۔ جن سے وہ بے چین ہو رہا تھا۔ مگر اس نے عجلت سے کام نہ لیا، اور باطمینان دن کے کام کے کاغذات جمع کئے، اور ایک گاڑی میں بیٹھ کر فنٹرزی سٹریٹ میں جا پہنچا۔ مکان پر پہنچ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ اور جب نوکر باہر آیا۔ تو اس نے پوچھا "مسٹر ڈارنٹ اندر ہیں"؟

جواب ملا" جناب وہ ابھی جاگے نہیں"۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے ان سے ضروری کام ہے" اور وہ یہ کہہ کر اندر داخل ہو گیا، لاری چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے لیٹا ہوا تھا، کمرے میں سگرٹ کی بو آرہی تھی، دھوئیں کے مرغولے سیاہ بادلوں کی طرح چھائے ہوئے تھے، لاری ایک کپڑا اوڑھے گلے سے ننگا لیٹا ہوا تھا، اس کے گھنے اور سیاہ بال اس کے ماتھے پر آ کر اس کی آنکھوں کو چھپا رہے تھے۔ سامنے کرسی پر سگرٹ کے ٹکڑوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا، غرضیکہ اس کا کمرہ فلاکت کی مکمل تصویر تھا جب کینتھ اندر داخل ہوا، تو اس نے دھوئیں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور آہستہ سے بولا "کیوں بھائی اس کی سزا کیا ہوگی حبس دوام اور چالیس پونڈ جرمانہ"؟

اِس گستاخی نے کینتھ کو آپے سے باہر کر دیا، کل رات یہی لاری مجسم عبرت اور عجز بنا ہوا تھا۔ مگر آج اس کی طبیعت میں وہی سرکشی ہے، وہ اپنے غصہ کو دبا کر بولا" تمہیں اب مذاق کی سوجھ رہی ہے"۔

لارنس نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا+

آہ اس کا استقلال کس قدر نفرت انگیز تھا، کینتھ پھر بولا" میں کل اس سے ملا تھا"۔

"تم؟" لاری نے چونک کر کہا+

"ہاں کل رات۔ اس لڑکی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے"+

لارنس کا چہرہ متبسم ہو گیا" یہ میں نے تمہیں بتایا تھا"

"اور مجھے بھی تو اپنی تسلی کرنا تھی۔ لاری میرے خیال میں تم فوراً۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ وہ دوسرے جہاز میں تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔ تم دونوں اکٹھے نہیں جا سکتے، کیا تمہارے پاس روپیہ ہے"؟

"نہیں"

"میں تمہیں خرچ دوں گا۔ میں تمہیں ایک سال کی کمائی دے دوں گا، اگر شرط یہ ہے کہ میرے سوا تمہارا پتہ کسی کو معلوم نہ ہو"۔

ایک لمبی آہ سے اُس نے جواب دیا" کینتھ تم ہمیشہ مجھ پر مہربان رہتے ہو، نہ جانے اس کی کیا وجہ ہے"۔

کینتھ نے جواب دیا" جیرکل ارجنٹائن جانے کے لئے جہاز تیار ہے۔ تم خوش قسمت ہو۔ انہوں نے ایک آدمی شبہ میں گرفتار کر لیا ہے اخبار میں درج تھا۔

کیا؟"

سگرٹ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اور وہ چارپائی سے اٹھ بیٹھا۔

"کیا؟"

کینتھ بولا "تم گھبرا کیوں گئے ہو۔ بیگناہ آدمی کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ ہمیشہ اسی طرح کسی نہ کسی کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ ہمیں اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور اس نے لہجہ بدل کر کہا" دیکھو لاری۔ تمہیں اس کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔ تم جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے لئے جہاز پر جگہ محفوظ کراتا ہوں چھ بجے میں تمہیں لینے آؤں گا۔ جب لڑکی تم سے جا ملے۔ تو تم چاٹل سے پرے چلے جانا۔ جتنے دُور ہو گے اتنا ہی بہتر ہوگا مجھے اب جانا چاہیئے۔ کیوں کہ کچہری بھی جانا ہے" اور اس نے بھائی پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا "جلدی کرو۔ تمہیں اس میں میری عزت و ناموس کا بھی خیال ہونا چاہیئے۔ سمجھتے ہو؟" مگر لاری ابھی تک اس کی طرف مبہوت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور جب اُس نے "سمجھتے ہو؟" کا جملہ دھرایا۔ تو لاری نے اثبات میں سر ہلا دیا، اور کینتھ باہر نکل گیا۔

جب کینتھ جا رہا تھا۔ تو اسے خیال آیا۔ کہ سب سے پہلے روپے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ بنک میں پہنچا، اور چار سو پونڈ کے نوٹ اپنے حساب سے نکلوائے، اس کے بعد وہ ساحل پر گیا۔ اور وہاں سے جہاز میں جگہ محفوظ کرا کے مطمئن ہو کر کچہری میں چلا گیا، اور مقدمات کی پیروی کرنے لگا۔ اس نے اس دن اپنے ذہن کو نہایت صاف پایا۔ چنانچہ اس کی تائید میں دو مقدموں کا فیصلہ اس کے موکلوں کے حق میں ہو گیا۔ دوپہر کو وہ کھانا کھانے کے لئے باہر نکلا تو اس نے اخبار خریدا۔ مگر تا ہنوز قتل کے متعلق کوئی خبر شائع نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ تمام دن کام کرتا رہا۔ اور کام ختم کر کے اس نے چانسری لین جا کر اخبار خریدا، اور چھ بجے کی گاڑی پر فنٹرزی سٹریٹ جا پہنچا۔

---

(۵)

لارنس اپنے بستر پر خاموش بیٹھا رہا۔ "بیگناہ آدمی کو کوئی خطرہ نہیں"۔ کینتھ نے کہا تھا۔ وہ ایک مشہور وکیل ہے کیا وہ اس پر اعتبار کر سکتا تھا۔ کیا وہ آٹھ ہزار میل کے فاصلہ پر اس لڑکی کو ساتھ لے کر ایک آدمی کی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر چلا جائے؟

گذشتہ رات وہ ایک فیصلہ پر پہنچ چکا تھا، اور ہر مصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار ہوگیا تھا، وہ کیتھ کے مشورہ کو قبول کرنے کے لئے تیار بیٹھا ہوا تھا، کہ خود کو پولیس کے حوالے کردے، مگر اس کے آنے پر اس کے خیالات تبدیل ہوگئے تھے۔ ایک ناقابل بیان سرعت کے ساتھ اس کے ذہن میں امید اور خوشی کی جھلک نمایاں ہوئی۔ ایک نئے ملک میں جاکر رہنا جہاں کی حکومت جمہوری ہو۔ کتنا فرحت افزا تھا، اور پھر لڑکی کیساتھ اس جگہ رہنا جہاں کے باشندوں نے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہو۔ کتنا مسرت خیز تھا، آخر اس نے بھی قتل بری نیت سے نہیں کیا تھا، قانوناً وہ مجرم نہ تھا۔ پھر یکایک اسے گرفتار شدہ آدمی کا خیال آیا، آج عدالت اسکو مجرم ٹھیرا دے گی، اور پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ کہ اُسکو جاکر دیکھے، اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ ایک حجام کی دکان پر گیا۔ جہاں اس نے حجامت بنوائی، اور اخبار دیکھا۔ ملزم کا نام "جان ایون" درج تھا، مگر اس کا پتہ درج نہ تھا دکان سے نکل کر وہ کچہری کی طرف چلدیا۔ مگر وہاں جاکر اس کا ارادہ متزلزل ہوگیا۔ وہ دو تین دفعہ کچہری کے سامنے سے گذرا۔ آخر کار جی کڑا کرکے ہجوم کو چیرتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

عدالت کا کمرہ لوگوں سے پُر تھا۔ جو خاص طور پر مقدمہ کا فیصلہ سننے کے لئے آئے ہوئے تھے، جج فیصلہ پر فیصلہ سنا رہا تھا، اور لاری کا اضطراب ہر لحظہ بڑھ رہا تھا، کچھ عرصہ بعد اس نے دیکھا، کہ جس آدمی سے وہ گذشتہ شب ملا تھا، اسے دو سپاہی گرفتار کئے ہوئے عدالت میں لا رہے ہیں۔ اس کی حالت دن کی روشنی میں رات سے بدتر تھی۔

عدالت میں ایک نرم سا شور ہوا۔ اور لاری نے اپنے دل کی حرکت کی سرعت کو محسوس کیا، یہ آدمی تھا، جو اس کے کئے کو بھگتنے کے لئے لایا جارہا تھا، پھر اس کی توجہ بیانات کی طرف مبذول ہوگئی۔ کارروائی نہایت مختصر تھی۔ ہوٹل کے مینجر کی شہادت تھی۔ جس کے پاس وہ ٹھہرا تھا۔ اس نے مقتول اور اس کی انگوٹھی کی شناخت کی۔ ایک ساہوکار کی شہادت تھی۔ جس کے پاس مذکورہ انگوٹھی ملزم نے گروی رکھی تھی، ایک سپاہی کی شہادت تھی۔ جس نے ملزم ایون کو بارہا گلوں میں دیکھا تھا۔ اور بارہا اس پل کے نیچے سوتے ہوتے اٹھایا تھا۔ ایک اور سپاہی کی شہادت تھی۔ جس کے سامنے ایون نے گرفتار ہوکر کہا تھا "ہاں میں نے انگوٹھی انگلی سے اوتاری تھی، میں نے اسے وہاں مردہ پایا تھا۔ . . میں جانتا ہوں کہ مجھے یہ نہ کرنا چاہیئے تھا۔ . . . میں تعلیم یافتہ ہوں . . . میں نے مقتول کی جیبیں الٹی ہوئی پائی تھیں۔

چند لمحے عدالت میں خاموشی رہی، اور پھر جج نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "مقدمہ ملتوی کیا گیا۔" اور سپاہی ملزم کو باہر لے گئے۔

لارنس بیٹھا رہا- اس کی پیشانی پر پسینہ کے سفید قطرات چمک رہے تھے- وہ سوچ رہا تھا- کہ جان ایون کے انگوٹھی اتارنے سے قبل ضرور کوئی لاش کے قریب آیا ہوگا- جس نے روپے نکال کر جیبوں کو اُلٹ دیا ہوگا- ویلن جیسا آدمی رات کو روپیہ کے بغیر کبھی باہر نکل نہیں سکتا- علاوہ ازیں اگر ایون کو روپے ملجاتے، تو وہ کبھی انگوٹھی اتارنے کے خطرہ کا سامنا نہ کرتا -اِس لئے ایون سے قبل ضرور کوئی لاش کے پاس آیا ہوگا- اور اب اُس کا فرض تھا- کہ یہ اقرار کرے کہ جب اس نے روپے نکالے تھے، تو انگوٹھی وہیں تھی، ایون کی بریت ثابت کرے، یہ خیال اس کے لئے تسکین دہ تھا- کیونکہ وہ محسوس کر رہا تھا- کہ اسے اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہئے- وہ کمرۂ عدالت سے متذبذب ہو کر نکلا- اور اب اُسے شراب کی خواہش تنگ کر رہی تھی، کیوں کہ اِن حالات میں اس کے بغیر زندہ رہنا دشوار معلوم ہو رہا تھا اُسے اب لوگوں کا کوئی ڈر نہ تھا، مگر وہ اس بات سے خائف تھا، کہ مبادا وہ خود جا کر جرم کا اقبال نہ کرلے- پھر یکایک اسے لڑکی کا خیال آیا، اور اس نے شراب کی خواہش کو دباتے ہوئے سوہو کی طرف چلنا شروع کر دیا- وہ سوچ رہا تھا، کہ اس نے کینتھ کو چابیاں دینے میں غلطی کی تھی، وہ اس کو دیکھ کر گھبرا گئی ہو گئی- اور کینتھ نے اس کو ضرور ڈرا دیا ہوگا+

گلی کی تاریکی میں جہاں وہ لاش کو پیٹھ پر لاد کر لایا تھا- اس نے جلدی جلدی چلنا شروع کر دیا- لڑکی کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اور پیشتر اس کے کہ وہ اندر داخل ہو- اس کی باہیں اس کے گرد حمائل ہوگئیں تھیں-

کمرے کی آگ بجھی ہوئی تھی- جس سے ظاہر ہوتا تھا، کہ وہ کمرہ کو گرم رکھنا ہی بھول گئی تھی، ایک سٹول کھڑکی کے قریب پڑا ہوا تھا، جہاں وہ بیٹھی رہی تھی- گو اسے معلوم تھا، کہ اب وہ اسے ملنے نہیں آئے گا مگر وہ اسی امید کے ساتھ اس کی منتظر تھی، جو ان اوقات مایوسی میں بھی عشاق کو محو تمنا رکھتی ہے- لاری نے بیٹھتے ہی کہا" انہوں نے کسی کو گرفتار کر لیا ہے"+

اس کے چہرہ ہی سے وہ اس خطرہ کو بھانپ چکی تھی- اور اس نے جواب دینے کی بجائے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں-

وہ مکان سے پانچ بجے نکلا، اور ابھی وہ دو ہی گلیاں گذرا تھا- کہ اسے ملزم کی یاد ستانے لگی- ایک مہیب شکل کو کٹہرہ میں کھڑا ہوا دیکھنا کتنا تکلیف دہ تھا+

جب وہ اپنے مکان پر پہنچا، تو کینتھ اس کے دروازہ پر ایک گاڑی سے اُتر رہا تھا، دونوں مکان کے اندر چلے گئے مگر دونوں میں سے کوئی بھی نہ بیٹھا، کینتھ دروازے کے پاس کھڑا ہوگیا- اور لارنس میز کے ساتھ، کینتھ بولا" اب جہاز پر جگہ

بالکل تھوڑی رہ گئی ہے، اور قبل اس کے کہ وہ پر ہو جائے، تم جا کر اسباب بک کرا لو، یہ لو روپیہ ہے"۔

لارنس نے جواب دیا "کینتھ میں نہیں جاؤں گا"۔

"لارنس دیکھو۔ یہ حماقت نہ کرو میں نے عدالت کی کارروائی پڑھی ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں۔ چند ہفتے ایک جیل میں یا باہر اس آدمی کے لئے یکساں ہیں۔ تم اس خیال کو دماغ سے نکال دو۔ اس کو مجرم ٹھہرانے کے لئے عدالت کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ اور یہ تمہارے لئے زرین موقع ہے۔ تم اپنی زندگی کی تجدید کر سکتے ہو"

لارنس ہنسا۔ اس کی ہنسی میں وحشت اور جنون پنہاں تھا، اس نے نوٹ پکڑ لئے اور بولا "بھاگ جاؤں اور اپنے بھائی کینتھ کی عزت و ناموس کو بچا لوں، کینتھ ان کو اپنی جیب میں رکھ لو۔ یا ان کو آگ میں پھینک دوں گا آؤ ان کو لے لو۔" اور اس نے بڑھ کر نوٹوں کو انگیٹھی کی سلاخوں سے لگا دیا۔۔۔۔۔ "یا یہ جل جائیں گے"۔

کینتھ نے بڑھ کر نوٹ واپس لے لئے۔

"کینتھ میرے دل میں ابھی تک خودداری موجود ہے۔ اگر میں بھاگ جاؤں تو وہ نہیں رہے گی۔ ایک بھیک منگے جتنی بھی نہیں رہے گی، گو اب اس سے بہت تھوڑی مقدار میں زیادہ ہو۔ مگر ہے ضرور"۔

کافی عرصہ تک سکوت رہا۔ جس کو توڑتے ہوئے کینتھ نے جواب دیا "میں تمہیں بتا دوں کہ تم غلطی پر ہو کوئی جیوری اسے ملزم نہیں ٹھیرائے گی۔ اگر وہ ٹھیرا بھی دیں۔ تو جج اسے پھانسی نہیں دیگا۔ اور ایک اُچکا جو لاشوں سے روپیہ چراتا ہے، اسی قابل ہے کہ قید کر دیا جائے۔ اگر تم انصاف کی نظر سے دیکھو تو تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ اس نے تم سے بدتر فعل کیا ہے"۔

لارنس نے سر اٹھا کر جواب دیا، "بھائی تم اندازہ نہیں لگا سکتے، دل ایک تاریک کنواں ہے"۔

کینتھ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تو پھر تم کرنا کیا چاہتے ہو، میں تمہیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ تمہیں اپنے نام کا ضرور پاس ہونا چاہیئے، یا تمہارے نزدیک یہ قابل التفات نہیں ہے؟"

لارنس نے سر جھکا لیا، یہ حرکت اس کے الفاظ سے زیادہ اس کے خیال کو ظاہر کر رہی تھی "مرے کو نہ مارو۔۔۔۔۔۔۔۔ بھائی میں نہیں جانتا۔ کیا کروں گا۔ بس اس وقت نہایت پریشان ہوں"۔

کینتھ نے اس کو نظر بھر کر دیکھا، اور ایک لفظ کہے بغیر باہر چلا گیا۔

---

(۶)

فلسفیوں کو اگر مستثنےٰ کر دیجئے تو معلوم ہوگا کہ جسقدر کسی کی ذاتی عزت ہوتی ہے اتنی ہی اسکے خاندان کے ننگ و ناموس کی بھی ہوتی

کینتھ کی عادت تھی، کہ وہ خطرات کا مقابلہ جرأت سے کرتا، مگر یہ ضرب شدید جواب اُس کے احساسات پر پڑی تھی۔اُس کی عقل و تدبیر کو مختل کرنے کے لئے کافی تھی۔جس طرح کسی سرسبز و شاداب گلشن پر صاعقہ ملتہب کا نزول اُسے خاک سیاہ کر دیتا ہے۔اسی طرح لاری کے اس رویہ نے اس کے جذبات کو مسل دیا تھا +

مقدمہ کے التوا نے ثبوت بہم پہنچایا۔کہ مقتول نے قتل کی رات سے قبل بہت شراب پی تھی۔ اور ملزم ایک پرانا عیاش تھا۔اور بارہا گالولین میں دیکھا گیا۔کینتھ اپنے آپ کو روکنے کے باوجود عدالت میں برابر جاتا رہا۔اور مقدمہ کی کارروائی سنتا رہا۔وہاں لاری کی عدم موجودگی اس کے لئے تسکین دہ ہوتی +

اس کے ضمیر نے اسے قتل کی معلومات چھپانے پر بالکل ملامت نہ کی۔اس کا ایمان تھا، کہ ملزم کو مجرم ٹھیرانے کے لئے عدالت کے پاس کافی شہادت نہ تھی۔علاوہ ازیں اس میں کسی بدمعاش کی تکلیف محسوس کرنے کی صلاحیت نہ تھی، اُس کا خیال تھا، کہ یہ غول بجائے اسکے کہ دسمبر کی راتوں میں لاشوں سے روپیہ چراتا پھرے۔قید خانہ میں بہتر رہے گا۔جذبات لطیف سے وہ محض ناآشنا تھا +

کافی دن گذر گئے، اور اس عرصہ میں نہ تو کینتھ نے لاری کو دیکھا۔اور نہ اُسے خط لکھا۔کرسمس کی رات جب وہ گرجا سے واپس آرہا تھا، اس کا گذر فٹرزی سٹریٹ سے ہوا۔اور اسے لاری کا خیال آیا، وہ مڑکر اس کے مکان پر جا کھڑا ہوا۔مکان میں بالکل تاریکی تھی۔کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔اور دروازہ پر "کرایہ کے لئے خالی ہے" لکھا ہوا تھا +

کینتھ یہاں سے ہوکر بارد سٹریٹ پہنچا۔لڑکی کے مکان میں روشنی دیکھ کر اُس نے کھڑکی سے جھانکا۔دونو محوِ خواب تھے، کینتھ نے اندر جانا مناسب نہ سمجھا، اور واپس چلا آیا +

لاری نے اب اپنی سکونت مستقلاً اس مکان میں منتقل کر لی تھی۔ اور اپنا مکان کرایہ پر دے دیا تھا۔شراب اب اُس نے ترک کر دی تھی۔تمام دن لڑکی کے ساتھ مکان میں رہتا۔نہ کوئی اُس کے پاس آتا اور نہ وہ کسی کے پاس جاتا، البتہ صبح کو ایک نوکرانی راکھ اٹھانے کے لئے آتی۔اور پھر تمام دن ان کے مکان میں کوئی داخل نہ ہوتا، اس کا خرچ نہایت معمولی تھا۔عام خوراک پر گذارہ تھا۔لڑکی نے بھی کبھی کسی چیز کے لئے خواہش ظاہر نہیں کی۔لاری شام کو اخبار ضرور خریدتا۔اور بڑے شوق سے پڑھتا +

---

(۷)

۳۰۔جنوری کی دوپہر کو عدالت سے ایک وحشت کے مقدمہ میں کامیاب ہوکر نکلنے پر کینتھ نے دیوار پر اشتہار

دیکھا۔ "گلولین کا قتل۔ کارروائی اور فیصلہ" اور اُسے فوراً خیال آیا۔ کہ میں نے اخبار نہیں دیکھا۔ وہ مسرت جس نے چند لمحے بیشتر اس کے نہانخانۂ دماغ کو مقدمہ کی کامیابی سے مسرور کر رکھا تھا، اب بے حقیقت نظر آنے لگی وہ تیز تیز چلتا ہؤا سٹال پر پہنچا، اور جب وہ اخبار لے کر ایک پنس ادا کر رہا تھا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا۔ "سٹاپ پریس میں درج تھا۔ گلولیس کا قتل۔ جیوری نے "مجرم" کا فیصلہ صادر کر دیا، پھانسی کی سزا دی گئی"۔ وہ حیران تھا، کہ آخر یہ کیسے ہؤا۔ مگر واقعات اس کے شاہد تھے۔ کہ یہ ہؤا ضرور۔ اس کے خیالات اور پریشان ہوگئے۔ اور وہ دل پر ایک بوجھ محسوس کرنے لگا +

تنگ راستہ سے جب وہ سیڑھیوں پر اترنے کے لئے جا رہا تھا۔ ایک دوست نے اُسے پکارا "ڈارنٹ مبارک ہو۔ آج مقدمہ خوب جیتا" اور کینتھ نے ایک تبسم کے ساتھ سوچا "مبارک اور میں" ؟ دو متضاد چیزیں ہیں "

فرصت کے اولیں لمحہ میں اس نے گاڑی کرایہ پر لی، اور بار وسٹریٹ میں جا پہنچا۔ لڑکی نے کھٹکھٹانے پر دروازہ کھول دیا۔ اور حیران ہو کر کینتھ کی طرف دیکھنے لگی۔ کینتھ نے کچھ دیر ٹھیر کر اس سے استفسار کیا "میرا بھائی ؟"

لڑکی نے جواب دیا "جناب اس وقت وہ اندر نہیں ہیں"

"کیا تمہیں معلوم ہے۔ کہ وہ کہاں ہے ؟" "نہیں"

"کیا اب وہ تمہارے پاس ہی رہتا ہے ؟" "جی ہاں"

"کیا تم اب بھی اسکی ویسی ہی مشتاق ہو ؟"

لڑکی نے اپنے ہاتھ سینہ پر رکھ لئے۔ گویا وہ جواب دینے سے قاصر ہے۔ اور کینتھ نے کچھ سمجھ کر "ہوں" کہدیا +

اُس نے آگ کے نزدیک بڑھ کر کہا "کیا میں اس کا انتظار کر سکتا ہوں ؟"

"ہاں جناب بڑی خوشی سے تشریف رکھیئے" +

مگر کینتھ نے بیٹھنا نہ چاہا۔ لڑکی نے لکنت آمیز لہجہ میں کہا۔ "خدا کے لئے آپ مجھے اس سے جدا نہ کریں میں مر جاؤں گی" ۔

اس نے درشتی سے جواب دیا "کہ میں تمہیں اس سے جدا کرنے نہیں آیا، بلکہ میں تمہیں اس کے ساتھ رہنے میں مدد دوں گا، کیا تم باہر جانے کے لئے تیار ہو ؟"

"ہاں۔ بالکل تیار ہوں"

"اور کیا وہ بھی؟" "ہاں مگر اُسے ملزم کا خیال ہے"

"اجی وہ مردود غول بیابانی قابلِ اعتنا نہیں"

"آہ" لڑکی نے ایک سرد آہ کھینچی "مگر مجھے اس کا افسوس ہے۔ شاید وہ بھوکا تھا۔ میں کئی دفعہ بھوکی رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔ کہ آدمی بھوک کے وقت کیا کچھ کر گذرتا ہے۔ مجھے بارہا اس کا خیال آتا ہے"۔

"اور لارنس کو"؟

"ہم دونو اس کے متعلق کبھی گفت گو نہیں کرتے۔ ہمیں ڈر معلوم ہوتا ہے"؟

"تو اس نے تمہیں مقدمہ کی کارروائی کے متعلق نہیں بتایا؟"

"نہیں تو۔ البتہ آج وہ کچھ پریشان سا تھا۔ آج صبح وہ بہت جلدی اٹھا تھا۔ کیا مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا ہے؟"

"ہاں"

"تو کیا ہوا ہے"؟

"مجرم"

کیتھ کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا لڑکی کو غش آنے لگا ہے۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور لڑکھڑائی۔ کیتھ نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

"سنو" وہ بولا "میری مدد کرو۔ لارنس کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ ہمیں کچھ وقت چاہیئے۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ مجرم کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے۔ غالباً اسے پھانسی نہیں دیا جائے گا"

وہ ابھی تک مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیتھ نے اس کا بازو دبا کر کہا "کیا تم سمجھتی ہو"؟

"ہاں لیکن اگر اس نے پہلے ہی راز افشا کر دیا۔ تو؟"

کیتھ کے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ اور اسے خیال آیا۔ کہ اگر پولیس اس وقت یہاں آجائے تو اس کا کیا حشر ہو" اور اس نے لڑکی سے کہا کیا میں تم پر اعتبار کرسکتا ہوں، کہ تم لاری کا خیال رکھو گی؟ جلدی کرو، جواب دو"۔

اس نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ کر جواب دیا، "میں کوشش کروں گی"۔

اتنے میں چٹخنی کے کھلنے کی آواز آئی، اور لارنس ایک گلدستہ ہاتھ میں لئے اندر داخل ہو گیا۔ اس کا چہرہ متردد اور زرد تھا۔ کیتھ کو دیکھ کر بولا "آیئے کیتھ صاحب"۔

کینتھ نے پوچھا "کیا تم نے دیکھا ہے"؟

لارنس نے اثبات میں سر ہلا دیا، اس کی حرکات اُس کے دِل کے حالات ظاہر کرتی تھیں۔ کینتھ نے پوچھا "پھر" ؟

"مجھے اس کی امید تھی، اس نے جواب دیا +

کینتھ بولا" مگر ایسا ہونے نہیں پائے گا۔ میں رپورٹ کو دیکھوں گا۔ وقت کی ضرورت ہے، اور میں دیکھونگا کہ اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ لاری تم سمجھتے ہو؟" وہ سمجھتا تھا، کہ لاطائل گفتگو کر رہا ہے۔ مگر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اور اس نے پھر کہا" تم وعدہ کرو۔ کہ کل صبح تک مکان سے باہر نہیں جاؤ گے "۔

لاری نے دوبارہ اثبات میں سر ہلا دیا +

کینتھ نے دوبارہ پوچھا" وعدہ کرتے ہو" ؟

" وعدہ کرتا ہوں" لارنس نے اقرار کیا، وہ ہنس رہا تھا۔ کینتھ اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ اور وہ باہر نکل گیا +

---

(۸)

جب کینتھ چلا گیا۔ تو لڑکی خاموش بیٹھی رہی، لاری نے آگ روشن کی، اور پھر ذرا بیٹھ کر شغل مے نوشی میں مصروف ہو گیا، لڑکی کھانا پینا نہیں چاہتی تھی۔ صرف ارشاد کی تعمیل کرتی رہی +

لاری بہت شراب پی رہا تھا۔ آج اس نے تمام کام ایک خواہش کے زیر اثر کئے تھے، یعنی آج وہ ایک جشن منانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کمرہ کو خوب سجایا ، انگیٹھی پر گلدان تازہ پھولوں سے بھرے رکھے تھے۔ اگر کی بتیاں جل رہی تھیں، وانڈا کو آج اس نے تمام پونجی صرف کر کے ایک نہایت نفیس لباس تیار کرا کے دیا تھا+ اور دو سنہری چوڑیاں بھی پہنا دی تھیں۔ جب عنبریں مے صراحی سے چھلکتے ہوئے پیمانہ میں آتی تو اس کی مسرت کی انتہا نہ رہتی +

آخر کار دس بجے کے قریب یہ جشن ختم ہوا۔ اور اُس نے، انڈا کو سونے کے کمرے میں بھیجا، خود آگ کے نزدیک کاغذ، قلم، اور دوات لے کر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی جو پرکاہ کی طرح بادحوادث سے ہر وقت متحرک رہتا تھا۔ آج دل میں سکون لئے بیٹھا تھا۔ وہ آدمی جس کے خیالات ہر وقت منتشر رہتے تھے۔ آج اپنی ساری توجہ ایک نقطے پر مرکوز

کئے بیٹھا تھا۔ وہ آدمی جس کے ذہن میں ہر وقت خیالات نے اودھم مچا رکھا ہو۔ آج اپنے ذہن کو آئینہ کی طرح شفاف بنائے بیٹھا تھا، وہ ایک کاغذ پر کچھ دیر لکھتا رہا۔ اور پھر عیش کی نیند سو گیا۔

---

(۹)

کینتھ گھر جانے کی بجائے کلب گیا، اور مہمانوں کے کمرہ میں اس نے مقدمہ کی کارروائی کا مطالعہ کیا۔ عدالت نے ایسا مقدمہ بنایا تھا، جو صریحاً عقل کی بجائے زیادہ تر قیاس پر مبنی تھا، اُسے خیال آیا کہ وہ مجرم کے وکیل سے ملے، اور اسے بتائے کہ اس کے مقدمہ میں انصاف کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ انہیں اپیل کرنی چاہیئے تھی، اور ابھی تک سب کچھ درست ہوسکتا تھا۔ بشرطیکہ لاری اور لڑکی خاموش رہیں۔

اسے بھوک نہ تھی۔ مگر کھانے کی رسم کی پابندی لازمی تھی، اسے اُن لوگوں پر طیش آرہا تھا۔ جو اُس کے ساتھ نہایت اطمینان اور دلجمعی سے کھانا کھا رہے تھے۔ آہ قدرت کا یہ کتنا غیر منصفانہ رویہ تھا، کہ ایک آدمی جو دوسروں جیسا ہی معصوم و بے گناہ ہو۔ اس آرام سے وقت نہ گذار سکے جیسے دوسرے گذار رہے ہوں۔ پھر اسے دن کے مقدمہ کا خیال آیا۔ جس میں وہ کامیاب ہؤا تھا۔ یہ خیال دل خوش کن تھا، رفتہ رفتہ اس کو پریشانی سے نجات مل گئی۔ پھر وہ اونگھنے لگا۔ اور گیارہ بجے گھر جانے کے لئے باہر نکل آیا۔ مگر جب اس نے سرد ہوا محسوس کی، تو خوف نے پھر اس پر غلبہ پالیا، قتل کا منظر پیش نظر تھا، واقعات ایک ایک کرکے سامنے آرہے تھے۔

اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ کو گرم کرنے کے لئے کوٹ کی جیب میں ڈالا، تو اسے کچھ سرد چیز محسوس ہوئی یہ چابیاں تھیں جو لاری نے اسے دی تھیں، اور جنہیں وہ واپس کرنا بھول گیا تھا۔ اس موقعہ کو اس نے غنیمت جانا اور وہ بار وسٹریٹ کی طرف مڑا۔ مکان پر پہنچکر اس نے دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہوکر بند کردیا، وہ وہاں کی فضا سے خائف تھا، اور محتاط رہنا چاہتا تھا، اس نے اندر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ شائد وہ سوئے ہوئے تھے، اس نے دوبارہ اور سہ بارہ کھٹکھٹایا۔ اور پھر دروازہ کھولکر اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ آگ روشن تھی۔ آگ کے سامنے فرش پر تنکئے پڑے ہوئے تھے، جن پر پھول بکھرے ہوئے تھے، میز پر بھی پھول اور رات کا بچا کھچا کھانا رکھا تھا۔

پردہ کے پیچھے سے اس نے دیکھا۔ کہ اندر کا کمرہ بھی روشن ہے۔ کیا وہ سب چیزیں اسی طرح چھوڑکر باہر چلے گئے تھے؟ اور باہر کیا کرنے؟ اس کے دل میں اضطراب پیدا ہونے لگا۔ بوتلیں اس پر شاہد تھیں کہ لاری شراب بھی پیتا رہا ہے۔

کیا سب کچھ ہو چکا تھا ؟ کیا وہ واپس چلا جائے - یہ سمجھ لے ، کہ اس کے بھائی نے جرم کا اقبال کر لیا ہے ، وہ جلدی سے پردہ کی طرف بڑھا - اور اسے کھینچکر ہٹا دیا ، کونے میں دیوار کے پاس ایک چارپائی پر وہ دونوں سو رہے تھے ، اسے کچھ اطمینان ہو گیا ، اسے خیال آیا - کہ وہ اس کے دروازہ .. کھٹکھٹانے پر بھی کیوں سوتے رہے ہیں - شائد مخمور ہیں - اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا - اُس نے چلا کر کہا " لاری " پھر چارپائی کے نزدیک جا کر پکارا " لاری " مگر صدائے برنخاست - کوئی حرکت نہ ہوئی - اس نے اپنے بھائی کا کندھا پکڑ کر زور سے ہلایا ، وہ سرد تھا - کینتھ نے اپنی انگلی بھگوئی - اور ان کی ناک کے پاس لے گیا - اسے خیال آیا - کہ شائد غش کی حالت ہے - مگر غش ایسا نہیں ہو سکتا - اُس کی انگلی نے ہوا محسوس نہ کی - نہ سانس تھا اور نہ زندگی کی کوئی علامت نبض کی حرکت بھی بند تھی - لڑکی کی آنکھیں بند تھیں او وہ صد درجہ کی معصوم دکھائی دے رہی تھی - لاری کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں - ان میں روشنی معدوم تھی - کینتھ نے ایک چیخ ماری اور پیچھے ہٹ گیا +

اور جب وہ مڑا - تو میز پوش کے ساتھ - پن سے ... ایک لفافہ لگا ہؤا تھا - جس پر یہ لکھا ہؤا تھا " برائے مہربانی پولیس کو دے دیں - لارنس ڈارنٹ " اُس نے اُسے پھاڑ کر جیب میں رکھ لیا - اور بجلی کی سرعت سے باہر نکل آیا - جب وہ چل رہا تھا - اُس کے خیالات کی حالت ناقابل بیان تھی - جب وہ اپنے دارالمطالعہ میں پہنچا تو اُسے کچھ ہوش آیا - کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے تھوڑی سی وسکی پی - اور پھر اسے خیال آیا - کہ اگر وہ دکان نہ جاتا تو صبح نوکرانی اُسے دیکھتی - اور لفافہ پولیس کو دے دیتی - اس نے لفافہ جیب سے نکالا - اور اپنا حق سمجھتے ہوئے اُسے پڑھنا شروع کر دیا ، لکھا ہؤا تھا :-

" میں لارنس ڈارنٹ جو خود اپنے ہاتھوں مر رہا ہوں - اقرار کرتا ہوں کہ یہ بیان حلفاً صحیح ہے میں نے گلوبین کا مشہور قتل ۲۷ نومبر کی رات کو ذیل کے طریقہ پر کیا ہے " اور اس نے تمام واقعات صحیح درج کئے تھے ..... - آخر میں لکھا تھا " ہم مرنا نہیں چاہتے تھے - مگر ہم ایک دوسرے سے جدا ہونے کے لئے بھی تیار نہ تھے ، اور اس کے ساتھ ہی کسی بیگناہ کو اپنی جگہ پر پھانسی پر لٹکتا ہؤا بھی نہیں دیکھ سکتے تھے ، مجھے اور کوئی طریقہ نظر نہیں آیا ، - اس لئے ہم نے خودکشی کر لی ... میں استدعا کرتا ہوں ، کہ ہماری لاشوں کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے - جو زہر ہم نے کھایا ہے - اس کا نمونہ میز پر پڑا ہؤا ہے - ہم دونوں کو اکٹھے دفن کیا جائے " +

لارنس ڈارنٹ ۲۸ جنوری ، ۱۰ بجے بعد دوپہر

آہ اُس نے ایک بیگناہ کو بچانے کی خاطر یہ سب کچھ کیا تھا۔ مگر اُس سے خاندانی عزت میں فرق آتا تھا۔ اِس خیال سے کیتھ نے بڑھ کر کاغذ کو آگ میں ڈال دیا۔ بلند اور تیز شعلوں نے آن کی آن میں اُسے راکھ کر دیا۔ اور کیتھ نے اسے بوٹ سے مسل ڈالا +

اس کا سر چکرا رہا تھا اور دماغ پھٹا پڑتا تھا۔ ہوا سے تازہ دم ہونے کی خاطر اُس نے کھڑکی کھول دی اور رات کی تاریکی میں باہر جھانکنے لگا۔ اسے نظر آیا کہ ہوا میں پھانسی کا ایک پھندا اور اس میں ایک جسم لٹک رہا ہے۔ اُس نے ڈر کر کھڑکی بند کر لی۔
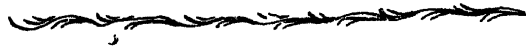
"دُنیا"

اے دنیا میں نے تیرا پھول توڑا۔ اور اُس کو سینے سے لگا لیا، کانٹا چُبھ گیا۔ جب دِن ختم ہوا اور تاریکی چھا گئی۔ تو میں نے دیکھا کہ پھول مرجھا چکا ہے۔ لیکن کانٹے کی تکلیف اب تک باقی ہے

اے دنیا بہت سے پھول تجھے اپنا "کبر" دکھائیں گے، اور خوشبو سنگھائیں گے۔ لیکن میری گلچینی کا دَور ختم ہو چکا، اور رات کی تاریکی میں میرا پھول ضائع ہو چکا۔ صرف تکلیف اب تک باقی ہے +

(ٹیگور)

(عزیز احمد)

نجدی مسافر

(حضرت ذوقی چاندپوری از مظاہر العلوم سہارنپور)

ذیل کی نظم ایک تصویر ہے۔ ایک نجدی مسافر آمادۂ سفر ہے۔ بہار کا زمانہ ہے۔ عُرار (گلاب) کے زرد زرد پھول کھل رہے ہیں۔ وُہ عصر و مغرب کے درمیانی وقت میں کھڑا ہوُا۔ اُن شگفتہ پھولوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور اپنے آپ سے یہ خطاب کر رہا ہے۔ کہ

تمتع من شمیم عُرار نجدٍ
فمٰا بعد العشیۃ من عُرارٖ

اَور قافلہ عنقریب آفتاب کے غروب ہوتے ہی کوچ کرنے والا ہے۔ ہمیں یہ نظم اپنے محترم دوست مولانا عبدالوحید صدیقی سے ملی ہے جس کے لئے ہم صاحب موصوف کے شکر گذار ہیں۔ (ایڈیٹر)

وُہ شام آئی وُہ آخر ہوگیا دن   چھپا جاتا ہے مہرِ مسافر باطن
یہ ساعت لوٹ آئے غیر ممکن   بس اب اے رہروِ غربت اماکن

تمتع من شمیم عرار نجدٍ
فما بعد العشیۃ من عرارٖ

قوافل کوچ کرنا چاہتے ہیں   بیاباں سے گذرنا چاہتے ہیں
کہیں جاکر ٹھہرنا چاہتے ہیں   ترے صدمے ابھرنا چاہتے ہیں

تمتع من شمیم عرار نجدٍ
فما بعد العشیۃ من عرارٖ

جدائی کے خیال آتے رہیں گے   یونہی آآ کے تڑپاتے رہیں گے
مجھے گھن کی طرح کھاتے رہیں گے   مگر یہ قافلے جاتے رہیں گے

تمتع من شمیم عرار نجدٍ
فما بعد العشیۃ من عرارٖ

متاعِ کارواں کی نقل و حرکت پتہ دیتی ہے یہ نوبت بہ نوبت
کہ اب نزدیک ہے ہنگامِ رحلت سمجھ کر اس اقامت کو غنیمت

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیة من عرار

دمادم آنسوؤں سے رونے والے عذارِ نیلگوں کو دھونے والے
غمِ فرقت میں جاں تک کھونے والے ابھی ناگاہ رخصت ہونے والے

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیة من عرار

بہت رویا ذرا اب ہوش میں آ سنبھل کر عالمِ خاموش میں آ
نہ ہو افسردہ خاطر جوش میں آ بہارِ نجد کی آغوش میں آ

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیة من عرار

وُہ بُو آئی پیامِ شوق ہو کر مگر نازک خرامِ شوق ہو کر
تو کیف اندوزِ جامِ شوق ہو کر زسرتا پا مشامِ شوق ہو کر

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیه من عرار

ہُوا جب جوشِ گویائی فراواں زبانِ حال سے بولا گلستاں
کہ اے وارفتۂ گلہائے خنداں تری حسرت بھری نظروں کے قرباں

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیة من عرار

سُن اے موسیٰ دشتِ ایمنِ نجد دل و جاں دادۂ برق افگنِ نجد
چھٹا ہی چاہتا ہے دامنِ نجد کہاں تو پھر کہاں یہ گلشنِ نجد

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیة من عرار

عہدِ خلافت میں کتابوں کی تجارت

(از غلام ناصر خاں صاحب بی اے)

کثرت فتوحات اور استحکام سلطنت کی وجہ سے جنگی اور انتظامی معاملات نے عربوں کو اتنی مہلت ہی نہ دی۔ کہ وہ علوم وفنون کی طرف توجہ کرتے اور نہ اس وقت ان کا رجحان طبع یہ تھا۔ کہ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر یہ کام انجام دیتے۔ من حیث القوم انہوں نے اب تک کسی علمی ذوق کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ شعر وشاعری میں انہوں نے نمایاں امتیاز حاصل کیا۔ مگر ان کی ادبی شان وشوکت کی یہی ابتدا تھی۔ اور یہی انتہا۔ اس زمانہ میں ایک خاص وقت تک مذہب اسلام ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ ایک یہی خیال تھا۔ جو ان کی مقامی۔ اجتماعی اور انفرادی روایات پر غالب رہا۔ ان کی کل محبت واحترام خدا ورسول ہی میں منقسم ہوگئی۔ قرآن نے ان کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔ وہ اس کو منزل من اللہ اور تمام خوبیوں کا گنجینہ سمجھتے تھے۔ اس سے عشق رکھتے تھے۔ اور احترام کرتے تھے۔ اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور اس کی تبلیغ واشاعت اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ اسے جنوبی عرب کے بنے ہوئے نہایت عمدہ اور چکنے چمڑے۔ چھال اور جھلّی پر لکھا کرتے تھے۔ اور اسی سے وہ اپنا ادبی ذوق پورا کر لیتے تھے۔ اس زمانہ میں کاغذ کا رواج نہ تھا۔ کیونکہ وسیع پیمانہ پر نہ تو نظام سلطنت ہی تھا۔ کہ اس کی ضرورت پیش آتی نہ ایسی چیزیں ہی تھیں جو معرض تحریر میں آتیں۔

گو عرب خود ایسے زیادہ متمدن نہ تھے لیکن ان کے مفتوحہ ممالک میں روایات بہت شاندار اور تمدن نہایت اعلیٰ تھا۔ مثلاً تسخیر مصر سے انہیں بہترین صنعت کاغذ سازی حاصل ہوگئی۔ اگرچہ یہ صنعت بہت زمانہ سے رائج تھی لیکن اسے فروغ عربوں کی سرپرستی ہی میں نصیب ہوا۔ کیونکہ اسلامی سلطنت نے دیسی اشیاء پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا تھا۔ اس صنعت کا مرکز بوصیرا میں تھا۔ جو ڈمیشیا کے ضلع میں ایک ساحلی مقام ہے۔ عربوں نے اس صنعت کو فروغ دیا۔ انہوں نے درخت کے پرانے نام کو بحال رکھا۔ جسے وہ فافر کہتے تھے۔ اور تیار شدہ

چیز کو قرطاس کہتے تھے۔ بازنطینی حکومت کی تمام کاغذ کی ضروریات یہیں سے پوری ہوتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مصر سے بازنطین میں کاغذ کی برآمد بہت بڑھ گئی۔

اس کے علاوہ مصر میں کاغذ سازی کا ایک نیا طریقہ دور اسلام میں اور جاری ہوا۔ جس کی بناء بقول ایک عرب کے یہ ہے۔ کہ خلیفہ معتصم نے ۲۲۱ھ میں جب شہر آباد کیا۔ تو اس نے اطراف حکومت سے ہر قسم کے صناع بلائے چنانچہ مصر سے کاغذ ساز بھی طلب کر کے بسائے۔ چونکہ سمارہ میں یہ درخت جس سے کاغذ بنتا تھا۔ نہیں ملتا تھا۔ اس لئے انہوں نے سن اور روئی سے کاغذ بنانا شروع کیا۔ یہ طریقہ شروع کیونکر ہوا؟ یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا البتہ ذہن خود بخود اس طرف منتقل ہوتا ہے۔ کہ پیپرس کی کمی کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی روئی کی آمیزش شروع کی گئی۔ اور رفتہ رفتہ پیپرس کی بجائے خالص روئی ہی رہ گئی۔

تیسری صدی ہجری تک تمام دفاتر سلطنت اسلام میں کھالیں اور پیپرس سے تیار شدہ کاغذ ہی استعمال ہوتا رہا۔ خلفائے امین و مامون کے عہد میں عام طور پر کھالیں ہی استعمال ہوتی تھیں۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں کی آپس کی لڑائی کے زمانہ میں جو دستاویزیں لوٹ لی گئی تھیں۔ وہ کھال ہی پر لکھی ہوئی تھیں۔ وہی دستاویزیں دھو کر اسٹیشنری کے طور پر بیچی جاتی رہیں۔ یہاں تک کہ مدتوں لوگ اسٹیشنری کی ضرورت سے بے نیاز رہے تیسری صدی ہجری کے آغاز سے چوتھی صدی کے وسط تک کاغذ کے استعمال میں ایک تغیر عظیم واقع ہو گیا۔ کیونکہ نہ صرف چین ہی سے قیمتی کاغذ آنا شروع ہوا۔ بلکہ تہامہ میں جو شمالی عرب میں واقع ہے۔ ایک نیا کارخانہ کھل گیا جس میں دیسی کاغذ بننا شروع ہو گیا۔ اور اس کارخانہ میں کاغذ خالص روئی سے تیار ہونے لگا۔

ابن خلدون راوی ہے۔ کہ وزیر فضل بن یحییٰ کی توجہ سے خود بغداد میں بھی کاغذ سازی کا کارخانہ قائم ہو گیا تھا۔ خلافت کے منتہائے شمال مشرقی صوبہ میں ایک عالی حوصلہ چینی نے سن سے کاغذ بنانے کا طریقہ جاری کیا۔

کتاب الفہرست میں جو چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر کی تصنیف ہے جتنے قسم کے کاغذ سن سے تیار ہوئے ہیں۔ سب کا مشرح حال درج ہے۔ یہ صنعت سمرقند میں معراج کمال پر پہنچ گئی جس کی تجارت میں کاغذ کی برآمد غالب جزو ہے۔

جوں جوں ادب اور تمدن ترقی کرتا گیا۔ کاغذ کی ضرورت بھی بڑھتی گئی۔ تمام سلطنت اسلامی میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم ہو گئے۔ مصر کے مسلمانوں نے شمالی افریقہ کے تمام سواحل کو فتح کر لیا۔ ان کی فتوحات یہیں ختم نہیں ہوئیں بلکہ وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے سپین پر قبضہ کیا۔ اور پھر سسلی میں اسلامی عظمت و جبروت کا ڈنکا بجایا۔

ان دونوں مقاموں پر انہوں نے کاغذ سازی کو رواج دیا۔ اور اسے منتہائے کمال پر پہنچا دیا۔ بارھویں صدی ہجری میں شاطبیہ کے بنے ہوئے مختلف قسم کے کاغذ بہت مشہور تھے۔ یورپ کے مغربی ممالک میں شاطبیہ سے اور مشرقی ممالک میں لیونٹ سے کاغذ جاتا تھا۔ گیارھویں بارھویں صدی ہجری میں عربی ساخت کے کاغذ نے یورپ میں کھالوں کی جگہ لے لی۔

۱۲۲۴ء میں شاہنشاہ فرڈرک دوم نے بعض سرکاری دستاویزوں کے لئے سن کے کاغذ کے استعمال کو ممنوع قرار دیا۔ کیونکہ یہ کاغذ بہت ادنیٰ قسم کا تھا۔ لیکن قیمت کے سوال نے اس امتناعی حکم کو بے اثر کر دیا۔ تیرھویں صدی کے نصف آخر میں سن کے کاغذ کا یورپ میں رواج ہوا۔ کاغذ کی ارزانی کی خاطر سن میں اُون کے اجزا کی آمیزش کی گئی۔ غالباً یہ ... مسلمانوں کی جدت تھی۔ مگر یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

کاغذ کا بکثرت تیار ہونا اور رفتہ رفتہ سستا ہوتا جانا بلحاظ تہذیب و تمدن بہت اہم ہے۔ کھال یا پیپرس کاغذ پر لکھی ہوئی کتابوں تک بہت کم آدمیوں کی رسائی ہو سکتی تھی۔ عربوں نے کاغذ کو بہت سستا کر دیا۔ اور مشرق و مغرب دونوں کے لئے مہیا کیا۔ اس وجہ سے علم نہ تو کسی خاص فرقہ کی ملکیت رہا نہ صرف امراء کے لئے مخصوص اب اس تک سب کی رسائی ہونے لگی۔ علم نے لوگوں کی آنکھیں کھولدیں۔ نئے نئے نظریئے پیش کرائے۔ جہالت اور مذہبی دیوانگی کی قید و بند سے لوگوں کو آزاد کر دیا۔ اور انسان کو رفیع النظر بنا دیا۔ علم نے بلند عزائم اور زریں حوصلوں کے زمانہ کی بنیاد ڈالی۔

کاغذ سازی کی صنعت کے ساتھ مختلف قسم کی روشنائیاں تیار کرنے اور جلدیں باندھنے کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ابتدا میں جلدیں بڑی بھدی ہوتی تھیں۔ کتابیں چمڑے میں سی کر اوپر سے چونے کا کوٹ کر دیتے تھے اس طرح جلدیں بہت سخت ہو جاتی تھیں۔ بعد میں کوفہ میں چمڑے کو خوبصورت اور نفیس بنانے کا اس سے بہتر طریقہ ایجاد ہوا۔ وہاں کھجور وغیرہ کسی طرح مل کر چمڑے کو بہت نرم کر لیا جاتا تھا۔ کتابوں کو سجانے اور چمکانے میں بھی بہت ترقی ہو گئی۔

پرانی عربی کتابیں دیکھنے سے کامل خوش ذوقی کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کتابوں کا متن ابھرا ہوا اور حاشیہ دبا ہوا ہوتا تھا۔ اس نمائش کے علاوہ وہ بالکل سادہ ہوتی تھیں۔ کتابوں کا مطلا و مذہب کرنا بعد کی اختراع ہے۔ اور وہ بھی فارس کی۔ ابتدائی زمانہ میں طائف کی جلد سازی بہت مشہور تھی۔

عامۃ الناس میں ادبی ذوق پیدا ہوا۔ اور حکومت نے اسے فروغ دیا۔ لوگوں کی ہمت افزائی ہو ر

قدردانی کی۔ علم مراحم خسروانہ کا بہترین وسیلہ بن گیا۔ علماء تو ہمہ تن تصنیف وتالیف میں معروف ہوگئے۔ اور امراء میں ان کی سرپرستی پر تقابل وتفاخر ہونے لگا۔ مدارس کا قیام اور کتب خانوں کا اجراء عام دستور ہوگیا۔ حالات کی مساعدت سے کتابوں کی تجارت یکایک چمک اٹھی۔ نام ونمود اور جلب منفعت کی خاطر لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔

ایک پرانا مصنف یعقوبی بیان کرتا ہے۔ کہ اس کے زمانہ میں سو سے زائد کتب فروش تھے۔ اس وقت مسجد کے پاس ہی ایک حجرہ میں کتابیں بغرض فروخت رکھی جاتی تھیں۔ اب بھی دمشق قاہرہ اور بیشتر مشرقی ممالک میں یہی حالت ہے۔ یہ کتابیں عموماً قلمی ہوتی تھیں۔ کتب فروش۔ فروخت شدہ کتابوں کی بجائے یا تو دوسرے قلمی نسخے خرید لیتا تھا۔ یا ان کی نقل کرا لیتا تھا۔ عام طور پر کتب فروش نادر وکمیاب نسخوں کی خود ہی نقل کرتا تھا۔ خود مشہور زمانہ یاقوت بھی جس کی جغرافیائی تصنیف کو وسٹن فیلڈ نے ایڈٹ کیا ہے۔ ایک کتب فروش ہی کا ملازم تھا۔ جو کتابوں کی نقل کرتے کرتے ایک بڑا فاضل بن گیا۔

بیشتر کتب فروش محقق اور فاضل ہوتے تھے۔ وہ کثیر معلومات فراہم کرتے تھے۔ اور انسائیکلوپیڈیا اور منتخبات کی شکل میں لکھ لیا کرتے تھے۔ جن سے ان کی ادبی تحقیقات اور تبحر علمی کا پتہ چلتا تھا۔ اس قسم کا ایک ادبی گنجینہ ہمارے پاس بھی ہے۔ یہ بغداد کے ایک کتب فروش نے تقریباً دسویں صدی ہجری میں تیار کیا تھا۔ اس میں ان تمام کتابوں کا ذکر ہے۔ جن کے نام اسے اس تجارتی تجربہ کے زمانہ میں معلوم ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نے مصنفین کے سوانح حیات پر قابل قدر حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے ہمیں اس زمانہ کے عربی ادب کی حیرت انگیز وسعت۔ کتابیں مخطوطات اور نوادر جمع کرنے کا بڑھتا ہوا شوق ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا جامع لکھتا ہے۔ کہ میں عراق کے ایک چھوٹے سے حصے میں کتابوں کے ایک شوقین سے ملا جس کے پاس مختلف مخطوطات کا خزانہ تھا۔ اس سے ادب کی مختلف اصناف پر روشنی پڑتی تھی۔ معلوم ہوا ہے۔ کہ اس کے پاس ایک بڑا صندوق تھا جس میں قدیم مخطوطات۔ کھالیں دستاویزیں مصری چینی۔ تہامہ اور خراساں کے کاغذوں پر لکھے ہوئے طومار بھرے ہوئے تھے۔ ہر تحریر پر صاحب تحریر کا نام تھا۔ اس کے علاوہ اس پر ہر زمانہ کے علماء وفضلاء کی مہر تصدیق ثبت تھی۔ اس کے مجموعۂ نوادر میں اوائل اسلام کے مشہور اور تاریخ میں اہمیت رکھنے والے اشخاص کی بہت سی دستخطی تحریریں بھی تھیں۔

ایسے جامع کثرت سے تھے۔ بعض مطالعہ کے لئے جمع کرتے تھے۔ بعض صرف رواجاً ہی جمع کر لیتے تھے۔ اور بعض کتب خانے اور مدارس جاری کرنے کے لئے کتابیں جمع کرتے تھے۔ بہر حال محرک کوئی چیز بھی ہو۔ اسلامی سلطنت میں کتابیں جمع کرنے کا شوق عام تھا۔ ایک عالم کہتا ہے۔ کہ میں نے اتفاق سے ایک جگہ الیگزینڈر آف افروڈیسیس

کی شرح جو اس نے ارسطو کی ایکرڈیسیس پر (حس کو عربی میں سیما کہتے ہیں) لکھی ہے بکتی ہوئی دیکھی۔ میں نے اس نسخہ کے ایک سو بیس دینار پیش کئے۔ مگر چونکہ میرے پاس اس وقت روپیہ نہ تھا۔ میں روپیہ کا انتظام کرنے کو چلا گیا مگر باوجود بہت جلد واپس آنے کے کتاب مع چند دیگر نسخوں کے تین سو دینار میں ایک خراسانی کے ہاتھ بک بھی چکی تھی۔ فراھیدی کی کتاب العین کا ایک نسخہ ۲۴۸ھ میں پچاس دینار میں فروخت ہوا تھا۔ یہ کتاب خراساں کا ایک کتب فروش بصرہ میں بیچنے کے لئے لایا تھا۔

لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں جعل اور فریب نے اس تجارت میں بھی راہ پالی۔ چالاک اور بدنیت تاجروں نے مشہور قدیم فضلا کی تصانیف میں تھوڑی بہت ترمیم و اضافہ کر کے منہ مانگی قیمتیں وصول کیں۔ چنانچہ اسحاق موصلی ماہر موسیقی کی وفات کے بعد ایک تاجر نے اس کی نظمیں ایک جگہ جمع کر کے اپنے نام سے فروخت کر دیں۔ اس قسم کے فریب مشرق کے بازاروں میں عام ہو گئے جعلی مہریں۔ غلط تاریخیں بازار میں عام ہو گئیں۔ اور نہایت مکروہ جعلسازیاں ہونے لگیں۔ جن کا مخطوطات پر نظر رکھنے والے اصحاب کو اچھی طرح علم ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کتابیں جمع کرنے کا شوق عالمگیر تھا۔ خلیفہ مامون نے بغداد میں ایک عالیشان کتب خانہ قائم کیا۔ اور مشہور مدبر صاحب ابن عبّاد کے متعلق مبالغۃً مشہور ہے۔ کہ اس کی کتابیں چار سو اونٹوں پر بار ہوا کرتی تھیں عراق ہی میں نہیں سپین میں بھی یہی زور شور تھا۔ سپین میں قرطبہ کتابوں کی بہترین تجارت گاہ تھی۔ جب کسی صوبہ کا عالم مرتا تھا۔ تو اس کا کتب خانہ قرطبہ میں بکنے کے لئے آتا تھا۔ یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ جس سے اس زمانہ کے شوق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک عالم بیان کرتا ہے۔ کہ میں قرطبہ میں مقیم تھا۔ اور ایک کتاب کی تلاش میں جس کی مجھے بہت دنوں سے بہت ضرورت تھی۔ ہمیشہ بازار جایا کرتا تھا۔ آخر ایک نہایت شاندار نسخہ ایک دکان پر نظر آیا۔ نہایت خوش ہو کر میں نے بولی بولنا شروع کی۔ مگر میری ہر بولی پر ایک شخص بولی بڑھا دیتا تھا۔ یہانتک کہ کتاب کی اصلی قیمت سے بھی بولی بہت بڑھ گئی۔ میں نے نیلام کنندہ سے دریافت کیا۔ کہ میرے مقابلہ میں بولی دینے والا کون شخص ہے۔ وہ جواب میں مجھے ایک خوش پوش آدمی کے سامنے لے گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ قبلہ! اگر آپ کو حقیقت میں کتاب کی ضرورت ہو تو میں اس کی خریداری سے دست بردار ہو جاؤں۔ کیونکہ خواہ مخواہ قیمت میں اضافہ کئے جانا خلاف عقل ہے۔ اس نے جواب دیا۔ جناب۔ نہ تو میں پڑھا لکھا ہوں اور نہ میں یہ جانتا ہوں۔ کہ اس کے اندر لکھا کیا ہے۔ البتہ میں نے حال ہی میں ایک کتب خانہ قائم کیا ہے۔ اور چاہتا ہوں کہ کچھ ہی کیوں نہ صرف ہو جائے۔ میں اسے شہر میں قابل دید بنا دوں کتب خانہ میں اس وقت ایک جگہ خالی ہے۔ وہ اس سے پر ہو جائے گی۔ چونکہ یہ نہایت خوش خط لکھی ہوئی ہے

اور اس کی جلد بھی نہایت دیدہ زیب ہے۔ اس لئے یہ مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے قیمت کی کوئی پروا نہیں۔ کیونکہ میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے۔

ان واقعات سے کتابوں کی تجارت کی ہر دلعزیزی اور نفع کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ عرب کے ہر شہر میں کتابوں کی تجارت گاہ تھی۔ اس تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ عربوں کی خطاطی جو اب تک بری حالت میں تھی۔ ترقی پکڑتی گئی۔ ابتدا میں جن کتابوں کی زیادہ مانگ ہوتی تھی۔ انہیں قابل اور ہشیار کاتب نقل کر لیا کرتے تھے۔ اور خوشنویسی کے مقابلہ میں صحت کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔

اس تجارت کی روز افزوں ترقی اور کتابوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے ساتھ ساتھ کاتبوں کی کثرت ہوتی گئی۔ جن کی روزی کا دارومدار ہی کتابیں نقل کرنا تھا۔ ان لوگوں نے صحت کا اتنا خیال نہ رکھا جتنا خوشخطی کا۔ اس طرح خوشنویسی کی قدر بڑھ گئی۔ اور بات بھی معقول تھی۔ کیونکہ معمولی قابلیت رکھنے والوں کے لئے خوشخطی ہی جاذب نظر ہوتی تھی۔ چونکہ بیشتر کتب فروش عالم و فاضل نہ تھے۔ اس وجہ سے خوش خطی کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی۔

بنو امیہ کے خلیفہ ولید اول نے مشہور خوشنویس خالد ابن ابی حجاج کو قرآن مجید اور دوسری کتب تاریخ کی نقل کیلئے مامور کیا۔ مدینہ شریف میں مسجد نبوی میں مذہب کتبے اسی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ملک دینار بھی اس فن میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اور اُجرت پر کام کیا کرتا تھا۔ خلیفہ مامون کی تخت نشینی پر علم و فضل اور کتابوں کی تجارت میں جو ترقی ہوئی وہ اسے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت سے خوشخطی باقاعدہ ترقی کرنے لگی۔ ابن مقلع نے عربی طرز تحریر میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ مشہور خطاط ابن نواب نے اس میں اور بھی اصلاحیں کیں۔ اور اس فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ ابن نواب کے بعد یاقوت نے کمال شہرت حاصل کی۔ عربوں کے زوال کے ساتھ ان کی ہر چیز میں زوال رونما ہو گیا۔ حتیٰ کہ ان کا ادبی ذوق بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ مگر خوش نویسی صرف بچی ہی نہیں رہی۔ بلکہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی رہی۔ فان کہ امیر کہتا ہے۔ کہ میں نے برٹش میوزیم میں ابن نواب اور یاقوت کی تحریریں دیکھی ہیں۔ میں وثوق سے کہتا ہوں۔ کہ مصری خطوط اول الذکر سے توڑ ھ گئے ہیں۔ مگر ثانی الذکر کے ہم پلہ ہی ہیں۔

یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے۔ کہ کتاب جتنی خوبصورت لکھی ہو گی۔ اتنی ہی اس کی صحت ناقابل وثوق ہو گی۔ غلطیوں سے پاک تو صرف پرانے اور بھدے نسخے ہی ہیں۔ لیکن کتابوں کی فروخت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ برابر شاہی کتب خانوں میں کتابیں خریدی جاتی رہیں۔ دوسرے پیشوں کی طرح خطاطی بھی ایک باعزت اور

نفع بخش پیشہ سمجھا جانے لگا۔

مصر کی حالت کچھ ہو۔ مگر ہندوستان سے خوش نویسی بحیثیت فن کے معدوم ہو چکی ہے (؟) فارسی اور عربی کے قلمی نسخوں کی تجارت معدودے چند لوگوں میں رہ گئی ہے۔ ابنائے وطن نے اس کی طرف سے بے اعتنائی برتنا شروع کر دی ہے۔ اب ان چیزوں کے خریدار صرف وہ امریکی ماہرین رہ گئے ہیں۔ جو ہر سال سردیوں کے موسم میں بغرض سیاحت ہندوستان آتے ہیں۔ اور نوادر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ (ترجمہ)

"گذشتہ نصف صدی تمام مشرقی ممالک میں اصلاح و تغیرات کی تاسیس و تحریک کا دَور گزرا ہے، جو یکسر اسی مشغلہ میں بسر ہؤا۔ نئی عمارت گو کوئی نہیں بنی۔ لیکن نقشے صدہا کھینچے گئے، اور کام گو بہت کم ہؤا، لیکن کام کرنے کا شور و غل ہر جگہ رہا +

اس صدی کے آغاز ہی میں یورپ کا سیاسی و تمدنی عروج اور مشرق کا تنزل، پوری طرح نمایاں ہوگیا تھا۔ یورپ کی متمدن قومیں اپنی جدید ترقیات کے ذخائر لے کر تقریباً تمام بڑے بڑے مشرقی ممالک میں پہنچ گئی تھیں۔ اور اکثر مقامات میں تو اُن کا سیاسی اقتدار ہی ان کے تمدن کی نمائش کر رہا تھا +

قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال کے ہر ایسے موسم میں ہمیشہ کچھ لوگ وقت سے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں۔ اور جب کہ تمام ملک خواب غفلت میں سرشار رہتا ہے۔ تو ہشیاری و بیداری کی صدائیں ان کے اندر سے اٹھنے لگتی ہیں +

اسلامی ممالک کے تمام حصے اگرچہ یکسان غفلت و بے خبری میں آنے والے مہالک و مصائب کا انتظار کر رہے تھے۔ اور اس انقلاب عظیم کی طاقت سے بے خبر تھے۔ جو یکایک یورپ کے تمدنی اقتدار سے نکل کر تمام عالم کو مغلوب کر دینے والا تھا، تاہم چونکہ یورپین اقوام سے اختلاط و تعارف شروع ہوگیا تھا اس لئے قدرتی طور پر بعض ذکی الحس اور صاحب فکر طبائع وقت کے اثرات سے متاثر ہوئیں اور اپنی حالت کا ان کے عروج و اقتدار سے مقابلہ کرنے لگیں۔ اس طرح تغیر و اصلاح کی تحریکوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ جس کا محرک اصلی تو مغربی تمدن کے اقتدار کا انفعالی اثر تھا۔ لیکن اس اثر نے مایوسی کی جگہ سعی و کوشش کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ اور ترقی کا مطالعہ تنزل کے اسباب و بواعث کے کشف و حس کا ذریعہ بن گیا تھا۔"

(مولٰنا ابوالکلام آزاد)

بنگال قدیم کی ایک دلنواز داستان

ایک رقاصہ شاہی محلات میں

(از جناب محمد عبداللہ صاحب قریشی)

جان کمپنی کے ابتدائی ایام میں جب بیگم سمرو شمالی ہندوستان کی تاریخ مرتب کر رہی تھی۔ بنگال کی نظامت میں منی بیگم کا طوطی بول رہا تھا۔

منی بیگم نواب میر جعفر علی خاں کی بیگم تھی۔ اس نے اس کشمکش میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی تاجرانہ سرگرمیوں کو وسعت دینے اور اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے جاری کر رکھی تھیں۔ نہایت سرگرم حصّہ لیا۔ مگر افسوس کا مقام ہے۔ کہ اس کے ابتدائی حالات بالکل ورطۂ گمنامی میں نہاں ہیں۔ ہاں کمپنی کی ان یادداشتوں میں جو شاہی محافظ خانہ میں محفوظ ہیں۔ فارسی زبان کا ایک مکتوب موجود ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وُہ ایک غریب بیوہ کی لڑکی تھی۔ اور سکندرے (آگرہ) کی رہنے والی تھی۔

ابتدائے زمانہ میں وُہ رقص و آہنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی بھیج دی گئی۔ جہاں اس نے اپنے فطری رجحان کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں فن موسیقی میں یدطولیٰ حاصل کر لیا۔ قدرت نے اسے حُسن صورت کے ساتھ آواز بھی نہایت پیاری اور دلنشین عطا کر رکھی تھی جس کی وجہ سے وُہ جس محفل میں جاتی تھی۔ برق بن کر چمکتی تھی اور جس مجلس میں گاتی تھی۔ اپنی ساحرانہ آواز اور غمزوں سے قلوب کو مسخر کر لیتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی ترنم ریزیوں کے سامنے دہلی کا عشرت پسند دربار بھی ماند پڑ گیا۔ اور ہوتے ہوتے اس کا شہرہ بنگال تک جا پہنچا۔ چنانچہ وُہ اپنے فن لطیف کی نمائش کے لئے نواب سراج الدولہ کے بھائی اکرام الدولہ کی شادی کے موقعہ پر مرشد آباد میں مدعو کی گئی۔

وُہ مرشد آباد آئی۔ اور نہایت کامیاب رہی۔ اس کے پُرجوش استقبال نے اس کی خودنمائی کے جذبات کو گدگدایا۔ اور شہر کی رونق و خوبصورتی نے جو اس وقت عروس البلاد بنا ہوا تھا۔ اس کے دل پر اتنا اثر کیا۔ کہ اس نے وہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ میر جعفر علی خاں

نے اس کے لئے ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور اسے اپنے حرم میں داخل کر دیا۔

اس وقت میر جعفر کی منظور نظر بیگم جو میرن کی والدہ تھی فوت ہو چکی تھی۔ بابو بیگم جو اُس کی دُوسری بیوی تھی۔ زندہ تھی۔ مگر منی بیگم نے حرم میں داخل ہوتے ہی اس پر فوقیت حاصل کر لی نجم الدولہ اور سیف الدولہ اسی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اَور میر جعفر کی وفات کے بعد ۱۷۶۵ء میں یکے بعد دیگرے مسند نظامت پر فائز ہوئے۔ اور دونوں پانچ سال کی قلیل مدت میں انتقال کر گئے۔

یہ مؤخر الذکر کی نظامت ہی کا زمانہ تھا۔ جب منی بیگم نے میر جعفر کی وصیّت کے مطابق پانچ لاکھ کا اثاثہ لارڈ کلائیو کے حوالہ کیا تھا۔ اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔ یہ وہی رقم تھی جس کے ذریعہ سے لارڈ کلائیو نے ایک ایسا فنڈ قایم کیا جس سے کمپنی کے دائم المریض ملازموں کی پرورش کی جاتی تھی۔

جب نواب مبارک الدولہ جو میر جعفر اور بابو بیگم کا خورد سال بچہّ تھا۔ مرشد آباد میں سریر آرائے مسند نظامت ہوُا۔ تو وارن ہیٹنگز کے ایما سے منی بیگم اس کی سرپرست مقرر ہو گئی۔ اس نے اپنی انتظامی قابلیت اور تدبر سے یہ ثابت کر دیا۔ کہ ہیٹنگز کا انتخاب نہایت مناسب اَور صحیح تھا۔ اس کا دربار اپنے معاصرین میں ایک نمونہ کا دربار سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کی شان وشوکت زبانزد خلایق تھی۔ سیاسی جوڑ توڑ میں انہماک اَور انصرام ملکی میں مہارت تامہ نے سکندرہ کی اس طوائف کو جس کے ہاتھ میں اب زمام حکومت تھی۔ نہ صرف مرشد آباد کے امرا میں ہر دلعزیز بنا دیا۔ بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جلیل القدر عہدہ داروں کی نظروں میں بھی معزز و ممتاز کر دیا۔

منی بیگم اور گورنر جنرل کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ چنانچہ ان کے خطوط سے جو ریکارڈ آفس کلکتہ میں محفوظ ہیں۔ (اور جن کے اقتباسات مسٹر اے۔ ایف۔ ایم عبدالعلی آنریری سیکرٹری کلکتہ ہسٹاریکل سوسائٹی شائع کر چکے ہیں۔) پتہ چلتا ہے۔ کہ وارن ہیٹنگز اس کی دل سے عزت کرتا تھا چنانچہ ۱۷۷۴ء میں جب وُہ گورنر جنرل مقرر ہوُا۔ اَور بیگم نے اسے مبارک باد کا خط لکھا۔ تو اُسنے تحریر کیا۔ کہ

> "آپ کا خط جس میں میرے گورنر ہونے پر اظہار مسرّت کیا گیا ہے۔ مجھے ایسے وقت پر موصول ہوُا۔ جب ہم مجلس رقص و سرود میں شریک تھے اس نے میرے دل کی کلی کو نسیم بہار کی طرح کھلا دیا۔ ہمارے مقاصد چونکہ یکساں ہیں۔ اس لئے آپ میری کامیابی پر ضرور خوش ہوئی ہونگی۔ خدا آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔"

بیگم کا خط پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک والدہ اپنے بچّے کو اس کی کامیابی پر ہدیۂ تہنیت و تبریک پیش کر رہی ہے۔ اس کے خط کا لب و لہجہ نہایت مشفقانہ اور جذبات ہمدردی سے لبریز ہے۔ چنانچہ وُہ اپنا ایک خط اس طرح شروع کرتی ہے۔

"نواب والا مقام۔ عالیجاہ۔ مخزنِ خیر و فضل۔ نور البصر۔ عزیز ارجان سلمہ اللہ تعالےٰ۔ درازیٔ عمر کی دُعا کے بعد واضح ہو۔ کہ والا نامہ محررہ ۱۷ ربیع الثانی ۱۱۹۲ھ موصول ہوا۔ آپ نے نواب مبارک الدولہ کی اسکیم کو شرف پذیرائی بخشا اور سردار الحق خاں اور راجہ گوردواس کو مرشدآباد واپس آنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ نواب کو بھی اس قسم کا ایک خط موصول ہو چکا ہے۔ وُہ آپ کا بیحد شکرگذار ہے۔ کیونکہ آپ اس کی خاندانی وجاہت کو برقرار رکھنے۔ اور اس کی عزت افزائی کرنے میں سعی بلیغ فرما رہے ہیں۔ اور اس بات سے کبھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ آپ نے موجودہ معاملہ میں اسکا وقار قائم رکھنے میں اپنی انتہائی قوت صرف کر دی ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نواب پر اپنی عنایات و مراعات کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھیں گے۔ اور گاہے گاہے اپنے حالات سے مجھے آگاہ کرتے رہیں گے"[1]

مسٹر ایچ ای۔ اے کاٹن اپنی کتاب "کلکتہ قدیم وجدید" میں لکھتے ہیں۔ کہ

"وکٹوریا میموریل ہال میں آج بھی ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ایک کرسی اور ایک چھوٹی سی میز موجود ہے۔ جو وہاں کے آثار عتیقہ میں شمار ہوتی ہے۔ یہ منی بیگم نے وارن ہیسٹنگز کی بیوی کو بطور تحفہ عنایت کی تھیں۔ یہ اشیاء ایک مدت تک وارن ہیسٹنگز کے سکونتی مکان ڈیلس ورڈ میں محفوظ رہی ہیں۔ مگر آج کل مہاراجہ دربھنگہ کے قبضہ میں ہیں"

وارن ہیسٹنگز نے ۱۴ نومبر ۱۷۸۴ء کو اپنی بیوی کے نام ایک خط لکھا جس میں درج تھا کہ

"بیگم صاحبہ نے مجھے متعدد پیغام اس قسم کے بھیجے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے میرے مرشدآباد نہ ٹھہرنے کو بہت بری طرح محسوس کیا ہے۔ انہوں نے تمہارے لئے کچھ صوفے اور کرسیاں طیار کرائی ہیں جو میرے پاس پہنچ چکی ہیں۔ ان میں دو صوفے آٹھ کرسیاں اور دو سٹول

---

[1] ۱۵ مئی ۱۷۷۸ء یہ خط ۲۸ مئی کو مکتوب الیہ کے پاس پہنچا۔

تو بالکل اسی طرز کے ہیں۔ جیسے ہمیں پہلے موصول ہو چکے ہیں۔ یہ بہت نازک ہیں۔ اور میرے مذاق کے عین مطابق یہ موٹے آدمیوں کے بیٹھنے کے لائق نہیں۔ اس لئے میری موجودگی میں تم انہیں استعمال نہیں کر سکتیں"

ایک دوسرے خط میں وارن ہیسٹنگز نے اپنی بیوی کو تحریر کیا۔ کہ:۔

"بیگم نے مجھے دو صوفے۔ چھ کرسیاں اور دو سٹول پرانے سونے کے اور بھیجے ہیں۔ وہ نہایت عمدہ ہیں میں نے انہیں نہایت احتیاط سے اپنے سامان میں بند کرا لیا ہے۔ لیکن ابھی تک میں نے ان کے بھیجنے کا ارادہ نہیں کیا۔ بیگم صاحب نے ان کے ساتھ دو کرسیاں بھینس کے سینگوں کی بھی ارسال کی ہیں۔ جنہیں میں ہاتھی دانت کی کرسیوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ وہ بہت سبک۔ نفیس اور عمدہ ہیں اور کمان کی طرح لچکدار! یہ تمام اشیاء صرف اس غرض سے طیار کرائی گئی تھیں۔ کہ جب میں مرشدآباد جاؤں۔ تو ان کی نمائش کی جائے۔ لیکن جب میں وہاں سے گذر گیا تو بیگم صاحبہ بہت آزردہ خاطر ہوئیں اور انہوں نے ایک خط کے ساتھ یہ تمام اشیاء میرے پاس بھیج دیں۔ یہ خط تمہارے نام تھا جس کے لئے مجھے تاکید کی گئی تھی۔ کہ یہ فی الفور تمہارے پاس بھیج دیا جائے"

وارن ہیسٹنگز کے ایک اور خط سے پایا جاتا ہے۔ کہ بیگم کو ہیسٹنگز کی بیوی سے دلی لگاؤ تھا۔ اور جب وہ اس سے جدا ہو کر واپس چلی گئی تو وہ اس کی مفارقت میں آٹھ آٹھ آنسو روتی رہی یہ خط ہیسٹنگز نے ۲۸ فروری ۱۷۸۴ء کو اپنی بیوی کے نام لکھا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے۔ کہ جب وارن ہیسٹنگز بیگم کی حدود و اطاعت میں قدم انداز ہوتا تو اسے خوراک کے لئے دو صد پاؤنڈ یومیہ دئے جاتے۔ چنانچہ نند کمار نے جرنیل کلیورنگ۔ کرنیل مونسون اور فلپ فرانسس کے روبرو جو اکتوبر ۱۷۷۴ء کو انگلستان سے کونسلر مقرر ہو کر آئے تھے۔ ہیسٹنگز پر یہ الزام لگایا۔ کہ اس نے منی بیگم سے ۳ لاکھ کا ایک نذرانہ قبول کیا ہے۔ مگر بیگم نے اس کی تردید کی اور ہیسٹنگز نے اس قسم کی ایک تحریر پیش کی۔ جس کے متعلق نند کمار نے کہا۔ کہ یہ بالکل جعلی ہے۔ اور بعد میں لکھوائی گئی ہے۔ وہ تینوں چونکہ ہیسٹنگز کی بیخ کنی پر تلے ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے نند کمار کے بیانات کو درست تسلیم کرتے ہوئے مئی ۱۷۷۵ء میں بیگم کے تمام اختیارات ضبط کر لئے۔ وارن ہیسٹنگز نے اسی معاملہ کا حوالہ دیتے ہوئے مسٹر لارنس سالوین کو جو اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر تھا۔ لکھا تھا۔ کہ:۔

"انہوں نے بیگم کو اس عہدہ سے جس پر میں نے اسے کمپنی کے حقوق کی محافظت کیلئے مقرر کیا تھا۔ معزول کر دیا ہے۔"

اس کے بعد بیگم اپنے درجہ کے مطابق زندگی بسر کرتی رہی۔ اور جب تک وُہ زندہ رہی۔ اسے بارہ ہزار روپیہ ماہوار پنشن ملتی رہی۔ وُہ مرشد آباد کی ان چند نامور بیگمات میں شمار کی جاتی ہے۔ جو گدی نشین بیگمات" کے نام سے موسوم ہیں۔ اس نے محل کے جنوب مشرق کی طرف ایک عالیشان مسجد بھی بنوائی جو چوک مسجد کہلاتی ہے۔ اور آجتک مرشد آباد کے عجائبات میں شمار ہوتی ہے۔

منی بیگم نے ۱۰ر جنوری ۱۸۱۳ء کو انتقال کیا۔ بیل صاحب نے اس کی تاریخ وفات ۱۷۷۹ء متعین کی ہے۔ جو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا ریکارڈ آفس مین اس کے کئی خطوط و مکاتیب موجود ہیں۔ جو اس نے انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں تحریر کئے تھے۔

انسانی کمزوری

دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی بہت شدت کی تھی۔ اور دم گھٹ رہا تھا۔ اس لئے محمود اپنے غصّہ کو نہ روک سکا۔ وُہ اس گرمی پر خفا ہو گیا۔ جو اسے لیٹے لیٹے بھی پسینہ سے بھگو رہی تھی۔ اس کے مکان کی چھت نہایت گندی ہو رہی تھی۔ اس کی کتابیں جو ایک کونے میں پڑی تھیں۔ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر معلوم ہو رہی تھیں اس کا نوکر اتنا سُست تھا۔ کہ اس کا کمرہ سال میں ایک مرتبہ بھی صاف نہیں کرتا تھا۔ اس کی بیوی نہایت پھوہڑ تھی۔ اور کسی قسم کا انتظام نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے کپڑوں سے ہمیشہ بہت تیز بدبو آتی تھی۔ محمود کے ذہن میں معًا اپنے ماحول کا خیال پیدا ہؤا۔ وُہ غصّہ سے کانپ اُٹھا۔ اور چلا کر بولا" خدا۔ اگر یہی گرمی۔ اور یہی نوکر۔ اور یہی بیوی رہی۔ تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

وُہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس امید میں کہ شاید بیٹھنے سے کچھ آرام ملے۔ کچھ دیر تک وُہ زمین کی طرف گھورتا رہا۔ اَور اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ کیا کرنا چاہئیے۔ پھر اس نے آنکھ اٹھائی۔ اس طرح سے کہ گویا اسے کوئی مجبور کر رہا ہے۔ اور اس نے وُہ کتابیں دیکھیں جن پر برسوں سے مٹی جمی ہوئی تھی۔ وُہ میز جس پر اس نے بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ اور جس پر اب پرانے اخبار۔ کتابوں کے پھٹے ورق۔ خالی دوات۔ بے نب کی قلم رکھی تھی۔ اَور پھر اس نے اپنے پلنگ اور اپنے اوپر نظر ڈالی۔ ہر چیز پر مٹی جمی ہوئی تھی۔ اور ہر چیز معلوم ہوتا تھا۔ صرف اُسے غصّہ دلانے کے لئے کمرہ میں آگئی ہے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اَور اس نے عاجز آکر پھر اپنے آپ سے پوچھا" یہ سب چیزیں آخر کیوں میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہیں۔ اَور مجھے غصّہ دلا رہی ہیں؟ میں نے آخر کیا جرم کیا ہے؟" اور اسی فکر میں اس کا سر جھک گیا۔ اسے یکایک خیال آیا۔ کہ شاید اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ میں بالکل کچھ نہیں کرتا ہوں۔ چار پانچ دن سے میں پلنگ پر پڑا ہوں۔ میرے جسم سے پسینہ نکلتا

رہتا ہے۔ اور میں اپنے نکمّے پن پر غور کرتا رہتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر میں کسی کام میں مشغول ہوتا تو مجھے اپنے کمرہ اور مکان کی کوئی فکر نہ ہوتی۔ میں خاموش اور متین اور خوش مزاج ہوتا۔ مگر سچ تو یہ ہے۔ کہ میں ایک بیکار۔ نکمّا۔ کاہل۔ نالائق۔ بزدل۔ بیوقوف آدمی ہوں! اگر میں اپنے نوکر پر سختی کرتا۔ تو اس کی کیا مجال تھی۔ کہ کوئی چیز صاف ستھری نہ ہوتی۔ اگر میں ٹھیک وقت پر اسے ہر کام کے لئے حکم دیتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں کبھی شرما جاتا ہوں۔ کبھی مجھ پر کاہلی سوار ہوتی ہے۔ ہر کام کو ٹالتا رہتا ہوں۔ اگر میں اپنی بیوی سے کہتا۔ کہ صاف ستھری رہے۔ تو وُہ ضرور میرا کہنا مانتی۔ مگر میں اس سے کہتا ہی نہیں ہمیشہ انتظار میں رہتا ہوں۔ سمجھتا ہوں۔ کہ سب کچھ آپ ہی آپ ہو جائے گا۔ اور پھر خفا بھی ہوتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بھی کیسا احمق ہوں!" اور اس نے اپنا سر تکیہ پر دے مارا۔

کچھ دیر وُہ پلنگ پر اس حالت میں پڑا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنے نکمّے پن پر غور کرنے لگا۔ شادی کے بعد جو دو سال اس نے پُوری طرح سے ضائع کئے تھے۔ اسے سب سے پہلے یاد آئے۔ ان دو برسوں میں وُہ اپنی بیوی سے بالکل تنگ آ گیا تھا۔ اگرچہ پہلے وُہ اسے بہت پسند تھی۔ اس نے اب دنیا سے قطع تعلّق کر لیا تھا۔ اور دُنیا نے اس سے اور زندگی میں اس کیلئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ پھر اسے وُہ دن یاد آئے۔ جب اس میں جوانی کا جوش باقی تھا! اور زندگی اس کے لئے بے معنی اور بے لطف دنوں اور راتوں کا ایک سلسلہ نہیں بن گئی تھی۔ اس زمانے میں وُہ کھیل کھود میں شریک ہوا کرتا تھا۔ اور اپنے کالج کی طرف سے کئی مرتبہ ہاکی کے ٹورنمنٹ میں بھی کھیلا تھا۔ اس زمانہ میں وُہ عاشق بھی ہو گیا تھا۔ لڑکی خوبصورت اور سلیقہ مند تھی۔ اور اسے محمود سے امیدیں بھی بہت تھیں۔ لیکن وُہ ایکبارگی اسے چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا۔ اور صرف تھوڑی سی جائداد کی لالچ اور اپنے باپ کے ڈر سے اپنی موجودہ بیوی سے شادی کرنے پر راضی ہو گیا۔ مگر نہ وُہ اس بات سے انکار کر سکتا تھا۔ اور نہ اسے بھول سکتا تھا۔ کہ اس نے عشق کے حوصلوں کو طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے چھوڑا تھا۔ اور اس میں اتنی جراٗت نہ تھی۔ کہ اپنی آزادی اور اصل خوشی لڑ کر حاصل کر لے۔ اپنے واسطے جو زندگی اس نے پسند کی تھی۔ وُہ صرف ایک چھوٹی، کمینی طبیعت کو بھا سکتی تھی"۔ ہاں میں کمزور ہوں۔ بزدل ہوں۔ ورنہ اب تک ضرور کچھ کر دکھاتا۔ میری بیوی سمجھ دار، صاف ستھری ہوتی۔ بجائے اس گھٹّل دماغ کی عورت کے جو جانوروں کی طرح جدھر ہانکی گئی۔ ادھر چلتی ہے۔ خود بیوقوف ہے۔ اور

دوسرے کو بھی بیوقوف بنا دیتی ہے۔ ہائے میں کیا نہیں کر سکتا تھا!"

ایک دل آویز خواب کی مانند اس کے سامنے ایک محل کی تصویر کھنچ گئی۔ چاروں طرف شام کا اندھیرا چھایا ہؤا تھا۔ لیکن محل کے درو دیوار سے ایک ایسی گہری سچی مسرت کی کرنیں نکل رہی تھیں۔ کہ اسے مایوسی کی ہوا تک نہیں لگ سکتی تھی۔ . . . . اور اس محل میں ایک میاں بیوی رہتے تھے جن کی عمر دوسروں کی خدمت میں گذر رہی تھی۔ اور جو اپنی بھلائی دُوسروں کی خوشی میں پاستے تھے۔ اس مکان کی روح رواں۔ اسے یقین تھا۔ وہی لڑکی ہے جس سے اُسے محبت تھی۔ اور جس کے ساتھ اس نے بیوفائی کی۔ وُہ مجھے ہر طرح سے آدمی بنا دیتی۔ میری طبیعت کو مضبوط کر دیتی۔ لیکن مجھ میں اتنی صلاحیت بھی ہے؟ مجھ جیسے بزدل کو بھلا کوئی بہادر بنا سکتا ہے؟" مگر اس زندگی کی تصویر نے جو اس کے لئے ممکن تھی۔ اس کی موجودہ حالت کو اور ناقابل برداشت کر دیا۔ یہ احساس کہ وہ اب ایک بالکل بے فائدہ۔ بے معنے۔ بے لطف زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔

اس نے اپنے آپ کو بہت یقین دلانے کی کوشش کی۔ کہ اب اس کے لئے کوئی امید باقی نہیں رہی مگر اس کی ابتدائی جوانی اور عشق کی یادگاروں نے باوجود اس مایوسی کے جو وُہ اپنے ساتھ لائیں۔ اس کے تصوّر میں حوصلہ پیدا کر دیا۔ ان یادگاروں میں لپٹا ہؤا ایک اور واقعہ اسے یاد آجاتا تھا۔ جب اس لڑکی نے جس سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ اس کی حکمت عملی اور ہمت کی داد تھی۔ اور اس وقت اس کا چہرہ خلوص اور دلی خوشی سے روشن تھا۔ کالج کے اسٹاف اور جلسہ میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ محمود کی کوششوں سے معاملہ صاف ہو گیا۔ محمود کو اپنی حرکت پر ہمیشہ تعجّب ہوتا رہا۔ اور یہ اُس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ کہ اسے ایسے معاملہ میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی۔ لیکن اسے پوری طرح سے کامیابی ہوئی تھی اور وُہ دراصل اس تعریف کا مستحق تھا۔ غالباً وُہ دوسرے واقعات کے ساتھ اسے بھی بھول جاتا لیکن لڑکی تعریف کرتے وقت مسکرائی تھی۔ اور یہ مسکراہٹ اس کے دل پر ایک نقش بن گئی تھی۔ جو اس کے مٹائے نہ مٹ سکا۔ اگر وہ اپنے اوپر لعنت ملامت کرتا ہوتا تو اس مسکراہٹ کی یاد اس کی طبیعت نرم کر دیتی، رنج اور مایوسی کے دنوں میں وہ پیام مسرّت بن کر اسے تر و تازہ کر دیتی۔

محمود کا سینہ سوکھنے لگا۔ اعضا حرکت پر رضامند ہو گئے۔ رگوں میں خون دوڑنے لگا۔ اور اسے یقین سا ہونے لگا۔ کہ وُہ اتنا کمزور اور بزدل نہیں۔ جتنا وُہ سمجھتا ہے۔ اور ابھی اس کے سدھرنے کی

امید ہے۔ اس نے دنیا میں بہت کچھ کھویا تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے سب کچھ کھو بیٹھنا لازم نہیں ہو گیا تھا۔ وہ اسی گھر میں اور انہی لوگوں میں پھر زندہ ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ناممکن نہیں تھا۔ کہ وُہ اپنے ساتھ دوسروں میں بھی روح پھونک دے۔۔۔۔۔۔۔ اس کا دل نئے جوش سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

اس نے یہ عہد کیا۔ کہ اب ہمیشہ سختی سے اپنے ارادہ پر قایم رہے گا۔ اپنے نوکر کو نکال دے گا۔ اگر اس نے پھر کبھی کسی قسم کی بے تمیزی یا کاہلی کی۔ اور اپنی بیوی کو مجبور کرے گا۔ کہ گھر کا انتظام ٹھیک طرح سے کرے۔ اور کپڑے صاف رکھے۔ وُہ خود محنت مشقت کرے گا۔ اور دوسروں کے لئے نمونہ بنے گا۔ یہ عہد کرکے اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ آنکھیں مل کر اِدھر اُدھر اِس اطمینان اور خوشی سے دیکھنے لگا۔ گویا اس کا کمرہ صاف ہے۔ اس کی بیوی شائستہ۔ وہ خود محنتی۔ چست اور دوسروں کا رہنما اور خادم ہے۔ اور وُہ پھر پلنگ پر لیٹ گیا۔ دِل آرزو کی موجوں سے پھٹا جاتا تھا۔ اور وُہ اس انتظار میں بیتاب تھا۔ کہ اپنے ارادہ کا امتحان لے۔ دوسروں کو اپنے عمل کے ذریعہ سے ایک بہتر زندگی کا پیام دے۔ اور جلد سے جلد اس انقلاب کی خبر دنیا تک پہنچا دے۔

اسے نہیں معلوم تھا۔ کہ وُہ کتنی دیر سویا ہے۔ لیکن یہ وُہ بغیر آنکھ کھولے بتا سکتا تھا۔ کہ شام ہو گئی ہے۔ ہوا نرم تھی۔ اور کسی قدر ٹھنڈی۔ زمین اب آسمان سے ترحم کی درخواست نہیں کر رہی تھی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وُہ اطمینان سے بیٹھ کر بجھے ہوئے دِل سے غور و فکر کر رہی ہے۔ اور اپنے بچّوں سے بھی یہی چاہتی ہے۔ علاوہ اس کے محمود نے بچّوں کو اپنے دروازے کے قریب کھیلتے اور ہنستے سُنا یہ بھی شام ہونے کی دلیل تھی۔

جب وُہ رفتہ رفتہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ تو اُسے اپنا ارادہ یاد آیا۔ لیکن اسے اس سے تسکین یا تازگی حاصل نہیں ہوئی۔ وُہ اب اس کے دل پر ایک بھاری بوجھ کی طرح دھرا ہوا تھا۔ اور اس سے نجات ملنے کی طرف سے بالکل مایوسی تھی۔ وُہ یہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اس ارادے کا پورا کرنا اس پر فرض ہے۔ لیکن اسے یقین ہو گیا۔ کہ وُہ ایسا نہیں کرنے پائیگا۔ "میں نے کیوں بیٹھے بٹھائے یہ ارادہ کر لیا۔ کیوں اپنے سر پر یہ مصیبت لے لی۔ کیا میرا ضمیر مجھے پہلے ہی سے کافی ملامت نہیں کر رہا ہے؟ اب مجھے ہر لحظہ یہ خیال رہے گا۔ کہ میں نے ایک بات کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور اس پر قائم رہنا ضروری ہے۔ ہمیشہ ہر جگہ میں یہی سوچا کروں گا۔ اور دل ہی دل میں شرمایا کروں گا۔ جو تھوڑا بہت اطمینانِ قلب مجھے حاصل تھا۔ وُہ بھی

اَب گیا۔ اب جب کبھی مجھے نیند کی خواہش ہوگی۔ میں محسوس کروں گا۔ کہ مجھے جاگتے رہنا چاہیئے۔ جاگتا رہونگا تو یہ خیال ہوگا۔ کہ کچھ کروں۔ کچھ کروں گا۔ تو یہ فکر ہوگی۔ کہ یہ ناکافی ہے ...... اور آخر میں کروں تو کیا کروں؟ اگر میں اپنی بیوی سے کہوں کہ صاف رہا کرو۔ تو وُہ مُسکرا دے گی۔ اور کہے گی "اب میں ایسی میلی بھی نہیں ہوں"۔ یا وُہ بے نہائے دہوئے کپڑے بدل لے گی۔ اور مجھے اسی پر قانع ہونا پڑے گا۔ لیکن میں نوکر کو کیا کروں؟ اگر اسے نکال دوں۔ تو کوئی دوسرا آئے گا۔ جو اتنا ہی کاہل ہوگا۔ بلکہ ممکن ہے اوپر سے چور بھی ہو اور یہ کمبخت اتنا زبان دراز ہے۔ کہ میں اس کی کاہلی یا کوئی قصور ثابت ہی نہیں کر سکتا۔ .... پھر یہ کہ میں اپنے لئے کونسا کام نکالوں؟ یونیورسٹی میں دوبارہ داخل ہونا تو فضول ہے۔ کیونکہ میری عمر بہت ہوگئی ہے۔ .... نوکری بھی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ میرے پاس کوئی ڈگری نہیں۔ صرف ایک صُورت ہے کہ سیاسی کام شروع کردوں۔ لیکن نہ میرے پاس روپیہ ہے نہ اتنا اثر ہے۔ تقریر بھی نہیں کر سکتا۔ پھر وہاں کیا بناؤں گا۔ لوگ یہ سمجھیں گے۔ کہ میں روپیہ کمانا یا سطحی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہوں...... ارادہ کرنے کو تو کر لیا۔ لیکن کوئی کام بھی ہو؟

وُہ کلبی فلسفیوں کے انداز سے اپنی حالت اور اپنے ارادے پر مسکرایا اور اس سے اُسے ایک گونہ اطمینان ہؤا۔ گو وُہ اپنے دل میں سمجھتا تھا۔ کہ ان دلیلوں سے اسے اپنے ارادے سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا نہیں ملا ہے۔ اور اس کا ضمیر اسے یہ ارادہ یاد دلا کر شرمندہ کیا کرے گا۔ لیکن یہ وقت اسے دور معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لمبی سانس لی۔ اور ایک کروٹ ہو کر لیٹ گیا۔

نیند کا انتظار کرتے ہوتے وُہ بچوں کا اودھم۔ ہنسی اور گالی گلوچ سننے لگا۔ اسے معلوم ہوگیا۔ کہ وُہ کونسے کھیل کھیل رہے تھے۔ کیا کیا غلطیاں کر رہے تھے۔ اور اس نے کوشش کی کہ کھیل کی رفتار پر غور کرتا رہے۔ لیکن دفعتہً سارا اودھم موقوف ہوگیا۔ اور ایسا معلوم ہؤا کہ سب بچے گونگے ہوگئے ...... اس نے اپنے نوکر کی بھاری موٹی آواز سُنی۔ جو بچّوں کو گالی دے رہا تھا۔ اور نکال رہا تھا۔ پھر اس نے ایک بچّے کے رونے کی آواز سُنی۔ اور اپنے نوکر کو گلا پھاڑ کر چلاتے ہوئے سُنا۔ جس سے بچے کے رونے کی آواز دب گئی۔

محمود کو بہت غصّہ آیا۔ اسے یُوں بھی پسند نہ تھا۔ کہ اس کا نوکر بچّوں پر خواہ مخواہ سختی کرے۔ اور یہ تو وُہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ کہ وُہ ان میں سے کسی کو مار بیٹھے وُہ جانتا تھا۔ کہ اس کمبخت کو جب موقع ملتا ہے۔ سختی اور ظلم سے نہیں چوکتا۔ اور اسے اس کی ان حرکتوں سے نفرت تھی۔ اِس لئے اُس

نے قصد کر لیا۔ کہ اٹھ کر اُسے خوب ڈانٹے گا۔ اور لعنت ملامت کی ایسی بوچھاڑ کرے گا۔ کہ نفرت و حقارت کا سارا بخار جو اس کے دل میں تھا۔ نکل جائے۔ اس نے اپنے دل میں کہا: "اس کی یہ حرکت پہلی بار نہیں ہے بلکہ وُہ ہمیشہ یہی کرتا ہے۔" اسے یکایک یہ خیال آیا۔ کہ یہ کمبخت ہمیشہ خود اس سے اور اس کی بیوی سے بھی بدتمیزی سے پیش آتا ہے۔ اور کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ محمود نے بلند آواز سے کہا: "کبھی نہ کبھی تو اس سے سمجھنا ہے۔ آج ہی کیوں نہ فیصلہ ہو جائے۔" وُہ بستر پہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنے نوکر کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن نوکر نہیں آیا۔ وُہ اپنی مرضی سے کہیں اور چلا گیا۔ محمود اس پر برس پڑنے کو آمادہ بیٹھا تھا۔ کہ اسے اپنے ارادے کا خیال آیا۔ تقدیر نے اسے یہ موقع دیا تھا۔ "یہی اسے پُورا کرنے کا وقت ہے۔ نوکر سے بسم اللہ کروں۔ پھر اپنی بیوی کی خبر لوں۔ پھر اپنی۔ پھر ساری دُنیا کی۔ بس یہی وقت ہے۔" اس نے اپنے دانت اور مٹھیاں بھینچ لیں۔ اور ابرو پر بل ڈال لیا۔ لیکن اس سے وُہ گھبراہٹ دُور نہ ہو سکی جو اس پر غالب آ رہی تھی۔ اور جس نے اسے شک اور پس و پیش میں ڈال دیا تھا۔ وُہ ڈانٹنے ڈپٹنے کو تیار بیٹھا تھا۔ اور دل کڑا کر کے ایسا کر بھی گذرتا۔ لیکن اصولاً یہ کرنا۔ اسے ایک مستقل دستور العمل بنانا ...... یہ ایک محال امر تھا۔ اسی نے اس کی ہمت پست کر دی۔ اور وُہ پھر شک اور مایوسی کا شکار ہو کر بستر پہ گر پڑا۔

عین اسی وقت گویا واقعات نے محمود کو پیس ڈالنے کی سازش کر لی تھی۔ یہ سنائی دیا۔ کہ اس کا نوکر کھٹ پٹ کرتا لمبے لمبے تلے قدم رکھتا چلا آ رہا ہے۔ اور ذرا دیر کے بعد وُہ اس کے سامنے کھڑا تھا ...... ایک لمبا بھاری بھر کم آدمی جس کے چہرے سے بدتمیزی ٹپکتی تھی۔ اور جس کے لبوں پر طنز آمیز مسکراہٹ تھی۔ جسے وُہ کبھی دبانے یا چھپانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

محمود نے انتہائی کوشش کی کہ اس کی آواز سے اعصابی کمزوری نہ ظاہر ہو۔ اُس نے کہا: "تم کہاں تھے؟"

نوکر نے سوال کو دہرایا: "میں کہاں تھا؟" اور محمود کو یہ محسوس ہُوا۔ کہ اس کے ہونٹوں پر معمولاً جو مسکراہٹ رہتی تھی۔ وُہ پھیل کر زہرخند بن گئی۔

"ہاں۔ ہاں۔ تم یہیں تھے۔ میں سن رہا تھا۔ کہ تم نے ایک بچّے کو مارا۔ بتاؤ تم نے اُسے کیوں مارا؟"

"کیوں مارا؟ مارتا نہیں تو کرتا کیا؟ اگر ان لونڈوں کو نہ ماروں۔ تو کل کو گھر میں گھس کر کھیلیں

گے۔ اور مجھے اُن کی چیخم دھاڑ اچھی نہیں لگتی" نوکر جواب دے رہا تھا۔ آخر میں اس کی آواز نے ملامت کا لہجہ اختیار کر لیا تھا۔ محمود نے کمزور آواز میں کہا" بھلا اتنی سی بات پر کوئی بچے کو مارتا ہے؟" اسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ پلنگ ٹوٹ جائے گا۔ اور وُہ نیچے گر پڑے گا۔

"ماروں نہیں تو کام کیسے چلے گا۔ گالی سے تو مانتے نہیں۔ سُنتے سُنتے عادت ہو گئی ہے۔ ہر شخص انہیں گالیاں دیتا ہے۔ مجھے مارنا ہی پڑتا ہے۔ کم سے کم ایک لونڈا ..."

محمود نے سنا تھا۔ کہ وُہ لڑکا دوسروں کے بھاگ جانے کے بعد دیر تک روتا رہا۔ غالباً وہ سب سے چھوٹا تھا۔ اسی لئے اُسے سزا ملی۔ بہرحال اسے یقین تھا۔ کہ صرف ڈانٹنے سے لڑکے بھاگ جاتے اور نوکر کا اس لڑکے کو مارنا محض ظلم تھا۔ مگر وُہ جانتا تھا۔ کہ وُہ اس کمبخت کو دلیل سے قائل نہیں کر سکتا۔ اور اس کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نے اس ذکر کو چھوڑ دیا۔ جس سے اس کے نوکر نے نتیجہ نکالا۔ کہ وُہ ہار مان گیا۔

محمود نے حتی الامکان رعب سے کہا" اب تم کہاں جا رہے ہو؟"

"بیوی مجھے شہر بھیج رہی ہیں"

"اچھا جاؤ" محمود نے کروٹ لے لی۔ تاکہ نوکر اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ اور احتیاط کی غرض سے اسے اپنے بازو سے چھپا لیا۔ نوکر حقارت سے مسکرا کر چل دیا۔

محمود نے نوکر کے جانے کی آواز سُنی۔ تو اسے کسی قدر اطمینان ہوا۔ اپنی ناکامیابی سے اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس نے خود اس کی پیشگوئی کی تھی۔ لیکن اس کی اضطرابی حالت باقی رہی۔ اس کے دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ نوکر سے گفتگو کرنے کے بعد اس کا ارادہ کافور ہو گیا تھا لیکن اس کی سیرت پر ایسا دھبہ لگا تھا۔ جس کا مٹنا ناممکن تھا۔ اسے ایک دھندلا سا احساس تھا۔ کہ موجودہ ناکامیابی کے نتائج گہرے اور دیرپا ہونگے۔ اور اگر آگے چل کر اس نے اور اسکی امیدوں نے سر اٹھایا۔ تو اس کوشش کی یاد اسے مغلوب کر دے گی۔ لیکن خدا جانے کیا بات تھی۔ کہ محمود کو اس خیال سے ایک طرح کا اطمینان تھا۔ اب آگے چل کر نہ کوئی امید ہو گی۔ نہ کوشش نہ ناکامیابی کی ذلت۔ اگرچہ وُہ اپنی بزدلی کو قابل حقارت سمجھتا تھا۔ تاہم اس کے خیال سے اسے ایک قسم کی خوشی ہوئی تھی۔ پرانے افیونی کی طرح وُہ جان بوجھ کر زہر کے گھونٹ چڑھا رہا تھا۔ وُہ جانتا تھا۔ کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے اعتراف

تھا۔کہ اس سے بہتر زندگی ممکن ہے۔ لیکن پھر ایک جھکی لے لیتا۔ تاکہ اپنے آپ کو یقین دلادے۔کہ بہتر زندگی اُس کی قسمت میں نہ تھی۔

جب اس کی بیوی نے زور سے دروازہ کھولا۔ تو اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے اپنے شوہر کے انداز سے سمجھ لیا۔کہ وہ اس وقت بھی بالکل احمق بنا ہؤا ہے۔ اَور وُہ اسے بُرا بھلا کہنے لگی........ لیکن محمود نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اور بے خبری کے عالم میں اس کے ہونٹوں کو ہلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بیوی نے آخر میں کہا" کھانا تیار ہے۔ آکر کھا لو"۔ مگر محمود نے حرکت نہیں کی۔ گویا کسی چیز نے اُسے بستر سے جکڑ دیا تھا۔ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس کی زندگی کا اٹل قانون ہے۔ کہ وُہ دن رات بے حس و حرکت پلنگ پر پڑا رہے۔ اَور صرف کھانا کھانے کے لئے اٹھا کرے! اور اس قانون کا تقاضا یہ ہے۔کہ وُہ کاہل۔ بزدل اور نکمّا بنا رہے۔ اَور اپنے ذہنی اور جسمانی جمود سے جو اس کے ضمیر میں ہے لطف اٹھائے۔

اس خیال اور احساس کے ساتھ اس میں کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ دقّت سے وُہ کھسک کر پلنگ کی پٹی پر آگیا۔ اَور اپنا ایک بازو لٹکا دیا۔ اس کی انگلی ایک پتھر سے لگی۔ جو زمین پر پڑا تھا۔ اَور وُہ اسے اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا۔ کہ یہ کہاں سے آیا۔ کیونکہ اسے دفعتًہ یہ خیال آیا۔ کہ اس میں اور اس مجہول بے ضرر پتھر میں کتنی مشابہت ہے۔ دونوں کی قسمت میں یہ لکھا تھا۔ کہ جب تک انہیں کوئی چیز حرکت میں نہ لائے۔ چپ چاپ پڑے رہیں۔ اور دونوں اس پر قانع تھے۔ وُہ اپنے پتھر کو انگلیوں میں دبائے تھے۔ گویا وُہ کوئی قیمتی چیز تھی۔ اور دل میں پوچھ رہا تھا" کیا پتھر میں احساس اَور خیال کی قوت ہے؟ کیا میں احساس اور خیال کر سکتا ہوں؟ شاید کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ کونسا بڑا فرق ہے؟"

دفعتًہ اس نے فتحمندی کے انداز سے وجد کے عالم میں اپنے بازو گھمائے۔ گویا مدت کے بعد بڑی بات معلوم کی ہے۔ اور چلّا کر کہا" ہاں! ہاں! میں بھی پتھر ہوں۔ بیشک میں پتھر ہوں!" کسی نامعلوم حوصلے نے اس کے بدن میں سنسنی پیدا کر دی۔ اَور وُہ یہ مسرّت انگیز خیال دل میں لئے ہوئے۔ کہ وہ پتھر ہے۔ اٹھا اور کھانا کھانے چلا۔

اسکی بیوی کو اس کے ہاتھ میں ایک پتھر دیکھ کر بہت تعجب ہؤا۔ (ع - ب)

بسترِ تنہائی

(ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب)

ابھی بارہ بجا چکی ہے گھڑی
رات برسات کی ہے اندھیاری

آسماں پر گھری ہے کالی گھٹا
ہر طرف چھا رہا ہے سناٹا

پتے ساکن ہوا کا نام نہیں
ہُو کا عالم صدا کا نام نہیں

اور جو کچھ سائیں سائیں سی ہے بھی
اور بڑھتی ہے اس سے خاموشی

یہ شب تار اور یہ تنہائی
دل مضطر تری قضا آئی

کن بہانوں سے تو نے روکے تھے
وہ خیالات پھر امڈ آئے

پھر ہوا حسرت والم کا ہجوم
پھر ہوئے راحت وسکوں معدوم

پھر وہی حسن وعشق کا جھگڑا
پھر وہی سلسلہ سوالوں کا

کس سے پوچھوں میں کون بتلائے
اچھی صورت میں یہ کشش کیوں ہے

کیوں مسلتی ہے دل کو پیاری ادا
کیوں لبھاتی ہے جی کو زلفِ سیاہ

دل میں چبھتے ہیں کیوں گھنے ابرو
نگہِ ناز میں ہے کیا جادو

لعل لب کیوں ہے چشمۂ امید	ہے حسینوں کی آنکھ میں کیا بھید
حسن والوں کے مسکرانے سے	کیوں کلیجہ میں درد ہوتا ہے
یعنی آخر یہ حسن کیا شے ہے	اور مرے دل سے کیوں خلش ہے سِوا
مرضِ عشق کا مزاج ہے کیا	اور اس درد کا علاج ہے کیا
دل جدائی میں کیوں ہے گھبراتا	وصل میں چین کیوں نہیں آتا

دلِ وحشی یہ گفتگو کب تک	رازِ الفت کی جستجو کب تک
تجھ سے پہلے بھی تھے بہت سے غریب	نہ ہوا پر کسی کو چین نصیب
اب مناسب تجھے یہ ہے سو جا	سارے عالم سے بے خبر ہو جا
خواب اور مرگ ہی میں ہے یہ اثر	کہ ہر اک غم سے چھوٹ جائے بشر
اب نہ جانے فنا کی گودی میں	نیند اور موت کی خموشی میں
ہم محبّت کا بھید پاتے ہیں	یا یہ قصّہ ہی بھول جاتے ہیں
خیر دونوں کا ایک ہی ہے مآل	یعنی جاتا رہے یہ رنج و ملال

مرنے جینے پہ اختیار کسے
نیند آ جائے تو غنیمت ہے

رسالہ "چاند" اور مدیر "نگار"

از ابوالبیان ابر انصاری گنوری

خدا کسی کو غرور قابلیت نہ دے اس زعم باطل میں سچ تو یہ ہے کہ انسان کے حواس بھی درست نہیں رہتے عقل پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں کہ دنیا کی تمام مصلحتیں اس قسم کے خطرات کی نگاہ میں ایک فریب طلسم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ زمانہ کسی طرف جائے۔ مگر یہ لوگ اپنا جادۂ غلط سب سے جداگانہ قائم کر کے اس پر گامزن ہوتے ہیں۔ ان کو قوم کے مطالبات سے کوئی غرض نہیں۔ صرف خود غرضی کی مسموم فضا میں خود کو نمایاں کرنے کی کوشش ان کا شعار عمل ہے +

ہندی اُردو کا مسئلہ دور حاضر میں ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ جس نے چند روز سے متفقہ طور پر اہمیت حاصل کر کے ہندوستان کے ادبا و علماء کے طبقہ میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ کون واقف نہیں کہ ہندوستان کے تقریباً ۲۰ کروڑ ہندوؤں نے اردو کے مٹانے کی قسم کھالی ہے، اور وہ ہمہ وقت اس کوشش میں کامیابی کے شادیانے بجاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ متعدد مقامات سے اُردو حرف غلط کی طرح مٹائی جا چکی۔ اور اکثر و بیشتر مقامات سے اس کے مٹانے کی سعی بلیغ جاری ہے۔ بہت سی کچہریوں میں اردو کی جگہ ہندی کا نفاذ ہو چکا۔ دیہاتی مدارس میں ہندو مدرسین جن کی اکثریت مسلمہ ہے۔ ہر ہندی طالب علم کی تعلیم کا آغاز ہندی سے کر کے ہمیشہ ہمیشہ کو ان کی اصل زبان ہندی بنا دیتے ہیں، ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ اس لئے کہ تاریخ اردو سے ناواقف ہنود کے ذہن میں یہ بات سما گئی ہے کہ اردو مسلمانوں کی اور صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ حالانکہ امر واقعہ اس خیال کی تردید کرتا ہے، اُردو نہ مسلمانوں کی واحد زبان ہے نہ ہندوؤں کی۔ بلکہ یہ دونوں کی مشترکہ زبان ہے جس پر دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ مجھے اسوقت اردو کی تاریخ بیان کر کے یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ ہندوؤں نے کیسی کیسی جان توڑ کوششیں کر کے زبان اُردو اور اپنی زبان اُردو کو پالا، اور اسپر کتنا ایثار کیا، اس کی ترقی میں کیسی کیسی زحمتوں کا مقابلہ کر کے آج اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی رقیب زبانوں کے دوش بدوش کھڑی ہو سکے۔ بلکہ اس وقت میرا مقصد اپنی قوم کے قابل اہل قلم کی غفلمندیوں کا ماتم کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اس بگڑی ہوئی فضا میں ان کا طرز عمل کیا ہونا چاہیئے اور کیا ہے +

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، کہ اگر آج زبان اُردو کو ہندو اصحاب فنا کر دینے میں کامیاب ہو جائیں، تو یقیناً اور نقصانات کے علاوہ ان کی اور مسلمانوں کی مذہبی دنیا میں ایک انقلاب عظیم واقع ہو جائے گا، سب آگاہ ہیں کہ ہم دونوں قوموں کے مذہب کا بہت بڑا ذخیرہ اردو کی امانت میں ہے۔ جس کو ہندی میں منتقل کرنا، اگر ناممکن نہیں تو محال یقینی ہے۔ اس کے لئے بہت بڑی دولت کے صرف کی ضرورت ہے۔ جس کو اس انتقال بے ضرورت پر صرف کرنے کے بجائے ہم پر قربان کرنا چاہیئے۔

جب دو بھائیوں میں کسی بات پر مناقشہ ہو جائے، اور ان میں کا ایک روٹھا ہوا غصہ کے بخار کے سبب سے اپنے نفع کو نقصان سے بدل جانے کی پروا نہ کرے تو ایسی حالت میں دوسرے بھائی کا فرض ہے کہ جس طرح ہو، اس کے غصہ کو فرو کرے۔ اس کو منا پرچا کر راہ راست پر لائے۔ اب اگر ایسی حالت میں ایک تیسرا بھائی روٹھے ہوئے شخص کے غصہ کو اپنی تلخ کلامی سے مشتعل کرے تو اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں کہ بنا بنایا گھر بگڑے اور سب کے سب نقصان اٹھائیں۔ یہی حال آج کل ہندو مسلم اور زبان اردو کا ہے۔ ہندو کسی مصلحت کے ماتحت اپنی مادری زبان اُردو سے برہم ہو گئے اور اس کے صفحہ دنیا سے مٹانے کا انہوں نے حلف اُٹھا لیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے مٹ جانے سے نسبتاً ان کا ہی نقصان زیادہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ مگر ایسے وقت میں مسلمانوں کا یہی فرض ہے، کہ ان کو جس طرح بھی ہو راضی کریں اور اپنے گھر کی دولت کو برباد نہ ہونے دیں، چنانچہ زبان کے تحفظ میں اہل دماغ مسلمان کیا کچھ نہیں کر رہے۔ اللہ خوش رکھے ہمارے محترم دوست مُلا رموزی کو وہ تو گویا اس کام کے لئے اپنی زندگی ہی وقف کر چکے ہیں۔ غرضیکہ زبان کی اہمیت کو سمجھنے والے مسلمان اپنے روٹھے ہوئے بھائیوں کو ہر طرح سمجھا بجھا کر اپنا ہم خیال بنا رہے ہیں۔ اور ہمارے روٹھے ہوئے بھائی بھی اپنی اُردو سے اظہار ہمدردی کرنے لگے ہیں۔ جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ آج ہندوستان میں ہنود کی ادارت میں متعدد اُردو اخبار و رسائل جاری ہیں۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان حضرات کی دامے درمے قدمے سخنے، امداد کر کے ان کی ہمت افزائی کریں۔ ان سے اگر علمی لغزشیں بوجہ اُردو سے غیر مانوس ہو جانے کے عمل میں آجائیں تو برادرانہ انداز سے ان کی اصلاح کریں ان کو تنہائی میں سمجھائیں کہ یہ بات اس طرح نہیں ہے یوں ہونی چاہیئے۔ پھر دیکھئے زبان کتنی جلدی ترقی کرتی ہے اور کہاں سے کہاں پہنچتی ہے۔ برعکس اس کے ان ایڈیٹروں پر طعنہ زن ہونا اُن کے غلط اڑانا، عیب جوئی کر کے اپنی قابلیت کا سکہ جمانا، اُن کو اور اُن کے جرائد کو پانی پی پی کر کوسنا جنون ہے اور نقصان دہ جنون جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ کو زبان کی اصلاح و اشاعت منظور نہیں۔ بلکہ اپنی لیاقت کی اشاعت مدنظر ہے۔

کئی برس سے رسالہ چاند بزبان ہندی الہ آباد سے نکلتا ہے، اب اس کے کارکنوں نے اپنے فرائض پر نگاہ کرتے ہوئے، اور اپنی مادری زبان اُردو کی ہمدردی کا اپنی قوم کو سبق دیتے ہوئے چند ماہ سے اسی چاند کو اُردو میں بھی جاری کردیا ہے۔ اس کے ایڈیٹر منشی کنھیالال صاحب بی اے ایل ایل بی ہیں، رسالہ ضخیم مصوّر دیدہ زیب ہے۔ ہر نمبر اپنے گذشتہ سے آب و تاب میں بڑھ چڑھ کر نکلتا ہے۔ ملک کے قریب قریب جملہ رسائل و اخبار کے مسلمان مدیروں نے اس پر دل کھول کھول کر تبصرے کئے ہیں مشاہیر ملک نے چاند کے مدیر اور مینجر کو اس سعید کام پر مبارکباد پیش کی ہے۔ بیشتر ایسے اہل قلم جو مسلمان رسائل کو بہیم تقاضوں پر بھی دو سطریں لکھ کر دینے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے تھے۔ چاند کو مضامین نظمیں۔ غزلیں بھیج رہے ہیں، اور ان کی تمامتر کوششیں اس میں صرف ہو رہی ہیں کہ الہ آباد کا چاند آسمان والے چاند سے زیادہ تابان و درخشان نظر آئے۔ یہ جو کچھ انہوں نے کیا اور کر رہے ہیں ان کا فرض ہے چاند پر احسان نہیں،

میں ۲۷۔ اپریل ۳۰ء کو مینپوری کے سالانہ مشاعرہ میں جا رہا تھا، کہ راستے میں اخی مکرم مولوی ضیا احمد صاحب ضیا بدایونی لیکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ مل گئے۔ موصوف نے مطالعہ کو حالیہ "نگار" دیا، تھوڑی دیر کی ورق گردانی کے بعد تبصرہ کے صفحہ پر نگاہ پڑی۔ میری حیرت کی حد نہ رہی۔ جب میں نے "چاند" کے متعلق مولٰنا نیاز کی غیر معقول اور غیر ضروری تنقید پڑھی ــــــــ فرماتے ہیں رسالہ ایسا ویسا ہے وہ تجارتی نقطہ نظر سے جاری کیا گیا ہے۔ اس کے اغلاط کا ذکر کرتے ہوئے آپ فتویٰ دیتے ہیں۔ کہ چاند علمی حیثیت سے کبھی ترقی نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کے موجودہ عملہ میں انقلاب نہ ہو۔ اس کا شائد یہ مطلب ہو کر چاند کی ادارت منشی کنہیالال صاحب سے لے کر خود مولٰنا نیاز کی سپرد کردی جائے اس وقت یہ رسالہ علمی۔ ادبی۔ سیاسی۔ تجارتی وغیرہ رسالہ ہوسکتا ہے ورنہ نہیں ÷

اب میں نیاز صاحب سے دریافت کرتا ہوں کہ آخر آپ کو ایسے اوچھے ہتھیار کے استعمال فرمانے کی ایسی اشد ضرورت کیا پیش آئی۔ وقت کی نزاکت کا احساس نہ کرتے ہوئے اس غیر ضروری تنقید کا کیا مقصد تھا، اگر آپ کو چاند میں کچھ لغزشیں نظر آئیں تو کیا وہ اس قابل نہ تھیں کہ رسالہ کی ابتدائی دشواریوں اور اہل رسالہ کو اُردو سے مدت کے بعد سابقہ پڑنے کی مشکلات کو مدنظر رکھ کر آپ معاف فرما سکتے یا اس کی اصلاح کے لئے چاند کے مدیر کو دوستانہ مشورہ دینا جانتی ہے، کہ کوئی شخص ابتدا ہی سے یا کسی کام کے شروع کرتے وقت ماہر فن نہیں ہوتا۔ بلکہ کام تجربہ کار اور ماہر فن بناتا ہے۔ اگر ناگوار نہ ہو تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں، کہ جس قابلیت کا اظہار آج آپکی طرف سے ہو رہا ہے۔ یا پیہم تجربوں کے بعد آج آپ جس لیاقت کے انسان بن گئے۔ یہ بات کل نہ تھی۔ آپ سے بعض لغزشیں ہوتی ہوں گی۔ آپ پر ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی ہوگئی۔ اور پھر ہزاروں ٹھوکریں کھانے کے

بعد آج آپ اس درجہ پر پہنچے ہوں گے جہاں آپکے نزدیک سوائے آپ کے دنیا میں کوئی ہستی اس قابل ہی نہیں رہتی جس کو قابل کہا جاسکے - میرا تو گمان غالب ہے کہ بلحاظ بشریت اب بھی آپ سے صدہا غلطیاں سرزد ہوتی ہوں گی - ایسی حالت میں آپ کو اس امر کا لحاظ چاہیئے کہ جو ہستیاں اردو سے مدت مدید سے غیر مانوس ہوں، اور جنہوں نے ادبی دنیا میں پہلا ہی قدم رکھا ہو، ان کی لغزشیں آپ کی لغزشوں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں، جب کہ آپ زبان اُردو کے ماہر فن ہونے کے ساتھ ساتھ برسوں سے ایک رسالہ کی ایڈیٹری کے تجربات بھی حاصل کر چکے ہیں - آج اگر آپ کسی ہندی رسالہ کے اجراء کا قصد فرمائیں تو کیا آپ کو یقین ہے کہ ہر قدم پر آپ کو ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں گی - پھر کیا ایسی حالت میں آپ کے ہمعصر ہندی رسائل کے مدیر (جن کی خواہش ہندی کی اشاعت بھی ہو) اپنے فرض کو اس صورت میں ادا کریں گے - کہ آپ کے رسالہ کی نسبت یوں لکھدیں :-

"یہ رسالہ ہرگز ہندی ادب کا کارآمد رسالہ نہیں ہوسکتا، بلکہ اس سے زبان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے - اس سے بیشمار غلطیاں سرزد ہوتی ہیں - لہذا آج سے مولٰنا نیاز کو اس سے برطرف کر کے کسی چتر ویدی براہمن کو اس کی ادارت کی خدمات سپرد کی جائیں - اس وقت تک یہ رسالہ اس قابل نہیں کہ کوئی شریف آدمی اسکو چھو بھی سکے -"

اپنی شہرت کے فریب میں آکر گھر بیٹھے ہوئے یہ قیاس کر لینا کہ دنیا میں کوئی ہندو اس قابل ہے ہی نہیں کہ اس کو ادیب کہا جاسکے - یا یہ کہ کسی ہندو میں یہ مادہ ہی نہیں کہ وہ اُردو کو صحیح طور پر حاصل کر کے ادیب بنے، اور کسی رسالے کی ایڈیٹری کے قابل ہوسکے - کھُلا ہوا فریب نفس ہے - آج ہندوستان میں بے شمار ایسے ہندو موجود ہیں جو فارسی کے منتہی ہونے کے علاوہ ادب اُردو پر تبحر کامل رکھتے ہیں - ان کے اشعار سن کر بڑے بڑے دعویدار شعراء کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کمالات اور ہندو میں! پھر چاند کے ہنود ارکان کی نسبت یہ قیاس کہ وہ کبھی رسالہ کو علمی ادبی نہیں بنا سکتے ایک غلط دعوے سے زیادہ کیا حیثیت رکھتا ہے - جس میں غرور اور تعصب کے عناصر غالب ہیں۔

مولٰنا کوئی کچھ کہے مگر میں تو یہی کہوں گا کہ یہ آپ سے ایک اصولی غلطی سرزد ہوئی - جو موجودہ زمانہ میں زبان کے لئے سم قاتل کا اثر رکھتی ہے - بہتر ہوتا کہ آپ یہ بددل کرنے والا تبصرہ فرمانے کے بجائے خاموش ہوجاتے یا دیگر رسائل کی طرح آپ بھی اسکی موافقت میں تبصرہ کرتے تو کوئی احمق ایسا نہ تھا جو یہ گمان کر کے آپ کی قابلیت کی طرف سے بدگمان ہوجاتا کہ مولانا نقاد نہیں - اور وہ صحیح تنقید نہیں فرما سکتے - ایسے وقت میں آپ کا فرض ہے کہ صرف چاند کو ہی نہیں بلکہ جملہ ہنود جرائد کو نیک مشورہ دیں اپنے تجربات سے آگاہ کریں - جس سے ان کی ہمت بلند ہو

اور وہ اس زبان سے جس سے کہ وہ غیر مانوس ہو چکے ہیں، اظہار ہمدردی کر کے اس قیام و ترقی کا سبب بنیں۔ مگر آپکو اس سے کیا آپ ایسا کیوں کرنے لگے۔ آپ کے نزدیک اُردو دنیا سے مٹ جائے تو غم نہیں۔ یا صاحبانِ اُردو کی مساعی حمیدہ خاک میں ملجائیں تو ملال نہیں۔ کیا جتنے بھی مشاہیر و مسلمہ اساتذہ نے چاند پر تبصرے کئے ہیں کوئی بھی اس قابلیت کا نہ تھا جس میں آپ کی طرح چاند کو سمجھنے کی لیاقت ہو مگر معاف کیجئے فرق یہ ہے کہ خدا نے ان کے دماغوں کو روشن کیا ہے اور وہ مصلحت کو سمجھتے ہوئے اس بات پر نگاہ رکھتے ہیں کہ اس قسم کے تبصروں کا زبان پر کیا اثر ہوگا*

چاند کو تجارتی نقطہ نظر سے جاری کرنے کی ایک ہی کہی۔ یہ ارشاد اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، کہ اپنا گھر شیشے کا بنا کر دوسرے کے گھر پر پتھر برسانا۔ مولٰنا کیا میں یہ دریافت کرنے کی ہمت کر سکتا ہوں کہ آپ کا نگار تجارتی نقطۂ نظر سے جاری نہیں کیا گیا ہے کیا آپ اس کو مفت تقسیم کرتے ہیں، یا اگر قیمت لیتے ہیں۔ تو صرف اسی قدر جتنی اس پر لاگت آتی ہے کیا آپ اس رسالہ سے منافع اور کافی منافع حاصل نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہی ہے، تو یہ اس کی چار پانچ روپیہ سالانہ قیمت کیوں ہے۔ جب کہ اس کی قیمت میں ایک ضخیم رسالہ دیا جا سکتا ہے۔ ایک نیرنگ خیال کو دیکھئے کہ نگار سے ڈیوڑھی ضخامت کے علاوہ متعدد تصاویر بھی دیتا ہے۔ جن پر یقیناً نگار کی قیمت کے برابر روپیہ صرف ہوجاتا ہوگا، اور وہ اس رسالہ کو بہر میں دیتے ہیں۔ جس میں اُن کا کافی نفع بھی شامل ہے پھر کیونکر یقین کیا جا سکے۔ کہ نگار جو نیرنگ خیال سے ضخامت میں بھی کم ہے۔ تصاویر پر بھی کچھ صرف نہیں کرتا۔ اور قیمت بھی ڈیوڑھی رکھتا ہے، اس کا دعویدار ہے کہ وہ تجارتی نقطہ نظر سے جاری نہیں کیا گیا۔ حضرت جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ اس سے بہت کافی نفع حاصل کر رہے ہیں۔ اور اسی نفع گیری کو دوسرے الفاظ میں تجارت کہتے ہیں۔ پھر اس طعنہ زنی کا خدا جانے آپ کو کہاں سے حق حاصل ہوگیا۔ جب کہ آپ خود اسی میں گرفتار ہیں*

حضرت یوں تو نگار اور چاند دونوں تجارتی مقصد کے ماتحت نکل رہے ہیں۔ اور ادبی خدمت کے دونوں دعویدار بھی ہیں۔ صرف ایڈیٹروں کی قابلیت کا فرق ہے۔ مگر اس پر بھی چاند کو نگار پر یوں ترجیح دی جا سکتی ہے۔ کہ چاند کا مدیر ہندو ہے۔ جس کی قوم اُردو کی مخالف ہے۔ اور اس سے متنفر اس پر بھی وہ اپنی قوم کی پروا نہ کرتے ہوئے خدمتِ زبان کے لئے ہمت باندھکر میدان عمل میں نکل آیا ہے، اور ہر طرح اس پر زر کثیر صرف کر کے اُس کی ہمدردی کا خالص ثبوت دے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا جذبہ قابل ستائش ہے*

انشاء اللہ یہی چاند چند دن کے بعد دنیائے صحافت میں ماہِ چہاردہ ہو کر چمکے گا۔ اور ان لوگوں کو زبار کے ہاں میں

سبق دے گا۔ جو آج اپنے زعم باطل میں خود کو ہمچو ما دیگرے نیست کا مصداق سمجھے بیٹھے ہیں۔ اس لئے سمجھ دار اور ہمت ور قوم کے لوگ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اسکو مغرور خود پسند اور مسخ شدہ ذہنیت کے لوگوں کی طرح ادھورا نہیں چھوڑتے +

بہرحال مسلمانوں کی ادارت میں بہت سے رسائل جاری ہیں۔ اگر ایسا ہی حق نگاری کا شوق ہے تو اُن کی طرف توجہ مبذول فرمایئے، اس لئے کہ ان سے اغلاط کا سرزد ہونا گناہ ہے، اور تخریب زبان کا باعث، وہ زبان اور صحیح زبان کے دعوے دار ہیں۔ یاد رکھیئے تندرستی کو دیکھ کر سزا دینا اور لیاقت کے موافق سوال کرنا ہی عین ہوشمندی ہے +

تصویر خیال

(جناب عندلیب شادانی)

مندرجہ ذیل نظم کا پلاٹ اگرچہ بظاہر مغربی معلوم ہوتا ہے لیکن بنگال میں، جو دریاؤں کا ملک ہے، اس قسم کے "واقعات" کا کال نہیں +

چاندنی، دریا، خموشی، تیری کشتی اور تو — مجھ کو بھی ہمراہ چلنے کا اشارا ہوگیا

بیٹھ کر چپّو سنبھالا میں نے، کشتی چل پڑی — رفتہ رفتہ دُور جب ہم سے کنارا ہوگیا

تو نے چھیڑا ساز، اور نغموں سے گونج اُٹھی فضا — دِل میں جوشِ آرزو ہنگامہ آرا ہوگیا

تھی کہاں لیکن مجھے عرضِ تمنّا کی مجال — آنسوؤں سے حالِ دِل کا آشکارا ہوگیا

بیخودی میں یک بیک آنکھیں ملیں اور جھک گئیں — پھر اُٹھیں اور پھر وہی عالم دوبارا ہوگیا

اِک ذرا پہلے فقط تیری نظر تھی برق پاش — اب ترا دِل بجلیوں کا گاہوارا ہوگیا

رکھ دیا میں نے اِدھر چپّو اُدھر تو نے رباب — دور اب دونوں سے خودداری کا یارا ہوگیا

تیرے سینے میں ہوئی محسوس اک جنبش مجھے — میری جرأت کا یہی شائد سہارا ہوگیا

ہاتھ اٹھے اور تیری گردن میں حمائل ہوگئے — تو نے سر خم کر دیا، یا، خود قضارا ہوگیا

جسم میں اک سنسنی تھی، روح میں اک اہتزاز — لفظ کیا بتلائیں، جو عالم ہمارا ہوگیا

ہاں، وہی میں ہوں، وہی تو ہے۔ مگر وہ دل نہیں — آہ، پیکرِ موم ہوکر سنگِ خارا ہوگیا

کیوں نہیں ملتا محبت سے محبت کا جواب — کس لئے قحطِ وفا پروردگارا ہوگیا

مصوّر کا استغراق

(از جناب عبدالرحمٰن اعجاز)

مصوّر نے چند مرتبہ اپنے شہکارانہ قلم کو حرکت دی۔ رنگ بھرا۔ اور سفید کپڑے پر لگایا۔ سامنے بیٹھی ہوئی دوشیزہ کا چہرہ اب کپڑے پر ہو بہو نظر آ رہا تھا۔ مصوّر چھ مہینے سے کسی فرمائش کی تعمیل نہ کرتا تھا۔ کسی کی تصویر بنانے کی ہامی نہ بھرتا تھا۔ مگر اس دوشیزہ نے جو اس وقت سامنے کوچ پر بیٹھی ہوئی فرطِ خوشی سے مُسکرا رہی تھی۔ کچھ اس انداز میں مصوّر سے درخواست کی تھی۔ اور کچھ اس طریق سے اس سے اپنی تصویر بنانے پر اصرار کیا تھا۔ کہ مصوّر کے لئے انکار کی گنجائش ہی نہ رہی۔ لڑکی خوبصورت اور سمجھ دار تھی۔ احساسِ جمال میں کمال رکھتی تھی۔ اور مصوّری کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات جو مصوّر کے نزدیک نہایت اہم تھی۔ یہ تھی کہ اس کی آنکھیں مصوّر کے ایک عزیز دوست کی آنکھوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔ جسے بچھڑے ہوئے دو سال گذر چکے تھے۔ اور جسے دیکھنے کے لئے چھ مہینے سے مصوّر نہایت بیتاب و مضطر تھا۔ اور اپنے مشاغل سے اس درجہ بے پروا ہو چکا تھا کہ دس دس ہزار روپے کے کئی آرڈروں کی تعمیل سے اپنی معذوری ظاہر کر چکا تھا۔

عزیز افسانہ نگار اور ریاض مصوّر دونوں ہم عمر تھے۔ آپس میں اُلفت تھی۔ بچپن ایک ساتھ گذارا اور جتنے او سے اس طرح زندگی بسر کی کہ ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں۔ اسے قسمت کی خوبی کہئے یا نیرنگیِ زمانہ۔ کہ آخر جدائی کی گھڑی آ ہی گئی۔ اور دونوں قلبی دوست ایک دوسرے کالے کوسوں دُور ہو گئے

عام طور سے ریاض چار پانچ نشستوں میں آخری رنگ و روغن بھر کر ایک شبیہ مکمل کر لیا کرتا تھا مگر آج غیر معمولی طور پر صرف پندرہ بیس منٹ میں ایک متبسم دوشیزہ اُس کے تصویر کے فریم میں انتہائی مُلکوتی شان کے ساتھ موجود تھی۔ اُس کے کام کرنے والے (ایزل) سٹینڈ کے پیچھے ہمیشہ قدِ آدم آئینہ رکھا رہتا تاکہ تصویر بنوانے والا اُکتا نہ جائے۔ اور اُس آئینے میں دیکھتا رہے۔ کہ اُس کی تصویر کس طرح بن رہی ہے اور مصوّری کے کتنے ارتقائی منازل طے کر چکی ہے۔

دوشیزہ زرّینہ آئینہ میں اپنی تصویر بنتی دیکھ رہی تھی۔ اور لحظہ بلحظہ اس کی آنکھوں کی چمک۔ رُخساروں اور لبوں کی سُرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ وُہ خوش تھی۔ اور واقعی خوش تھی۔ وُہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی۔ کہ اُس کی تصویر اتنی اچھّی بن رہی ہے۔ جو صدیوں آرٹ کی دُنیا میں ایک بیش بہا اضافہ سمجھی جائے گی۔ اِس خیال کے آتے ہی اس نے ریاض کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں منت پذیری اور کمالِ فن کے اعتراف کے جذبات جھلک رہے تھے۔ لیکن اسے انتہائی تعجّب ہوُا۔ کہ مصوّر جو تھوڑے تھوڑے وقفے پر اُسے دیکھتا تھا۔ اب ایک اور ہی عالم میں بُت بنا کھڑا ہے۔ اُس کی نگاہیں تصویر میں جیسی جا رہی ہیں۔ اور اُس کے ہاتھ کا مو قلم آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہے۔ وُہ اب زرّینہ کی طرف مطلق نہیں دیکھتا۔ حالانکہ ایک مصوّر کے لئے ضروری ہے۔ کہ جس کی تصویر بنا رہا ہو۔ اُسے بار بار دیکھ کر تصویر کا اصل سے مقابلہ کرتا جائے۔

زرّینہ مصوّر کے انہماک اور محویّت پر اور زیادہ مسرور ہوئی۔ کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ کسی شہکارِ مصوّری کے لئے یہ استغراق بہترین ضمانت ہے۔ اس نے ایک بار پھر اطمینان کا سانس لے کر آئینے میں دیکھنا شروع کیا۔ لیکن یکایک اس کی حالت متغیّر ہو گئی۔ اس پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ کیونکہ اب مصوّر جو تصویر بنا رہا تھا۔ وُہ زرّینہ نہ تھی۔ بلکہ اُسی کے نرم و نازک اور گداز جسم پر مردانہ خدوخال نشو و نما پا رہے تھے۔ وُہ انگشت بدنداں تھی۔ پہلی تصویر کے آثار مٹ چکے تھے۔ اور پردے پر ایک دوشیزہ کی بجائے ایک حسین و جمیل نوجوان مُسکرا رہا تھا۔ ریاض آخری بار مو قلم کو پردے پر جنبش دے کر پیچھے ہٹا۔ تو زرّینہ نے بکمال تعجّب اس سے پُوچھا۔

زرّینہ۔ آپ کس کی تصویر بنا رہے ہیں؟

ریاض۔ (بیخودی اور استغنا کے عالم میں) آپ کی۔

زرّینہ۔ میری!!

ریاض۔ نہیں۔ عزیز کی شاید اسی کی ہے!۔

زرّینہ۔ کون عزیز۔

ریاض۔ میرا ایک بھائی اور دوست ہے۔

زرّینہ۔ وُہ تو آپ کے سامنے نہیں تھا۔

ریاض۔ ہاں شاید میرے سامنے تو آپ تھیں۔

زرّینہ۔ عزیز کی کوئی اور تصویر بھی آپ کے پاس ہے۔

ریاض۔ ہاں بہت سی تصویریں ہیں۔ مختلف حالتوں کی۔ مختلف وقتوں کی۔ میرے کام کے مختلف نمونے (یکایک چونک کر) کیا آپ دیکھیں گی؟

زرّینہ۔ ہاں۔ ہاں۔ ضرور۔

ریاض۔ پھر آئیے۔ دوسرے کمرے میں تشریف لائیے۔

اُس کمرے میں ہر طرف عزیز کی تصویریں آویزاں تھیں۔ نادر و عجیب۔ آبی اور روغنی رنگوں میں پنسل اور کوئلے میں۔ ہر طرف عزیز ہی عزیز تھا۔ زرّینہ بغور ان تصاویر کو دیکھتی رہی پھر دونوں پہلے کمرے میں واپس آگئے۔ زرّینہ نے کہا۔ گو میں نے اپنی تصویر کے لئے آپ کو آڈر دیا تھا۔ مگر میں اُسی قیمت پر یہ تصویر لے جاؤں گی۔ مجھے آرٹ کا یہ نمونہ بہت پسند ہے۔ ...... ہاں تو عزیز کا پتہ کیا ہے۔ ریاض نے اسی حالت میں عزیز کا پتہ بتایا۔ زرّینہ نے وہ تصویر اٹھائی۔ باہر گئی اور اسے اپنی موٹر میں رکھ کر کہیں چلدی۔ ریاض ٹکٹکی باندھے اِدھر دیکھتا رہا۔

ریاض ایک مخصوص ذوق کا آدمی تھا۔ وُہ صرف عزیز کی صحبت میں خوش رہتا تھا۔ جو اُسے ایسے افسانے سُناتا جن میں محض تصویروں ہی کا ذکر ہوتا۔ اُس کے لئے دُوسرے افراد میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اِس لئے جب عزیز اس کے پاس نہ ہوتا تو وُہ بیشتر اپنے مصوّری کے کام میں مصروف رہتا یا اپنا وقت مطالعہ اور سیر میں گذارتا۔ لیکن اَب کے عزیز کی طویل مفارقت نے اس کی تمام مسرتوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس پر ایک عجیب جنون کی کیفیّت طاری تھی۔ ایک روز ریاض بہت سُست اور ملول تھا۔ اور کرسی پر خاموش بیٹھا تھا۔ کہ چٹھی رساں آیا۔ اور اُس نے عزیز کا ایک خط دیا۔ جس میں علاوہ اَور دلچسپ باتوں کے عزیز نے ریاض پر چند جُرم عائد کئے تھے۔ اور اُن کی سزا بھی خود ہی تجویز کر دی تھی۔

پہلا جرم۔ لوگوں کو ان کی تصویریں بنا کر دینے کے بجائے دُوسروں کی تصویریں دے کر پیسے بٹورنا۔

دوسرا جرم۔ ایک شریف پردیسی آدمی کو مجبور کرنا کہ وُہ ایک بھولی بھالی خوبصورت دوشیزہ کو اپنی بیوی بنالے۔

تیسرا جرم۔ ایک دوست کی تصویریں بیچ کر روزی کمانا۔

چوتھا جرم۔ لوگوں کو موقع دینا۔ کہ وُہ کسی غیر کی تصویر بغل میں لئے مارے مارے پھریں۔ اور پریشان ہوں:۔

ان جرایم کی سزا یہ تجویز کی گئی تھی

(۱) جتنا وقت ریاض سے ملنے میں صرف کیا جاتا تھا۔ اس میں اب ایک اَور شخص کو شریک کیا جائیگا

(۲) جس تصویر میں ریاض ناکام ہوُا ہے۔ وہی دوبارہ اس سے بنوائی جائے گی۔ بلکہ زرّینہ کی چار پانچ تصویریں مختلف حالتوں میں اسے بنانی پڑیں گی جن کی اب کوئی قیمت ادا نہ کی جائے گی۔

(۳) آئندہ عزیز کوئی تصویر اپنی نہ بنوائے گا۔ نہ اس کی اجازت دے گا۔

(۴) زرّینہ اور عزیز کے خدوخال مل کر جتنے نئے نمونے پیدا کر سکیں۔ سب کی تصویریں ریاض کو مفت بنانی پڑیں گی۔

اِس کے بعد درج تھا۔ کہ عزیز عنقریب زرّینہ کی معیّت میں پہنچے گا۔ اور اپنے گھر جانے سے پہلے آٹھ روز ریاض کے ہاں قیام کرے گا۔ اَور اب کے ریاض کو ایک کی بجائے دو کے لئے پُرتکلّف دعوت کا انتظام کرنا پڑے گا۔

خط پڑھ کر ریاض مُسکرا دیا۔ اور سوچتا رہا کہ یہ افسانہ بھی نہایت دلچسپ رہا۔ مصوّر کا یہ استغراق رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جائے گا:۔

"حیف ہے اُس قوم پر جس میں قوّت عمل مفقود ہے۔ اور جس کے افراد حوصلہ مند سینوں اور ولولہ خیز دلوں سے محروم ہیں" * (برک)

"صبح کا بحرِ خموشی طیور کی ننھی امواج نغمہ میں تبدیل ہوگیا تھا، پھول کنار راہ میں مسرور تھے، اور دولت زر بادلوں کے شگاف میں پھیلی پڑتی تھی" *

(ٹیگور)

لباس اور صحت

(جناب نصیر الدین احمد بی اے)

مجھے خوب معلوم ہے کہ قومی لباس سے کیا مراد ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہر علاقے کا لباس علیحدہ ہوتا ہے لیکن پنجاب کی کیفیت بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں جسم کے ہر حصّے کے لئے مختلف قسم کے لباس ہیں۔ مثلاً سر پر ٹوپی بھی پہنی جاتی ہے اور پگڑی بھی۔ پھر یہ ضروری نہیں کہ پگڑی کس رنگ کی ہو، ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق چھوٹی یا بڑی پگڑی باندھے۔ شملہ رکھے یا نہ رکھے۔ پگڑی کے نیچے کلاہ پہنے نہ پہنے اُسے کلی اختیار حاصل ہے۔ اگر کوئی غیر پنجابی ہے تو اس کے لئے بھی کوئی خاص ٹوپی پہننا ضروری نہیں۔ گاندھی، افغانی، ترکی، فلٹ۔ غرض کہ ہر قسم کی پوشاک کی اجازت ہے ان حالات میں سر کے لئے کسی قومی لباس کی توقع رکھنا بالکل بے سود ہے۔ جسم کے نچلے حصّے کے لئے بھی کوئی خاص لباس مقرر نہیں۔ لوگ مختلف قسم کے زیر جامے پہنتے ہیں *

یہاں مجھے انواع و اقسام کے کپڑوں کے متعلق بحث کرنا منظور نہیں۔ مجھے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ انسانی صحت کے قائم رکھنے کے لئے کس قسم کا لباس مفید ثابت ہو سکتا ہے *

ہندوستان میں لوگ عموماً ریشمی سوتی یا اونی کپڑے پہنتے ہیں۔ روئی یہاں بکثرت پیدا ہوتی۔ روئی یہاں ارزاں ہے، یہی وجہ ہے کہ دوسرے کپڑوں کی نسبت سوتی کپڑوں کا استعمال یہاں زیادہ ہوتا ہے۔ ریشمی گران قیمت ہیں۔ عوام کو میسر نہیں آسکتے۔ سرد علاقوں میں اونی کپڑوں کی بیحد ضرورت ہے لیکن پشم نسبتاً مہنگی ہے *

ہر قسم کے کپڑے میں کوئی خاص خصوصیت ہوتی ہے۔ سوتی کپڑے کو لیجئے۔ اس میں سرایت حرارت خوب ہوتی ہے، لیکن غیر جاذب ہے ریشمی کپڑا بھی غیر جاذب ہے، لیکن سرائیت حرارت کے اعتبار سے کچھ اچھا نہیں، پشم ہر قسم کی نمی اور رطوبت کو جذب کر لیتی ہے جسم کو خوب گرم رکھتی ہے۔ لیکن سرایت حرارت کے اعتبار سے یہ بھی اچھی نہیں اس کے بنے ہوئے کپڑے زیادہ گتھے ہوئے نہیں ہوتے جس کے باعث ہوا ان میں سرایت کر جاتی ہے اور اندرونی گرمی کو زائل ہونے سے روکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اونی کپڑے جسم کو سردی سے بچاتے ہیں۔ نازک اندام لوگوں کیلئے شائد یہ قدرے تکلیف دہ ہو، لیکن اس کا کھردرا پن ہی ایک ایسی چیز ہے جو اس کپڑے کو گرم ہونے کے اعتبار سے زیادہ قیمتی بنا دیتی ہے جسم سے جو غلاظت یا پسینہ وغیرہ بہتا ہے وہ اس میں جذب ہو جاتا ہے۔ جس کے باعث اس کپڑے کو بار بار
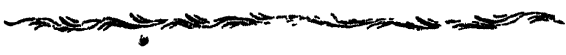
دھونے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے +

بنائین (زیر جامے) کے لئے سوتی کپڑا زیادہ موزوں نہیں۔ ورزش کے بعد عموماً جسم سے پسینہ بہنے لگتا ہے اور جسم سرد ہو جاتا ہے۔ کپڑا اگر چھدرا اور کھُردرا ہو تو جسم کو سردی لگنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ ململ اور اسی قسم کے دوسرے ملائم کپڑے جسم کو گرم رکھنے کے حق میں مفید نہیں ہیں۔ لیکن اگر یہی کپڑے ہاتھ کے کاتے ہوئے سوت سے قدرے چھدرے بنوائے جائیں تو مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے چھوٹے سوراخوں میں ہوا بھر جاتی ہے۔ جو اندرونی گرمی کو زائل نہیں ہونے دیتی۔ نیز اس قسم کے کپڑے ادنیٰ کپڑوں کی نسبت ملائم ہونے کے اعتبار سے زیادہ آرام دہ ہوتے ہیں۔ ہاتھ کا بنا ہوا گاڑھا ایک تو جسم کو سردی سے بچاتا ہے۔ دوسرے غیر جاذب ہونے کے سبب جسم کی غلاظت اس میں جذب نہیں ہو سکتی۔ ریشم پشیم کی نسبت زیادہ مفید ہے یہ کم سکڑتا ہے اور نظافت کے اعتبار سے بھی بدرجہا بہتر ہے +

موسم گرما میں کوٹ وغیرہ کی قسم کے کپڑے سفید یا ہلکے رنگ کے ہونے چاہئیں۔ کپاسی اور انگوری رنگ زیادہ موزوں ہیں لیکن موسم سرما میں گہرے یا سیاہ رنگ کے ہونے چاہئیں، کیونکہ ان میں حرارت آفتاب اچھی طرح سے جذب ہو سکتی ہے +

کپڑے پہننے کا مقصد جسم کو سردی کی شدت سے بچانا اور گرم رکھنا ہے۔ لباس میں یہ خوبی ہونی چاہیئے۔ کہ اس کے پہننے سے چلنے پھرنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہو اور خون کا دَورہ باقاعدہ ہوتا رہے۔ سر کیلئے لباس نہایت ہلکا اور سوراخدار ہونا چاہیئے تاکہ گرمی کے موسم میں سر کو ہوا لگ سکے۔ پگڑی عموماً بھاری ہوتی ہے۔ اِس کے باندھنے سے بال اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور سر کی جلد میں سخت درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ اگر بال باریک کترے ہوئے ہوں۔ یا سکھوں کی طرح لمبے لمبے ہوں تو پھر کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ گرمیوں میں پگڑی پسینے سے تر ہو کر سر کو سورج کی گرمی سے تو یقیناً بچاتی ہے۔ لیکن آنکھیں اور پیشانی گرمی سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ سکھوں کے لئے پگڑی واقعی ایک مفید چیز ہے۔ اِس سے ان کے بال محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن غیر سکھ اصحاب کو اس کے پہننے سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا سردی کے موسم میں یہ سر کو خوب گرم رکھتی ہے۔ لیکن سونے کے وقت بسا اوقات سر کو سردی لگ جانے کا احتمال ہے بنگالیوں کی طرح ننگے سر رہنا اچھا فیشن ہے۔ لیکن بااین ہمہ موسم گرما میں چھتری یا تنکوں کی ٹوپی کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ کپڑے کی ٹوپی سوراخدار ہونے کی وجہ سے سر کو سورج کی گرمی سے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن اس سے چہرے اور آنکھوں کو سورج کی گرمی سے بچایا نہیں جا سکتا۔ تنگ کالر کا استعمال گلے کے لئے سخت مضر ہے۔ اِس سے گلے کی چھوٹی چھوٹی رگوں میں خون کا دَورہ باقاعدہ نہیں ہو سکتا۔ موسم گرما کے لئے دھوتی اور قمیص یا ساڑھی اچھا ہلکا پھلکا لباس ہے

لیکن سردیوں کے لئے یہ لباس اچھا نہیں۔ وہ لوگ جو دھوتی باندھنے کے عادی ہیں۔ سردیوں کے موسم میں انہیں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں۔ ٹانگیں سردی سے سُن ہو جاتی ہیں اور اُن پر سُرخ سُرخ نشان جن میں ہر وقت سوزش سی رہتی ہے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ غرض کہ سخت تکلیف ہوتی ہے۔ نیز دھوتی کے باندھنے سے نزلے اور زکام کے ہو جانے کا بہت خدشہ ہے۔ خاص کر بلغمی مزاج کے لوگوں کو سردیوں میں ہرگز دھوتی نہیں باندھنی چاہیئے۔ نیز بچوں . . . کے لئے اس امر کی احتیاط نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم کو موسم سرما میں گرم رکھیں۔ کیونکہ زندگی کے ان مرحلوں میں طبیعت گرمی اور سردی سے فوراً متاثر ہو جاتی ہے اور نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ بچوں کے بازوؤں اور پاؤں کو سردیوں کے موسم میں ننگا رکھنا خطرے سے خالی نہیں، بچوں کے جسم پر عمر کے لحاظ سے نوجوانوں کی نسبت زیادہ گوشت ہوتا ہے اور اُن کا خون زیادہ تیزی سے دورہ کرتا ہے۔ انہیں سردی لگ جانے کا بہت امکان ہے۔ پنجاب میں بڑے بڑے پگڑ باندھنے کا خاص رواج ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ ٹانگیں تقریباً ننگی رکھی جاتی ہیں۔ اس قسم کا لباس از روئے صحت نہایت ضرر رساں ہے۔ موسم گرما میں پاؤں کے لئے چپلیاں نہایت اچھی چیز ہیں۔ بوٹ پہننے سے گرمی محسوس ہوتی ہے پسینہ بہ بہ کر پاؤں سے ایک خاص قسم کی بدبو آنے لگتی ہے۔ بسا اوقات انگلیوں کا درمیانی حصہ پھٹ جاتا ہے اور سخت تکلیف ہوتی ہے، البتہ موسم سرما کے لئے بوٹ نہایت مفید چیز ہے۔ پاؤں گرم اور صاف رہتے ہیں۔ بوٹ اگر پاؤں سے قدرے بڑے یا چھوٹے ہوں تو کئی قسم کے عوارض لاحق ہو جاتے ہیں۔ انگلیاں کسی قدر خمیدہ ہو جاتی ہیں۔ اور ان میں ٹینٹ پڑ جاتے ہیں۔ ناخن اندر کی طرف مڑ جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے بوٹ ہرگز نہیں خریدنے چاہئیں۔ ننگے پاؤں چلنے پھرنے کی عادت سخت خطرناک ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ پتھر کی تیز نوک۔ کیل یا کانٹا چبھ جانے سے خون زہر آلود ہو گیا ہے یا کسی زہریلے کیڑے مکوڑے کے کاٹ کھانے سے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ پنجاب کے بعض علاقوں میں ایک دھاگے کی قسم کا باریک کیڑا پایا جاتا ہے، یہ پاؤں یا لات کی جلد سے جسم کی باریک رگوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور وہاں نشو و نما حاصل کرتا رہتا ہے۔ جب تک یہ جسم کے اندر رہتا ہے۔ مریض کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور اس کے لئے زندگی دو بھر ہو جاتی ہے یہ کیڑا مصر اور دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی پایا جاتا ہے۔

پتلون پاجامے کی نسبت نہایت آرامدہ لباس ہے، پاجامے کو کمر بند سے باندھنا پڑتا ہے اس سے اکثر عورتوں اور مردوں کو فتق کی بیماری ہو جاتی ہے۔ لیکن پتلون کے لئے گیلس استعمال کئے جاتے ہیں۔ جس سے کمر کو کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچتا

عورت کے لئے ساڑھی زیادہ خوبصورت لباس ہے۔ لیکن اس کو پہن کر پھرتی سے چلنا پھرنا محال ہو جاتا ہے۔

شلوار اور قمیص نہایت اچھا لباس ہے۔ اس سے دوڑنے بھاگنے اچھلنے کودنے اور گھر کے کام کاج کرنے میں کوئی دقت

محسوس نہیں ہوتی۔ دوپٹہ جو عورت کے لئے نہایت ہی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ پھرتی سے کام کاج کرنے میں مانع آتا ہے بار بار سر سے کھسک جاتا ہے جس کے باعث ہر وقت احتیاط رکھنی پڑتی ہے۔ برقعہ اور چادر کے اوڑھنے سے عورت تازہ ہوا سے محروم رہتی ہے۔ اس کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس لباس میں اصلاح کی بہت کچھ ضرورت ہے +

اِس ملک میں کچھ تو قدامت پسندی اور دیرینہ رسوم میں گرفتار ہونے کے باعث اور کچھ عوام کی جہالت اور غربت کے باعث حفظانِ صحت کے قوانین پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ صورت حالات دیر تک نہیں رہے گی اور ہم بہت جلد اپنے ملک کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایسا لباس تجویز کریں گے۔ جو یقیناً ہمارے ملک کی آب و ہوا اور ضروریات کے مطابق ہوگا +

محسوسات

(جناب عندلیب شادانی۔ ایم۔ اے)

کیا کروں میں جو درِ سعی طلب، باز نہ ہو
ڈر ہے کچھ اور گماں دِل شکنِ ناز نہ ہو

میں تو مر جاؤں مگر رازِ محبت نہ کھلے
کاش تیری خلشِ دل تری غماز نہ ہو

آج دھندلی نظر آتی ہے خیالی تصویر
رحم کر یاس، بس اب تو اثر انداز نہ ہو

غمِ دُوری، ترے اندوہ کا غم، پھر یہ خلش
کہ یہ احساس کہیں تیرا بھی دمساز نہ ہو

کیا محبت کو مری تم نے ہوس سمجھا ہے
کہ ہوئی یاس تو سر گرمئِ آغاز نہ ہو

دِل کا خون آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اسکا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو

شکر یہ پرسشِ غم کا، مگر اصرار نہ کر
پوچھنے والے، یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو

ہو کے مایوس بھی ہم جیتے ہیں، ہاں جیتے ہیں
وائے وہ زیست، اجل پہ بھی جسے ناز نہ ہو

ناز کو میں نے بنایا ہے پرستارِ نیاز
عندلیب اپنی محبت پہ مجھے ناز نہ ہو؟

دُنیائے اُردو

اُردو، حیدر آباد دکن

حسب معمول مضامین اور نظموں کا معیار بلند ہے۔ تمام مضامین محنت اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں جناب محمد مجیب صاحب بی، اے آکسن کا مضمون "روسی ادب" جامع اور پڑھنے کے لائق ہے۔ مجیب صاحب کا طرزِ نگارش اور اسلوب بیان بھی نہایت دلکش ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ لائق مضمون نگار اگر توجہ کریں، تو کامیاب افسانہ نگار ہو سکتے ہیں، ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا مضمون "مقدمہ فاؤسٹ" مضمون نگار کے فلسفیانہ ذوق، اور وسعت مطالعہ کا پتہ دیتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میدان کے رہرو بھی ہیں اور رہنما بھی۔

جامعہ (دہلی)

ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی استاذ جامعہ عثمانیہ کا مضمون "تعلیم اور علم مرفہ الحالی" اچھا مضمون ہے اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر دنیا ترقی کی خواہاں ہے، یعنی یہ کہ لوگوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ مہذب، شائستہ اور مرفہ الحال بنانا چاہتی ہے تو محض نظری مدارس کی تعلیم سے فیض نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لئے لابدی ہے کہ ایسی عمرانی فضا پیدا کی جائے جو تربیت بخش ہو اور لڑکوں، لڑکیوں بالغوں، کم سنوں، بوڑھوں، بچوں، امیروں، غریبوں، سب کو اپنی فضا سے ہر وقت اور ہر موقع پر متاثر کرتی رہے۔ ساتھ ہی حکومت کے زیرِ سرپرستی معاشی زندگی میں تازگی پیدا کر کے اور لوگوں کی معاشی حالت میں اصلاح کر کے تہذیب و شائستگی کے لئے بنیاد قائم کی جائے۔

"غزل گوئی اور نظریہ الہام" محمد حسین صاحب آوہب ایم، اے۔ بی۔ ای ٹی، کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے یہ موضوع نہایت اہم اور بہت زیادہ تفصیل کا محتاج ہے۔ یہی سبب ہے کہ محمد حسین صاحب کی کوشش تشنۂ تکمیل رہ گئی ہے۔ مضمون کو اکثر مواقع پر فلسفہ کی اصطلاحات سے گنجلک بنا دیا گیا ہے، بعض ضروری مسائل پر بالکل سرسری تبصرہ کیا گیا ہے۔ "آمد" اور "آورد" کی بحث میں بہت زیادہ عجلت سے کام لیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر "کسب" اور "وہب" عقل و ادراک اور وجدان میں کوئی مابہ الامتیاز فرق ہے تو یقیناً آمد اور آورد میں بھی فرق ہے۔ "اضطراری" اور "اختیاری" الہام کا فرق بھی کچھ یوں ہی سا معلوم ہوتا ہے۔

ماہ اگست کے "جامعہ" میں مضامین کم ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہر ماہ رسالہ "جامعہ" میں فلسفہ، اسلام یا تاریخ اسلام پر کوئی محققانہ مضمون ضرور ہونا چاہیئے۔ "جامعہ" میں اب تک یہ کمی رہی ہے

"زمانہ" کانپور

ٹھاکر جے آر رائے صاحب (لاہور) کا مضمون "محرکات کامیابی" اچھا ہے، اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ نظموں کا انتخاب خاص طور سے مستحقِ تحسین ہے۔

کامیابی (دہلی)

مضامین دلچسپ اور عامۃ الناس کے لئے خاص طور سے نہایت مفید ہیں۔ مولوی نورالرحمٰن صاحب بی، اے کا مضمون "نوجوان اور مذہب" توجہ کے قابل ہے۔ مولوی نورالرحمٰن صاحب فرماتے ہیں :۔

"حقیقت یہ ہے کہ ہر عقیدہ کو مقبولِ عام کی سند اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ اُس پر عمل کرنیوالوں اور اُس کے ماننے والوں کی جماعت اپنے عادات و خصائل میں قابلِ تعریف اور دنیا میں کامیاب نظر آئے۔"

یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ عقیدہ کے قدر کی تعیین محض اعتباری اور اضافی ہو سکتی ہے۔ "عقیدۂ محض" کوئی چیز نہیں ہے؟ یہ مسئلہ ہماری خاص توجہ کا مستحق ہے۔

اِس کے بعد لائق مضمون نگار رقمطراز ہیں! :۔

"علماء نے اگر مدارس کی چہار دیواری میں فقہ اور مسائل فقہ کی ورق گردانی کو ضروری سمجھا اور جدید حالات و خیالات اور ترقی و اصلاح کی نئی تحریکوں سے خبردار نہ ہوئے، تو غالباً اُن کو یہ حق نہیں پہنچتا، کہ وہ عام لوگوں .... کو مذہب کا شیفتہ و دلدادہ پائیں.... .... (انہیں چاہیئے کہ) وہ مذہب کو عمل و سرگرمی سے ہٹا کر معطل و بیکار ثابت نہ ہونے دیں اور آج جس بیدردی سے مذہب کے نام کی بیحرمتی ہو رہی ہے اس کو روک سکیں"

علماء سے جتنی بھی شکایت کی جائے بجا ہے، مگر اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ علماء کرام کو مذہبی معاملات کا واحد اجارہ دار بنا دیا جائے۔ اگر آج نوجوانوں میں بے یقینی راہی، اور گمراہی پھیل رہی ہے، تو "جدیدیوں" اور "متنور" طبقہ کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اس کے انسداد کی طرف فوری توجہ کرے۔ یہ کیا ضروری کہ خود تو کچھ نہ کیا جائے اور علماء کو جلی کٹی سنا دی جائے۔ ہم علماء کے موجودہ جمود کے خود بھی بہت شاکی ہیں۔ مگر ہم یہ نہیں سمجھتے کہ روشن خیال طبقہ کی تمام ذمہ داریاں علماء کی طرف منتقل ہو گئی ہیں۔

"کامیابی" کے "ہمارے خیالات" بیشتر اخباری رنگ کے ہوتے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ اِن میں متانت اور سنجیدگی کو اور زیادہ اہمیت دی جاتی۔

"دین و دنیا" (دہلی)

ہم سمجھتے ہیں کہ "کامیابی" اور "دین و دنیا" جناب خواجہ حسن نظامی صاحب کی سرپرستی میں نکلتے ہیں یا خواجہ صاحب کا اِن رسائل سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان دونوں رسائل کی پالیسی میں بنیادی اختلاف کیوں ہے "کامیابی" موجودہ تحریک کا حامی ہے۔ اور "دین و دنیا" مخالف۔ امید ہے کہ ہماری غلط فہمی رفع کر دی جائے گی!

"دین و دنیا" میں ایک مستقل عنوان "گدگدیاں" بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس عنوان کے ذیل میں لطف و ظرائف دیئے جاتے ہیں۔ پیش نظر نمبر میں اس قسم کے لطائف بھی درج کئے گئے ہیں:-

"خوبصورت نرس:- ڈاکٹر صاحب جب میں مریض کی نبض پر ہاتھ رکھتی ہوں تو نبض میں غیر معمولی سرعت پیدا ہو جاتی ہے اس کا کیا علاج

ڈاکٹر!- مریض کی آنکھوں پر پٹی باندھو یا اپنے چہرہ پر نقاب ڈالو"

ممکن ہو کسی خاص نقطۂ نظر سے اِن "گدگدیوں" کو جائز قرار دیا جاسکے۔ مگر "دین و دنیا" کے نام سے جو سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ وہ اس "زندہ دلی" کی کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے؟

اورینٹل کالج میگزین "لاہور"

اگست کا میگزین ہمارے سامنے ہے۔ مضامین ٹھوس جامع، اور کافی محنت اور عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جس رسالہ کو جناب حافظ محمود شیرانی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال ایم اے، پی۔ ایچ، ڈی اور پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم جیسے مستند اہلِ قلم کی علمی اعانت حاصل ہو اُس کی معنوی خوبیاں بالکل مسلم ہو جاتی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ رسالہ کی کتابت اور طباعت کی طرف قدرے بے توجہی برتی جاتی ہے۔

مولوی (دہلی) کا "رسول نمبر"

رسالہ "مولوی" کا "رسول نمبر" معنوی محاسن کا ایک قابلقدر مجموعہ ہے، رسول نمبر کی ظاہری وضع و قطع ایک مولوی ہی کی شایانِ شان ہے مضمون نگاروں میں مولٰنا سید سلیمان ندوی، مولٰنا عبدالرزاق ملیح آبادی ڈاکٹر سعید احمد، مولٰنا عزیز حسن بقائی، مولٰنا محی الدین قصوری کے نام نمایاں نظر آتے ہیں، مسز دیوی داس گاندھی (خلف اصغر مہاتما گاندھی) ڈاکٹر ستیہ پال، مسٹر تارا سنگھ، مسٹر بی، این، ساہنی (ایڈیٹر ہندوستان ٹائمز دہلی) لالہ دیش بندھو ڈائرکٹر "تیج" دہلی کے مضامین بھی بڑی کوشش سے حاصل کئے گئے ہیں ان غیر مسلم زعماء کی آراء پڑھنے کے لائق ہیں۔

تبصرے

تلاشِ حق - مترجمہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح حیات (my experiments with truth) کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی طرف سے دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ جامعہ ملیّہ مسلمانانِ ہند کی بالخصوص اور تمام ہندوستان کی بالعموم جو قابل قدر تعمیری و تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ وُہ محتاجِ بیان نہیں۔ اپنی زندگی کے ان مختصر ایّام میں اس نے اپنے افادی پہلو کے بیش بہا ثبوت فراہم کر دئے ہیں۔ اور دنیا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک بے مایۂ مگر اولو العزم جماعت دہلی کے ایک خاموش گوشہ میں بیٹھ کر اپنے خلوص اور قوت ارادی کی بنا پر وُہ کام کر سکتی ہے۔ جو جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اور جو کم سے کم ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے لئے تو قابلِ رشک ضرور ہے۔ اگر کوئی تعلیمی ادارہ اپنی تصانیف تراجم اور تعلیمی پیداوار پر فخر کر سکتا ہے۔ تو بلاشبہ جامعہ بھی بدرجہ اولیٰ اپنی تعلیمی و مُلکی خدمات پر ناز کر سکتی ہے۔

جامعہ کی طرف سے تاریخ۔ تفسیر۔ ادب۔ فلسفہ۔ معاشیات۔ تعلیم۔ سیاسیات۔ اسلامی تمدن و ثقافت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ وُہ یقیناً ادب اردو میں بے بہا اضافہ کرتی ہیں۔ "تلاش حق" بھی جامعہ کے سلسلہ تالیف و تصنیف کی اہم کڑی ہے۔ گاندھی جی کی یہ آپ بیتی دنیا بھر میں شہرت حاصل کر چکی ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور لاکھوں آدمی اسے پڑھ چکے ہیں۔ لیکن [illegible] اس کا ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ ہمیں مسرت ہے کہ جامعہ کے محترم استاذ ڈاکٹر عابد حسین کی [illegible] نے اس کمی کی تلافی کر دی محض یہ امر کہ ڈاکٹر عابد اس کتاب کے مترجم ہیں۔ اس کتاب کی ظاہری و باطنی محاسن کی کافی ضمانت ہے۔ تاریخ فلسفہ اسلام کے مترجم ہربرٹ اسپنسر اور دوسرے مشہور ماہرین تعلیم کی تصانیف کو اردو کے قالب میں نہایت کامیابی سے ڈھالنے والے نکتہ رس دماغ اور پردہ "عصمت" کے منصف، سے بجا طور پر یہ توقع قائم کی جا سکتی ہے۔ کہ گاندھی جی کی آپ بیتی کے ترجمہ میں بھی وہ بطریق احسن کامیاب ہُوا ہو گا۔

گاندھی جی خود انگریزی زبان میں ایک مخصوص اسلوب بیان اور طرز نگارش کے مالک ہیں

ان کی ہر تحریر نہایت سادہ، نہایت شستہ و رفتہ نہایت فصیح اور سلیس ہوتی ہو مگر اس کے ساتھ ہی ہر جملہ میں اسرار و معانی اور حقائق و معارف کا دریا موجیں مارتا ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک درویش عرفان و تزہد کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گیا ہے۔ اور اپنے سادہ، بے لوث، اور پر تاثیر الفاظ سے دنیا کے قلوب کو مسخر کر رہا ہے۔ ترجمہ میں تحریر کی ان خوبیوں کو باقی رکھنا، نہایت مشکل کام ہے۔ لیکن ڈاکٹر عابد مستحق مبارک باد ہیں۔ کہ وُہ اس اعتبار سے بھی بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ "تلاش حق" کے پڑھنے والے کو یہ نہیں معلوم ہوتا۔ کہ وُہ گاندھی جی کے طرز تکلّم اور طرز نگارش سے جس سے وہ آشنا ہے۔ بے تعلق کر دیا گیا یا دُور ہٹا دیا گیا ہے اور اس ترجمہ میں گاندھی جی کی نہیں بلکہ مترجم یا کسی دُوسرے شخص کی روح کارفرما ہے۔ ایک مترجم کی یقیناً یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔ کارڈینیل نیومین کے سامنے جب کوئی یہ اعتراض کرتا کہ انجیل مقدس کا یونانی و لاطینی زبان سے انگریزی میں ترجمہ ہونا ہی اس امر کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اُس کے حقیقی محاسن باقی نہیں رہے ہوں گے۔ تو وہ بہت خفا ہوتا اور کہتا کہ انجیل کے مترجم ٹنڈیل اور ویکلف کے سے صاحب سواد ماہرین فن تھے، اور انہیں مذاق سلیم اور وجدان صحیح سے بہرۂ وافر ملا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ گاندھی جی کے عقیدتمندان خاص کے اس "انجیل مقدس" کے لائق مترجم کے متعلق بھی ہندوستان کے ارباب ذوق کی یہی رائے ہوگی۔ ڈاکٹر عابد نے اس امر کا خاص طور سے خیال رکھا ہے۔ کہ ترجمہ کی زبان میں ثقالت نہ آنے پائے اور روزمرّہ کی زبان میں مفہوم ادا کر دیا جائے چنانچہ اس کوشش میں ڈاکٹر موصوف کو کسی قدر بیجا ہو گیا ہے +

نفس مضمون کے متعلق ہم تفصیل سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ مشرق میں "آپ بیتی" لکھنے کا دستور، مغرب کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ ایک انسان کے لئے یہ تقریباً ناممکن ہے۔ کہ وہ اپنے حالات زندگی پر بے لاگ تبصرہ کرے۔ اور اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کو الفاظ کے نقش و نگار میں چھپانے کی کوشش نہ کرے۔ ہم گاندھی جی کی حق گوئی اور صداقت شعاری کے معترف ہیں۔ مگر ہم انہیں پھر بھی انسان ہی سمجھتے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں ان کا انتہائی شرف یہ ہے۔ کہ وُہ ایک بڑے انسان ہیں گاندھی جی کو اپنی سیرت نگاری میں بعض جگہ ناکامی ہوئی ہے۔ مثلاً وُہ ایک جگہ تو یہ لکھتے ہیں۔ کہ میں نہایت شرمیلا لڑکا تھا۔ دو چار آدمیوں کے مجمع میں لب کشائی کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہر بات پر جھینپ جاتا تھا۔ اور نہایت بھولا تھا۔ اس کے بعد وُہ لندن پہنچتے ہیں اور ایک لندنی دوست انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وُہ گوشت ضرور کھائیں۔ اس کا جواب وُہ ان الفاظ میں دیتے ہیں

"آپ کے ہمدردانہ مشورہ کا شکریہ۔ لیکن میں اپنی ماں سے صدق دل سے وعدہ کر
چکا ہوں کہ گوشت کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ اس لئے میں اس کے کھانے کا خیال بھی دل میں
نہیں لا سکتا۔ اگر میں دیکھوں گا۔ کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ تو میں ہندوستان واپس چلا
جاؤنگا۔ مگر یہاں رہنے کے لئے گوشت کھانا قبول نہیں کرونگا"

یہ الفاظ ایک پختہ کار اور ہوشیار دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ کہ گاندھی جی
لندن جاکر جہاں دیدہ ہوگئے تھے چنانچہ ایک موقع پر ان کے ایک بزرگ دوست انہیں نصیحت کر
کرتے ہیں۔

"دوسروں کی چیزیں نہ چھیڑا کرو۔ پہلی ملاقات میں اس قسم کے سوال نہ کیا کرو۔ جیسے ہم
ہندوستان میں کرتے ہیں۔ چلا کر بات نہ کیا کرو۔ لوگوں سے گفتگو کرتے وقت انہیں "سر" نہ کہا
کرو۔ ... .. وغیرہ وغیرہ"

اس کے بعد فوراً گاندھی جی اپنے اس دوست کو جو انہیں گوشت کھانے کی ترغیب دیا کرتا تھا۔
یہ جواب دیتے ہیں۔

"مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ میں مانتا ہوں کہ گوشت کھانا ضروری ہے۔ مگر میں اپنا عہد نہیں
توڑ سکتا۔ اس میں بحث کی گنجائش نہیں۔ .. خدا کے لئے مجھے بیوقوف اور ضدی سمجھ کر
چھوڑ دیجئے۔ میں آپ کی محبت کی قدر کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ ہیں مجھے
یہ بھی معلوم ہے۔ کہ آپ میری ہمدردی کے سبب سے مجھ سے بار بار یہ بات کہتے ہیں۔ مگر میں
مجبور ہوں"

یقیناً کاٹھیاواڑ کے "ناگا ناتھ" کے یہ الفاظ ہمیں نہایت تعجب انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سیرت نگاری
کا بین تناقض ہے۔ گاندھی جی نے غیر محسوس طریق پر ان انقلابات کو جو ان کے ذہنی امیال و عواطف
میں ہوئے۔ نظر انداز کر دیا ہے۔ اور اس کا تفصیلی ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ بات نہایت ضروری تھی۔ جو
شخص کاٹھیاواڑ کے مشر سیلے گاندھی کا ذکر پڑھ رہا ہو۔ وہ یقیناً یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ کہ صرف دو سال
بعد یہی گاندھی لندن میں "نباتاتی مشرب کے حامیوں" کی ایک انجمن قائم کر لیتا ہے۔ گاندھی جی نے
اپنی ان لغزشوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کا ارتکاب ان سے نفسانی خواہشوں کی بدولت ہوا۔ اور
انہوں نے ہر موقع پر یہی لکھا ہے۔ کہ خدا کی مدد شامل حال رہی۔ اور وہ اپنی پاکدامنی کی رسوائی سے

بچگئے۔ ہم یہ نہیں کہتے۔ کہ یہ بات غلط ہوگی۔ مگر بہرحال یہ ایک غیر معمولی بات ضرور ہے۔ اسی طرح گاندھی جی نے کستورا بائی یعنی اپنی اہلیہ محترمہ سے تعلقات کی کشیدگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ میں ان سے خواہ مخواہ بدگمان تھا۔ اس مسئلہ میں انہیں زیادہ تفصیل سے کام لینا چاہیئے تھا۔ تاکہ نوجوانان وطن ان کی مثال سے سبق اندوز ہوتے۔ میاں بیوی کے تعلقات کی کشیدگی کی بڑی وجہ آج بھی یہی فرضی بدگمانیاں ہوا کرتی ہیں۔ ممکن ہے۔ گاندھی جی کی صاف گوئی سے اکثر لوگ عبرت حاصل کرتے۔

بہرحال۔ اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا۔ کہ یہ "آپ بیتی" عہد حاضر کے ایک بڑے انسان کے سچے تجربات زندگی پر مشتمل ہے۔ اس لیئے اس میں اہل نظر کو حقائق کا ایک بیش بہا گنجینہ ہاتھ لگ سکتا ہے گاندھی جی کے یہ اقوال رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔

"طالب حق کو خاک راہ سے بھی زیادہ خاکسار ہونا چاہیئے۔ دنیا خاک کو پیروں سے کچلتی ہے۔ لیکن طالب حق کو ایسی عاجزی اختیار کرنا چاہیئے۔ کہ خاک بھی اسے کچل سکے تب ہی اس کو حق کی جھلک دکھائی دے گی"۔

"سچی دوستی روحانی اتحاد کا نام ہے۔ جو اس دنیا میں بہت کم ہوتا ہے۔ صرف انہی لوگوں میں جن کی طبیعت ایک سی ہو۔ دوستی پوری طرح مکمل اور پائدار ہوسکتی ہے۔ دوستوں میں ہر ایک کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ اس لیئے دوستی میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے میری رائے میں کسی ایک شخص سے یکجان و دوقالب ہو جانے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان پر بہ نسبت نیکی کے بدی کا اثر پڑتا ہے۔ اور جو شخص خدا کا دوست ہونا چاہتا ہے۔ اُسے لازم ہے کہ یا تو اکیلا رہے یا ساری دنیا سے دوستی کرے"۔

"گناہ کا پُورا اعتراف اور آئندہ اس سے باز رہنے کا عہد ایسے شخص کے سامنے جو اس کا اہل ہے۔ توبہ کی خالص ترین صورت ہے"۔

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ اس نوع کے بہت سے زریں اقوال اس "آپ بیتی" میں مل سکتے ہیں تلاش حق کی دونوں جلدوں کی قیمت صرف دو روپیہ ہے۔ کتابت نہایت اچھی ہے۔ مگر کتابت کے اغلاط کافی ہیں۔ مصحح کو زیادہ توجہ کرنا چاہیئے تھی۔ کاغذ بڑھیا لگایا گیا ہے۔ جلد بھی انگریزی کتابوں کی طرح سادہ اور ناشر کے حسن مذاق پر دال ہے۔ ملنے کا پتہ۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ قرولباغ دھلی

چند بہترین کتابیں

زیر ادارت

مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے - پی ایچ ڈی

یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جو تقریباً سات سال سے برابر شائع ہو رہا ہے اور اپنے بلند پایہ علمی مضامین کے باعث ملک میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے "جامعہ" کے مضمون نگاروں میں ہندوستان اور یورپ کے مشہور انشاء پرداز شامل ہیں جن میں سے بعض کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں ان تمام حضرات کے مضامین ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئے ہیں:-

پروفیسر فریڈرش مائینکے (برلین)
مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی
مولانا سید سلیمان صاحب ندوی
یوسف حسین خانصاحب بی اے (جامعہ) مقیم پیرس
محمد مجیب صاحب - بی اے (آکسن)

ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب پی - ایچ - ڈی
ملک اسلم خان صاحب - بی اے (کیمبرج)
ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم اے پی ایچ ڈی
زبید احمد صاحب بی اے (لندن)
سجاد ظہیر صاحب بی اے (آکسن)

رسالہ کی خوبیوں کا اندازہ نمونہ دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے جو صرف ایک کارڈ لکھنے پر ارسال کیا جاتا ہے - البتہ تازہ پرچہ ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے - رسالہ کی قیمت پانچ روپے سالانہ ہے - اور اراکین اکادمی کی خدمت میں مفت پیش کیا جاتا ہے - مفصل کیفیت خط و کتابت سے معلوم کیجئے -

المشتہر: منیجر رسالہ "جامعہ" دہلی

ایڈیٹر

منشی کنہیا لال

ایم اے ایل ایل بی

ایڈوکیٹ

ہندوستان کا سب سے زیادہ مشہور رسالہ

"چاند" کا اسپیشل نمبر

ایڈیٹر نمبر

چندہ

سالانہ تین روپے

مستقل خریداروں کو

مُفت

جو نومبر دسمبر کا یکجائی نمبر ہوگا اور جس میں سو سے زائد ایڈیٹر صاحبان کے شاہکار قلم شائع ہوئے ہیں حجم ۴۰۰ صفحات

صدہا رنگین اور سادے تصاویر اور کارٹون

مختصر فہرست مضامین

- مضمون - آنریبل جسٹس سر عبدالقادر، سابق ایڈیٹر مخزن لاہور

۱- مضمون - مولانا عبدالحق، ایڈیٹر "اردو" اورنگ آباد دکن

۲- نظم - حضرت بہار، ایڈیٹر "معیار" لکھنو

۴- غزل - جناب ظفر ہاشمی، ایڈیٹر "چمنستان" لاہور

۵- نظم - ڈاکٹر اعظم کریوی، سابق ایڈیٹر "اکبر" الہ آباد

۶- غزل و نظم - ایڈیٹر صاحبان رسالہ "جام جہاں نما" لکھنو

۷- مضمون - لالہ رام لال ورما ایڈیٹر روزانہ "تیج" دہلی

۰- نظم - جناب طالب علی، سابق ایڈیٹر "اکبر" الہ آباد

۹- مضمون - پروفیسر علم الدین سالک سابق ایڈیٹر "امام" "سوراج" لاہور

۱- نظم - جناب ساغر نظامی، ایڈیٹر رسالہ "پیمانہ" علیگڈھ

۱- مضمون - جناب فہیم الدین نوری، ایڈیٹر "الامان" (روزانہ) دہلی

۱۱- رباعیات - مرزا یگانہ لکھنوی، سابق ایڈیٹر "اودھ اخبار" لکھنو

۱۳- نظم - حکیم آشفتہ صاحب ایڈیٹر رسالہ "مبصر" لکھنو

۱۴- افسانہ - جناب عزیز حسین بقائی ایڈیٹر رسالہ "پیشوا" دہلی

۱۵- نظم - مولانا سیماب اکبرآبادی، ایڈیٹر "تاج" آگرہ

۱۶- افسانہ - جناب واحدی، ایڈیٹر رسالہ "نظام المشائخ" دہلی

۱۷- نظم - جناب اختر شیرانی، ایڈیٹر "خیالستان" لاہور

۱۸- غزل - ایڈیٹر صاحب رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور

۱۹- نظم - جناب حیرت ایڈیٹر رسالہ "سرگذشت" لاہور

۲۰- نظم - جناب سراج لکھنوی رکن ادارہ (اعزازی) رسالہ "مبصر" لکھنو

۲۱- افسانہ - جناب عشرت رحمانی ایڈیٹر "نیرنگ" دہلی

۲۲- نظم - جناب اکبر حیدری، ڈائرکٹر "نیرنگ" دہلی

۲۳- افسانہ - جناب سعید ایڈیٹر صاحب رسالہ "کامیابی" دہلی

مفصل کیفیت کے لئے "چاند" الہ آباد سے خط و کتابت کیجیے

کیسٹائل پریس لاہور میں باہتمام میاں ظہورالدین پرنٹر چھپا اور میاں ظہورالدین مالک و ایڈیٹر و پبلشر نے دفتر مخزن بھاٹی گیٹ سے شائع کیا

جملہ حقوق محفوظ
قیمت سالانہ
چار روپیہ - بذریعہ
وی پی چار روپیہ چار آنہ

دورِ جدید
مخزن

رجسٹرڈ ایل ۲۰۹۷
ممالک غیر سے
۹ شلنگ
قیمت فی نمبر ۸/

جلد (۴) | بابت ماہ نومبر ۱۹۳۰ء | نمبر (۶)

فہرست مضامین

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام میاں ظہور الدین پرنٹر چھپا اور میاں ظہور الدین مالک و ایڈیٹر و پبلشر نے دفتر مخزن بھاٹی گیٹ سے شائع کیا

چشمۂ خورشید

(پروفیسر محمد اکبر منیر۔ ایم۔ اے)

جھپکی نہیں ہے آنکھ ستاروں کی رات بھر　　عالم رہا ہے بزمِ فلک میں سرور کا
ہر گوشہ انجمن کا چراغاں تھا نور سے　　پیہم رہا ہے دور شراب طہور کا
ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے قدسی تھے محوِ رقص　　لب پر تھا وردِ نغمۂ وید و زبور کا
تھی حوریوں کی آنکھ فرشتوں سے لڑ رہی　　شیدا ہر اک فرشتہ تھا انداز حور کا
مستانہ وار پی کے تھے گردش میں اس طرح　　در پیش ہو کسی کو سفر جیسے دور کا
مستی میں ایک حور سے ساغر جو گر پڑا　　مشرق کی سمت ابلنے لگا چشمہ نور کا

تیری زباں میں جس کا لقب آفتاب ہے
وہ قدسیوں کی بزم کا جامِ شراب ہے

یہ جام بزمِ قدس کا ہے شمعِ زندگی　　گر یہ نہ ہو تو محفلِ کون و مکاں نہ ہو
تارے نہ جگمگائیں شبِ تار میں کبھی　　مہتاب کا چراغ کبھی ضَو فشاں نہ ہو
سبزہ اُگے نہ پھول کھلیں باغ و راغ میں　　گلزار و کوہسار میں جوئے رواں نہ ہو
ہر ذرہ خاک اُسکی ضیا سے ہی مستنیر　　اس کے بغیر نورِ زمین و زماں نہ ہو
یہ سرِ زندگی ہے اسے خوب یاد رکھ　　گر وہ جہاں نہ ہو تو کبھی یہ جہاں نہ ہو
اُٹھ چھوٹتا ہے چشمۂ خورشید تابناک　　بیگانۂ حقیقتِ سود و زیاں نہ ہو

پی بھر کے جام چشمۂ آبِ حیات سے
اور آشنا ہو رمزِ حیات و ممات سے

آہنگ حجاب ـ میاں یعقوب علی بی دہلی کوشش

CALCUTTA
ART PG WORKS
LAHORE
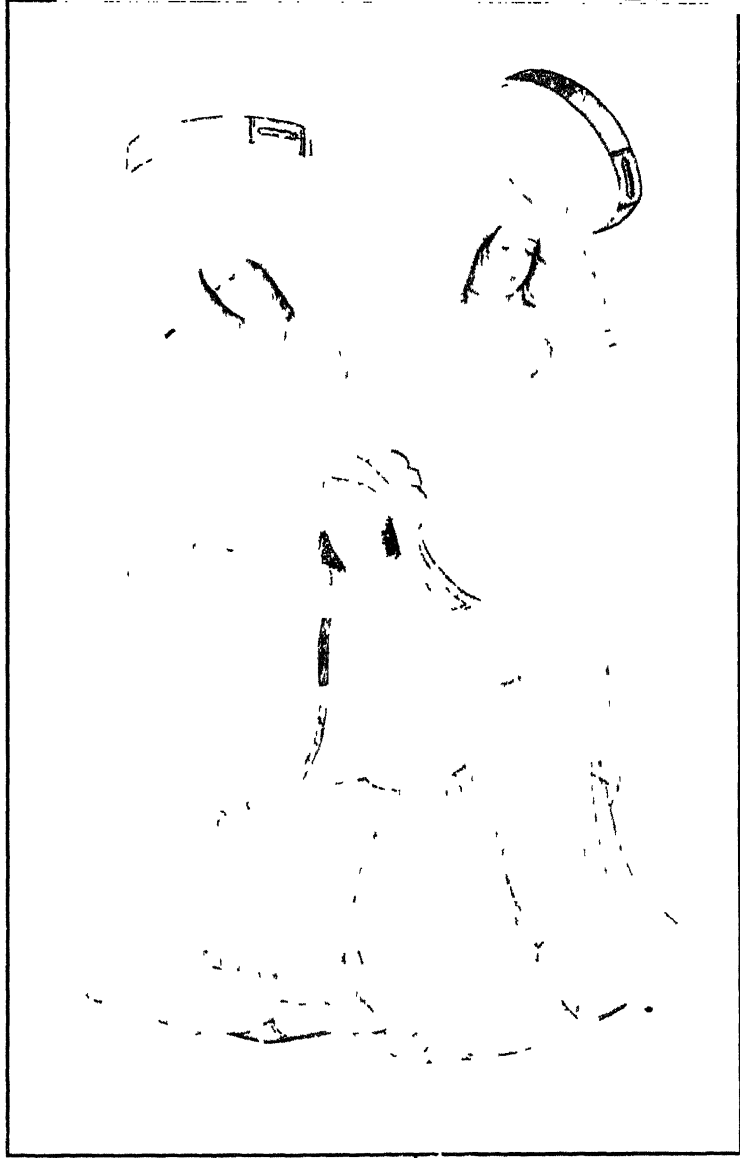
شذرات

تین مہینے کے عارضی التواء کے بعد "مخزن" کے اجراء اشاعت پر جن قدر دانوں، کرمفرماؤں اور معاونین نے بے پایاں جذبۂ اخلاص و مودّت کا اظہار فرمایا ہے۔ اُس کے لئے ہم بصمیم قلب ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔ اور خدائے بزرگ و برتر سے دست بدعا ہیں کہ وہ ہمیں اس اعتماد کا اہل ثابت کرے۔ جس نے ہم پر بے شمار ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں۔ قارئین "مخزن" کو یہ اطمینان دلانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ مخزن اپنی زندگی کے ہر دور میں اپنے شاندار ماضی اور اپنے جلیل القدر پیشروؤں کے روائتی محاسن اور عدیم النظیر عزم و استقلال کو شمع راہ بنائے گا اور "نقشِ پا" کی اہمیت کو ہمیشہ ملحوظ رکھے گا۔

آغاز کار سے "مخزن" نے زبان اردو کی مخلصانہ خدمت کو مقصد اوّلین قرار دیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس پُرخار اور سنگلاخ وادی میں اس طرح کامیاب ہوا کہ مذاق سلیم آج کھل کر داد دے رہا ہے، اور قوت فکر مرحبا و آفرین کہہ رہی ہے۔ مخزن کے نزدیک آج بھی وہی مقصد اوّلین توجہ کا مستحق ہے۔ "مخزن" اس لئے زندہ ہے کہ اسے معلوم ہے کہ وہ حسب استطاعت زبان اردو کی خدمت کر رہا ہے۔ جس لمحہ اُسے یہ یقین ہو گیا کہ اس کا وجود بیکار، اس کی مساعی رائیگاں، اور اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے، وہ

ہمیشہ کے لئے سکوت اختیار کرلے گا اور اپنے وجود سے اس دنیا کو پاک کردے گا۔ ہم ایک مرتبہ یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ زبان اُردو کے ایک اَدنےٰ خادم ہونے کی حیثیت سے "مخزن" کو "پارٹی بازی" یا "فرقہ بندی" سے کبھی کوئی تعلق نہ ہوگا، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ علم وادب کے ارتقا و احیائے کے لئے اس قسم کی فریقانہ کشمکش کو انتہائی درجہ مذموم اور قابلِ نفرین سمجھتا ہے۔ اختلاف رائے بلاشبہ ایک نعمت ہے۔ مگر یہی اختلاف رائے جب خصومت، بغض و عداوت اور تکدر قلبی کی شکل اختیار کرلے تو مستقل لعنت بن جاتا ہے اور قوم کی تمام کوششیں بے جا تعصب کی دلدل میں پھنس جاتی ہیں۔ "مخزن" مقامی اَدبی پارٹیوں کی تقسیم کو ایک لمحہ کے لئے تسلیم نہیں کرسکتا۔ نہ کسی خاص فرد یا جماعت سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا چاہتا ہے وہ اردو زبان کا ایک مخلص خادم ہے، اور اس حیثیت سے سب کا نیازمند ہے اور سب کا خادم! یہ امر کس قدر سوگوار ہے کہ ان اَدبی نزاعوں میں اب مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ آج کل لاہور میں اسی قسم کا ایک مقدمہ چل رہا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ غیر جانبدار اصحاب اس طرف توجہ کرتے، اور فریقین میں مصالحت کرا دیتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ لاہور میں ایسے متقدر اصحاب موجود ہیں جن پر فریقین کو کامل اعتماد ہے اور جو بطریق احسن اس فرض سے عہدہ برا ہوسکتے ہیں۔

اس رسالہ میں عزیزی یعقوب علی کی ابتدائی صناعانہ کوششوں کا نمونہ "آہنگِ حیات" کے عنوان سے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ عزیز موصوف کی عمر ابھی چودہ سال سے زیادہ نہیں ہے۔ "چغتائی طرز" نے اِن کے وجدان صحیح کو بیدار کیا۔ اور اب ان کا ذوق سلیم چغتائی اسکول آف آرٹ کی تقلید پر مائل ہے میاں یعقوب علی نے جناب چغتائی سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل نہیں کیا، پھر بھی معنوی حیثیت سے انہیں ان کا شاگرد ہی کہنا چاہیئے۔ جناب چغتائی مستحق مبارکباد ہیں کہ انہیں ایسے ہونہار تلامذہ مل رہے ہیں جو ان کے نام کو مستقبل قریب میں آرٹ کی دنیا میں غیر فانی شہرت دے دیں گے۔ ابھی یہ ابتدائی نقوش ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر میاں یعقوب علی نے مشق و مزاولت جاری رکھی تو بہت جلد ترقی کرلیں گے۔ اور تقاضائے سن وسال کی وجہ سے اب جو بعض خامیاں نظر آتی ہیں، وہ بالکل دُور ہوجائیں گی۔ جب یہ تصویر جناب چغتائی کو دکھلائی گئی تو انہوں نے بہت تعریف کی۔ اور میاں یعقوب علی کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین بھی عزیز موصوف کے ذوق سلیم کی قدر کرینگے

ہمیں افسوس ہے کہ ستمبر اور اکتوبر کے رسالہ میں کتابت کی بعض غلطیاں رہ گئیں - جو اہل نظر سے پوشیدہ نہ رہی ہوں گی - مثلاً ساعی کو "ص" سے لکھدیا گیا "تخریب" نہ جانے کیوں مذکر ہوگیا، "وال" دل ہوگیا - اور ان سے بھی زیادہ افسوسناک غلطی یہ ہوئی - کہ "مسٹر رشید احمد (خلف رشید مولانا ظہور الدین صاحب مالک و مدیر رسالہ مخزن)" کی بجائے "خان رشید مولانا ظہور الدین . . ." لکھدیا گیا - اسی طرح "پھانسی دیدی جائیگی" کی بجائے "پھانسی دے دیا جائے گا" چھپ گیا - ان اغلاط کے لئے ہم ناظرین "مخزن" سے عفو خواہ ہیں' ہماری یہ خواہش ہے کہ مخزن میں اوّل تا آخر ایک نقطے کی بھی غلطی نہ ہو - اور ہمیں امید ہے کہ ہماری خواہش بہت جلد پوری ہوگی - اس کے ساتھ ہی ہمیں افسوس ہے کہ رسالہ کے وقت پر لانے میں ابھی تک کامیابی حاصل نہ ہوسکی - لیکن قوی امید ہے کہ سالِ نو کے آغاز تک انشاءاللہ ہماری تمام کوششیں بار آور ہوں گی *

گذشتہ چند برسوں میں جو تبدیلیاں حکومت ترکی میں ہوئی ہیں، وہ تمام دنیا کے لئے بالعموم اور عالم اسلامی کے لئے بالخصوص ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں - تاریخ عالم سے دلچسپی رکھنے والے ارباب فہم وبصیرت سے یہ امر پوشیدہ نہ ہوگا، کہ عالم اسلامی میں یورپ کے تصادم سے جو بیداری اور اپنے بل بوتے پر کھڑے ہونے کی خواہش پیدا ہوئی ہے، وہ اور ملکوں کے مقابلہ میں ترکوں میں زیادہ مؤثر طور پر کارفرما ہے عالم اسلامی میں نشأۃ ثانیہ کی تحریک کے دو نتائج پیدا ہوئے ہیں - ایک جماعت یورپ کی مفید باتوں کو اختیار کرنا چاہتی ہے، اور دوسری ہر اس چیز کو ردّ کرنا چاہتی ہے جس کا یورپ سے کسی طرح بھی تعلق ہو - چونکہ ترکی اور مصر یورپ سے قریب ہیں - اس لئے دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں یہ کشمکش ان دونوں ممالک میں واضح طور پر نظر آتی ہے *

ترک ایک حریت پسند قوم ہے - آزادی اس کی سرشت میں شامل ہے - اس میں تسفّل وتعبّد کی عادتیں اب تک نہیں پیدا ہوئی ہیں جو دیگر اسلامی ممالک کے افراد میں دوسری قوموں کے زیر تسلط رہنے سے پیدا ہوگئی ہیں - ترک اولوالعزم بہادر اور ارادے کے پکّے ہیں - جب وہ کسی بات کا تہیّہ کر لیتے ہیں تو کر بھی ڈالتے ہیں - ترکوں میں بہت عرصہ سے ایک ایسی جماعت موجود تھی جو غلط یا صحیح طور پر یہ سمجھتی تھی کہ نظام خلافت اُس کی قومی ہستی کے لئے مضر ہے، اور اس نظام کے برسر اقتدار ہونے کی وجہ سے

وہ کسی قسم کی اصلاحی جد وجہد نہیں کر سکتی۔ زمانہ کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست وریخت سے دنیا سمجھی کہ یہ قوم شاداب نہ پنپنے پائے گی۔ لیکن یہ اس ابتلائے عظیم سے ایسی نکلی کہ دنیا محو حیرت رہ گئی۔ نہ صرف یہ کہ اُس نے اپنے قومی وجود کو سنبھال لیا، بلکہ اپنی قومی اصلاح کو کامیاب بنانے کے پورے پورے مواقع بھی تلاش کر لئے۔

مصطفےٰ کمال اور ان کے روشن خیال رفقاء کار نے ترکی جمہوریت قائم کرنے میں جو کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ دراصل ترکان احرار کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ تاریخ اُس کی دوسری مثال پیش نہیں کر سکتی۔ انگلستان، فرانس اور امریکہ اس وقت جمہوری حکومت کے لئے مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں لیکن ان ملکوں میں بھی استبداد اور غیر ذمہ دار حکومت خون کی ندیاں بہائے بغیر حاصل نہ ہو سکی۔ استبداد کی اپیل ہمیشہ تلوار سے ہوتی ہے۔ کیوں کہ اُس کے پاس سچائی نہیں ہوتی۔ جسے وہ سچائی کے مقابلہ میں پیش کر سکے۔ ترکی میں حالات ایسے پیدا ہوتے گئے کہ مصلحین کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کا پورا موقع مل گیا۔ جنگ عظیم کے دوران میں قدیم نظام حکومت کی نااہلیت سے قوم کا سارا شیرازہ بکھر گیا اور ساری ترکی قوم اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو آمادہ ہو گئی جو اس کی شیرازہ بندی کر سکے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ پہلا شخص جس نے اس بات کا بیڑا اٹھایا، جماعت مصلحین کا ایک فرد تھا، جس کے خوابوں کی تعبیر آج ہم جمہوریہ ترکی میں عملی طور پر دیکھ رہے ہیں۔

یہ یقیناً کوئی بُری بات نہیں ہے کہ ترکوں کی موجودہ برسر اقتدار جماعت میں نہ تو یورپ کے خلاف بے جا تعصب ہے اور نہ غلامانہ نقل کا جذبہ ان کا محرک عمل ہے۔ وہ اپنی ہر قومی ضرورت کو واقعات کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور اسی پر ان کے اعمال کی بنیاد ہے۔ وہ یورپ کے ہر خیال کی اس لئے تائید نہیں کرتے کہ وہ یورپ کا خیال ہے اور نہ وہ یورپ کے ہر انسٹی ٹیوشن (ادارہ) کو اس لئے رد کرتے ہیں کہ اس کا تعلق سرزمین یورپ سے ہے۔ کوئی خاص خیال یا انسٹی ٹیوشن ایک جغرافیائی حد کے رہنے والوں کی ذاتی ملکیت نہیں۔ اپنی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ دوسری قوموں کے خیالات اور نظامات سے فائدہ حاصل کرے، اور واقعہ یہ ہے کہ بنی نوع کی ترقی اسی حقیقت میں مضمر ہے کہ قومیں اپنی مخصوص ضروریات اور خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپس میں ایک دوسرے سے مستفید ہوتی رہیں۔

موجودہ ترکی حکومت پر ایک یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے دائرہ عمل کو محض ریاست کے بقا کا جہاں تک تعلق ہے محدود نہیں رکھا، بلکہ انفرادی زندگی کے ہر معاملہ میں اس کی دخل اندازی جاری ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک بیوی سے زیادہ نکاح قانوناً جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ قدیم عربی مدارس بند کر دیئے گئے ہیں اور اُن کی بجائے سرکاری مدارس میں بچوں کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک مخصوص لباس سرکاری دفاتر اور کارخانوں کے لئے لازمی بنا دیا گیا ہے۔ آزادی نسواں کے معاملہ میں اعتدال پیش نظر نہیں رہا۔ یہ اعتراضات بڑی حد تک صحیح ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ حکومت ترکیہ افراط و تفریط سے اجتناب کرنے میں محتاط نہیں رہی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ اعتراضات اکثر ان لوگوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ جن کے نزدیک بیجا تعصب اور قدامت پرستی، قومی ترقی کے مرادف ہیں۔ حالانکہ انسانی ترقی کسی مقام پر ٹھہر جانے میں نہیں بلکہ آگے بڑھنے میں مضمر ہے۔ مذہب معاشرت اور سیاست کا اصلی مقصد حیات انسانی کی تکمیل و ترقی ہے، یہ تو در اصل ان کی غلط تاویل ہے کہ بجائے ممد حیات ہونے کے یہ ترقی کے رستہ میں موانع کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اسلام ایک سے زائد نکاح کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن اسلام اسے مستحسن کبھی نہیں کہتا۔ اس لئے اگر ترکوں کی قومی ضروریات اس مذہبی اجازت کے خلاف قانون بنانے پر مجبور کرتی ہیں تو انہیں ہرگز قابل الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اسی طرح اگر صنعتی اور دیگر ضروریات ایک مخصوص لباس اختیار کرنے پر مجبور کریں تو اس معاملہ میں بھی کوئی مضائقہ نہیں

"تازہ اطلاعات مظہر ہیں کہ برسر اقتدار جماعت یعنی جماعت خلق کے مقابلہ میں ایک دوسری جماعت جماعت احرار کے نام سے قائم ہو رہی ہے۔ اس جماعت کا مقصد غالباً جماعت خلق کے بیجا اقدامات کا انسداد ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس جماعت کا وجود اگر وہ اپنے دائرہ عمل تک محدود رہی تو ترکی قوم کے لئے نہایت مفید ہوگا، مگر اس سے اختلافات کے وسیع دروازے کھل جائیں گے۔ جو ایک قوم کے دور اصلاح و تغیر میں بسا اوقات نہایت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ اگر انقلاب پسند مصطفےٰ کمال کے حقیقی عزائم و مقاصد کی مخالفت کی گئی، تو ترکی یقیناً وہ ترکی نہیں رہے گا۔ جس نے اقوام عالم کو آج اپنے آپ سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ترکی کی ترقی کا راز مصطفےٰ کمال کی انقلاب پسندی میں مضمر ہے۔ اور اگر جماعت احرار کے معرض وجود میں آنے سے یہی بات نہیں رہی تو نتیجہ معلوم ہے!"

رباعیات

(فصیح الملک حضرت شاؔد مرحوم عظیم آبادی)

کیا مفت کا زاہدوں نے الزام لیا
تسبیح کے دانوں سے عبث کام لیا
یہ نام وہ تھا کہ جسکو بے گنتی لیں
کیا لطف جو گن گن کے ترا نام لیا

خوابیدۂ خلوت عدم نکلیں گے
ذی روح ہیں جسقدر بہم نکلیں گے
برسات میں جسطرح نکل آئیں درخت
محشر میں یونہی زمیں سے ہم نکلیں گے

چالاک ہیں سب کے سب بڑھے جاتے ہیں
افلاک ترقی پہ چڑھے جاتے ہیں
مکتب بدلا، کتاب بدلی لیکن
ہم اب بھی وہی سبق پڑھے جاتے ہیں

آنکھوں میں پھڑک پھڑک کے دل پہنچا تھا
مینا میرے لب کے متصل پہنچا تھا
ساقی نے زمین پر گرا دی وہ مے
معلوم نہیں کون مخل پہنچا تھا

ناموں پہ نثار ہونیوالا ہوں میں
اس سوگ میں جان کھونے والا ہوں میں
سب کے تو اجل نے آکے آنسو پوچھے
اگلوں کا اب ایک رونیوالا ہوں میں

مذکور زباں پہ صبح و شام اُس کا ہے
منقوش ہر ایک دل پہ کلام اُس کا ہے
جینے کے زمانہ میں تو سب جیتے ہیں
جو مر کے جیئے جہاں میں نام اُس کا ہے

غیر مطبوعہ

بوسینا اور ہرزی گوینا[۱] کے مسلمان

(جناب سید محمد عبد اللہ رکن اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ لاہور)

"یہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔ جس کا عنوان "بوسینا" ہے۔ افسوس ہے کہ مضمون سنہ ۱۹۰۹ء تک کے واقعات سے متعلق ہے اور ہمارے زمانے کے حالات نہیں پیش کرتا۔ اس مضمون کے شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سنہ ۱۹۰۹ء میں بوسینا کے مسلمانوں کی مذہبی معاملات میں خود مختاری کا حال ہمارے نوجوانوں کو معلوم ہو سکے، آج ہندوستان میں اس قسم کی خود مختاری کو قومیت کے منافی سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ خود مختاری مذہبی خود مختاری کا دوسرا نام ہے جو آج سے بہت پہلے بوسینا کے مسلمانوں کو حاصل تھی"۔

بوسینا اور ہرزی گونیا کا رقبہ ۱۹۷۰۲ مربع میل ہے بوسینا کا ۱۶۱۷۳ مربع میل ہے، اور ہرزی گونیا کا ۳۵۲۹ م م۔ ترکی حکومت نے سنہ ۱۸۷۵ء میں جو مردم شماری کی تھی اس کے مطابق اس ملک کی آبادی تقریباً ۱۰۵۱۰۰۰ تھی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جو مردم شماری ہوئی۔ اس میں ان علاقوں کی آبادی ۱۸۹۸۰۴۴ تھی جن میں سے ۶۱۲۰۰۰ مسلمان تھے۔ اکثر آبادی زراعت پیشہ ہے۔ جس کا اندازہ ۱۶۶۸۵۸۷ نفوس تک کیا گیا ہے باقی لوگ صنعت و تجارت کا کام کرتے ہیں۔

بوسینا میں اسلام کا داخلہ

سنہ ۱۴۵۳ء میں جب ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس ملک کے اصلی حکمران خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ ترکی فتوحات کا بڑھتا ہوا سیلاب تھوڑے ہی دنوں میں بوسینا کی جانب مائل ہوا۔ سنہ ۱۵۲۸ء میں ہرزی گونیا کا کچھ حصہ اور بوسینا کے جنوبی علاقے ترکوں کے قبضے میں آ گئے۔ جب سنہ ۱۵۳۶ء میں ہنگری کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، تو وہ ملک سلطان اول کی فاتحانہ یلغار کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا۔ چنانچہ پورے طور پر یہ ترکی کی حکومت کا صوبہ ہو گیا۔ متمول لوگوں، اور اکثر زمینداروں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان لوگوں کے سابقہ حقوق قایم رکھے گئے، اور وہ

---

[۱] بوسینا اور ہرزی گونیا البانیہ کے شمال مشرقی علاقوں کے نام ہیں۔

مذہب اسلام کے زبردست پیرو بن گئے۔ اس زمانے سے لے کر ۱۹۰۸ء تک بوسینا اور ہرزی گو نیا ترکی کا ایک صوبہ رہا۔ اس لئے اس کی تاریخ ترکی کی تاریخ سے الگ نہیں ہے۔ انیسویں صدی میں ملک کی عیسائی آبادی کی جانب بغاوتیں شروع ہوگئیں۔ جن میں سے سب سے زبردست ۱۸۷۵ء کی بغاوت تھی۔ ۱۹۰۸ء میں یہ دونوں صوبے ترکوں کے ہاتھ سے آخراً نکل کر آسٹریا ہنگری کی مملکت میں داخل کر لئے گئے*

ترکی حکومت کا خاتمہ

جب آسٹریا ہنگری کی فوجیں بوسینا میں داخل ہوئیں تو حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ گذشتہ قوانین بہت حد تک باقی رکھے جائیں سوائے اِن کے جو وقتاً فوقتاً منسوخ ہوتے رہیں گے، اس لئے سب سے پہلے انہوں نے ترکی قوانین ایک جگہ جمع کئے اور ان کا ترجمہ کیا۔ اس مجموعے میں قوانین اراضی، قوانین محصول تجارت کے قانون اور عدالت ہائے شرعی کے آئین تھے۔

نیابتی حکومت

۱۹۱۰ء میں نیا دستور اساسی منظور ہوا۔ اِس سے پہلے وضع آئین و قوانین کے جملہ اختیارات بادشاہ سے متعلق تھے۔ نئے دستور کی رو سے ایک مجلس "پارلیمنٹ" مرتب ہوئی، جو وضع آئین میں بادشاہ کے ساتھ تعاون کرتی تھی، یہ مجلس نامزد اور منتخب ارکان پر مشتمل تھی، ارکان یہ ہوتے تھے۔ رئیس العلماء جو "وقف معارف" کا ناظم ہوتا تھا۔ سراجوا اور مسٹر (Mostar) کے مفتی۔ ایک اور مفتی رجو سب سے زیادہ اس عہدے پر رہا ہو) چار "سردی آرتھاڈکس میٹرو پالیٹن"۔ آرتھاڈکس سروین چرچ مجلس انتظامی و تعلیمی کا نائب صدر۔ رومن کیتھولک آرکبشپ۔ دو رومن ڈایوسین بشپ اور ادارۂ فرانسسکن کے دو صوبجاتی نمائندے وغیرہ وغیرہ . . . .

منتخب نمائندوں کی کل تعداد ۷۲ تھی۔ ارکان کی میعاد نیابت ۵ سال۔ ہر تجویز اس وقت قابل منظور ہوتی تھی جب نصف سے زیادہ ارکان حاضر ہوں اور پھر جو حاضر ہوں ان سب کا متفق ہونا ضروری تھا۔ جن تجاویز کا تعلق مذہبی امور سے ہو اُن کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ تمام ارکان کا ⅘ حصہ موجود ہو۔ اور پھر حاضرین میں سے ⅔ اسی کے حق میں ہوں۔ تمام تجاویز جن پر بحث کرنے کا اختیار پارلیمنٹ کو تھا۔ ہاؤس میں پیش کرنے سے پہلے آسٹریا ہنگری کی حکومت کے سامنے پیش ہوتی تھیں۔ جو بل پارلیمنٹ کی منظوری حاصل کر چکے ہوں۔ ان کی تصدیق حکومت کی دونوں ریاستوں اور کراؤن (بادشاہ یا تاج) کی جانب سے لازمی ہے*

بوسینا کی پارلیمنٹ میں صرف داخلی سیاسیات سے بحث ہو سکتی ہے۔ پارلیمنٹ صوبجاتی کونسلوں کے

لئے نوممبروں کا انتخاب کرتی ہے جو بوسینا اور ہرزی گونیا کے معاملات اور ضرورتوں کا وقتاً فوقتاً اظہار کیا کریں صوبجاتی کونسلوں ہیں ہر مذہبی فرقہ اپنی آبادی کے لحاظ سے نمائندے بھیجتا ہے +

انتخابی مجالس

پارلیمنٹ کے ارکان کا انتخاب فرقہ وار ہے - بوسینا اور ہرزی گونیا کا ہر مرد جس کی عمر ۲۴ سال سے اوپر ہو- اور جس کے پاس ایک سال تک رہنے کا مکان ہو- ووٹ دے سکتا ہے، نیز وہ لوگ جو بوسینا اور ہرزی گونیا کی سول سروس یا محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوں ووٹ دے سکتے ہیں اور تمام ذکور جن کی عمر ۳۰ سال سے اوپر ہو اور جو ووٹ دے سکتے ہوں اور جو شہریت کے جملہ حقوق سے مستفید ہو رہے ہوں پارلیمنٹ کی رکنیت کیلئے کھڑے ہو سکتے ہیں - اس تعمیم سے بوسینا اور ہرزی گونیا کے سول سرونٹ، فوجی ملازمین قومی ریلوے کے ملازمین، معلمین و اساتذہ مستثنیٰ ہیں +

ملک کی انتخابی مجالس تین ہوتی ہیں - ۷۲ نمائندوں میں سے ۱۸ پہلی (Curia) سے متعلق ہوتی ہیں - بیس دوسری سے اور ۳۴ تیسری سے سب سے پہلی پارلیمنٹ کا افتتاح ۱۵ رجون ۱۹۱۰ء کو سراجیوا میں ہؤا - اس مجلس نے نہایت ہی خوش اسلوبی سے ملک کا انتظام کیا ہے - اور جو توقعات اس سے وابستہ تھیں وہ اس سے بہت حد تک پوری ہو رہی ہیں +

مذاہب

آسٹریا کے قبضے سے پہلے، بوسینا اور ہرزی گونیا میں مسلمانوں کا کوئی خاص نظام نہ تھا ارتھاڈکس سروی جن کا تعلق یونانی کلب سے تھا - کیتھولک اور یہودی (Millet) کہلاتے تھے، یونانی کیتھولک اور اونگیلیکل چرچ آسٹریا کے قبضے کے بعد قائم ہؤا - سروین ارتھاڈکس چرچ ۱۹۰۵ء میں از سر نو زندہ کیا گیا - اس کو اپنے اندرونی معاملات خود سرانجام دینے کی اجازت تھی - بشرطیکہ ملک کے قانون سے تصادم نہ ہو - اس وقت تک کا ایک آئین نامہ موجود ہے - جس میں سروین ارتھاڈکس چرچ کا دائرہ عمل واضح کیا گیا ہے اور اس کے ان اختیارات کی تجدید کی گئی ہے جو اسے مذہبی اور تعلیمی معاملات میں حاصل ہیں +

مُسلمانوں کے معاملات

مسلمانوں نے ۱۸۸۱ء میں خواہش ظاہر کی کہ انہیں اپنے مذہبی امور خود سرانجام دینے کی اجازت دی جائے ان کی خواہش تھی کہ یہ کام ایک مجلس کرے جس کا صدر "رئیس العلماء" ہو ۱۸۸۲ء میں ان کی خواہش پوری کی گئی - چنانچہ ایک ایسی مجلس بنائی گئی - جس میں چار علماء ہوں اور رئیس ا

ایک عارضی وقف کمیشن مقرر کیا گیا۔جس کا فرض یہ تھا کہ وہ تمام اوقاف کے حالات دریافت کرے، ان کے اخراجات کا بندوبست کرے اور نئے قوانین اصول کی حفاظت کے لئے بشرط ضرورت وضع کرے ۱۸۸۴ء میں تمام اضلاع کے عارضی وقف کمیشن مقرر ہوئے۔ہر ضلع کا قاضی اس کا صدر ہوتا تھا وہ اوقاف کے متعلق معلومات حاصل کرتا تھا۔مساجد اور عمارات وقف کی نگہداشت اس کے ذمہ ہوتی تھی، وہ متولیوں اور امینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور پھر ان سب امور کی رپورٹ صوبجاتی وقف کمیشن کے سامنے پیش کرتا۔آخر میں ان کی جانب سے جو ہدایات موصول ہوتیں۔ان پر عملدرآمد کرتا۔۱۸۹۴ء میں وقف کمیٹیوں کی ازسرنو تنظیم کی گئی۔عارضی وقف کمیشنوں کی بجائے مستقل کمیشن قائم کئے گئے جو ایک طرح کی وضع قوانین اور انتظامی مجلس تھی اس کے ساتھ ایک وقف بورڈ بھی قائم کیا گیا جو ایک طرح کی کارکن جماعت تھی۔صوبجاتی وقف (کمیشن) مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل تھی۔صدر۔مفتش (انسپکٹر) کاتب (سکرٹری)۔مجلس العلماء کے چار ارکان چیف شریعت کورٹ کے دو جج بوسینا۔اور ہرزی گوینا کے بارہ اضلاع میں سے ہر ایک ضلع کے دو مقتدر مسلمان (جو تین سال تک اس حیثیت میں کام کرتے تھے اور وزارت ان کو منتخب کرتی تھی) صوبجاتی وقف بورڈ مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل ہوتا تھا۔پراونشل وقف کمیشن کا صدر۔مفتش۔کاتب (سیکرٹیری) اور باقی دفتر کا ضروری عملہ وغیرہ*

"وقف معارف" کے فرائض

۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کے مذہبی معاملات کی یہی حالت تھی۔اس ملک کے عیسائیوں کی طرح اندرونی معاملات مذہبی میں آزادی دے دی گئی۔اس دستور کے چند اہم واقعات یہ ہیں:۔

مجلس وقف معارف کے فرائض:۔مساجد اور ان کے علاوہ اور اسلامی عمارات کی تعمیر اور حفاظت۔اماموں اور مکاتب کے معلمین کی تربیت۔مسلمان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اسلامی عقائد میں۔جہاں تک ممکن ہو۔مسلمانوں میں مذہب اسلام کی اشاعت و تبلیغ*

وقف معارف کے ادارہ انتظامی کی ترتیب یوں ہے:۔ جماعت۔اس کے ماتحت بہت سی "آئینی مجلسیں" ہوتی تھیں اضلاعی کمیشن۔صوبجاتی اسمبلی۔اس اسمبلی کی سب کمیٹی۔بعض انتخابی مجلسیں۔اضلاعی کمیٹیاں اور چھوٹے چھوٹے اضلاع کی کمیٹیاں۔یہ تمام جماعتیں اس عظیم الشان نظام کے اجزا ہیں۔ان سب کا انتخاب آئین کے مطابق مسلمان آبادیاں کرتی ہیں یہ وقف معارف کے آزاد نمائندے اور دوسرے مذہبی حکام تمام فرائض کو آئین کے مطابق انجام دیتے ہیں ان کے احکام کی اپیل

سول کورٹس میں نہیں ہوتی ۔ بجز ایسے حالات کے کہ ان کے فیصلے ملک کے قانون سے متصادم ہوتے ہوں اگر ان آزاد بورڈوں میں سے کوئی بورڈ قانون ملک کے خلاف فیصلہ صادر کر دے تو حکومت اس فیصلے کو منسوخ کر دیتی ہے ۔ اور معاملہ زیر بحث کو از سر نو اس بورڈ کے سامنے برائے غور بھیجتی ہے تاکہ کوئی اور فیصلہ صادر ہو سکے

صوبے کی حکومت یہ اختیار رکھتی ہے ۔ کہ وہ "مجلس علماء" صوبجاتی مجلس اور اُس کی سب کمیٹی سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ اپنی روداد عمل پیش کرے ۔ وقف المعارف کی مجلس انتظامی اور دوسری مجالس مطلوبہ معلومات بہم پہنچانے پر مجبور ہیں +

"وقف المعارف جماعت" میں مسلمانوں کی طرف سے ۲۰ مسلمان نمائندے ہوتے ہیں' جماعت مجلس کی میعاد تین سال ہوتی ہے [1] اضلاع کی جماعتوں" میں مقامی جماعتوں سے منتخب نمائندے شامل ہوتے ہیں ۔ اضلاعی کمیشنوں کے وظائف یہ ہوتے ہیں :۔

۱ ۔ وقف المعارف کی منقولہ و غیر منقولہ مملوکات کے متعلق معلومات بہم پہنچانا +

۲ ۔ وقف المعارف کی عمارات اور دیگر مذہبی عمارات کا نظم و نسق +

۳ ۔ متولیوں اور تمام ان لوگوں کی نگہداشت جنہیں وقف المعارف کے خزانے سے معاوضہ ادا کیا جاتا ہے +

۴ ۔ اس چیز کا خیال رکھنا کہ مدارس، مکاتب، کے نصاب تعلیم اور دوسرے اداروں کے انتظامی دستور العمل پر باقاعدگی سے عمل ہوتا ہے یا نہیں، ان تمام امور کی رپورٹ "مفتی یا مجلس علماء" کے سامنے پیش کرنا ۔ ایسے حالات میں جب کہ یہ معلوم ہو جائے کہ سکول یا مکتب کا نصاب باقاعدگی سے نہیں پڑھایا جاتا ۔ پولیٹیکل افسر کے سامنے شکایت کرنا +

وقف المعارف کی صوبجاتی اسمبلی

وقف المعارف پراونشل اسمبلی، بوسنیا اور ہرزیگوینا کی تمام مملوکات وقف کا انتظام کرنیوالی جماعت ہے اس کا مرکز سراجوا ہے ۔ اس کے ارکان میں رئیس العلماء بنجولوکا ۔ بہاس ۔ موآر ۔ تراونیک ۔ تزلہ اور سراجوا کے مفتی ۔ ڈائرکٹر وقف المعارف اور ضلاعی کمیشنوں میں سے ۲۴ منتخب شدہ نمائندے شامل ہیں ۔ اس قومی مجلس کا صدر رئیس العلماء ہوتا ہے اور نائب صدر کا انتخاب خود ارکان اپنی جماعت میں سے کر لیتے ہیں ۔ اس اسمبلی کے وظائف یہ ہوتے ہیں :۔

---

[1] ۔ علاقوں کے نام ہیں +

۱۔ تمام ان معاملات کی نگہداشت جنہیں وقف المعارف کے ماتحت شعبے سرانجام دیتے ہیں +

۲۔ تمام کارکنان و حکام وقف المعارف کی دیکھ بھال +

۳۔ مساجد۔ مکاتب، مدارس اور ان کے متصل حجروں کی تعمیر پر غور کرنا اور فیصلہ کرنا +

۴۔ سکولوں اور دوسرے تعلیمی اور رفاہ عام کے اداروں کا چلانا +

۵۔ وقف المعارف کی تمام مملوکات کے مخارج و مداخل، خرید و فروخت وغیرہ کا بندوبست جہاں تک کہ شریعت کے قوانین اجازت دیتے ہیں +

۶۔ ذاتی اوقاف اور مرکزی وقف المعارف کے فنڈ کا حساب لگانا +

۷۔ وقف المعارف کے انتظامی امور کے متعلق پرانے قوانین کو بدل کر نئے اور آسان قوانین کا وضع کرنا +

اس پراونسل اسمبلی کے ماتحت ایک کمیٹی بھی ہوتی ہے۔ جو دراصل مجلس عاملہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں وقف المعارف کا ڈائرکٹر (جو بحیثیت صدر کام کرتا ہے) مفتیٔ سراجوا اور ۶ اور ممبر ہوتے ہیں جو اسمبلی میں سے ہی چنے جاتے ہیں نیشنل اسمبلی کی یہ کمیٹی عام طور پر یہ کام کرتی ہے، وقف المعارف کی ملوکات کا معمولی کام ڈسٹرکٹ کمیشن کی نگرانی اور ان کو ہدایات دینا۔ ذاتی اوقاف کی نگرانی اور یہ دیکھنا کہ آیا وہ اس مقصد کو بخوبی پورا کر رہے ہیں جس کے لئے وہ وقف کئے گئے تھے، مالیہ کا جمع کرنا اور پھر اُسے پراونسل اسمبلی کے زیر ہدائیت مختلف کاموں پر صرف کرنا۔ رفاہ عام کے کاموں کے لئے اوقاف کی منظوری دینا۔ ترکوں اور تحائف کو قبول کرنا۔ متولیوں اور اوقاف المعارف کے دوسرے انتظامی افسروں کا تقرر۔ دینی سکولوں میں دنیاوی تعلیم دینے کے لئے استادوں کا تقرر۔ ڈسٹرکٹ کمیشنوں کے لئے ملازمین اور افسروں کا تقرر۔ ان تمام افراد میں ضبط و نظم قائم رکھنا۔ علماء مجلس کے سامنے دینی اور تعلیمی عہدہ داروں کے انتخاب کے متعلق سفارشات کرنا +

مجلس علماء

مجلس علماء جس کا مرکز سراجوا میں ہوتا ہے۔ بوسنیا اور ہرزی گونیا کے تمام اسلامی مذہبی معاملات کی مختار کل ہے۔ مجلس علماء کی ہیئت ترکیبی یہ ہوتی ہے۔ رئیس العلماء بطور صدر۔ اور چار دیگر ارکان۔ ان لوگوں کا انتخا خفیہ جلسے میں (Curza) کی طرف سے ہوتا ہے۔ رئیس العلماء کا انتخاب ان تین ارکان میں سے جنہیں (Curza) منتخب کرے شہنشاہ کرتا ہے جب مجلس علماء کے کسی رکن کی اسامی خالی ہوتی ہے۔ تو وزارت

ان دو امیدواروں میں سے ایک کو چن لیتی ہے۔ جنہیں (Curza) چنے ❖

(Curza) اس کے بعد شیخ الاسلام قسطنطیہ کے سامنے درخواست کرتی ہے کہ وہ شاہنشاہ کی جانب سے منتخب کردہ رئیس کو مذہبی فرائض انجام دینے کی اجازت دیں۔ یہ درخواست شیخ الاسلام کے نام شاہی سفارت خانہ متعینہ قسطنطیہ کی معرفت روانہ کی جاتی ہے۔ علما مجلس کو تمام اسلامی معاملات پر ضبط و انتظام کا اختیار حاصل ہے، ان کا کام یہ بھی ہے کہ وہ اگر کسی مقام پر مساجد مکاتب اور مدارس کی تعمیر کی ضرورت سمجھیں تو اس کے متعلق وقف المعارف کی مجلس انتظامی کے سامنے رپورٹ پیش کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ کہیں اسلام کے قانون کی مسلمانوں کے قومی مدارس، اور دیگر پبلک سکولوں اور اداروں میں بے حرمتی تو نہیں ہوتی۔ مجلس علما کو مکاتب و مدارس کے نصاب تعلیمی کی ترتیب اور عام پبلک کی مذہبی تبلیغ کے کام میں وقف المعارف پراونشل اسمبلی کے ساتھ تعاون کرنا پڑتا ہے۔ سرکاری سکولوں میں مسلمان طلبہ کی مذہبی تعلیم کا کورس بھی پراونشل گورنمنٹ کے مشورے سے یہی جماعت مقرر کرتی ہے۔ یہی جماعت وقف المعارف اسمبلی کی جانب سے مذہبی عہدہ داروں کا تقرر کرتی ہے۔ یہی مجلس سرکاری سکولوں میں مذہبی معلمین کا تقرر کرتی ہے اور ان معلمین کے مستقل ہونے کی سفارش حکومت کرتی ہے۔ شرعی ججوں کے امتحانات لینا اور کامیابی پر ان کو سرٹیفیکیٹ دینا بھی اسی جماعت کا کام ہے۔ صوبجاتی حکومت کے لئے مفتی کا انتخاب بھی اس مجلس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ رئیس العلما کو کچھ خصوصی اختیارات حاصل ہیں۔ مثلاً شرعی ججوں کے لئے مراسل کا تقرر اماموں اور خطیبوں کا تقرر سراجوا میں جو شرعی لا کالج قائم ہے اس کی نگرانی وغیرہ۔ مشتبہ و مشکوک معاملات شرعی میں فتویٰ صادر کرنے کے لئے مجلس علما کا شیخ الاسلام قسطنطیہ سے استصواب کرنا لازمی ہے۔ استفتاء کے لئے ضروری ہے کہ وہ حکومت کے محکمۂ سیاسی کی معرفت شیخ الاسلام کے پاس بھیجا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس اس کا جواب بھی اسی ذریعے سے آتا ہے ❖

مفتی اور اس کے فرائض

ہر ضلع کے بڑے شہر میں ایک "مفتی" رہتا ہے۔ مجلس علما مفتیوں کو نامزد کرتی ہے اور صوبجاتی حکومت اس کی تصدیق کرتی ہے مجلس علما مفتی کی اسامی کے لئے دو آدمیوں کا نام پیش کرتی ہے جو اس منصب کے اہل ہوں۔ حکومت ان میں سے ایک کو منتخب کر لیتی ہے۔ مفتی کے فرائض یہ ہیں:-

کہ وہ ضرورت کے اوقات میں فتویٰ صادر کرے۔ ضلع میں دورہ کرے اور مسجدوں اور مکتبوں کی حالت کا معائنہ

کرے اور دیکھے کہ اس نصاب مقررہ پر مدارس میں کہاں تک عمل درآمد ہوتا ہے جو مجلس علما نے پبلک کی تربیت دینی کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ مدارس میں طالب العلموں کے سالانہ امتحانات میں نگران اعلےٰ بننا بھی مفتی کا فرض ہے *

صوبجاتی حکومت کا فرض ہے کہ وہ بوسینا اور ہرزی گونیا میں اسلامی تعلیم کی ترویج و ترقی کے لئے مجلس کے مشورے سے ادارے قائم کرے۔ وقف المعارف کے اہم ترین ادارے مکاتب و مدارس ہیں صوبجاتی اسمبلی بھی مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ادارے قائم کرسکتی ہے۔ لیکن پراونشل گورنمنٹ کی اجازت سے۔ وقف المعارف کے سکولوں میں وہی لوگ تعلیم دے سکتے ہیں جو اس کام کے لئے تربیت حاصل کر چکے ہوں جن مدرسوں میں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے وہ مکاتب کہلاتے ہیں۔ تعلیم منت ہوتی ہے، نصاب، مضامین کا انتخاب اور مکاتب کے ٹائم ٹیبل کی ترتیب وغیرہ علما مجلس کی طرف سے ہوتی ہے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ بچوں کو تعلیم کے لئے مکاتب میں بھیجے۔ ۸ سال کا لڑکا اور ۷ سال کی لڑکی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ مدارس اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں ہوتی ہیں۔ ان کا بڑا مقصد یہ ہے کہ دینی عہدوں کو پُر کرنے کے لئے بہتر سے بہتر آدمی پیدا کئے جائیں۔ یہ تمام ادارے مجلس علما کی زیر ہدایت چلتے ہیں۔ مدرسین کا انتخاب مجلس علما کی جانب سے ہوتا ہے *

پراونشل اسمبلی کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ ان دینی اداروں کے مصارف کو پورا کرنے کے لئے لوگوں سے ٹیکس وصول کرے *

تعلیم

۱۲۸۵ھ کا ترکی ایکٹ بوسینا اور ہرزی گونیا کے بدلے ہوئے حالات کے مناسب نہ تھا۔ ۱۹۰۹ء میں بوسینا میں ۱۴۳۴ ابتدائی مدارس تھے۔ جن میں ۳۹۸ مخلوط تھے۔ اور ۱۳۴ قومی اور ۱۱ پرائیویٹ جن میں ۳۸۹۵۰ طالب علم تعلیم پاتے تھے مسلمانوں کے خاص معاشرتی اور مذہبی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ملک کے چھ ضلعوں میں اہم مقامات پر ابتدائی مکاتب کا انتظام کیا گیا۔ جن کو "رشدیہ" کہتے ہیں۔ اسی طرح سراجیکا میں بھی جو علاقے کا ایک بڑا شہر ہے مکاتب قائم کئے گئے ان سکولوں کا مقصد بھی قریباً وہی ہے جو عام ابتدائی سکولوں کا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ رشدیہ سکولوں میں عربی اور ترکی بھی پڑھائی جاتی ہے۔ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی طرف بھی یکساں طور پر توجہ دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کا سب سے بڑا سکول سراجیوا میں ہے جو حکومت کے خرچ سے چلتا ہے۔ اس میں چار ابتدائی جماعتیں ہیں اور ثانوی کورس تین سال کا ہے۔ جن کا مقصد طالبات کو پڑھانے کے لئے معلمات

کو تیار کرنا ہے ۔ ۱۹۰۹ء میں ۹ کمرشیل سکول تھے لڑکوں کے لئے ایک فوجی بورڈنگ سکول بھی قائم تھا جس کی غرض وغایت فوجی اکیڈیمی میں داخل ہونے والے طلبا کو تیار کرنا تھا، ان کے علاوہ ۳ غیر قومی اور ۷ لڑکیوں کے سکول تھے ۔ ۲ انڈسٹریل سکول ۔ ۱۲ صنعتی سکول ۔ ا ٹیکنیکل سکول ۔ ایک سکول جنگلات کے علم کی تعلیم کے لئے، ایک ٹرننگ کالج معلمین کے لئے ایک قومی کالج معلمات کے لئے ۔ ۳ ۔ پبلک ۔ جمینیزیا[۱] سکول ۔ قومی جمینیزیا سکول ۔ افرنسس سکول اور دو حکومت کے Real Schuler[۲] موجود تھے +

اِن تمام اداروں میں مذہبی تعلیم کا انتظام عمدہ ہے ۔ ہر سکول میں ہر مذہب کے معلمین موجود ہوتے ہیں Gemnesia جمینیزیا کے مسلمان طالب علم یونانی کی بجائے عربی پڑھ سکتے ہیں ۔ مکتب مدرسے ۔ سراجوا کا دار المعلمین وغیرہ خود مسلمانوں کے خرچ سے چلتے ہیں ۔ مسلمان لڑکے مخلوط درسگاہوں میں جانے سے قبل اپنے ابتدائی مکاتب میں ضروری مذہبی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں ۔ مکاتب میں دوسرے مضامین بہت کم پڑھائے جاتے ہیں ۔ چونکہ "علما سسٹم" نے کوئی خاص نتائج پیدا نہیں کئے ۔ اس لئے ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۰ء کے درمیان وقف کمیشن کے ایما اور حکومت کی تائید سے ایک اصلاحی تحریک پیدا ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ مکاتب میں اصلاح کی جائے ۔ ۱۹۰۹ء میں ۱۰۰۰ کے قریب پرانی طرز کے مکاتب تھے ۔ ۹۲ نئی طرز کے مکاتب تھے جن میں سے ۸۳ لڑکوں کے لئے اور ۹ لڑکیوں کے لئے تھے ۔ بوسینا اور ہرزی گوینا کے مدارس (اعلیٰ درگاہیں) زیادہ تر ترکی مدارس کے انداز پر چل رہے ہیں ۔ اور ان میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے ۔ ۱۹۰۹ء میں ۴۲ اعلیٰ درسگاہوں میں ۶۱۳ طالب العلم تحصیل علم کر رہے تھے ۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم دو ہیں یعنی فرشونلی اور خانقاہ جو سراجوا میں واقع ہے، اور ان کے اخراجات غازی خسرو بیگ وقف سے چلتے ہیں ۔ دار المعلمین کا سنگ بنیاد ۱۸۹۳ء میں رکھا گیا تھا، اس میں مدارس کے عام کورس کے علاوہ بعض اور مضامین رکھے گئے ہیں ۔ جو مادری زبان میں پڑھائے جاتے ہیں ۔ مثلاً تاریخ، جغرافیہ ۔ حساب ۔ علم التعلیم ۔ ان مضامین کی تعلیم سے مقصد یہ ہے ۔ کہ وہ معلمین بن سکیں ۔ نصاب تین سال کا ہوتا ہے ۔ ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۰۹ء تک ۶۰ سو خطا (۶۱۳ × ۶۰) طالب علموں، نے دار المعلمین میں تعلیم حاصل کی +

شریعت کالج

سراجوا کا شریعت کالج ۱۸۸۷ء میں بنیاد رکھا گیا ۔ اس کا خرچ حکومت برداشت کرتی ہے ۔ اِس کی

---

[۱] ۔ ایسے سکول جن میں قدیم زبانیں مثلاً لیٹن اور گریک پڑھائی جاتی ہوں

[۲] تانوی سکول جن میں لیٹن ۔ گریک نہ پڑھائی جاتی ہوں +

اصلی غرض و غایت یہ ہے کہ شرعی عدالتوں کے لئے جج پیدا کئے جائیں - یہ کالج مسلمانوں کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے - اس کالج میں داخل ہونے کے لئے رئیس العلماء اور حکومت کی اجازت ضروری ہوتی ہے، ۹-۱۹۰۸ء میں ۲۸ طالب العلموں نے اس کالج میں تعلیم پائی - جن میں سے ۲۵ کالج میں رہتے تھے - اور قیام و طعام کے جملہ اخراجات وصول کرتے تھے - اس کالج کا کورس پانچ سال کا ہے - نصاب میں ذیل کے مضامین شامل ہیں :- منطق، معانی و بیان، عقائد، قانون شریعت، اصول فقہ، صک (؟) فرائض - اصول المحاکمہ فقہ یورپ، ملکی زبان، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، عربی خوشخطی ۹-۱۹۰۸ء میں کالج کے ۹ پروفیسر تھے +

قومی عجائب خانہ

سراجوا کا قومی عجائب خانہ ۱۸۸۵ء میں قائم کیا گیا تھا - ۱۸۸۸ء میں حکومت نے لے لیا - ہم اسے بھی درسگاہوں میں شمار کرسکتے ہیں - اس کا ایک سہ ماہی اخبار ہے - جو ۱۸۸۹ء سے باقاعدہ نکل رہا ہے - اس کے بعض چیدہ مضامین جرمن زبان میں بھی شائع ہو چکے ہیں +

اخبارات

۱۹۰۹ء میں ۳۵ اخبارات نکلے - جن میں سے ۶ کروٹ - ۶ سروین - ۱۳ عام قومی - ۴ اسلامی - ۴ رومن کیتھولک اور ۲ سروین ارتھاڈکس مفاد کے حامی تھے +

رسم الخط

بوسینا اور ہرزی گوینا کے مسلمان جو قبضہ آسٹریا سے پہلے ترکی کی علمی آب وہوا میں پرورش پاتے تھے، ترکی اور عربی میں لکھا کرتے تھے - لیکن قبضہ آسٹریا کے بعد انہوں نے ورنیکر کو اختیار کر لیا ہے - وہ لیٹن رسم الخط میں لکھتے ہیں - چند سال ہوئے ملک کے علماء میں یہ تحریک پیدا ہوئی - کہ کم از کم مذہبی کتابوں کو سلیوی زبان میں عربی خط میں لکھا جائے - اس لئے عربی رسم الخط کو سلیوی زبان میں ملا ــــــــــــ نے کی کوشش کی گئی ہے معتمین کی نیشنل سوسائٹی کا اخبار اسی طریق سے چھپتا ہے +

شرعی عدالتیں

شرعی عدالتیں، حکومت کی عدالتوں کے ساتھ ساتھ قائم ہیں - علاقے کی شرعی عدالت میں ایک قاضی ہوتا ہے - جو باقاعدہ شریعت کالج سراجوا کا سند یافتہ ہوتا ہے - اس کے ساتھ اس کے اسسٹنٹ اور منشیوں کا سٹاف ہوتا ہے - شریعت ہائی کورٹ میں ہائی کورٹ کا پریزیڈنٹ - ہائی کورٹ کے دو جج اور دو شریعت چیف مجسٹریٹ

ہوتے ہیں۔ شریعت عدالتوں کے دائرہ اختیار کے متعلق ۱۸۸۳ء میں بوسینا حکومت نے وضاحت کر دی تھی۔ اِن کے حدود اختیارات یہ تھیں:۔

۱۔ مسلمانوں کے نکاح کے معاملات۔ جب فریقین مسلمان ہوں خواہ وہ تنازعہ جائیداد کا ہو یا کسی اور امر کا۔

۲۔ ان تنازعات کا فیصلہ کرنا جو والدین اور اولاد میں ہوں ـــــ اُنہیں وراثت کے تنازعات کا فیصلہ بھی) کرنا پڑتا ہے۔ تقسیم میراث اور جاگیر وغیرہ کے جملہ حالات بھی یہاں فیصل ہوتے ہیں +

پہلے قسم کے معاملات کا فیصلہ تنہا شریعت کورٹ کر سکتی ہے۔ لیکن باقی امور ایک مخلوط عدالت میں طے ہو سکتے ہیں۔ قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے مجلس علما سے بھی استصواب کر لیا جاتا تھا +

شرعی عدالتوں کے فیصلے (عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ) تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن حقیقی معنوں میں) ان احکام پر عمل اس وقت ہوتا ہے۔ جب عام سرکاری عدالتیں بھی اس قسم کا فیصلہ دیں +

۱۹۰۹ء میں ۲۶۲۹ مقدمات شرعی عدالتوں کے سامنے پیش ہوئے ۱۷۴۶ واقعات وراثت کے متعلق ہوئے۔ ۷۳۱۲ نکاح رجسٹر کرائے گئے اور ۸۱۹ طلاقیں منظور کی گئیں۔ شریعت کورٹ کے ججوں کی تنخواہیں ویسی ہی ہوتی ہیں جیسی اس منصب کے دوسرے ملازمین کی +

جرائم کے اعداد و شمار کے متعلق یہ معلوم رہنا چاہیئے۔ کہ ان لوگوں کی تعداد جو جرائم اور بدچلنی کیلئے مستوجب سزا قرار پائے ۳۰۷۲ تھی۔ جن میں سے ۱۰۳۲ مسلمان۔ ۱۵۰۴ ارتھاڈکس یونانی ـ ۵۱۷ کیتھولک ۱۰ یہودی ـ ۹ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے تھے +

یونانی مترجم

(سر آرتھر کانن ڈائل کا ایک نیا افسانہ)

(جناب ظفر قریشی دہلوی)

باوجود شرلک ہومز سے میری طویل اور پرانی دوستی کے میں نے کبھی اُسے اپنے رشتہ داروں یا اُنہیں سابقہ زندگی کے متعلق ذکر کرتے نہیں سنا تھا - اُسے عورتوں سے مطلق دلچسپی نہ تھی اور نہ نئی دوستی پیدا کرنے کا شوق - غرض انسانی تفریح اور ہمدردی کا جذبہ اس میں بیحد قلیل تھا - میں اسے ایک یتیم ولاوارث سمجھتا تھا جس کا کوئی رشتہ دار دنیا میں زندہ نہ تھا +

ایک دن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب شرلک ہومز نے یکایک اپنے بھائی کا ذکر کرنا شروع کر دیا میں نے کہا "ہومز! تمہاری قوت مشاہدہ اور سراغرسانی کی بے پناہ صلاحیت کوئی متوارث دولت ہے یا اکتسابی چیز" ؟

ہومز نے مسکرا کر جواب دیا "دونوں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں، میری ماں میں یہ صلاحیت موجود تھی"

"آپ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ خاندانی آرٹ ہے" ؟

"اس لئے کہ میرا بھائی مجھ سے بھی زیادہ ماہر ہے - اِس کی قوت مشاہدہ مجھ سے کہیں زیادہ تیز ہے - مگر اس نے میری طرح سراغرسانی کو پیشہ کی طرح شروع نہیں کیا ہے - وہ کبھی کبھی شوقیہ کوئی معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے - اکثر ایسے پیچیدہ مسائل میں جنہیں میں سمجھنے سے قاصر ہوتا ہوں - اپنے بڑے بھائی سے مشورہ کر لیتا ہوں - اس کی رائے صائب اور قابل قبول ہوتی ہے"

"وہ کہاں رہتا ہے" ؟ میں نے پوچھا

"وہ گونگوں کے کلب میں رہتا ہے" -

"گونگوں کا کلب" ! میرے لئے یہ ایک بالکل نیا نام تھا میں نے پوچھا " شرلک ہومز یہ کونسا کلب ہے ؟ میں نے تو نام ہی آج سُنا ہے - کیا لندن میں ہے ؟

شرلک ہومز نے آرام کرسی پر دراز ہوتے ہوئے کہا " یہ دنیا کی چند عجیب وغریب انجمنوں میں سے ایک ہے

اس کلب کے صرف وہی لوگ رکن بن سکتے ہیں جو دن بھر میں مشکل سے نصف درجن الفاظ بولتے ہوں اور اُن کے بولنے میں بھی کوفت محسوس کرتے ہوں۔ یعنی وہ لوگ جنہیں بولنے سے نفرت ہو۔ ہر وقت گم صم بیٹھے رہنا چاہتے ہوں ۔۔ جو انسانی صورتوں سے بیزار ہوں۔ جنہیں اپنے ہمجنسوں سے ملنے میں کوئی خوشی حاصل نہ ہوتی ہو، جو حد درجہ کے بددماغ آدمی ہوں۔ صرف ایسے ہی لوگ اس کلب کے ممبر بن سکتے ہیں۔ اس کلب کے احاطہ میں کسی ممبر کو بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ ممبر آتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں، اخبار اور رسالے پڑھتے ہیں۔ یا کھیل کے کمرہ میں چلے جاتے ہیں اور کوئی کھیل کھیلتے ہیں۔ لیکن کھیل کے دوران میں بھی خاموش رہتے ہیں۔ "اجنبیوں کا کمرہ"۔ صرف ایک ایسی جگہ ہے۔ جہاں باہر کے آدمی کسی ممبر سے باتیں کر سکتے ہیں۔ اور کسی جگہ اس کی اجازت نہیں۔ اگر کسی ممبر کے متعلق باتیں کرنے کی تین شکائتیں موصول ہو جائیں تو اسے رکنیت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ غرض لوگوں نے اِس عجیب و غریب کلب کا نام "گونگوں کا کلب" بالکل ٹھیک رکھا ہے۔ میرے بھائی نے اس کے قیام میں بہت سرگرمی دکھائی تھی۔ میں اکثر اس جگہ جاکر آرام حاصل کرتا ہوں۔ دُنیا کے شور و شغب اور ہنگامہ سے اگر نجات حاصل کرنا ہو تو اس عمارت کے سنسان کمروں میں جاکر کچھ آرام محسوس ہو سکتا ہے۔ میرا بھائی ٹھیک ساڑھے پانچ بجے روزانہ اس کلب میں جاتا ہے۔ اگر تم چلنا چاہو تو آج تمہیں وہاں لے چلوں۔ اس کا مکان بھی کلب کے قریب ہی ہے +

میرے لئے شرلک ہومز کی یہ گفتگو بہت اضطراب انگیز ثابت ہوئی اور میں اس کے عجیب و غریب بھائی اور اس انوکھے کلب کے دیکھنے کو فوراً آمادہ ہو گیا +

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے ہم لندن کے ایک مشہور بازار کی ایک عمارت میں داخل ہوئے اور "اجنبیوں کے کمرے" میں پہنچے۔ شرلک ہومز کا بھائی اس کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا۔ اور شرلک ہومز سے مشابہت ہی نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ ہو بہو شرلک ہومز معلوم ہوتا تھا۔ اس کا نام مائی کرافٹ ہومز تھا +

شرلک ہومز نے میرا تعارف کرایا۔ جس کے جواب میں اُس نے مسکرا کر کہا "میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ میرے بھائی نے آپ کی دوستی اور اس امداد کا جو آپ وقتاً فوقتاً اسے دیتے رہتے ہیں اکثر تذکرہ کیا ہے" +

ہم تینوں کھڑکی کے قریب کرسیاں سرکا کر بیٹھ گئے۔ سامنے بلیرڈ کھیلنے کا کمرہ تھا لوگ آکر آکر بیٹھ رہے تھے

دو آدمی ہاتھ میں چاک لئے ہوئے میز کے قریب آئے اور کھڑے ہو گئے۔ ایک شخص کی بغل میں چھوٹے چھوٹے کئی بنڈل تھے۔ اور اُس کی ٹوپی کسی قدر کج تھی اور سر پر ترچھی رکھی ہوئی تھی*

شرلک ہومز نے اس شخص کی طرف دیکھ کر اپنے بھائی سے کہا "یہ سپاہی معلوم ہوتا ہے"*

"اور ابھی ابھی فوج سے آیا ہے" بھائی نے جواب دیا

"میرے خیال میں ہندوستان میں کسی فوج میں ملازم تھا"

"اور افسر بھی تھا"

"شاہی توپ خانہ میں"

"رنڈوا بھی ہے"

"ایک بچہ بھی ہے"

"نہیں نہیں بھائی کئی بچے ہیں"

میں ان دونوں بھائیوں کی اس بے ربط گفت گو کو انتہائی حیرت کے ساتھ سُن رہا تھا کہ یکایک جب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا تو میں نے شرلک ہومز سے پوچھا "پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ بتاؤ یہ سب باتیں تم نے کیونکر معلوم کر لیں۔ کیا تم اس شخص سے واقف ہو؟"

"نہیں، ہم واقف نہیں ہیں۔ لیکن آخر مشاہدہ بھی کوئی چیز ہے۔ ہر شخص اس آدمی کے غصہ ور چہرہ، تحکمانہ انداز اور شدت گرمی سے جھلسی ہوئی صورت سے خیال کر سکتا ہے کہ یہ سپاہی ہے، معمولی نہیں بلکہ افسر، اور یہ کہ وہ ہندوستان میں رہ چکا ہے"*

"مائی کرافٹ نے کہا "اس نے ملازمت حال ہی میں چھوڑی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے پیروں میں ابھی تک فوجی جوتے ہیں"*

"وہ اسپ سوار کی طرح نہیں چلتا۔ اس کے جسم کا وزن اور ظاہری تناسب ظاہر کرتا ہے، کہ وہ توپ خانہ میں کام کرتا ہو گا"

"شکل کی اداسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ حال ہی میں اس کا کوئی پیارا رشتہ دار مر گیا ہے۔ چونکہ خود سودا خرید کر لایا ہے اس لئے خیال ہو سکتا ہے کہ اس کی بیوی مر گئی ہے۔ جو چیزیں اس کی بغل میں ہیں وہ ایسی ہیں (مثلاً کھلونوں کا ڈبہ)، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا کوئی چھوٹا سا بچہ ہے۔ تصویروں کی ایک کتاب بھی ساتھ

ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور بڑا بچہ بھی ہے"۔

میں یہ منطق سُن کر دونوں بھائیوں کی قوت تخمین ومشاہدہ پر انگشت بدندان رہ گیا۔

مائی کرافٹ نے شرلک ہومز سے تھوڑی دیر بعد کہا "شرلک ہومز! ایک بہت ضروری بات کہنی بھول گیا تھا۔ اس میں ضرور کچھ مدد دینا"۔

"ہاں ضرور دوں گا۔ بیان کرو"

یہ سُن کر شرلک ہومز کے بھائی نے ایک کاغذ کے پرزہ پر کچھ لکھا۔ اور گھنٹی بجا کر کلب کے ملازم کو بُلایا اور اسے دے دیا، اور پھر کہا "میں نے مسٹر میلز کو بلایا ہے۔ یہ میرے مکان سے بالکل قریب رہتے ہیں۔ میری ان کی معمولی شناسائی ہوگئی ہے۔ وہ مجھ سے اپنا عجیب وغریب واقعہ سنانے آئے تھے۔ مسٹر میلز وطن کے اعتبار سے یونانی ہیں۔ مگر کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ وہ مترجم کی حیثیت سے لندن میں رہتے ہیں"۔

تھوڑی دیر بعد ایک مضبوط آدمی کمرہ میں داخل ہوا۔ ہمارا تعارف ہوا۔ اور یونانی مترجم نے کرسی پر جم کر بیٹھتے ہوئے کہا "اگر آپ میری داستان سننے کے لئے تیار ہیں تو کچھ عرض کروں"۔

"ضرور ضرور" ہم نے کہا

"آپ کو معلوم ہے میں مترجم ہوں۔ لیکن چونکہ میرا نام اور وطن وغیرہ یونانی ہے۔ اس لئے جس زبان سے مجھے زیادہ لگاؤ ہے وہ یونانی ہے۔ مگر اس کے علاوہ میں تقریباً ہر مشہور زبان کا ترجمہ کرسکتا ہوں میں لندن کے چند مشہور مترجمین میں سے ہوں۔ ہوٹلوں میں میری کافی شہرت ہے"۔

"اکثر اوقات مجھے رات کو سوتے ہوئے اٹھایا جاتا ہے اور ترجمہ کرنے کے لئے دور دراز مقامات پر لے جایا جاتا ہے۔ بہت سے غیر ملکی لوگ جو لندن میں نووارد ہوتے ہیں کسی مشکل میں گرفتار ہو کر میری مدد لینے آتے ہیں۔ اور مجھے ہر وقت لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہ تھی کہ مجھے گذشتہ پیر کی شب کو گیارہ بجے ایک شخص لینے کو آیا۔ اس شخص کا نام لیٹر تھا۔ اُس نے بیان کیا، کہ اُس کا ایک یونانی دوست اس سے ملنے آیا ہے، اور وہ چونکہ سوائے اپنی مادری زبان کے کوئی زبان نہیں بول سکتا۔ اس لئے ایک مترجم کی شدید ضرورت ہے۔ میں چلنے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ نووارد نے مجھے جلد جلد لے جاکر ایک بند گاڑی میں بٹھا دیا۔ اور اشارہ پاتے ہی گاڑی روانہ ہوگئی"۔

"مسٹر لیٹر نے راستہ میں کہا" میرا مکان یہاں سے کسی قدر دُور ہے ——— کین سنگٹن میں

بتایا تھا ——— ہماری گاڑی سڑکوں اور بازاروں کو عبور کرتی ہوئی گذری چلی جا رہی تھی کہ یکایک لیٹر نے اپنی جیب میں سے ایک بھرا ہؤا پستول نکالا اور اُسے اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں اس خوفناک نظارہ سے تھرّا اُٹھا۔ میں پریشان تھا۔ کہ کیا ماجرا ہے۔ یہ شخص کیوں اس طرح میرا اغوا کرنا چاہتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کھڑکی کھول کر چیخوں اور "مدد" کے لئے لوگوں کو پکاروں۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے یہ معلوم کیا کہ کھڑکیاں کیلوں سے جڑ دی گئی تھیں اور باہر کی طرف نیلا کاغذ چپاں کر دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے بیرونی دنیا سے کوئی تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے مضطرب ہو کر کہا "مسٹر لیٹر یہ تو بہت بیجا بات ہے، آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ ایک غیر قانونی بات کر رہے ہیں"۔

"مسٹر لیٹر نے جواب دیا" آپ بالکل مطمئن رہیئے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن اگر آپ نے شور مچانے کی کوشش کی تو یہ بہت بُری بات ہوگی۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ آپ میرے ساتھ آئے ہیں اگر میں آپ کو قتل کر دوں تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اس لئے آپ کے فائدہ کی غرض سے کہتا ہوں کہ چپ چاپ بیٹھے رہئے۔ مکان پر بھی پہنچکر اگر آپ نے شور مچانے یا کسی کو اپنی آمد کی اطلاع کرنے کی کوشش کی تو سمجھ لیجئے آپ کی خیر نہیں ہے"۔

میں راستہ بھر خاموش رہا۔ حتیٰ کہ گاڑی ایک سنسان جگہ پر بار ٹھیر گئی یہاں پہنچکر مترجم نے رک کر ایک سگار سلگایا۔ اور چند کش لینے کے بعد شرلک ہومز کے مضطرب چہرہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"میں یہ سمجھ گیا کہ لندن کے باہر تھا۔ سامنے ایک مکان تھا جو بظاہر سنسان معلوم ہوتا تھا۔ روشنی مطلق نظر نہ آتی تھی۔

لیٹر نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور مجھے سہارا دے کر اُتارا۔ میں مکان میں داخل ہؤا۔ لیکن کسی جگہ روشنی نظر نہ آئی۔ اندھیرے میں ہوتا ہؤا ایک پائیں باغ میں سے گذرا اور بالآخر ایک کمرہ کے قریب پہنچکر ٹھہر گیا۔ میرے ساتھی نے دروازہ پر دستک دی۔ جس کے جواب میں کسی نے دروازہ کھولا۔ اُس نے کسی قدر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کیا یہی مترجم صاحب ہیں ہیرلڈ؟"

"ہاں"

"بہت خوب اندر تشریف لائیے" میں کمرہ میں داخل ہؤا۔ لیکن کمرہ میں نصف تاریکی تھی۔ ایک کونہ میں

ایک میز بچھی ہوئی تھی جس پر ایک لیمپ جو لصف ڈھکا ہؤا تھا رکھا تھا۔ اس کی روشنی ایک محدود دائرہ تک پہنچتی تھی۔ ورنہ سارے کمرہ میں اندھیرا گھپ تھا" +

بڑے آدمی نے لیٹر سے کہا "کیا سلیٹ موجود ہے"؟

"ہاں"

"اچھا تو اسے یہاں لے آؤ" +

لیٹر چند لمحے کے لئے غائب ہوگیا۔ اور اپنے ساتھ ایک میانہ قد نوجوان کو . . . لایا۔ اُس کا چہرہ زرد تھا۔ اور مُردنی چھائی ہوئی تھی، اُس کے جسمانی ضعف سے زیادہ مجھے جس چیز نے اور چونکا کر دیا وہ یہ تھا کہ اس شخص کے چہرہ پر پلستر کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور ٹھیک مُنہ پر ایک موٹی سی تہ اس طرح جما دی گئی تھی کہ بولنا ناممکن تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شخص کوئی بدنصیب قیدی ہے۔ جسے ان لوگوں نے ناجائز طور پر محبوس کر رکھا ہے اور اس سے کسی اہم مقصد کی تکمیل کرانا چاہتے ہیں" +

بڑے آدمی نے مجھ سے کہا" مسٹر میلز آپ کو دوبارہ یاد دلاتا ہوں کہ آپ کے ذمہ ایک بہت اہم کام ہے اِسے ایمانداری سے انجام دیجئے۔ اگر آپ نے اِس شخص سے ہمارے سوالات کے علاوہ اور سوالات کئے تو چھانہ ہوگا۔ نیز اس کے متعلق کسی سے ذکر نہ کیجئے گا۔ ورنہ جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ آپ اگر کسی سے ذکر کریں گے تو ہمیں اپنے مخصوص ذرائع سے معلوم ہو جائے گا اور آپ کو اِس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا +

میں نے انہیں کامل رازداری کا یقین دلایا اور پوچھا کہ اس شخص سے کیا پُوچھوں۔ جس کے جواب میں لیٹر نے کہا" آپ پوچھئے کیا یہ کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہے" +

" قیدی کی آنکھیں کسی قدر غصّہ سے مشتعل ہونے لگیں" +

"ہرگز نہیں" میرے سوال کے جواب میں قیدی نے یونانی میں سلیٹ پر لکھا۔

"کسی شرط پر بھی نہیں" ؟ میں نے سٹیمر کے پوچھنے پر سوال کیا

" بشرطیکہ لڑکی کی شادی کسی ایسے یونانی پادری کے سامنے ہو جسے میں بھی جانتا ہوں"

پھر میں نے حسب ایما سوال کیا" تمہیں اپنا حشر معلوم ہے، غور کر لو" +

" مجھے اپنی کوئی پروا نہیں" قیدی نے ترش رو ہو کر جواب دیا +

" مسٹر شرلک ہومز! یہ اور اسی قسم کے چند سوالات تھے جو میں نے یونانی زبان میں ایک قیدی سے کئے

مگر اس نے میرے متواتر سوالوں کا جواب ہمیشہ نفی میں دیا - پھر میرے ذہن میں یکایک ایک اور خیال آیا کہ ان سوالات کے ساتھ ساتھ کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کر دیا کروں اور اس پراسرار معاملہ کی بابت کچھ معلوم کروں - ابتدا میں تو میں نے اس سے بہت عام قسم کے سوالات کئے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان میں سے کوئی انہیں تاڑ سکتا ہے یا نہیں مگر معلوم ہؤا کہ میں جو سوالات کرنا چاہتا تھا کرسکتا تھا - انہیں مطلق علم نہ تھا، اب میری گفتگو کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی :-

"تم اس ضد سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے ———— تم کون ہو"؟

"میں پروا نہیں کرتا ———— میں لندن میں ایک غریب الوطن ہوں"

"تمہیں پچھتانا پڑے گا ———— تم یہاں کب سے ہو"؟

"کوئی ہرج نہیں ———— تین ہفتے سے"

"مال تمہیں اب نہیں مل سکتا ———— تمہیں کیا تکلیف ہے"؟

"یہ بدمعاشوں کو ہرگز نہیں ملے گی ———— یہ مجھے فاقے کرا رہے ہیں"

"اگر تم دستخط کر دو تو رہا کر دیئے جاؤ گے ———— یہ مکان کہاں ہے"؟

"میں دستخط نہیں کروں گا ———— مجھے نہیں معلوم"

"تم لڑکی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کر رہے ———— تمہارا نام کیا ہے"؟

"کیا مضائقہ ہے ———— میرا نام "کری ٹس" ہے"

"اگر تم دستخط کر دو تو لڑکی سے ملا سکتے ہیں ———— تم کہاں سے آئے ہو"؟

"میں اُسے دیکھنا ہی نہیں چاہتا ———— ایتھنز"

غرض مسٹر ہیرلڈ اگر پانچ منٹ مجھے اور مل جاتے تو اس طرح مجھے ساری کہانی معلوم ہو جاتی - مگر میں ایک سوال کرنا چاہتا ہی تھا کہ دفعتہً ہال کا دروازہ کھلا - اور ایک خوبصورت لڑکی دیوانہ وار اندر داخل ہوئی اُس نے آتے ہی بہت شستہ انگریزی میں کہا "ہیرلڈ میں زیادہ دیر تک اس عورت کے پاس نہیں رہ سکتی تھی مگر! ——

مگر اے ———— میرے خدا ———— یہ تو پال ہے"

"یہ آخری الفاظ یونانی میں کہے گئے اور لڑکی آگے جھپٹی اور قیدی سے چمٹنے کی کوشش کرنے لگی - قیدی بھی "صوفیہ، صوفیہ" ! کہتا ہؤا آگے بڑھا مگر اس سے پہلے کہ یہ دونوں ہم آغوش ہو سکتے - ظالم لیٹر کے

آہنی پنجہ نے اُنہیں جدا کر دیا اور وہ لڑکی کو دھکیلتا ہُوا دروازہ کی طرف لے گیا اور اُسے باہر نکال کر دروازہ مقفل کر دیا۔

"لڑکی کو باہر کر دینے کے بعد بڑے آدمی نے کہا" یہ پانچ پونڈ آپ کی فیس حاضر ہے۔ اب آپ کو میں اسی گاڑی میں بھجوا دیتا ہوں لیکن ——— "اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا" اگر تم نے کسی انسان سے آج کی بابت ذکر کیا تو تمہاری جان کی خیر نہیں ہے، اچھی طرح سمجھ لو"۔

میں نے روپیہ جیب میں ڈالا اور سلام کر کے آگے بڑھا۔ دروازہ کھول دیا گیا، اور لیٹر مجھے ہاتھ پکڑ کر اس سرعت کے ساتھ مکان کے دروازہ میں لے آیا۔ کہ میں اپنے ماحول کا اچھی طرح اندازہ بھی نہ لگا سکا۔

"میری گاڑی مکان سے دو میل کے فاصلہ پر یکایک رُکی اور لیٹر نے مجھے اتارتے ہوئے کہا" افسوس ہے کہ ذاتی مصلحتوں کے لحاظ سے آپ کو یہاں اُتارنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے متعلق کوئی یہ معلوم نہ کر سکے کہ رات کو گاڑی میں بیٹھ کر کہیں گئے تھے"۔

میں نے اُتر کر گاڑی کو اچھی طرح دیکھنا چاہا۔ مگر وہ موڑ پر سے گذر کر ہوا ہو گئی تھی۔ میں بادلِ ناخواستہ گھر آیا اور سو گیا۔ صبح اُٹھتے ہی یہ واقعہ اپنے دوست مسٹر مائی کرافٹ کو سُنایا۔ جنھوں نے کہا میرا بھائی شرلک ہومز آپ کی ضرور مدد کرے گا۔

ہم سب نے ان عجیب و غریب واقعات کو بہت دلچسپی سے سُنا۔ یکایک شرلک ہومز بولا" اس کے بعد کچھ اور ہُوا"۔

مائی کرافٹ نے اخبار" ڈیلی نیوز" اُٹھایا اور اس میں سے یہ عبارت پڑھی:۔

"جو شخص ایک یونانی شخص مسمی پال کری دس کا پتہ بتائے گا۔ اُسے معقول انعام دیا جائے گا۔ اسی قدر انعام اس یونانی لڑکی کے پتہ دریافت کرنے کا بھی دیا جائے گا۔ جس کا نام صوفیہ ہے۔ جوابات ۲۴۷۳ جنرل پوسٹ آفس کی معرفت آنے چاہئیں"۔

"یہ اشتہار ہر روزانہ اخبار میں چھپوا دیا گیا تھا۔ مگر ابھی تک کوئی جواب موصول نہیں ہُوا ہے"

شرلک ہومز نے پوچھا" یونانی قونصل خانہ سے دریافت کیا گیا ہے"

"ہاں۔ مگر وہ اِن دونوں کے متعلق لاعلم ہیں۔

شرلک ہومز نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا "مسٹر میلز ان لوگوں کو اس اشتہار سے معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ آپ نے رازداری سے کام نہیں لیا۔ اِس لئے اب آپ کو اپنی حفاظت کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ میری نصیحت ہے کہ آپ ذرا ہوشیار رہیئے گا۔ میں اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔ اور اس پر غور کرکے آپ کو اطلاع دوں گا۔"

جب میں اور شرلک ہومز گھر واپس آرہے تھے تو اس نے پوچھا "ڈاکٹر واٹسن تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ یعنی اس معاملہ کی تہ میں کیا ہے؟"

"ایک انگریز مسمی ہیرلڈ لیٹمر نے اس عورت کا اغوا کیا ہے"

"کہاں سے"

"ایتھنز سے"

"نہیں" شرلک ہومز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ لڑکی انگریزی بول سکتی ہے۔ اس سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ انگلستان میں کچھ دنوں رہی ہے مگر ہیرلڈ یونانی کا ایک حرف بھی نہیں بول سکتا جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ کبھی ایتھنز نہیں گیا۔"

میں نے جواب دیا "تو پھر یہ ہوسکتا ہے کہ لڑکی انگلستان کسی غرض سے آئی ہوئی تھی کہ اس شخص ہیرلڈ نے اسے ورغلا لیا۔"

"ہاں یہ کسی قدر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے"

"اِس کے علاوہ یہ ہوسکتا ہے کہ جب اس یونانی کو معلوم ہوا ہوگا۔ کہ اس کی رشتہ دار صوفیہ اِس طرح انگلستان میں اغوا کرلی گئی ہے تو وہ یہاں آیا ہوگا اور ان دونوں نے اسی بھی پکڑ کر مقید کرلیا ہوگا اور اس پر ظلم و تعدی کرکے اس سے ایسے کاغذات پر دستخط کرانا چاہتے ہوں گے۔ جن سے اس لڑکی کی کچھ جائیداد یا املاک۔ وغیرہ ان کے نام ہوجاتی ہوگی ———— شاید یہ شخص اس لڑکی کا بھائی ہوگا۔ اور اُس کے دستخطوں کی ضرورت ہوگی۔ چونکہ یہ لوگ یونانی نہیں جانتے تھے۔ اِس لئے معاملہ طے کرنے کے لئے انہیں کسی یونانی مترجم کی ضرورت پڑی ہوگی۔ چنانچہ وہ مشہور مسٹر میلز کو لے گئے۔ اور اس وجہ سے ہمیں بھی یہ کہانی معلوم ہوگئی۔ لڑکی کو بھائی کی آمد کی اطلاع نہیں دی گئی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ یکایک

کمرہ میں آئی - تو اُس نے حیرت و استعجاب کا اظہار کیا +

"بہت خوب!" میں چلّایا +

ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی - جب اپنے کمرہ میں ہم نے مائی کرافٹ کو بیٹھے ہوئے دیکھا - اس نے ہماری حیرانی کو دیکھ کر کہا "آپ حیران کیوں ہوتے ہیں - میں ایک خاص کام کی وجہ سے موٹر میں بیٹھ کر آپ سے پہلے پہنچ گیا - آپ پیدل آ رہے تھے اس وجہ سے دیر میں پہنچے +

" اس قدر جلدی کرنے کی وجہ، ہم ابھی تو تم سے مل کر آئے ہیں" ہ شرلک ہومز نے پوچھا "اشتہار کا جواب موصول ہوا ہے" +

اچھا، کہاں "

مائی کرافٹ نے جیب میں سے ایک سفید کاغذ نکالا اور کہا " یہ خط ابھی موصول ہوا ہے کسی ادھیڑ عمر کے آدمی نے "جے" نب سے لکھا ہے وہ جسمانی طور پر ضعیف ہے - لکھتا ہے" آپ کے اشتہار کے جواب میں عرض ہے کہ میں اس یونانی لڑکی کی اندوہناک داستان سے بخوبی واقف ہوں - اگر آپ مجھ سے ملیں تو سب حال عرض کروں کہ آج کل وہ بیکن ہم کے مشہور مکان' مارٹل" میں مقیم ہے"

جناب کا بہی خواہ ———— جے، ڈیون پورٹ"

" یہ خط برگٹسن سے لکھا گیا ہے - بہتر ہے کہ ہم وہاں چل کر اس بدنصیب لڑکی کی داستان سنیں اور کچھ نتیجہ نکال سکیں" مائی کرافٹ نے کہا :-

" شرلک ہومز نے کہا" ہرگز نہیں - بھائی کی زندگی بہن کی داستان سے زیادہ قیمتی ہے - اس لئے ہم اُسے بچانے کی کوشش کریں گے - بہتر ہے کہ سکاٹ لینڈ یارڈ چل کر انسپکٹر گریگسن کو لے لیں اور رستہ میں سے مسٹر میلز کو بھی اور پھر سب چل کر اس بدنصیب قیدی کو چھڑائیں" +

ہم تینوں یہاں سے روانہ ہوئے اور تھانہ سے انسپکٹر کو لیتے ہوئے مسٹر میلز کے مکان پر پہنچے - مگر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی - جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی کسی کے ساتھ باہر گئے ہیں - ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور ان بدمعاشوں نے مسٹر میلز پر بھی چھاپہ مارا اور وہ انہیں دم دلاسا دے کر لے گئے +

ہم جلدی ٹرین میں سوار ہوئے اور بیکن ہم پہنچے - انسپکٹر صاحب مکان کی تلاشی کا وارنٹ ساتھ لیتے گئے تھے، اس لئے ہمیں اب کوئی دقت نظر نہ آتی تھی +

ٹرین سے اتر کر نصف میل طے کرنے کے بعد ہم اس مکان پر پہنچے، مگر وہ بند تھا۔ کھڑکیوں میں سے روشنی بھی نظر نہیں آرہی تھی اور ظاہری خاموشی سے بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ مکان خالی ہوگیا ہے۔ شرلک ہومز نے پھرتی سے ایک کھڑکی کا شیشہ توڑ کر ہاتھ ڈالا۔ اور چٹخنی کھول کر دروازہ کھول دیا۔ گویا اسے اس طرح دروازے توڑنے کا خاص ملکہ تھا۔

ہم جلد اندر اترے۔ کمرے میں اندھیر اگھپ تھا۔ بلکہ دھوُاں مسلط تھا۔ ہمیں چھینکیں آئیں اور سانس گھٹنے لگا۔ انسپکٹر گرگسین نے اپنا برقی لمپ روشن کیا۔ تو ہال کے ایک کونہ میں دو شخص اوندھے پڑے ہوئے نظر آئے۔ اُن کے قریب ہی ایک تپائی پر ایک دھات کا برتن رکھا ہوا تھا۔ جس میں کوئی چیز جل رہی تھی۔ یہ دُھوُاں اسی میں سے نکل رہا تھا۔ شرلک ہومز نے جلدی سے کمرہ کا دروازہ کھولا اور روشندان اور کئی کھڑکیاں جنہیں احتیاط سے بند کیا گیا جلد جلد کھول دیں۔ دُھوُاں باہر نکلنے لگا۔ اور ہماری جانیں بچیں ورنہ زہریلا دھوُاں ہمیں ان دونوں شخصوں کی طرح تباہ ہی کرکے چھوڑتا۔

میں نے وہ برتن تپائی پر سے اٹھا کر باہر باغ میں پھینک دیا اور سب نے مل کر ان دونوں کو اٹھایا اور باہر ہوا میں لے جاکر انہیں گھاس پر لٹایا۔ میں نے دونوں کی نبضیں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ ایک شخص تو مر چکا تھا۔ مگر دوسرا ابھی سسک رہا تھا۔

کپڑوں اور شکل کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ دوسرا شخص جس کے جینے کے آثار تھے وہ ہمارا دوست یونانی مترجم تھا۔ ہمارا خدشہ صحیح تھا۔ بدمعاشوں نے یونانی مترجم اور اس کے رازداروں کو زہریلی گیس سے مارنا چاہا تھا ایک چونکہ پہلے ہی نیم مردہ تھا اس لئے زیادہ دیر تک گیس برداشت نہ کرسکا دوسرے کی عمر تھی تو بچ گیا۔

میں نے معمولی طریقہ سے تنفس جاری کرایا، اور پانی وغیرہ کے چھینٹے دیئے جس کی وجہ سے یونانی مترجم کو تھوڑی دیر کے بعد کچھ کچھ ہوش آیا۔ اور وہ اس قابل ہوگیا۔ کہ باتیں کرسکے۔ مگر اس نے کچھ زیادہ لمبی داستان نہیں سنائی وہی ہوا جو خیال کیا تھا۔ یعنی لیٹر انہیں لینے آیا۔ اور ایک پستول دکھا کر کہا۔ ایک دفعہ پھر میرے ساتھ چلو۔ قیدی سے دوبارہ باتیں کرنی ہیں۔

مترجم پر کچھ ایسا خوف چھایا کہ وہ لیٹر کے ساتھ ہولیا۔ مکان پر پہنچکر اس نے قیدیوں سے دوبارہ ملاقات کی۔ مگر اس دفعہ بھی قیدی نے دستخط کرنے اور ان لوگوں کی خواہشات پوری کرنے سے انکار کر دیا۔ "ان لوگوں نے دونوں کو کمرہ میں قید کر کے" اور گیس روشن کر کے راہ فرار اختیار کی اور چلتے ہوئے کہہ گئے "مسٹر میلز یہ آپکی

غداری کی سزا ہے" +

جس شخص نے ہمارے اشتہار کا جواب دیا تھا - اس سے خط و کتابت کرنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ یہ یونانی لڑکی ایک متمول خاندان کی فرد تھی - اور یہ قیدی اس کا بھائی تھا - لڑکی اپنی کسی سہیلی سے ملنے کے لئے انگلستان آئی تھی یہاں وہ کسی شخص ہیرلڈ لیٹیرا کے ہتھے چڑھ گئی - اُس نے لڑکی کو ورغلایا - اور اپنے ساتھ بھاگنے پر مجبور کیا، اِس اثناء میں لڑکی کے جاننے والوں نے اس کی خبر اس کے بھائی کو ایتھنز میں دے دی اور وہ فوراً انگلستان آیا - لیکن اتفاق یا غلطی سے وہ بھی ان لوگوں کے بہکائے میں آ گیا - اور اس طرح ان کے قید میں پڑ گیا +

یہ چونکہ زبان سے ناواقف تھا اس لئے ان لوگوں نے ——— دوسرا شخص جس کا نام ولسن کیمپ تھا اور جو بڑا پکا بدمعاش تھا ——— اسے بھوکا رکھنا اور طرح طرح کی ایذائیں پہنچانا شروع کیں، اور مجبور کیا کہ اپنی اور اپنی بہن کی تمام جائیداد ان دونوں کے نام لکھ دے - ظاہر تھا کہ اس نے ایسا کرنے سے قطعاً انکار کر دیا - اور جب انہوں نے دیکھا کہ یہ نہیں مانتا تو انہوں نے اسے اور اس کی مدد کرنے والے مترجم کو جس نے اُن سے "غداری" کی تھی موت کی سزا دی اور چند گھنٹے کا نوٹس دے کر لڑکی کے ہمراہ فرار ہو گئے +

قیدی کے چہرہ پر پلستر کی تہیں اِس وجہ سے جمائی گئیں تھیں کہ اگر اتفاق سے لڑکی اپنے بھائی کو اچانک دیکھ پائے ——— اور جس کا بہت کم امکان تھا ——— تو وہ پہچان نہ سکے - مکان میں بھائی اور بہن دونوں قیدیوں کی طرح محبوس رکھے جاتے تھے اور ایک دوسرے کو خبر نہ تھی کہ وہ یہاں موجود ہیں - یونانی مترجم نے جس دن قیدی سے گفت و شنید کی اُس دن لڑکی اتفاقیہ آ نکلی تھی اور اس نے بیک نظر اپنے بھائی کو باوجود اس پریشان حالی کے فوراً پہچان لیا تھا +

ہمیں کئی مہینے کے بعد بوڈاپسٹ (ہنگری) سے ایک اخبار کا کٹا ہوا ٹکڑا موصول ہوا - جس میں ایک واقعہ درج تھا، کہ کس طرح دو انگریز جن کے ساتھ ایک غیر برطانوی عورت بھی ایک دوسرے سے لڑ کر اور باہم زخمی ہو کر مر گئے - شرلک ہومز کہتا ہے کہ یونانی لڑکی اور اس کے بدقسمت بھائی کا قدرت نے شائد یونہی انتقام لیا ہو گا - مگر جب تک وہ یونانی لڑکی نہ مل جائے اس قیاس کی صحت نہیں ہو سکتی - گو یہ خیال قرین قیاس ضرور معلوم ہوتا ہے +

غزل

(جانشین میر و غالب مصور جذبات جناب ثاقب لکھنوی)

مصور جذبات جناب ثاقب لکھنوی عہدِ حاضر کے اساتذۂ سخن کی صفِ اول میں شمار کئے جاتے ہیں یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ آپ نے ہماری پیہم درخواستوں پر مخزن کی طرف گوشۂ چشم التفات مبذول فرمایا ہے - ہمیں قوی امید ہے کہ آپ اپنے افکار عالیہ سے قارئین مخزن کو ہمیشہ محظوظ اور لطف اندوز ہونے کا موقع دیں گے - موصوف کی عنایات مسلسل کے لئے ہم شکریہ ادا کرتے ہیں - (مدیر)

دلِ پُر درد ایسا ہے کہ درد ایجاد کرتا ہے
زمانہ رو رہا ہے یوں کوئی فریاد کرتا ہے

جہاں میں کوئی شے میں ہوں تو موقع ہی شکایت کا
نہ کوئی بھولتا ہے اور نہ مجھ کو یاد کرتا ہے

یہ سب احباب تھے جو ہٹ گئے میرے نشیمن سے
چمن کا پتہ پتہ خاطرِ صیاد کرتا ہے

تعجب ہے کہ تنکے کو پہاڑ اپنا عدو سمجھے
رگِ گردن کا شکوہ خنجرِ فولاد کرتا ہے

شبِ غم جھیلنے والے بجا لاتے ہیں شکر اُس کا
مؤذن صبح ہوتے ہی خدا کو یاد کرتا ہے

یہی وہ ہیں کہ جن سی دوست دشمن خوش نہیں کوئی
سُنا ہے میرے نالوں کا گلہ صیاد کرتا ہے

مرے آنسو کا گرنا ایک دفتر ہے مصائب کا
ستارہ ٹوٹتا ہی جب تو دل کو یاد کرتا ہے

ہمیں تھی کی جنھوں نے روشنی گورِ غریباں میں | وگرنہ مٹکے ویرانے کو کون آباد کرتا ہے

نوشتے لوحِ مرقد کے کوئی پڑھتا نہیں ثاقبؔ
یہ وہ بھولے ہوئے ہیں جن کو گردوں یاد کرتا ہے

وله

مشکل تبدیل دورِ چرخ آساں ہوگئی | جب کٹا کوئی گلا بس عید قرباں ہوگئی

ہم نے دیکھا تھا کہ دل معمورۂ امید تھا | اب یہ سنتے ہیں کہ وہ بستی بھی ویراں ہوگئی

پھر حوادث سے قیامت تک وہ مٹنے کی نہیں | جس جگہ آبادئ گورِ غریباں ہوگئی

ابرِ باراں کا پسینا اور مرے دل کا لہو | خیر ان دونوں سے تعمیرِ گلستاں ہوگئی

ایک دم تھا جو کسی صورت نکلتا ہی نہ تھا
عشق کے ہاتھوں سے یہ مشکل بھی آساں ہوگئی

نظامِ عالم

یہ سطور انگلستان کے مشہور اہل قلم برٹرینڈ رسل کی کتاب "راہ آزادی" کے آٹھویں باب کا ترجمہ ہیں +

(مترجم)

اکثر مرد عورتوں کی روزانہ زندگی میں خوف کو امید سے زیادہ دخل ہے - انہیں اپنے مقبوضات کا خیال زیادہ ہے، جو دوسرے ان سے چھین سکتے ہیں بہ نسبت اس خوشی اور مسرت کے جو یہ خود اپنی زندگی میں پیدا کرسکتے ہیں اور ان زندگیوں میں جن سے انہیں واسطہ پیدا ہو +

زندگی اس طرح جینے کے لئے نہیں ہے +

جن لوگوں کی زندگیاں خود اپنے لئے، اپنے دوستوں کے لئے یا دنیا کے لئے بارآور ہیں اُنہیں امید ابھارتی اور خوشی سہارا دیتی ہے - یہ اپنے تخیل میں ان چیزوں کو جو ہوسکتی ہیں — انہیں عالم وجود میں لانے کی راہ کو دیکھتے ہیں - شخصی تعلقات میں انہیں اس کی فکر نہیں ہوتی - کہ یہ جس محبت اور عزت کے مورد ہیں، کہیں اسے زائل نہ کردیں - یہ فراخدستی سے محبت اور عزت دیتے ہیں اور انعام بلا اُن کے مانگے خود بخود آتا ہے - اپنے کام میں اُنہیں مقابلہ کرنے والوں کا رشک نہیں ستاتا - انہیں سروکار رہتا ہے اس معاملہ سے جو انجام دینا ہے - سیاست میں یہ اپنا وقت اپنے طبقہ یا اپنی قوم کی ناجائز مراعات کی حمایت میں صرف نہیں کرتے بلکہ ساری دنیا کو بہ حیثیت کل زیادہ خوش - کم بیرحم، مقابل حرصوں کے جھگڑوں سے کم اور ان انسانی وجودوں سے زیادہ پر بنانا چاہتے ہیں جن کی نشو ونما ظلم اور دباؤ سے مسدود ہو کر ماری نہ گئی ہو +

جس زندگی کی روح یہ ہو - جس روح کا مقصد چیزوں پر قبضہ کرنے کے بجائے، اُن کا بنانا ہو - اس زندگی میں ایک گہری مسرت ہوتی ہے - جسے نامساعد اسباب اس سے کلیتہً نہیں چھین سکتے - یہی وہ طریقۂ زندگی ہے - جو انجیل مقدس نے اور دنیا کے بڑے بڑے معلموں نے پیش کیا ہے - جنھوں نے اُسے پالیا - وہ خوف کے استبداد سے آزاد ہو گئے - کیونکہ انہیں اپنی زندگی میں جو چیز سب سے عزیز ہے، وہ کسی خارجی قوت کے دسترس میں نہیں، اگر سب انسان باوجود مشکلات اور مایوسیوں کے اس زندگی کا منظر دیکھ لینے اور ایسی زندگی گزارنے کی ہمت

کر لیتے، تو کچھ ضرورت نہ تھی کہ دنیا کی تجدید سیاسی اور معاشی اصلاح سے شروع کی جاتی۔ جس اصلاح کی ضرورت ہے وہ افراد کی اخلاقی تجدید کی وجہ سے خود بخود بلا مقاومت پیدا ہو جاتی۔ لیکن اگرچہ کئی صدیوں سے دنیا نے مسیح کی تعلیم کو قبول کر لیا ہے۔ تاہم آج بھی اس کے اتباع کرنے والوں کو اسی طرح ایذا دی جاتی ہے جس طرح قسطنطین سے قبل کے زمانہ میں دی جاتی تھی۔ تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ایک ہنگامہ خیز زندگی کی بدیہی برائی کی تہ میں ایمان اور تخلیقی امید کی مخفی مسرّت دیکھ سکیں۔ اگر خوف کے غلبہ کو دُور کرنا ہے تو جہاں تک عام انسانوں کا تعلق ہے یہ کافی نہیں کہ تقدیر اور نصیب سے لاپروائی کی تلقین کی جائے، بلکہ خوف کے اسباب کا دُور کرنا ضروری ہے، یہ ضروری ہے کہ اچھی زندگی دنیاوی اعتبار سے ناکام زندگی نہ ہو۔ ضروری ہے کہ اس ضرر کو کم کیا جائے جو ان لوگوں کو پہنچایا جا سکتا ہے، جو اپنی مدافعت میں چالاک نہیں۔

ہم جن زندگیوں سے واقف ہیں، ان کی برائیوں پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ برائیاں تین گروہوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ اوّل تو وہ برائیاں جن کی وجہ فطرتِ طبیعی ہے، ان میں موت، درد اور زمین سے غذا وغیرہ پیدا کرنے کی دشواریاں ہیں۔ انہیں ہم "طبیعی برائیاں" کہیں گے۔ دوسری وہ برائیاں ہیں جو بھگتنے والے کی سیرت یا صلاحیت کے نقص سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں جہل، قوت ارادی کی کمی، اور شدید جذبات ہیں جنہیں ہم "سیرت کی برائیاں" کہیں گے۔ تیسرے وہ برائیاں ہیں جو ایک شخص یا گروہ کے دوسرے پر اقتدار یا تسلّط سے وابستہ ہیں۔ ان میں صرف کھلا استبداد ہی نہیں بلکہ آزاد نشو و نما کی راہ میں ہر مداخلت شامل ہے۔ خواہ یہ "خیر" سے پیدا ہو، یا شدید دماغی تاثر سے۔ جیسا کہ تعلیم میں ہو سکتا ہے۔ انہیں ہم "قوت کی برائیاں" کہیں گے۔ نظام اجتماعی کا ان تین قسم کی برائیوں سے جو تعلق ہے اسی کے اعتبار سے اس نظام پر حکم لگایا جا سکتا ہے

ان تین قسموں میں ایک دوسرے سے کوئی صاف و صریح فرق نہیں کیا جا سکتا۔ خالص طبعی برائی کی ایک حد ہے اور کبھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ہم اس حد کو پہنچ جائیں گے، ہم موت کو نہیں مٹا سکتے۔ ہاں حکمت کے زور سے اسے اکثر ملتوی کر سکتے ہیں۔ اور آگے چل کر یہ بات حاصل کرنا ممکن ہے کہ ایک بڑی کثرت بڑھاپے کی عمر تک زندہ رہے۔ ہم درد کو مطلقاً نہیں ہٹا سکتے، لیکن سب کے لئے تندرست زندگی حاصل کر کے ہم اسے بہت کم ضرور کر سکتے ہیں۔ بے محنت ہم زمین کو فراوانی کے ساتھ اپنے پھل دینے پر مجبور نہیں کر سکتے لیکن ہم محنت کی مقدار گھٹا سکتے اور اس کی حالت کو ایسا بہتر بنا سکتے ہیں کہ یہ کوئی برائی باقی نہ رہے۔ سیرت کی برائیاں اکثر طبعی برائیوں اور اس سے زیادہ قوت کی برائیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ کیوں کہ استبداد اسے بھی

پست کرتا ہے، جو اسے برتتے اور معمولاً اسے بھی جو اسے جھیلے، جن کے ہاتھ میں قوت ہے ان کی قوت کی برائیاں خود ان کی سیرت کی برائیوں سے اور ان طبعی برائیوں کے خوف سے جو ان کی قسمت میں لکھی ہیں۔ جن کے پاس قوت نہیں، اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اِن وجوہ سے یہ تینوں قسم کی برائیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ تاہم عام طور پر ہم اپنی بدنصیبیوں میں یہ تین قسمیں پہچان سکتے ہیں۔ وہ جن کی قریبی علت مادی دنیا میں ہے۔ وہ جو ہماری ذات کے نقائص سے پیدا ہوئی ہیں۔ اور وہ جو ہمارے دوسروں کے قابو میں ہونے کا نتیجہ ہیں۔

اِن برائیوں کے مقابلہ کے خاص خاص طریقے یہ ہیں۔ طبیعی برائیوں کے لئے حکمت یا سیرت کی بُرائیوں کے لئے تعلیم (وسیع ترین معنوں میں) اور تمام ایسے امیال و عواطف کے لئے بے روک نکاسی جن میں دوسروں پر تسلط نہ پیدا ہو۔ قوت کے عیوب کے لئے جماعت کے سیاسی اور معاشی نظام کی اصلاح اس طرح کہ ایک شخص کی زندگی میں دوسرے کی مداخلت کو جتنا ممکن ہو کم کر دیا جائے۔ ہم ان بُرائیوں میں سب سے پہلے تیسری قسم سے شروع کریں گے۔ کیونکہ اشتراک اور نراج نے سب سے زیادہ اسی قوت کی برائیوں کو رفع کرنا چاہا ہے دولت کی عدم مساوات پر ان کا اعتراض زیادہ تر ان ہی برائیوں کے احساس پر مبنی ہے جو دولت کی دی ہوئی قوت سے پیدا ہوتی ہیں۔ مسٹر جی۔ ڈی۔ ایچ۔ کول نے اس نکتہ کو خوب بیان کیا ہے:۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہماری موجودہ ہیئت اجتماعی کی وہ کونسی بنیادی برائی ہے جسے ہمیں مٹانا چاہئے۔ اس سوال کے دو جواب ممکن ہیں اور مجھے یقین ہے کہ بہتیرے نیک نیت ان میں سے غلط جواب دیں گے جو یہ ہوگا کہ "افلاس" حالانکہ جواب ہونا چاہیئے "غلامی" افلاس علامت ہے۔ اور غلامی مرض۔ دولت اور افلاس کی انتہائی شکلیں اختیار اور بندگی کی انتہائی شکلوں کا لازمی نتیجہ ہیں۔ آج دنیا میں صدہا انسان اس لئے غلام نہیں ہیں کہ یہ مفلس ہیں بلکہ یہ مفلس ہیں اس وجہ سے کہ غلام ہیں۔ تاہم اشتراکیوں نے اپنی نظر ضرورت سے زیادہ مفلس کی مادی مصیبت پر رکھی ہے اور یہ نہیں سمجھا کہ اس کی بنیاد غلامی کی روحانی پستی ہے۔"

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی معقول آدمی اس میں شک کریگا کہ موجودہ نظام میں قوت کی برائیاں جتنی لازمی ہیں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ تھوڑے سے خوش نصیب لوگ آج نہایت آزادی سے لگان یا سُود پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور انہیں کسی دوسرے نظام میں مشکل ہی سے اِس سے زائد آزادی مل سکتی ہے لیکن نہ صرف نہایت مفلس لوگوں کی بلکہ مزدوروں کی تمام جماعتوں کی نیز پیشہ ور طبقوں کی بھی بہت بڑی تعداد روپیہ

حاصل کرنے کی ضرورت کی غلام ہے، وہ اِس قدر سخت کام کرنے پر مجبور ہیں کہ انہیں تفریح کے لئے یا اپنے معمولی کام کے علاوہ کسی اور شغل کے لئے مشکل ہی سے مہلت ملتی ہے۔ جو درمیانی عمر کے آخر میں کام چھوڑ سکتے ہیں وہ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے یہ نہیں سیکھا کہ جب خالی ہوں تو اپنے وقت کو کیسے صرف کریں اور اپنے کام کے علاوہ پہلے جو کچھ ان کی دلچسپیاں تھیں۔ وہ اب سب ختم ہو چکی ہوتی ہیں اور پھر بھی غیر معمولی طور پر خوش نصیب ہیں۔ زیادہ تعداد کو تو بڑھاپے تک سخت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ افلاس کا ڈر ہمیشہ اُن کے سامنے ہوتا ہے، ان میں جو مالدار ہیں انہیں یہ خوف لگا ہوتا ہے کہ اپنے بچّوں کے لئے خاطر خواہ تعلیم یا طبی نگرانی فراہم نہ کر سکیں گے، جو غریب ہیں وہ فاقہ سے کچھ دُور نہیں۔ اور تقریباً جتنے کام کرنے والے ہیں اُن میں سے کسی کو اپنے کام کی ترتیب میں ذرا بولنے کا اختیار نہیں۔ کام کے پورے وقت میں یہ بس کلیں ہیں۔ جو اپنے آقا کی مرضی بجا لا رہے ہیں۔ کام عموماً ایسے ناگوار حالات میں کیا جاتا ہے جس سے تکلیف اور جسمانی مشکلات وابستہ ہوتی ہیں۔ کام کرنے کی محرک صرف اُجرت ہے۔ یہ خیال بھی کہ کام صنّاع کے کام کی طرح خوشی کا باعث ہو سکتا ہے، عموماً ایک شاندار خواب سمجھا جاتا ہے *

لیکن ان برائیوں کا بہت بڑا حصّہ بالکل غیر ضروری ہے۔ اگر نوعِ انسان کے مہذب حصّہ کو اس بات پر راضی کیا جا سکتا کہ وہ دوسروں کے دُکھ سے زیادہ اپنی خوشی کا طالب ہو اگر انہیں آمادہ کیا جا سکتا کہ ایسی ترقیوں کے لئے تعمیری کام کریں۔ جس میں یہ ساری دنیا کے ساتھ حصّہ دار ہو سکیں۔ بجائے اس کے کہ دوسرے طبقوں یا قوموں کے اپنے اوپر سبقت لے جانے کو تباہ کن طریقوں سے روکیں، تو اس سارے نظام کی جس سے دنیا کا کام ہو رہا ہے ایک نسل کے اندر جڑ سے اصلاح ہو جائے *

حریت کے نقطۂ نظر سے کونسا نظام سب سے اچھا ہے؟ ہمیں کیا خواہش کرنی چاہیئے کہ ترقی کی قوتیں ایک سمت حرکت کریں؟ اس نقطۂ نظر سے اور تھوڑی دیر کے لئے تمام دوسرے خیالات سے قطع نظر کر کے، مجھے ذرا شبہ نہیں کہ بہترین نظام اس سے چنداں دُور نہیں جو کروپاٹکن نے پیش کیا ہے اور جو گلڈ ہی اشتراکیت کے خاص خاص اصولوں کو اختیار کرنے کے بعد قابلِ عمل ہو جاتا ہے۔ چونکہ ہر پہلو پر بحث ممکن ہے۔ اس لئے میں بلا دلیل تنظیم کار کی وہ شکل پیش کئے دیتا ہوں جو میرے نزدیک سب سے اچھی ہے *

ف۱ یہ روس کے ان امراء میں سے ہے جس کی تصانیف میں نراجی تخیلات کی باقاعدہ ترجمانی پائی ہے *

ف۲ یہ ایک تحریک ہے جو صنعتی دنیا میں خود اختیاری اور ریاست کے اختیارات میں کمی کی حامی ہے *

سولہ برس یا اس سے زیادہ عمر تک تعلیم لازمی ہونی چاہیئے اس کے بعد متعلم کو اختیار ہے کہ اُسے جاری رکھے یا نہ رکھے۔ لیکن جو جاری رکھنا چاہیں ان کے لئے کم از کم اکیس سال کی عمر تک تعلیم بلا معاوضہ رہے ختم تعلیم کے بعد کسی کام کرنے پر مجبور کیا جائے جو کام کرنا چاہیں انہیں محض گذارہ کے لائق دیا جائے اور انہیں بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے۔ لیکن غالباً یہ زیادہ پسندیدہ بات ہوگی کہ کام کی موافقت میں قومی رائے عامہ ہو تا کہ مقابلۃً بہت لوگ کاہل رہنا پسند کریں۔ کاہلی کو معاشی طور پر ممکن بنا دینے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کام کو ناگوار نہ بننے دینے کے لئے ایک قوی محرک حاصل ہو جائے گا اور جس جمعیت میں کام کا اکثر حصہ ناگوار ہو اسکے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس نے مسائل معاشی کا حل دریافت کرلیا ہے۔ میرے خیال میں معقولیت کے ساتھ فرض کیا جاسکتا ہے کہ بہت ہی کم لوگ کاہل رہنا پسند کریں گے، جب ہم اس مروقعہ کو پیش نظر رکھیں کہ آج بھی سو پونڈ سالانہ کی آمدنی رکھنے والوں میں سے ۱۰ میں سے ۹ اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے اجرت پر کام کرتے ہیں۔

اب اس بڑی تعداد پر آیئے جو کاہلی نہیں پسند کرے گی میرے خیال میں ہم فرض کرسکتے ہیں کہ حکمت کی مدد سے اور غیر پیدا آور کام کی اس مقدار عظیم کو ہٹا کر جو داخلی اور بین الاقوامی مقابلہ میں صرف ہوتی ہے ساری جمعیت کو روزانہ چار گھنٹے کے کام سے آرام کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ تجربہ کار آجر اب بھی اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ان کے مزدور چھ گھنٹے روزانہ کے کام میں بھی اتنی ہی چیزیں تیار کرسکتے ہیں۔ جتنی کہ ۸ (آٹھ) گھنٹے روزانہ کام کرکے، پھر جس دنیا میں صنعتی تعلیم کی سطح آجکل کے مقابلہ میں بہت بلند ہوگی۔ اس میں تو اس رجحان کو اور بھی تقویت پہنچیگی۔ آج کل کی طرح لوگوں کو ایک صنعت یا ایک صنعت کا بھی کوئی چھوٹا سا حصہ سکھایا جائیگا بلکہ کئی کام سکھائے جائیں گے تاکہ موسم اور مانگ کے تغیر و تبدل کے مطابق یہ اپنا شغل بدل سکیں۔ تمام اندرونی معاملات میں ہر صنعت اپنے اوپر آپ حکومت کریگی اور جو معاملے صرف کارخانوں میں کام کرنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں انہیں بھی علیحدہ علیحدہ کارخانے طے کرلیا کریں گے۔ آج کل کی طرح سرمایہ دارانہ انتظام نہ ہوگا۔ بلکہ جیسے سیاست میں ہوتا ہے منتخب کردہ نمائندے انتظام کریں گے۔ مختلف دولت پیدا کرنے والے گروہوں کے معاملات گلڈ کانگرس طے کیا کرے گی۔ ایک خاص رقبہ زمین کے باشندوں کی حیثیت سے جو معاملات جمعیت کو پیش آئیں گے ان کا فیصلہ پارلیمنٹ ہی کیا کرے گی، اور گلڈ کانگریس اور پارلیمنٹ کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ ایک ایسی جماعت سے ہوگا جس میں دونوں کے برابر رکن ہوں گے۔

آج کل کی طرح دام صرف انھی کام کے نہیں دیئے جائیں گے جس کی مانگ ہو اور واقعی وہ انجام دیا گیا ہو بلکہ دام

دیئے جائیں گے کام کرنے کی آمادگی پر اکثر کاموں میں جہاں اچھے دام ملتے ہیں آج کل بھی یہ طریقہ اختیار کر لیا گیا ہے ایک شخص کسی عہدہ پر مقرر ہے اور جب بہت تھوڑا کام بھی ہوتا ہے تو وہ اُس وقت بھی مقرر رہتا ہے بیکاری اور روزی چلے جانے کا خوف انسانوں کے سروں پر بھوت کی طرح سوار نہ رہے گا۔ کام کرنے پر جو لوگ آمادہ ہیں آیا ان سب کو برابر دام ملیں گے یا خاص غیر معمولی ہنرمندی کے لئے اب بھی غیر معمولی اجرت دی جائے گی؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کا فیصلہ ہر گلڈ پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ تھیٹر میں گانے والے کو اگر پردہ بدلنے والوں سے زیادہ دام نہ ملیں تو ممکن ہے کہ جب تک یہ طریقہ بدل نہ جائے وہ پردہ بدلنے کا کام ہی پسند کرے، اگر یہ صورت حال جاری رہی تو زیادہ دینا غالباً ضروری ہوگا۔ لیکن اگر یہ گلڈ کی آزاد رائے سے طے ہو تو پھر مشکل ہی سے شکایت کی صورت باقی رہ سکتی ہے +

کام کو خوشگوار بنانے کے لئے کچھ بھی کیوں نہ کیا جائے۔ یہ تسلیم کرنا ہوگا۔ کہ بعض کام ہمیشہ ناگوار باقی رہیں گے۔ ان میں لوگوں کو کم وقت کام کرا کے یا زیادہ اجرت دے کر بلایا جا سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ افلاس کی وجہ سے وہ اس کے کرنے پر مجبور ہوں۔ ان غیر معمولی کاموں کی ناگواری کو کم کرنے کے لئے اس طرح جمعیت کے پاس نہایت قوی قومی معاشی محرک موجود ہوگا +

ہم جس قسم کی جمعیت کا تصور کر رہے ہیں اس میں اب بھی زریا اس سے ملتی جلتی کسی اور چیز کی ضرورت ہوگی۔ نراجیوں کی اس تجویز میں بھی کہ محنت کی ساری پیداوار کو برابر حصہ میں تقسیم کر دیا جائے، ایک معیاری قدر مبادلہ کی ضرورت سے نہیں نجات نہیں ملتی۔ کیونکہ ایک آدمی چاہے گا کہ اپنا حصہ ایک شکل میں لے اور دوسرا دوسری شکل میں سامان عیش کی تقسیم کا دن آئے گا تو بڈھی عورتیں بنا سگاروں کا حصہ طلب کریں گی، اور یہ جوان مرد گود کے کتوں کے لئے اپنا جائز حق لینا چاہیں گے۔ اس لئے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ کتنے سگار ایک گود کے کتے کے مساوی ہوتے ہیں سب سے آسان طریقہ تو یہ ہے کہ جیسے آجکل ہوتا ہے کہ ایک آمدنی دیدی جائے اور پھر قدر اعتباری کا باہمی تناسب طلب پر چھوڑ دیا جائے لیکن اگر سچ مچ نقود ادا کئے گئے تو ایک شخص انہیں جمع کر کر کے ایک دن سرمایہ دار بن سکتا ہے اسے روکنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ نوٹ دیئے جائیں۔ جو ایک خاص مدت کے لئے چالو ہوں، مثلاً تاریخ اشاعت سے سال بھر تک۔ اس سے یہ ہوگا۔ کہ ایک شخص اپنی تعطیل کے لئے کچھ پس انداز کر سکے گا، لیکن اس سے زیادہ غیر محدود دولت نہ بچا سکے گا۔

اس نراجی تجویز کی موافقت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ضروریات زندگی اور وہ چیزیں جو آسانی سے مانگ کے مطابق تیار ہو سکیں۔ انہیں جو مانگے بے دام دیا جائے۔ اور جتنی مقدار اسے درکار ہو اتنی دی جائے۔ یہ تجویز اختیار کی جائے یا نہیں۔ یہ میرے نزدیک بالکل ایک ضابطہ کا سوال ہے۔ کیا دفعتاً اس کا اختیار کرنا ممکن ہوگا

بلا اس کے کہ محنت کی بہت سی مقدار ضائع ہو اور ضروری اجناس کی تیاری میں منتقل ہو درآنحالیکہ یہ اس سے بہتر کام میں لگائی جاسکتی ہے؟ میرے پاس اس سوال کے جواب دینے کے لئے ذرائع نہیں ہیں۔ لیکن میں اسے نہایت غلب سمجھتا ہوں کہ جلد یا بدیر جب طریقہائے پیدائش میں برابر ترقی ہوتی رہے گی، تو یہ نراجی تجویز قابل عمل ہو جائے گی۔ اور جب یہ قابل عمل ہو جائے تو اُسے ضرور اختیار کر لینا چاہیئے +

خانگی کام میں عورتوں کو خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، وہی اُجرت ملے گی جو صنعتی کام میں ملتی ہے۔ اس سے بیویوں کو کامل معاشی خود مختاری حاصل ہو جائے گی جس کا حصُول اور کسی طریقہ سے دشوار ہے۔ کیوں کہ چھوٹے بچوں کی ماؤں سے یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ وہ گھر سے باہر کام کریں +

بچوں کا خرچ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے والدین پر نہیں پڑے گا، بالغوں کی طرح انہیں بھی ضروریات زندگی میں اپنا حصہ رسدی ملے گا، اور ان کی تعلیم جو ہوگی وہ بے معاوضہ قابل بچوں کو وظیفوں کے لئے آج کل کے سے مقابلہ کا سامنا نہ کرنا ہوگا۔ بچپن ہی سے ان میں مقابلہ و مسابقت کی روح نہیں پیدا کی جائے گی۔ اور نہ انہیں اس پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے دماغوں پر غیر فطرتی کساد ڈالیں جس کا نتیجہ بعد کو کُند ذہنی اور عدم صحت ہوتا ہے۔ تعلیم میں آجکل کے مقابلہ زیادہ تنوع ہوگا، اس بات کا زیادہ خیال رکھا جائے گا کہ تعلیم مختلف قسم کے بچوں کے مطابق حال ہو متعلمین میں اوپج پیدا کرنے کی زیادہ کوشش کی جائے گی اور اس بات کی خواہش کم ہوگی کہ ان کے دماغوں میں ایسے عقائد و عادات ذہنی ٹھونسی جائیں۔ جنہیں ریاست خصوصاً اس وجہ سے پسندیدہ خیال کرتی ہے کہ یہ موجودہ صورت حالات کے قائم رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ غالباً بچوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے یہ ضروری ثابت ہوگا کہ ان کی تعلیم دیہات کے کھلے میدان میں ہو ذرا زیادہ عمر کے ایسے لڑکے لڑکیوں کے لئے جنہیں کوئی علمی یا فنی دلچسپی نہیں ان کے واسطے صنعتی تعلیم اگر آزاد طریقہ سے دی جائے تو اُن کے افعال ذہنی کو ترقی دینے کے لئے کتابی تعلیم سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ کیوں کہ اس مؤخر الذکر کو تو یہ (چاہے غلط ہی سہی) سوائے امتحان کے کام کے اور تو بالکل فضول جانتے ہیں۔ واقعی مفید تعلیم وہ ہے، جو خود بچے کے جبلی رجحانات کا اتباع کرے، وہ علم فراہم کرے جس کی اسے تلاش ہے۔ نہ کہ وہ خشک جزوی معلومات جو اُس کے فطری خواہشات سے بالکل بے تعلق ہوں +

لطائف الادب

(از جناب پروفیسر محمد علم الدین سالک - بی اے)

اس میں شک نہیں کہ آج کل ایران اور ہندوستان میں تعلیم وتعلم کا بڑا زور شور ہے - شاعری اپنا حلقۂ اثر نہایت سرعت سے وسیع کر رہی ہے - بلکہ یہاں تک عام ہو چکی ہے کہ ہر طبقہ کے لوگوں پر حاوی ہے، اور روزمرّہ کی طرح عام بول چال میں استعمال ہوتی ہے، مگر اس سے کوئی مفید کام نہیں لیا جاتا، جن ارباب ذوق کو قدیم ایرانی اور ہندوستانی تمدن اور اُس وقت کی علمی وادبی سرگرمیوں کے مطالعہ کا موقعہ ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ ازمنۂ ماضیہ میں شاعری ایک نہایت زبردست طاقت تھی - شعرا کی بے حد قدر ومنزلت ہوتی تھی اور بدیہہ گوئی وجذبات نگاری میں لوگوں کو ید طولیٰ حاصل تھا - لڑائیوں کی ابتدا - جنگوں کا التوا - مجرموں کی جان بخشی اور سلطنتوں کی شکست وریخت سب کچھ اسی کے ذریعے عمل میں آتا تھا - اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ع

وہ دن ہی اور تھے وہ زمانہ ہی اور تھا

ذیل میں ہم قارئینِ "مخزن" کی ضیافت طبع کے لئے چند دلچسپ تاریخی واقعات پیش کرتے ہیں - ان کے مطالعہ سے ہمارے بیانات کی خود بخود تصدیق ہو جائے گی :-

(۱)

خاندان سلجوق کے مشہور تاجدار معز الدنیا والدین سلطان سنجر کے زمانہ میں صوبۂ خوارزم کی نظامت سلطان اتسز کے سپرد تھی - اتسز اپنے آپ کو آل سلجوق کی غلامی سے آزاد کرنا چاہتا تھا - سلطان سنجر کو بھی کسی نہ کسی طرح اُس کے ارادہ کا علم ہو گیا - اُس نے ایک زبردست لشکر لے کر اس پر چڑھائی کی - اتسز کثرت سپاہ سے گھبرا اٹھا اور قلعہ ہزار اسپ میں قلعہ بند ہو گیا - اُس کے ساتھ ہی سلطان سنجر کو چڑانے کی نیت سے اُس نے مندرجہ ذیل اشعار تیر کے ذریعے اُس کے لشکر میں پھینکے ؎

مرا با ملک تاب جنگ نیست — بہ صلحش مرا نیز آہنگ نیست
ملک شہریار است و شاہ جہاں — گریز از چنیں پادشاہ ننگ نیست
اگر باد پائیست یکران شاہ — کمیت مرا نیز پا لنگ نیست

بخوارزم آید بہ سقسین روم	خدائے جہاں را جہاں تنگ نیست

انوری سنجر کے ہمرکاب تھا، بادشاہ نے اسے طلب کیا اور متذکرہ بالا قطعہ دکھا کر کہا کہ اس کا فی البدیہہ جواب لکھو۔ چنانچہ اُس نے حسب ارشاد شاہی یہ قطعہ لکھا جسے اسی وقت تیر کے ذریعے قلعہ ہزار اسپ میں پھینک دیا گیا ؎

اے شاہ ہمہ ملک جہاں حسب تراست	وز دولت واقبال شہی کسب تراست
امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر	فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

اتسز اس جواب سے بھنا اٹھا - اس نے رشید الدین وطواط کو دکھا کر جواب لکھنے کی التماس کی - چنانچہ اس نے فی الفور مندرجہ ذیل جواب لکھا - جو سلطان سنجر کے لشکر میں پھینک دیا گیا

شاہا کہ بجامت مئے صاف ہست نہ دُرد	اعدائے توز غصہ خون باید خورد
گر خصم تو اے شاہ بود رستم گرد	یک خر ز ہزار اسپ نتواند بُرد

اس جواب سے سلطان سنجر بھڑک اٹھا اور عہد کیا کہ اگر وطواط اس کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اُس کے پورے سات ٹکڑے کریگا، کچھ عرصہ کی مسلسل کوشش کے بعد قلعہ فتح ہوا - اتسز جان بچا کر بھاگا - رشید الدین وطواط بد قسمتی سے گرفتار ہوکر سنجر کے حضور میں پیش ہوا - سنجر کو اپنا عہد یاد آیا - اُس نے خدام بارگاہ کو حکم دیا کہ وہ وطواط کی پورے طور پر نگہداشت کریں +

سنجر کا دبیر منشی نجیب الدین وطواط کا دوست تھا وطواط اس سے طالب استمداد ہوا - ایک دن اس نے بادشاہ کو خوش پاکر عرض کیا کہ ابابیل (وطواط) ایک ننھا مُنا جانور ہے اس کے سات ٹکڑے تو درکنار دو ٹکڑے ہونے بھی مشکل ہیں - بادشاہ یہ سُن کر مسکرایا اور وطواط کی خطا بخشی کرکے اسے آزاد کر دیا +

(۲)

ناصر الدین کبود جامہ سے ایک دفعہ سلطان تکش ناراض ہوگیا - اس نے اپنا ایک خاص آدمی اس کام پر متعین کیا کہ وہ جاکر ناصر الدین کا سر کاٹ لائے وہ آدمی ناصر الدین کے پاس پہنچا - اور اسے بادشاہ کا حکم سنایا ناصر الدین نے کسی نہ کسی طرح قاصد کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ زندہ ہی اسے دربار میں لے چلے - جب بادشاہ نے اسے زندہ دیکھا تو وہ قاصد پر بہت خفا ہوا - مگر ناصر الدین آگے بڑھا اور ہاتھ باندھ کر عرض پیرا ہوا ؎

من خاکِ تو در چشم خرد می آرم	معذرت نہ یکے نہ دہ کہ صد می آرم
سر خواستۂ بدغت کس نتواں داد	مے آئیم و برگردنِ خود می آرم

بادشاہ اِن اشعار سے پھڑک اُٹھا۔ اس سے بغلگیر ہؤا اور خلعتِ فاخرہ دے کر اسے اپنے عہدہ پر بحال کر دیا۔

(۳)

ایک دفعہ سلطان طہماسپ صفوی خواجہ امیر بیگ سے ناراض ہوگیا۔ اور اُسے خراسان کے ایک قلعہ میں قید کر دیا۔ انہی ایام میں عبداللہ خان ازبک والیئے توران خراسان پر حملہ آور ہؤا۔ اور معمولی سی لڑائی کے بعد عارضی طور پر وہاں قابض ہوگیا۔ اس نے طنز کے طور پر مندرجہ ذیل شعر خواجہ کے پاس بھیجا ؎

اے خواجہ بعد ازیں طمع از زندگی ببر ... زاں رو کہ گشتہ مسندِ خانی مقام ما

خواجہ نے یہ پڑھ کر مندرجہ ذیل جواب اُس کے پاس ارسال کیا ؎

اے باد اگر باہلِ خراساں گذر کنی ... زنہار عرضہ دہ برایشان پیام ما
وانگہ بگو براہِ وفا آں گروہ را ... کاے گشتہ کینہ خواہِ شما خاص و عام ما
کلک غرور وجہل شما ثبت کردہ بُود ... در رقعۂ کہ بود دراں رقعہ نام ما

کاے خواجہ بعد ازیں طمع زندگی ببر
زاں رو کہ گشتہ مسندِ خانی مقام ما

اے مدعی مگر نشنیدی کہ مے رسد ... شاہ ستارہ خیل و سپہر احتشام ما
باشد خواب دعوئ خانی کہ کردۂ ... بینے کہ گفتہ حافظِ شیریں کلام ما

چند بود کرشمہ و ناز سہی قداں
کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما

(۴)

عبداللہ خان ازبک والیئے توران چند ایرانی امیروں کی معیت میں رستم کی قبر کے پاس سے گذرا۔ ایرانی امیروں کو چڑانے کی غرض سے اس نے کہا ؎

سراز خاک بردار و ایراں بہ بیں ... بکامِ دلیران توراں زمیں

اس کے ایک حاضر جواب وزیر نے عرض کیا۔ کہ اگر اس وقت رستم زندہ ہوتا تو وہ ضرور اس کا کچھ نہ کچھ جواب دیتا۔ عبداللہ خان نے پوچھا۔ بھلا اس کا جواب کیا ہوسکتا ہے۔ ایک ایرانی امیر نے جان کی امان پاکر فی البدیہہ عرض کیا:۔ ؎

چو بیشہ تہی ماند از نرہ شیر　　شغالاں بہ بیشہ در آیند دلیر

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ پہلا شعر امیر تیمور نے کہا تھا، اور اس کے ایک وزیر نے اس کا جواب اس طرح دیا تھا ؎

گذشتند شیراں ازیں مرغزار　　کند روبۂ لنگ ایں جا شکار

(۵)

شیخ اسلام تبریز نے ملا محمد عصار تبریزی سے خوش ہو کر اپنا پھٹا پرانا لباس اُسے بخش دیا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے یہ انعام واقعی قابل قدر تھا، اور عوام الناس اس قسم کے انعامات کی نمائش عام تقریبوں میں کیا کرتے تھے مگر عصار اس انعام کو ناپسند کرتا تھا اُس نے فی البدیہہ مندرجہ ذیل قطعہ لکھا اور شیخ اسلام کی خدمت میں بھیجدیا۔

جامۂ بخشید شیخ اسلام اعظم بندہ را　　وہ مبارک جامۂ سال فراواں یافتہ
رشتہ حوّا از برائے آدمش در بدو حال　　مریمش در کارگاہ از بہر عیسےٰ یافتہ
وانگہ از مقتول پشم ناقۂ پیغمبرش　　فاطمہ گشتہ رفو گر ہر کجا بشگافتہ
من چہ حد دارم کہ پوشم جامۂ ما کاندرو　　آفتاب طلعت چندیں پیمبر تافتہ

(۶)

سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں بیغو بن طغان شاہ ترکستان کے ایک حصّہ قبا پر حکمران تھا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ جب وہ فوت ہوا تو یہ علاقہ اس کے پانچوں بیٹوں میں تقسیم ہو گیا۔ محمود نے جب سمرقند اور ترکستان کا کچھ علاقہ فتح کیا تو ان پانچوں بھائیوں سے خراج طلب کیا۔ انہوں نے خراج ادا کرنے سے انکار کرتے ہوئے مندرجہ ذیل گستاخانہ جواب بارگاہِ محمودی میں روانہ کیا ؎

ما پنج برادر از قبائیم　　دریا دل و آفتاب رائیم
ما ملک زمیں ہمہ گرفتیم　　اکنوں بہ نفکر سمائیم
گر چرخ بکام ما نگردد　　چنبر ز ہمش فرو کشائیم

محمود نے ایک لشکران کی سرکوبی کیلئے روانہ کیا، اور ساتھ ہی عنصری کو اس کا جواب لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ عنصری نے اس قطعہ کا مندرجہ ذیل جواب دیا:- ؎

نمرود بعہد پدر آذر　　میگفت خدائے خلق مائیم
جبّار بہ نیم پشہ اورا　　خوش داد سزا کہ ما کجائیم

جب اُن کو ہوش آیا اور انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں محمود سے معذرت طلب کی :-

ما پنج برادر از قبائیم	در قحط و نیاز مبتلائیم
شاہا تو عزیز مصر جودی	وا خوان گنہگار مائیم
مارا کہ بضاعت مزجات	شرمندۂ حضرت شمائیم
بر حالت زار ما بہ بخشا	از فضل و کرم کہ بینوائیم

محمود نے اپنا لشکر واپس منگوا لیا اور ان کی خطا بخش دی۔

(۷)

ایک ایرانی شہزادے نے زیب النساء بنت اورنگ زیب عالمگیر کی شہرت سُن کر مندرجہ ذیل اشعار اسکی طرف بھیجے

بلبل روئیت شوم گر در چمن بینم ترا	من شوم پروانہ گر در انجمن بینم ترا
خود نمائی مے کنی اے شمع محفل خوب نیست	من ہمی خواہم کہ در یک پیرہن بینم ترا

بیگم نے اس کا دندان شکن جواب اس طرح دیا :-

بلبل از گل بگذرد چوں در چمن بیند مرا	بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا
در سخن مخفی شدم ما نند بو از برگ گل	میل دیدن ہر کہ دارد در سخن بیند مرا

شاہزادہ جواب پڑھ کر اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا۔

(۸)

ایک دفعہ زیب النساء نے ایک قدسی نفس شیخ کی زیارت کا ارادہ کیا۔ مگر چند وجوہ کی بنا پر اُسے یہ ارادہ فسخ کرنا پڑا۔ شیخ کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے مذاقیہ طور پر بیگم کو لکھا کہ :-

اے کہ میگوئی کہ می آئیم نمی آئی چرا	پائے شوکت را مگر رنگ حنا زنجیر پاست

بیگم نے اس کے جواب میں تحریر کیا :-

گرچہ من لیلے اساسم دل چو مجنوں در نواست	سر بصحرا میزنم لیکن حیا زنجیر پاست

اس کے جواب میں شیخ نے لکھا :-

عشق تا خام است باشد بستۂ ناموس و ننگ	پختہ مغزان جنوں را کے حیا زنجیر پاست

بیگم نے پھر جواب میں لکھا :-

عاشقانِ ایزدی را سر بسر باشد حیا	چوں تو مرغِ بے حیا را کے حیا زنجیر پاست

(۹)

ایک دفعہ نور جہاں اور جہانگیر دریچہ میں کھڑے تھے ایک خمیدہ پشت بوڑھا ان کے سامنے سے گذرا جہانگیر نے نور جہاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا ؎

چرا خم پشت مے گردند پیرانِ جہاندیدہ

نور جہاں نے فی البدیہ دوسرا مصرعہ لگایا :-

بزیرِ خاک مے جویند ایام جوانی را

(۱۰)

ایک دفعہ نور جہان اور جہانگیر اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے - نور جہاں پر غنودگی سی طاری ہو گئی - یہ دیکھ کر جہانگیر نے کہا :-

تو مست بادہ حسنی بفرما ایں دو نرگس را	کہ برخیزند واز خوابِ شبانگاہ دارند مجلس را

نور جہان نے جواب میں عرض کیا :-

مکن بیدار اے ساقی ز خوابِ ناز نرگس را	کہ بدمست اند و برہم میزنند اہالِ مجلس را

دالیا

(از پنڈت شیام کشور نوز سناتن دھرم کالج کانپور)

(۱)

زمانہ کی گردشیں بے پناہ ہوتی ہیں، اس کا انقلاب مفلس کو غنی اور غنی کو مفلس بنا دیتا ہے۔ اس کا اَدنے سے اَدنے تغیر بڑے سے بڑے جابر و مغرور حکمران کی سلطنت کی بنیادیں ہلا دیتا ہے کون کہہ سکتا تھا کہ شاہ شجاع کا علم بغاوت باوجود اپنے بے انتہا سر و سامان اور ذاتی شجاعت کے اورنگ زیب کی مختصر فوج کے مقابلے میں سرنگوں ہوجائیگا!

شاہ شجاع کو پورا یقین تھا، کہ وہ اپنے بھائی سے اس مرتبہ قطعی طور پر انتقام لے لیگا۔ یہی امید تھی جو اُسے اورنگ زیب جیسے جلیل القدر بادشاہ کے مقابلے میں رہ رہ کر ابھار رہی تھی۔ اُس نے خانہ بدوشی کی زندگی گذار کر، اور در در کی ٹھوکریں کھاکر آخر کار اپنی ایک زبردست فوج مرتب کر ہی لی۔ لیکن پیہم ناکامیاں اور مسلسل مایوسیاں انسان کے وہم و قیاس سے باہر ہوتی ہیں۔ تقدیر اس کی اس جدّ و جہد پر ہنس رہی تھی، اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ مستقبل کا خیال کرکے کانپ جاتا تھا *

دونوں فوجیں خوشگوار توقعات لئے ہوئے میدان کارزار میں صف آرا ہوئیں۔ حریفین کے سورماؤں نے زمین شجاعت پر خون جگر سے لالہ کاریاں کیں۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے، اور شام سے پہلے پہلے شاہ شجاع کو اپنی شکست و ناکامی کا حال معلوم ہوگیا *

آفتاب اس خونی منظر کو دیکھ کر داغہائے دل کی بہاریں دکھاتا ہؤا غروب ہوگیا۔ شاہ شجاع کا دل گردش زمانہ کی مسلسل ٹھوکروں سے پاش پاش تھا۔ غیرت اُسے مجبور کر رہی تھی کہ اب وہ اورنگ زیب کی حدود سلطنت کو چھوڑ دے اس نے غیرت کے اس تقاضے پر لبیک کہا اور پھر اُسے اورنگ زیب کے کسی آدمی نے کبھی نہ دیکھا *

(۲)

شاہ شجاع جس وقت میدان جنگ سے ناکام واپس ہؤا اس وقت اسے صرف ایک خیال ستا رہا تھا، اور وہ اپنی لڑکیوں کا خیال تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کا یہاں بے یار و مددگار چھوڑنا خلاف مصلحت ہے چنانچہ اس نے اپنا تمام مال و اسباب چھوڑ دیا اور اپنی تینوں لڑکیوں کو ساتھ لیکر بادشاہ اراکان کی سلطنت میں پناہ لینے کے لئے چل کھڑا ہؤا *

لڑکیاں اگر ایک طرف تعلیم یافتہ، مہذب اور آداب سلطنت سے واقف تھیں تو دوسری طرف کچھ اس بلا کی حسین تھیں کہ کائنات کی تمام کیفیات ان کی ہر جنبش چشم و ابرو پر قربان تھیں ٭

جب شاہ اراکان نے شجاع کے آنے کی خبر سنی تو اُس نے اس کا شاہانہ استقبال کیا، مگر یہ غائبانہ محبت آخر لڑکیوں کے رعنائی حسن کے سبب تلخیوں میں بدل گئی۔ اُس نے انہیں دیکھ کر پہلی ہی نظر میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اُس کے لڑکے کی (جو آئندہ اُس کی سلطنت کا مالک ہونے والا ہے) بہترین رفیق زندگی بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہیں، اُس نے اس مسئلہ پر زیادہ غور و فکر سے کام نہ لیا اور کچھ دنوں کے بعد ہی شاہ شجاع کی خدمت میں اپنے لڑکے کا مؤدبانہ پیغام بھیج دیا ٭

(۴)

یہ پیغام نہ تھا بلکہ ایک ایسی اشتعال انگیز تحریک تھی۔ جس نے شاہ شجاع کے جذبات نفرت و حقارت کو بھڑکا دیا، اس نے اپنی عبرت آگین حالت پر غور کیا۔ کہ آج گردش روزگار نے اسے اس درجہ حقیر و بے کس بنا دیا ہے کہ ایک معمولی درجہ کا والئے ریاست اس سے ایسی مساویانہ حیثیت کی درخواست کر رہا ہے۔ جسے شجاع اپنے خون کے آخری قطرے اور اپنے قلب کی آخری سانس تک نہیں منظور کر سکتا ٭

بس یہی خیال تھا جس نے اس کا صبر و سکون اس سے چھین لیا، اور شام کی نمناک اداسی میں وہ اپنی تینوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر حدود سلطنت سے باہر دریا کے کنارے پہنچ گیا، ساحل پر کشتی اس کے انجام پہ جیسے ہی سی ہچکولے لے لے کر اپنے اضطراب کا اظہار کر رہی تھی۔ اُس نے حسرت بھری نظروں سے خشکی کو آخری مرتبہ دیکھا اور لڑکیوں کو کشتی پر سوار کر کے خود بھی بیٹھ گیا۔ کشتی طوفانی موجوں میں پڑتے ہی کنارے سے دور چلی گئی۔ شاہ شجاع جانتا تھا۔ کہ اب سوائے اس ایک دریا کے دنیا میں اسے کوئی پناہ دینے والا نہیں۔ اس لئے اس کے ذہن میں دریا عبور کرنے کا خیال تک موجود نہ تھا ٭

کشتی اس اداس جھٹپٹے میں موجوں کے تھپیڑوں میں ساحل سے بہت دور چلی جا رہی تھی۔ شاہ شجاع آج اس دریا میں اسقدر مطمئن تھا کہ شائد اپنی زندگی میں خشکی پر بھی کبھی اس نے اطمینان کا ایسا سانس نہ لیا ہو گا وہ ایک ایسے خوفناک قتل کے ارتکاب کا فیصلہ کر چکا تھا جس کے بعد انسان کا دل دنیا اور دنیا کے تمام خواہشات سے یکسو و مطمئن ہو جاتا ہے، کشتی کا گرداب فنا میں آنا گویا اس کی مرادوں کا بر آنا تھا ۔

اُس نے اپنی لڑکیوں پر جو خود بھی اس کے ارادے سے واقف ہو چکی تھیں آخری نگاہ ڈالی اور اپنے ان ہاتھوں

سے جو کبھی اُنہیں آغوشِ محبت میں لیا کرتے تھے کانپتی ہوئی چھوٹی لڑکی کو ہمیشہ کے لئے دریا کی موجوں کے سپرد کر دیا، اور باقی دونوں لڑکیاں اس سے پہلے کہ باپ اُنہیں دریا میں ڈالے خود پانی میں کود پڑیں +

(۴)

رحمت خاں جو شاہ شجاع کا وفادار نوکر تھا۔ اور جس سے شاہ شجاع اپنے ادنےٰ سے ادنےٰ راز بھی پوشیدہ نہ رکھتا تھا، اس غمناک حادثہ کو پہلے سے جانتا تھا۔ اُس نے ارادہ کر لیا تھا کہ خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے لیکن شاہ شجاع کی نسل کو اس طرح مٹتے ہوئے نہ دیکھے گا۔ وہ وقت سے پہلے پیر کر ساحلِ دریا پر پہنچ گیا اور چونکہ کشتی کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے پہلے ہی دریا میں پیر پیر کر اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب وہ اپنی نمکخواری و جان نثاری کا ثبوت دینے والا تھا۔ وہ اس الم انگیز منظر کو دیکھکر بے تاب ہوگیا، اور اپنی پوری طاقت سے لڑکیوں کو غرق ہونے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن آہ اسکی عمر بھر کا ساتھ دینے والا آقا اور اُس کی بڑی لڑکی ہمیشہ کے لئے پانی کی چادر اوڑھ کر دریا کی تہ میں سو چکے تھے، جب وہ پانی کی جد وجہد سے فارغ ہو کر کنارے آیا تو ساحلِ دریا پر اُس کے سامنے دو لڑکیاں آمنہ اور زلیخا بے ہوش پڑی ہوئی تھیں +

(۵)

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔ سلطان اراکان کے بعد اس کا بڑا لڑکا جس کے دل میں اب بھی محبت کی آگ سی طرح سلگ رہی تھی تخت نشین ہوا۔ آمنہ سی (جو کسی طرح رحمت خان سے علیحدہ ہو کر ایک ماہی گیر کے مختصر جھونپڑے میں رہنے لگی تھی،) آخر کار اس کی بڑی بہن زلیخا بھی آکر مل گئی، اور رحمت خان پوشیدہ طور پر موجودہ فرمانروائے اراکان کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا +

ایک دن بوڑھے ماہی گیر نے روکھے پن سے کہا "تنی" تمہیں آج کیا ہوگیا ہے، گھر کا سارا کام ویسے ہی پڑا ہوا ہے۔ اور ہاں تم اب تک کشتی پر بھی نہیں گئیں +

آمنہ نے بوڑھے ماہی گیر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا "پیارے باپ" آج میری بہن مجھ سے ملنے آئی ہے اس لئے تمام کاموں میں اس قدر دیر ہوگئی +

ماہی گیر اُس کی یہ بات سن کر متعجب ہوا۔ اور ابھی وہ کچھ کہنے ہی کو تھا کہ زلیخا نے پیچھے سے آکر اُس کی حیرت میں اور اضافہ کر دیا۔ اُس نے دونوں لڑکیوں کو ہم شبیہ دیکھ کر زلیخا سے پوچھا تم اب تک کہاں تھیں اور کیا کام کرتی تھیں +

اُس نے اس طرح کا سوال صرف اس لئے کیا تھا کہ اُس کی آمدنی کسی تیسرے آدمی کی کفالت کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی +

زلیخا اُس کی اس تشویش کو سمجھ گئی اور فوراً اُس نے ایک اشرفی نکال کر اُس کے سامنے ڈال دی اور کہا لو یہ تمہاری ضروریات کے لئے بہت عرصہ تک کافی ہوگی۔ اب تم اس قدر زیادہ محنت نہ کیا کرو +

(۶)

موسم بہار کا زمانہ تھا، دونوں بہنیں ایک مختصر سے جھونپڑے کے سامنے سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی آپس میں باتیں کر رہی تھیں یکایک زلیخا نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا "خدا نے ہماری جانوں کو اس لئے صرف اس لئے بچایا ہے کہ ہم اپنے شہید باپ کے خون کا انتقام لیں۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ مجھے ذرہ ذرہ میں مرحوم باپ کی روح متشکل نظر آتی ہے اور بار بار اپنی بے گناہی کی یاد دلا کر انتقام پر آمادہ کرتی ہے +

آمنہ نے افسردگی کے لہجے میں کہا کہ" پیاری بہن اب گذشتہ باتوں کی یاد تازہ نہ کرو۔ جنہیں یاد کر کے روح ایک یاس افزا غم کے سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔ میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ زندگی کے دن کسی طرح عزت کے ساتھ اسی جھونپڑی میں گذر جائیں +

زلیخا نے اس کی اس بزدلانہ بات کو سن کر جوش میں کہا۔ افسوس کہ تم نے اِس قدر جلد اپنے شفیق اور عزت جان دینے والے باپ کی یاد کو دل سے محو کر دیا۔ کیا تم گذشتہ زمانے کو بھول گئیں، آہ کیا تمہیں دہلی کا شاہی محل اس جھونپڑے سے بھی زیادہ حقیر معلوم ہونے لگا۔

آمنہ نے کسی قدر متاثر ہو کر کہا" بہن، حقیقت یہ ہے کہ میری طبیعت میں ایک انقلاب ہو گیا ہے۔ خدا جانے کیوں مجھے یہ جھونپڑی اور سایہ دار درخت دہلی کے تاج و تخت سے زیادہ بھلے معلوم ہوتے ہیں +

نہیں، نہیں، بھولی آمنہ، تیرا یہ تخیل شاہانِ مغلیہ کے روایتی اقتدار کے خلاف ہے۔ یقیناً تیرے جسم میں بہادری و شجاعت کا خون گردش کر رہا ہے۔ کم از کم میرے کان تیرے یہ بزدلانہ الفاظ نہیں سن سکتے۔ مجھے بتا کہ کیا تو اپنے مرحوم باپ کے خون کا انتقام نہ لے گی؟

آمنہ نے یہ باتیں خاموشی کے ساتھ سنیں اور انرات کا ایک حصہ لئے ہوئے جھونپڑی کے اندرونی حصہ میں چلی گئی +

زلیخا آمنہ کی ان باتوں پر غور کر رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اُس کی آنکھیں بند کر لیں +

اُس نے چونک کر کہا مجھے یہ باتیں پسند نہیں آتیں،
اتنا کہنا تھا کہ آنکھیں بند کرنے والا جھجک کر ہٹ گیا۔ اور سنجیدہ صورت بنا کر کہنے لگا' ایں، تم تو تنّی نہیں ہو؟
زلیخا نے اپنا آنچل سنبھالتے ہوئے غصّے سے کہا تم کون ہو جو اس قدر گستاخانہ باتیں کر رہے ہو؟
نوجوان لڑکے نے جواب دیا۔ کہ تم مجھے نہیں جانتیں۔ تنّی مجھ سے اچھی طرح واقف ہے*
آمنہ ان دونوں کی یہ باتیں سن کر اندر سے نکل آئی اور زلیخا کی خشم آگیں نظریں دیکھ کر سمجھ گئی کہ ضرور دالیا نے میری طرح حسب عادت اسے پریشان کیا ہوگا*
وہ کہنے لگی بہن زلیخا، تم اس کی باتوں سے خفا نہ ہو، یہ آدمی نہیں ہے، اسے ایک جنگلی جانور سمجھو' اور یہ کہہ کر اس نے دالیا سے مخاطب ہو کر کہا'
تم بہت ہی احمق لڑکے ہو۔ تمہیں شہزادیوں سے گفتگو کرنے کا سلیقہ نہیں آتا،
لڑکے نے شرمندہ ہو کر کہا میں نے تو اُن سے کوئی بے ادبی نہیں کی صرف آنکھیں بند کر لی تھیں*
آمنہ نے اس سے کہا' اچھا' زلیخا کو جھک کر سلام کرو اور جھونپڑی میں جا کر کھانا پکانے کیلئے آگ سلگاؤ*
دونوں بہنوں میں تھوڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی، آمنہ نے کہا" بہن' چونکہ ابھی تم نووارد ہو اس لئے تمہیں یہاں کے لوگوں کی ہر حرکت وحشیانہ اور تہذیب سے عاری معلوم ہوتی ہے۔ شروع شروع میں مجھے بھی ان باتوں کا احساس ہوتا تھا، لیکن اب اس کا خیال نہیں آتا*
زلیخا۔ واقعی، آمنہ۔ میں جب سے آئی ہوں تمہاری گذشتہ اور موجودہ حالت کا موازنہ کر رہی ہوں میں دیکھتی ہوں کہ تم میں پہلے کی بہت سی باتیں اب موجود نہیں رہیں۔ تمہاری طبیعت میں اس قدر ضبط و تحمل ہو گیا ہے کہ تمہیں پہچاننا مشکل ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تم شہزادی ہی نہ تھیں، اگر میں یہاں کچھ دن رہ گئی تو اس جھونپڑے میں آنے والے وحشیوں کی وحشت دور کر دوں گی، اور کوشش کروں گی کہ کم از کم یہ تو لوگوں سے گفتگو کرنے کے آداب سے واقف ہو جائیں*
آمنہ سمجھ گئی کہ اس کی اس گفتگو کا رُخ دالیا کی طرف ہے، اُس نے بے پروائی سے کہا، نہیں، بہن، تم اس لڑکے کو با سلیقہ بنانے کی کوشش نہ کرنا، مجھے تو اُس کی کچھ یہی حرکتیں بھاتی ہیں۔ حقیقت میں مجھے اسکا احسانمند ہونا چاہیئے کہ وہ میرے گھر کے بہت کام کرتا ہے، روزانہ صبح کو بڑی محنت سے پھول جمع کرتا ہے اور اس سے پہلے

میں سو کر اُٹھوں نہایت محبت سے پھولوں کو میرے سرہانے رکھ دیتا ہے اور اگر میں کبھی اس سے ناراض ہوتی ہوں تو یہ بچوں کی طرح خوشی اور دلار سے اچھلنے لگتا ہے۔

(۸)

زلیخا کو اپنی بہن آمنہ کے پاس رہتے ہوئے ایک عرصہ گذر گیا، اب وہ والیا سے بہت کچھ مانوس ہو چکی تھی۔ انہیں اس کی خوش مزاجی و ظرافت سے بہت لطف آتا تھا۔

ایک دن زلیخا نے والیا سے پوچھا کہ ہوں والیا تم تو ہمیشہ سے یہاں رہتے ہو، کیا تمہارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ تم ہمیں بادشاہ کا محل دکھا سکو۔

والیا، زلیخا کے اس سوال پر ہنسنے لگا اس نے متین صورت بنا کر کہا کہ میں تو روزانہ بادشاہ کے محل میں جاتا ہوں۔ جس دن کے لئے مجھے کہو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر محل دکھلاؤں گا۔ لیکن یہ بتاؤ، کہ تم بادشاہ کے محل میں جا کر کیا کرو گی؟

والیا کے اس سوال پر زلیخا اپنے جوش کو نہ چھپا سکی اور ایک خنجر دکھا کر کہنے لگی کہ بس میں اس لئے جانا چاہتی ہوں کہ تمہارے بادشاہ کے سینے میں اسے پیوست کردوں والیا یہ سُن کر پہلے تو کچھ ہچکا لیکن پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا، اس گفتگو کے دوسرے دن زلیخا کو رحمت خان کا ایک خط ملا جس میں لکھا ہوا تھا کہ:-

"بادشاہ اراکان کو تمہاری موجودگی کا حال معلوم ہو چکا ہے آج ہی وہ تمہیں اپنی خوابگاہ میں بلوائے گا۔ اگر تم انتقام لینا چاہتی ہو تو اس سے بہتر اور کوئی موقعہ نہیں ہو سکتا۔"

خط پڑھ کر زلیخا جوشِ مسرت میں آمنہ سے لپٹ گئی۔ اور کہنے لگی دیکھو آمنہ، بالآخر خدا نے ہمیں یہ موقع دے دیا ہے، اب صرف تمہاری ہمت کی ضرورت ہے۔ اپنے ان بزدلانہ خیالات کو چھوڑ دو، اور باپ کی اس بیکسانہ موت پر غور کرو جو اس عالمِ غربت میں انہیں نصیب ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری زندگی کا واحد مقصد انتقام ہونا چاہیئے۔

والیا جو اس وقت خاموش کھڑا ہوا ان دونوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ لفظ "انتقام" پر ہنس پڑا۔ زلیخا نے جھنجھلا کر کہا، دیکھو۔ والیا، تمہاری ہنسی بعض وقت بالکل بے موقع ہوتی ہے، خیر آؤ ہم لوگ تم سے بھی رخصت ہو لیں، پھر خدا جانے ملنا نصیب ہو یا نہ ہو۔

(۹)

صبح کو جب سورج اپنی زرپاش شعاعوں کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا شاہی محل سے دونوں بہنوں کے لئے مرصع زیورات

اور مع قیمت لباس بھیج دیئے گئے، جنہیں دونوں بہنیں پہن کر شہزادیاں بن گئیں۔
زلیخا نے اپنا وہ زہر آلود خنجر کپڑوں میں چھپا لیا، جو اس کے مرحوم باپ کی تنہا یادگار تھا۔
آمنہ اُس وقت کسی نامعلوم جذبے سے بے تاب ہو رہی تھی۔ اُس وقت اس کی صرف یہی خواہش تھی کہ وہ ایک مرتبہ والیا کو جی بھر کر دیکھ لے۔ وہ ایسا محسوس کرتی تھی کہ شائد اس کے قدم والیا سے ملے بغیر شاہی محل کی طرف نہ بڑھیں گے۔
لیکن آج والیا اُن سے دن کے کسی حصے میں ملنے نہ آیا تھا، آمنہ بوڑھے ماہی گیر کے پاس گئی، اور کہنے لگی، بابا، اگر والیا ہم لوگوں کے چلے جانے کے بعد یہاں آئے تو تم اسے یہ انگوٹھی میری طرف سے دے دینا، اور کہدینا کہ آمنہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھی۔
شام کو اس سے پہلے کہ سورج غروب ہو شاہی نوکروں نے دو پالکیاں جھونپڑے کے سامنے لا کر رکھدیں، کچھ دیر بعد دونوں شہزادیاں اپنے دلوں میں خوفناک تخیلات لئے ہوئے پالکیوں میں سوار ہوگئیں اور دم کی دم میں شاہی محل میں جہاں ہر طرف محل کے تمام متعلقین ان کے استقبال کیلئے ٹہل رہے تھے اتار دی گئیں۔

رات ہو چکی ہے، سناٹا چھایا ہوا ہے اور کافوری شمعیں محل کے طاقوں پر دنیا کی بے ثباتی پر ہنس رہی ہیں، دونوں شہزادیاں بادشاہ کی خوابگاہ میں بھیجدی گئیں، بادشاہ ایک باریک چادر اوڑھے ہوئے مسہری پر لیٹا ہوا ہے۔ زلیخا چھپے ہوئے خنجر کو نکالکر مسہری کی طرف بڑھتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کا خنجر کسی انسانی سینے میں پیوست ہو وہ "والیا" کہکر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ہوش آنے کے بعد آمنہ زلیخا کو اور زلیخا آمنہ کو ایک بامعنی حیرت کے ساتھ دیکھنے لگتی ہیں۔

نادم گنہگار
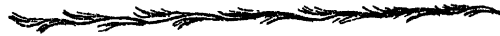
(مصنفہ کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی (۱۸۸۶ء)
(مترجمہ جناب ملک محمد اسلم خان ایم اے (کینیٹ) صوفی منزل، پنڈی بہاؤ الدین)

"اور اس نے یسوع سے کہا۔ آقا۔ جب تم اپنی سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لو، تو مجھے نہ بھولنا
اور یسوع نے اس سے کہا۔ آج تم میرے ساتھ جنت میں ہو گے" (لوقس باب ۲۳ ۔ ۴۲ و ۴۳)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص تھا جو ستر برس کی عمر تک جیا۔ اور اس کی پوری زندگی گناہوں میں کٹی۔ وہ بیمار ہو گیا۔ لیکن پھر بھی اس نے توبہ نہ کی۔ بس آخری وقت جب نزع کا عالم اس پر طاری تھا۔ وہ رویا اور اس نے کہا:۔

"اے خدا مجھ سے درگذر کر، جس طرح صلیب پر تو نے چور سے درگذر کی"۔

اور جونہی اس نے یہ الفاظ کہے، اس کی روح اس کے تن سے جدا ہو گئی۔ اور گنہگار کی روح، خدا کے لئے محبت محسوس کرتے ہوئے اور اس کے رحم پر یقین کرتے ہوئے مملکت سماوی کے دروازہ پر پہنچی اور دروازہ کھٹکھٹانے لگی تاکہ اسے اس مملکت میں داخل کر لیا جائے،

دروازے کے اندر سے ایک آواز آئی،

"یہ شخص کون ہے جو جنت کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ اس کی زندگی کے اعمال کیسے ہیں؟"

اور الزام لگانے والے فرشتہ کی آواز نے جواب میں اس کے سارے اعمال بد کا کچا چٹھا کھول دیا اور عملِ نیک اس شخص کا ایک بھی نہ نکلا۔

اور دروازے کے اندر سے جو آواز آ رہی تھی اس نے جواب دیا۔۔

"مملکتِ سماوی میں گنہگار نہیں داخل ہو سکتے، یہاں سے چلے جاؤ"۔

پھر اس شخص نے کہا۔۔

"آقا، میں تمہاری آواز تو سنتا ہوں۔ لیکن نہ تو میں تمہارا چہرہ دیکھ سکتا ہوں نہ تمہارا نام جانتا ہوں"

آواز نے جواب دیا:۔

"میں پطرس رسول ہوں"

اور گنہگار نے جواب دیا

"پطرس رسول مجھ پر رحم کرو۔ بشری کمزوری اور رحمتِ خداوندی کو یاد رکھو۔ کیا تم مسیح کے حواری نہیں تھے۔ کیا اس کی تلقین تم نے خود اپنے کانوں سے نہیں سنی، اور اس کی مثال کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں دیکھا۔ اس لئے یاد رکھو کہ جب وہ غم میں تھا اور اس کی روح تنگ آئی ہوئی تھی، اور اس نے تم سے درخواست کی کہ جاگتے رہو اور دعا میں مصروف رہو تو تم سو گئے، کیوں کہ تمہاری آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں اور تین مرتبہ اُس نے تم کو سوتے پایا۔ یہی مجھ سے بھی ہؤا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ تم نے اس سے عمر بھر کا پیمانِ وفا باندھا تھا، اور پھر بھی جب وہ **کایافاس** کے سامنے لے جایا گیا تو تم نے تین مرتبہ اسے پہچاننے سے انکار کیا۔ یہی حال میرا تھا، اور یاد رکھو کہ جب مرغ بولا، تو تم باہر جاکر پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ یہی حال میرا تھا۔ تم مجھے داخل کرنے سے انکار نہیں کر سکتے"۔

اور دروازے کے پیچھے جو آواز تھی وہ خاموش ہو گئی،

اور گنہگار تھوڑی دیر ٹھہرا رہا۔ اور پھر اُس نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ اور مملکتِ سماوی میں داخلہ کی پھر درخواست کی۔

اور اس نے دروازے کے پیچھے ایک آواز سنی، جس نے کہا،

"یہ کون ہے، اور دنیا میں یہ کیسے رہا"؟

اور محاسب نے اُس کا نامۂ اعمال پڑھ کر پھر سُنا دیا، اور اُس کا عمل نیک ایک بھی نہیں تھا۔

اور دروازے کے پیچھے سے جو آواز آ رہی تھی، اُس نے جواب دیا "یہاں سے چلے جاؤ، ایسے گنہگار ہمارے ساتھ جنت میں نہیں رہ سکتے"۔ پھر گنہگار نے جواب دیا:-

"آقا۔ میں تیری آواز سنتا ہوں۔ لیکن تجھے دیکھ نہیں سکتا۔ نہ میں تیرا نام ہی جانتا ہوں"

اور آواز نے جواب دیا

"میں داؤد ہوں، شاہ اور پیغمبر"

گنہگار مایوس نہ ہؤا۔ نہ وہ اپنی جگہ سے ہلا۔ بلکہ اُس نے کہا:-

"شاہ داؤد۔ میرے حال پر رحم کر۔ بشری کمزوری اور رحمتِ خداوندی کو یاد رکھ۔ خدا کو تجھ سے محبت

تھی۔ اور اس نے انسانوں میں تجھے عالی رتبہ دیا۔ تیرے پاس سب کچھ تھا، سلطنت، عزت، دولت، بیویاں بچے، لیکن تو نے اپنے گھر کی چھت پر سے ایک غریب آدمی کی بیوی کو دیکھا۔ اور گناہ کا جذبہ تجھ میں سماگیا، اور تو نے عوریہ کی بیوی چھین لی، اور اموینیتوں کی تلوار سے اُسے ہلاک کر دیا۔ تو نے دولتمند ہونے کے باوجود ایک غریب آدمی سے اس کا مینڈھا چھین لیا۔ اور اُس غریب آدمی کو مار ڈالا۔ میں نے بھی یہی باتیں کی ہیں پس یاد کر کہ تو کس طرح پچتایا، اور تو نے کہا کہ "میں اپنی زیادتیوں کا اقرار کرتا ہوں۔ میرا گناہ میری آنکھوں میں ناچ رہا ہے۔ میں نے بھی یہی باتیں کی ہیں، تم مجھے پناہ دینے سے انکار نہیں کر سکتے"

اور دروازوں کے اندر کی آواز خاموش ہوگئی۔

گنہگار تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ اور پھر اُس نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ اور مملکت میں داخلہ کی درخواست کی، اور ایک تیسری آواز دروازے کے اندر سے یہ کہتی ہوئی سنائی دی:۔

"یہ کون شخص ہے، اور اس نے دنیا میں اپنی زندگی کیوں کر گذاری"

اور تیسری مرتبہ الزام لگانے والے فرشتہ نے گنہگار کے اعمال بد کی فہرست پڑھ کر سنائی۔ عمل نیک اس کا ایک بھی نہ تھا۔

اور دروازے کی اندر سے آواز نے کہا:۔

"یہاں سے چلے جاؤ، گنہگار مملکت سماوی میں داخل نہیں ہو سکتے"

اور گنہگار نے کہا:۔

"میں تمہاری آواز سُنتا ہوں، لیکن تمہارا چہرہ نہیں دیکھتا۔ نہ تمہارا نام جانتا ہوں"

پھر آواز نے جواب دیا:۔

"میں علوی یوحنا ہوں۔ جو عیسٰی علیہ السلام کا محبوب حواری تھا"

اور گنہگار نے خوشیاں مناتے ہوئے جواب دیا:۔

"اب ضرور مجھے اجازت دے دی جائے گی کہ اندر آجاؤں۔ پطرس اور داؤد مجبور ہیں کہ مجھے داخل کریں، کیوں کہ وہ تو بشری کمزوری سے آشنا ہیں، اور رحمتِ خداوندی سے مستفیض ہوئے ہیں۔ اور تم مجھے اس لئے داخل کر لوگے کہ تم میں محبت بہت ہے۔ کیا تم ہی وہ علوی یوحنا نہ تھے جس نے لکھا کہ خدا محبت ہے اور جو محبت سے ناآشنا ہے خدا سے بھی ناآشنا ہے، اور اپنے بڑھاپے میں کیا تو نے لوگوں

سے یہ نہیں کہا" بھائیو! ایک دوسرے سے محبّت کا برتاؤ رکھو۔ اِس لئے مجھے نفرت کی نظر سے کیونکر دیکھ سکتے اور واپس لوٹا سکتے ہو، یا تو تم اس تلقین کی تکذیب کرو جو تم کرتے رہے ہو۔ یا مجھ سے محبت کا برتاؤ کر کے مجھے مملکت سماوی میں داخل ہونے دو۔

اور بہشت کے دروازے کھل گئے، اور یوحنا نے نادم گنہگار سے معانقہ کیا، اور اُسے مملکتِ سماوی میں داخل کر لیا۔

"اکثر میرے دوستوں نے ایسے سوال کئے ہیں کہ اگر تم اپنے بچّوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے تو کیا ہرج تھا؟ تمہیں کیا حق تھا۔ کہ اُن کی دماغی نشوونما کو روک دو؟ تم نے انہیں یہ آزادی کیوں نہ دی کہ کالج ان سے سندلیں، اور جو پیشہ انہیں پسند ہو وہ اختیار کریں؟ میرے خیال میں اس قسم کے سوال بالکل فضول ہیں، مجھے بہت سے طالبعلموں سے سابقہ رہا ہے، مجھے جن تعلیمی طریقوں کا "خبط" ہے وہ میں نے خود یا دوسروں کے توسط سے اور بچّوں پر بھی کر کے دیکھے۔ آج میں بہت سے نوجوانوں کو دیکھتا ہوں جو میرے لڑکوں کے ہم عمر ہیں اور میرے خیال میں میرے لڑکے ان سے ہرگز ہیٹے نہیں ہیں۔

لیکن میرے تجربوں کا آخری نتیجہ ابھی مستقبل کے پردے میں پنہاں ہے۔ میری غرض ان باتوں کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ عمرانیات کا مطالعہ کرنے والوں کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ گھر کی باضابطہ تعلیم میں اور سکول کی تعلیم میں کیا فرق ہے اور بچّوں پر اُن کے والدین کی زندگی کے تغیرات کا کیا اثر پڑتا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ حق کے طالب کو تلاش حق میں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اور آزادی کے شیدا یہ دیکھ لیں گے کہ یہ پرجلال دیوی کتنی قربانیاں مانگتی ہے۔ اگر مجھ میں خودداری نہ ہوتی، اگر میں اپنے بچّوں کو وہ تعلیم دلا کر خوش ہوتا جو اور بچے نہیں پا سکتے تھے، تو ان کی ادبی تعلیم تو ہو جاتی۔ لیکن آزادی اور خودداری کی عملی تربیت سے وہ محروم رہتے جس کی خاطر میں نے اس ادبی تعلیم کو قربان کر دیا، آج یہ صورت پیش آجائے کہ آزادی اور علم میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنا ہو تو، کون ایسا شخص ہے جو آزادی کو علم سے ہزار درجے بڑھ کر نہ سمجھے گا"

(مہاتما گاندھی)

"افسانہ" زبان ندارد

(جناب ظفر ہاشمی)

"نہ سہی! ہم تو منہ میں زبان رکھتے ہیں" ——— آج ایک خطرناک ہنگامہ کو لیکر بیٹھا ہوں، اُردو زبان کی موجودہ وسعتوں کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا، کہ اس کے صنف میں افسانوں کی فراوانی اور بہتات ابھی رسوائی تک پہنچ گئی ہے، لیکن خطرہ یہ ہے، کہ یہی فراوانی اور بہتات اُردو کی تکمیل آزادی میں سدّ راہ نہ ہو۔ ہر چیز، اپنے مستقبل کو ہمیشہ جراُت اور امید کے ساتھ دیکھنے کی خوگر ہے اسلئے میں یہ کہنے میں ہرگز ہرگز گریز نہیں کرونگا۔ کہ باوجود اس امر کے کہ اردو کی حالت ترقی پذیر اور خوشگوار ہے' اس میں بہت سے خطرناک عناصر شامل ہو رہے ہیں "اُردو" زبان بذاتِ خود کوئی خطرناک یا تاریک چیز نہیں، مگر خود ہمارا عمل اس کے مستقبل کو صدمہ پہنچا رہا ہے "اردو" کی موجودہ ترقی میں "افسانہ نگاری" کو بہت دخل ہے۔ مگر ہمارے افسانہ نگاروں نے "افسانہ" کی "حقیقت" اور "ماہیت" کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی ہے' افسانے کا آجکل جو مفہوم عام ہے اس کے خلاف جہاد کرنا بھی "صحت ذوق" کی دلیل ہے "افسانے" کا یہ مطلب نہیں کہ "داستان معاشقہ" الفاظ کے اُلٹ پھیر سے ایک خاص چیستان بنا دی جائے، شباب کی ہنگامہ آفرینی اور اُس کی لطیف معصیت' صحیح سہی۔ مگر ذرا سوچئے تو کہ بدذوقی اور دیکھا دیکھی، اندھا دھند تقلید کس قعرِ مذلت کی طرف لے جا رہی ہے!!

بلاشبہ، ہمارے افسانہ نگاروں نے' نئے نئے خیالات و واعیات سے اردو لٹریچر میں کسی قدر دلچسپی ضرور پیدا کر دی ہے، لیکن یہ تمام ع "سعدی از دستِ خویشتن فریاد" کی مصداق ہے۔ اُردو کے انسانی تخیل اور افکار کا زیادہ تر انحصار تقلید اور تتبع پر ہوا کرتا ہے، اور اس کا بڑا حصّہ، اجتماعی معلومات' مشاہدات اور تجربات سے وابستہ ہے، اگر یہی چیزیں نامکمل ہوئیں تو اس جذبہ کی نامعقولیت میں کوئی شبہ نہ ہوگا ——— تخیلات کی رسائی انسانی دماغ میں اس وقت تک ہرگز ممکن نہیں جب تک کہ ہم اپنے تاثرات، کو کسی خارجی اثر کے "اظہار" "فکر و احساس" میں داخل نہیں کر لیتے، !!

آئے دن نئے نئے افسانہ نگاروں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ جس نے ذرا اُردو لکھنا پڑھنا جان لیا۔ اُس نے جھٹ افسانہ ترتیب دے دیا۔ نہ یہ معلوم ہے کہ "افسانہ" کا مقصد کیا ہے ———— ؟ نہ یہ جانتے ہیں کہ اس کا اصلی مفہوم کیا ہے" . . . ؟ ؟

ایک عورت اور مرد کو نشانہ "تحریر" بنا لیا اور فرضی "عشق و محبت" کے قصّے کو طول دینا شروع کر دیا، اس میں "ہوس پرستی" ———— آغوشِ اشتیاق ———— ہجر و وصال ———— درد و فراق اور خلوت میں "بوسہ بازی" وغیرہ حیا سوز منظر اس طرح دکھائے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا بیٹھا بیٹھا بے تاب ہو جاتا ہے ———— لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ

یہ ہے ہمارے افسانہ نگاروں کا "حسنِ مذاق" یہ ہے "ارتعاشِ رنگین"۔ یہ ہے "آشوبِ خیال" جو ہمارے تصوّراتِ شوق ادب کو اس دورِ آویزش میں فرسودہ کر رہا ہے، ان گناہ آلود "ہوسناکیوں" کا نام "حسنِ خیال" رکھا گیا ہے، اللہ ہمارے نوجوانوں کو اس "رنگینیٔ فکر" سے بچائے ———— !

اندیشہ ہے۔ کہیں اس خیال کے اظہار سے بعض بزرگ "چراغ پا" نہ ہو جائیں، حاشا میرا یہ منشاء نہیں منشاء صرف یہ ہے کہ ہم وہ کام شروع کریں، اور اس طرح کا کام شروع کریں، جس کا "مستقبل" و "حال" ہمارے لئے اور ہمارے آئندہ آنیوالوں کے لئے "خسرانِ مبین" ہی نہ ثابت ہو کر رہے۔ بلکہ ان کے لئے چراغِ راہ بنے اور ہماری زبان ان "لچرمایت" اور "فضولیات" سے پاک رہے، کیوں کہ زبان کا اصلی وقار اُس کے سنجیدہ سرمایۂ علمی ہی سے قائم ہو سکتا ہے نہ کہ اس فرسودہ اور عامیانہ طرزِ عمل سے ! ہمیں اس وقت" جوانی کی راتیں" ———— "مرادوں کے دن" والے افسانے درکار نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسے تمام لٹریچر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ جس سے اُردو کی سنجیدگی اور پاکیزہ وقار کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ اور وہ جذبات جو ہوس پرستیوں اور کام جوئیوں کی نذر ہو کر دردناک تماشے دکھا رہے ہیں۔ اور خصوصاً وہ "سرابِ معصیت" جو ہمارے نوجوانوں کے لئے، امورِ لذّتِ نفس کے واسطے معین ہو چلا ہے اس کا بالکلیہ استیصال کر دیں !

اس قسم کے افسانے، ہمارے اخلاق اور کیرکٹر پر جس قسم کا اثر ڈال رہے ہیں۔ وہ بدقسمتی سے سب خدمتِ علمی ہی سمجھے جاتے ہیں۔ [illegible] نئے نئے افسانہ [illegible] صحیح کو خراب کر رہے ہیں۔ +

افسانہ لکھنے سے پہلے ہر شخص کو [illegible]

عادات کے جزوی عناصر اس کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ انہیں اپنے نظامِ عقل سے ترتیب دیتا ہے۔ جب کسی فرضی شخص کی عادات کا مرقع تیار کرنا چاہتا ہے۔ تو صفات خصوصی داخل کرتا ہے، حقیقت کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ "مشاہدہ" کی ہر خصوصیت کی اصلیت کو سامنے رکھا جاتے۔ مشاہدہ کئی صورتوں سے ہوتا ہے "اجمالی" یا "تفصیلی" ——— پھر ان دو اصولوں کے تحت وہ تمام تفصیلیں روشن ہو جاتی ہیں۔ جن کا نتیجہ "افسانہ" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہر صفت، ہر وجود، ہر کیفیت، ہر مشاہدہ کی اصلیت، ان کی حقیقت معنویت، جذبۂ تاثر، کسی خاص ادا کا مخصوص انداز، غرض اس کی کتنی ہی منزلیں ہیں۔ ہر کیفیت کا احساس۔ فرضی تعینات۔ یا مصنوعی تقابل سے ہی لازم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس لئے کسی خاص جذبے اور خاص ترتیب نظام کا ہونا ضروری ہے ——— لذت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جس جذبہ کی تصویر ہو مکمل ہو ———، جس سے "روح" کو خاص لذت حاصل ہو، اور کسی ایسے اخلاق کی نشو ونما میں مدد ملے، جو ایک سطحی مذاق کی تکمیل ہو، بلندی لطافت اور اسکی ہر کیف رنگینی و تسلسل سے معمور ہو ——— !!

افسانہ نگاری جس قدر لوگوں کو آسان معلوم ہوتی ہے۔ اسی قدر مشکل ہے۔ "افسانہ نگاری" کو شاعری اور جذبات سے جس قدر تعلق ہے اور کسی چیز سے نہیں۔ اس کا دامن اگر ایک طرف تاریخ سے اٹکا ہوا ہے، تو دوسری طرف اس کا سب سے بڑا معاون "ماثر شعری" ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ نگاری میں شوخی اور سنجیدگی بھی باہم حصہ دار ہیں۔ جس افسانہ میں کسی قسم کا سبق یا عبرت نہیں۔ وہ افسانہ نہیں بلکہ ایک محنتِ رائیگاں ہے، ——— !!

افسانہ لکھنے سے پہلے افسانہ نگار کو "محاکاتِ افسانہ" پر غور کرنا چاہیئے۔ ——— ——— یعنی کسی بیہ کا تصور یا تخیل اس طرح باندھ لینا۔ کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے جم جائے۔ محاکاتِ افسانہ کہلاتا ہے محاکات اور تخیل میں کوئی فرق نہیں، ان دونوں کا نتیجہ معنوی ایک ہی ہوتا ہے اور ان کی "تخلیقی قوت" اس قدر متحد ہوتی ہے، کہ ان کی مخصوص کیفیتوں کے اثرات بھی ایک دوسرے کی مستقل اہمیت ہوتے ہیں "ان دونوں قوتوں کا ذہنی ارتقا کے ساتھ اتنا ہی ربط ہے جتنا کہ ہر افسانے کا عنصر بہ عنصر کے ساتھ !!

افسانے کے دوں کے موضوعی پہلو کے ساتھ ساتھ نفسیات (Psychology) کے ذریعہ اس کی نہی مجانست کا مطالعہ بھی ضروری ہے "جمالیاتِ افسانہ" گویا تاثرات کا دوسرا نام ہے۔ جس قدر افسانہ نویس

اپنے افسانہ کا باریک و لطیف خاکہ کھینچتا ہے، اور اسے جمالی پہلو پر لا کر "واقعیت" کا لباس پہنانا چاہتا ہے، اور اس کی اخلاقی، نفسیاتی، اور معاشرتی پیچیدگیوں کو سلجھاتا ہے اور بخیال خود اس کی اجمالی خوبیوں کا تسلسل پیرانۂ تحریر میں آرائش و زیبائش کے ساتھ نبا ہتا ہے، پھر اس کے ساتھ ساتھ "حسن و عشق" فراق و وصال، درد محبت، انبساط و غم، نیز اس کے تنوع کے تمام جزوی خصوصیات مربوط کر دیتا ہے۔ کیوں کہ جذبۂ عشق کی ترجمانی آغاز کائنات ہی سے انسان کا ایک دلچسپ مشغلہ رہا ہے، اور سب سے پہلے اس کے اظہار کا ایک ہی ذریعہ پیدا ہوا۔ یعنی "افسانہ" یا "قصہ نویسی" ——— !!

جذبہ عشق کو جو ہر فرد بشر کے لئے حلقہ بگوش آفرینش ہے، ہر شخص امتیازی طور پر ساتھ لاتا ہے، دنیا کی فضائے لامکانی میں جہاں حسن کی شعاعیں ہمیشہ بکھری رہتی ہیں "قوت متخیلہ" کام کرتی رہتی ہے، یہ مانا کہ سیلاب شباب کی طغیانی، سمندر کی موجوں سے زیادہ مہیب ہوتی ہے، جس طرح، آفتاب، چاند اور ستارے اپنے محور پر گھومتے ہوئے بتقاضائے فطرت عروج و زوال سے لاچار رہتے ہیں، اسی طرح ہر انسان منازل ہستی طے کرنے وقت پست و بلند سطح حیات کو عبور کرتا ہوا دوش بدوش ہوتا ہے، مگر نہ کوئی طاقت بشری نظام عالم کے نظام کن فکانی کو درہم برہم کر سکتی ہے، اور نہ قوت جبری جذبات صادق کو روک سکتی ہے،

در میان قعر دریا تختہ بندم کردۂ   باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

مگر اس جذبہ لطیف" یعنی عشق کو، ہمارے نوجوان اور افسانہ نگار طبقہ نے کس قدر رسوائی کی منزل تک پہنچا دیا ہے۔ کہ روز بروز عام وبا کی صورت اختیار کر رہا ہے، کوئی افسانہ ایسا نہیں ہوتا، جس میں اسی قسم کے گندے عشق و محبت کے سوا کچھ اور ہو، ہمارے افسانہ نگار سمجھتے ہیں کہ ہم اُردو کی بہترین خدمت کر رہے ہیں۔ مگر حقیقت میں انہوں نے رعنائی ادب میں اپنی فرسودہ قلمی سے اس قدر لغویات اور فضولیات بھر دی ہیں۔ کہ ... مذاق سلیم آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے، اردو زبان کے روز افزوں ترویج اشاعت کے باوجود تنزل پذیر ہونا حیران کن نہ ہو۔ تو کیا ہو؟ کیا ہم اسے اُردو زبان کی حقیقی ترقی کہہ سکتے ہیں ... ؟ ؟ نہیں! بلکہ یہ ترقی معکوس ہے، جس کی بنا سراسر تخطاطی ہے،

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کیساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہمیں اس وقت جھوٹے "عشق و محبت" کے بجائے اپنے لئے اور اپنی زبان کے لئے کسی اور چیز کی

ضرورت ہے !! اور عموماً ہمارے نوجوان اس سے بے خبر نہیں ہیں کہ ہماری زبان، ہمارا لٹریچر، اور ہمارا اخلاق ان تمام فرسودہ خیالات سے پاک ہونا چاہیئے۔ جس کا اثر روز بروز ہماری زندگی کو خراب کر رہا ہے، نوجوانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ جھوٹے عشق کے بجائے اپنے دل میں سچا "عشق" پیدا کریں، زبان کی پاکیزگی کی ذمہ واریاں ان پر ہیں مگر افسوس ہے کہ انہیں اس کا احساس نہیں۔!!

جوشِ جوانی

(از جناب ناظر غزنوی مدیر رسالہ چمنستان)

نہاں ہیں کس قدر رنگینیاں جوشِ جوانی میں
شرابِ کیف کا جلوہ نظر آتا ہے پانی میں

لہو کا ایک قطرہ دل، اور اس میں سوزِ الفت بھی
تماشا ہے کہ آتش شعلہ زن ہے سرخ پانی میں

محبت کی لطافت پر گراں ہے بوجھ دنیا کا
چلو چل کر رہیں دونوں فضائے آسمانی میں

وہی جنت جو بچپن میں رہا ہے میرا گہوارہ
نہ دے ترغیب واعظ اس کی ایامِ جوانی میں

نظر آتی ہے اک موجِ تبسم مجھ کو اے ناظر
ہوا کی جنبشوں میں اور موجوں کی روانی میں

مصر میں طبِّ قدیم

(مولانا عبدالوحید صدیقی سابق مدیر "مساوات" و "مہاجر")

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ طبّ جدید کی تمامتر بنیاد مصر کی طب قدیم پر ہے، اور ہمارے پاس یقین کرنے کے لئے کافی وجوہ موجود ہیں۔ کہ طب جدید اٹھارویں صدی سے پہلے مصر کی طب قدیم کے اس مرتبہ رفیع تک نہیں پہنچی تھی جس پر وہ چار ہزار سال قبل مسیح پہنچ چکی تھی ✤

مصری طبیب فروع طب میں سے صرف ایک فرع کو اختیار کرتا تھا۔ اور اسی کی تحصیل میں اپنا تمام وقت اور تمام جدو جہد صرف کر دیتا تھا۔ حتےٰ کہ وہ اس فرع مخصوص کا ماہر خصوصی سمجھا جانے لگتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مصری طب کی شہرت تمام متمدن دنیا کے اندر پھیل گئی تھی۔ اور ایک طبیب کو اپنی ثقاہت اور اپنے کمال کا اعتراف کرانے کے لئے صرف اتنا کہدینا کافی ہوتا تھا کہ اُس نے علوم طبیہ کی تحصیل مصر میں کی ہے

دوسرے ممالک کے تاجداروں اور بادشاہوں میں سے جب کوئی بیمار ہوتا تھا۔ تو نہایت تیز رفتار قاصد مصر بھیجا جاتا تھا۔ تاکہ وہ جلد سے جلد مصری طبیب کو اس کے معالجہ کے لئے لے جائے ✤

مصر قدیم کے اطباء کے نزدیک بھی طب کی خصوصیات آج کل کی طرح علوم تشریح۔ فزیولوجی۔ طب۔ جراحت اور علاج تھیں۔ قدیم مصری طبیب حیوانوں کی ہڈیوں کے جوڑوں اور ترکیبوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا نہایت کامیاب معالجہ کرتے تھے، وہ معدہ کی جگہ اور اس کے معینہ کام کو خوب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا۔ کہ امعاء۔ طحال اور قلب کی جگہیں اور اعمال کیا ہیں۔ اور یہ بڑی بڑی اوعیہ قلب سے شروع ہوتی ہیں اور جسم کے تمام عضا میں پھیل جاتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قلب تمام اعضاء کا مرکز ہے۔ مصری طبیب جب مریض کی پیشانی پر یا گردن کے پچھلے حصّہ پر ہاتھ رکھتا تھا۔ یا اُس کے دونوں ہاتھوں کو مس کرتا تھا تو بہرحال اُس کی توجہ مریض کے قلب کی طرف ہوتی تھی۔ کیونکہ قلب کی اوعیہ تمام اعضائے جسم میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصری طبیب نبض کی کیفیتوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ دورۂ دمویہ کی پہچان رکھتے تھے اور اسے "ہوائے حیات" یعنی [illegible]

ایک قدیم طبی تحریر سے جو ورق بردی[1] پر لکھی ہوئی ہے پتہ چلتا ہے کہ "ہوا حیات" جسم میں ناک کے ذریعہ داخل ہو کر خون کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اور پھر قلب تمام ایسے اجزا جسم میں پہنچا دیتا ہے جس سے جسم انسانی حیاۃ اور حرکت کا اکتساب کرتا ہے۔

قدیم مصری طبیبوں کے نزدیک ایک ہوا "موت" بھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ہوا جب جسم میں داخل ہوتی ہے تو اعضا کے عمل کو فاسد کر دیتی ہے اور اس کی رفتار میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے التہاب پیدا ہو کر امراض رونما ہو جاتے ہیں اور جب طبیب ان امراض کے معالجہ سے عاجز ہوتا تھا تو اس کے معنی یہ سمجھے جاتے تھے کہ ہوا حیات نے خون سے مفارقت اختیار کر لی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ منجمد اور غیر متحرک ہو گیا ہے اور مریض کی زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔

آج کل کی طرح زمانہ قدیم کے مصری طبیب بھی جب مریض کو دیکھتے تھے تو پہلے کچھ سطحی تفحص کرتے تھے اور اس سے کچھ سوالات دریافت کرتے تھے۔ اس کے بعد اس کی نبض دیکھتے تھے اور اچھی طرح حالت دریافت کر لینے کے بعد دوا اور نسخہ تجویز کرتے تھے۔

اوراق بردی پر ایسے بہت سے نمونے ملتے ہیں، جہاں طبیب نے معدہ کے مریضوں سے بے شمار سوالات کئے ہیں، تاکہ تشخیص امراض میں مدد مل سکے۔ ان اوراق سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصری طبیب دوا تجویز کرنے سے پہلے تشخیص مرض کی پوری پوری کوشش کرتا تھا، مثلاً وہ پہلے معلوم کرتا تھا کہ "پیٹ میں ثقل ہے؟ جوف معدہ میں سخت گرانی ہے؟ قلب میں گرمی محسوس ہوتی ہے؟ اور وہ زور زور سے دھڑکتا ہے؟ اور کیا کپڑے مریض کو بہت ہی ناگوار معلوم ہوتے ہیں؟ اور وہ انہیں اتار کر پھینک دینا چاہتا ہے؟ رات کو پیاس معلوم ہوتی ہے؟ اس کا قلب مریض ہے، اسے اپنے تن بدن کی خبر نہیں رہتی وغیرہ وغیرہ"۔

اس زمانہ میں عام طور پر نباتی ادویہ استعمال کی جاتی تھیں۔ اس لئے طبیب کو علم النبات کی تحصیل نہایت ضروری تھی۔ اور اسے بے شمار جڑی بوٹیوں اور گھاس پات کے خواص طبیہ سے پوری طرح واقف ہونا پڑتا تھا۔ بہت سے ایسے نہایت مفید اور قیمتی نباتات کا ذکر اوراق بردی میں ملتا ہے جن کا معلوم کرنا آج کل ناممکن ہے، نباتات کے علاوہ وہ اکثر پھلوں سے دوا کا کام لیتے تھے اور ان سے مختلف قسم کے عرق، خوشبو، سفوف، معجون، مرہم اور روغن تیار کرتے تھے۔

---

[1] ورق بردی۔ ایک درخت کا پتا جس سے زمانہ قدیم میں مصری تحریر کا کام لیتے تھے۔

نسخہ لکھنے کا طریقہ ہمارے زمانہ کے نسخہ لکھنے کے طریقہ سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔ ایک ورق بردی پر وہ مرکب دوا کے تمام اجزاء علیحدہ علیحدہ مع ان کے معینہ اوزان کے لکھ دیتے تھے۔ مریض نسخہ کو دوافروش کے پاس لے جاتا تھا۔ دوافروش ان تمام اجزاء کو نسخہ کی ہدایت کے مطابق کوٹ چھان کر ایک دوسرے سے ملا دیتا تھا، اور مریض کو دوا کی ترکیب اور اوقات استعمال سمجھا دیتا تھا۔

قدیم مصری طبیب بعض معدنی چیزیں بھی مریضوں کو استعمال کراتے تھے۔ لیکن وہ بہت کم تھیں جن میں زیادہ تر پتھر تھے، ان پتھروں میں بعض ایسے تھے جنہیں آج کوئی نہیں جانتا۔

ان پتھروں میں سے بعض کے خواص نہایت حیرت انگیز تھے۔ ایک پتھر ایسا تھا جسے زخم پر رکھ دینے سے وہاں کا گوشت مر جاتا تھا۔ اور پھر اس مقام پر عمل جراحی کرنا نہایت آسان ہو جاتا تھا۔ ریڈیم کے طریق علاج سے شائد وہ واقف نہ تھے۔ مگر طبی امراض کے لئے وہ پتھروں کا استعمال خوب جانتے تھے۔

تخدیر (جسم کے کسی حصہ کو بے حس کر دینا) کا طریقہ سب سے پہلے قدیم مصری حکما نے دریافت اور رائج کیا۔ چنانچہ اوراق بردی میں اس طریقہ کے متعلق کثرت سے کنایات اور تلمیحات ملتی ہیں، انہوں نے بعض گھاسیں بھی دریافت کی تھیں جن کا استعمال مریض کے حزن والم کو فراموش کرا دیتا تھا۔ مواد حیوانیہ کا استعمال قدیم مصری اطبا کے یہاں بہت ہی نادر تھا۔ وہ صرف شہد اور دودھ کا استعمال جانتے تھے۔ یا کبھی کبھی موم اور بکرے کی سینگ کو بھی کام میں لے آتے تھے۔

ان مواد نباتی معدنی اور حیوانی کے علاوہ ہمیں ان کے یہاں بعض ایسے مرکبات بھی ملتے ہیں جو کسی حیوان کی جان لے کر تیار کئے جاتے تھے۔ اس ضمن میں مختلف حیوانات سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ کچھوے کی چربی، بکری کے بچے کا خون اور سانپ کے تیل وغیرہ سے عام طور پر کام لیا جاتا تھا۔ لیکن یہ چیزیں ہمیشہ مالش یا لیپ وغیرہ کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔

سترھویں صدی عیسوی تک، اور بعض دیہاتوں میں اب بھی ان حیوانی مرکبات کی بڑی قدر کی جاتی ہے مصری طبیب کے، مذکورہ مشاغل کے علاوہ کچھ اور مشاغل بھی تھے۔ زمانۂ قدیم میں بھی خواتین مصر آج ہی کی طرح آرائش و زیبائش اور بناؤ سنگار کی بہت دلدادہ تھیں، چنانچہ وہ ان اطباء سے جلد کو ملائم اور حسین بنانے کے روغن اور پاؤڈر وغیرہ اور ایسی چیزیں جن سے وہ اپنے بالوں کو رنگ سکیں اور ظاہری حسن و جمال میں اضافہ کر سکیں طلب کرتی تھیں۔ طبیب اُن سے ملاطفت اور مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے، اور انہیں ہر قسم

کی ممکن امداد بہم پہنچاتے تھے ۔
قدیم مصری طبیب سے کبھی کبھی اجنّہ کے دُور کرنے اور اُن کے حملہ سے ذکور و اُناث کو محفوظ رکھنے کی خدمت بھی لی جاتی ۔
مختصر یہ کہ زمانۂ قدیم کا مصری طبیب آج کل کے طبیبوں سے اور اسکا طریقۂ علاج آجکل کے طریقۂ علاج سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا ۔ گویا آج دُنیا اس سبق کو یاد کر رہی ہے ۔ جسے مصریوں نے چار ہزار سال قبل خود معلوم کیا اور دوسروں کو بتایا تھا ۔ لیکن مرُورِ زمانہ نے اسے انسانی ذہنوں سے محو کر دیا تھا ۔

تحریکِ عمل

(لانگ فیلو کی ایک نظم کا ترجمہ)

(از جناب ارادالصاری مالیگانوی)

کچھ غم نہ کر جو شورشِ افکار ہو تو ہو
مایوسیوں کا سر پہ ترے بار ہے تو ہو
یہ چرخ بھی جو درپئے آزار ہی تو ہو
منزل اگر ہزار بھی دشوار ہے تو ہو
ہے مصلحت یہی کہ ٹھہرنا نہ چاہیئے
راہِ طلب میں ہمت مردانہ چاہیئے

"دِل"

(خواجہ حافظ شیرازی کے ایک شعر کا ترجمہ)

طرازِ خانۂ دِل کی نہ پُوچھ زیبائی
ہے اِس میں شاہدِ مطلق کی جلوہ آرائی
نگارشِ قلمِ ایزدی کا ہے یہ کمال
ہر ایک نقش سے ظاہر ہے شانِ یکتائی
ہر ایک شکل کا نظریہ ہے خود آرائی
ہر ایک صُورتِ زیبا ہے اپنی شیدائی

افسانۂ گل و بلبل

(جناب محمد عادل خان متعلم بی، اے)

معشوقہ نے نوجوان سے کہا - میں تمہارے ساتھ رقص اس وقت کروں گی جب تم مجھے ایک سرخ گلاب کا پھول لادوگے"

نوجوان نے کہا " پھول! سرخ گلاب کا پھول! افسوس میرے باغ میں اس وقت گلاب کا کوئی پھول نہیں - میں کیا کروں - کہاں جاؤں "

بلبل شاہ بلوط کے درخت پر بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھی اور خاموش پتوں کی اوٹ سے جھانک رہی تھی " نہیں، کوئی پھول میرے باغ میں نہیں " نوجوان کا یہ کہنا تھا کہ اس کی چمکدار آنکھوں سے فوراً آنسو جاری ہوگئے، بولا " اُف کتنی معمولی سی چیز سے ہماری حیات کی مسرتیں وابستہ ہیں - میں نے بزرگوں کی حکمتوں کا مطالعہ کیا، اور فلسفہ کے تمام رموز سربستہ کی عقدہ کشائی کی - لیکن یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ تمام ظاہری علوم آج بیکار ہیں - میری حقیقی مسرتیں آج ایک سرخ گلاب کے پھول سے وابستہ ہیں +

بلبل نسیر بن مقال چہچہانے لگی اور بولی " آخر کار وہ عاشق صادق جس کے لئے میں نے اپنی زندگی کی قیمتی راتیں نغمہ سرائی میں گذاریں - جس کی داستان درد میں نے ستاروں کو سنائی میرے سامنے آزردہ اور دل شکستہ کھڑا ہے - اس کے بال سواد شام تنہائی سے زیادہ کالے ہیں - اِس کے لب گل آرزو سے کہیں زیادہ سرخ ہیں مگر تلاطم جذبات نے اسے زرد موتی کی طرح زرد کر دیا ہے +

نوجوان نے کہا - کل رات شہزادہ رقص و سرود کی ایک مجلس منعقد کرے گا - میری محبوبہ میری روح حیات بھی وہاں ہوگی - اگر میں نے ایک سُرخ گلاب کا پھول مہیا کرلیا اور اُس کے حضور میں پیش کر دیا، تو وہ حسب وعدہ طلوع آفتاب ہونے تک میرے ساتھ رقص کرے گی - میں اُسے اپنی

آغوش محبت میں لونگا۔ اسکا پیارا نازک ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہوگا۔ مگر افسوس میرے باغ میں
کوئی پھول نہیں، میں اس کے پاس کیا لے جاؤں گا۔ پھول ناممکن الحصول ہے۔ میں تنہا
کسی گوشے میں چپکے سے جا بیٹھوں گا۔ وہ بصد ناز و نزاکت میرے قریب سے گذر جائیگی
اور وہ پروا بھی نہیں کرے گی۔ اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت ہوگی ——— ؟"

بُلبل نے کہا: "یہی، بیشک یہی وہ سچا عاشق ہے جس کے لئے میں چہچہاتی ہوں۔ اسے اس بات کا
احساس ہے کہ محبت کی دیوی کو دکھ نہ پہنچے، محبت اسی کا نام ہے کہ آبگینۂ دل کو صدمہ
نہ پہنچایا جائے محبت ایک عجیب چیز ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر عاشق تزکیۂ قلب کی اس منزل پر پہنچ جائے
کہ دل سوائے محبت کے ہر چیز سے خالی ہو۔ اگر اُس کے سیتار کے ہوئے ہوں تو اُن کی لرزش
نغمہ بن کر حد نظر سے آگے چلی جاتی ہے۔

نوجوان:۔ گویئے اور مغنی مجلس عیش و طرب میں رونق افروز ہوں گے۔ آلات موسیقی بجا کر اہل محفل
پر وجد کی کیفیت طاری کریں گے۔ میری محبوبہ رقص کرے گی۔ اُس کے نازک پاؤں زمین سے
نہ چھوئیں گے۔ تمام اہل مجلس اس کے گرد حلقہ باندھے ہوں گے۔ میں بھی کسی گوشے میں بیٹھا دیکھ رہا
ہوں گا۔ وہ مجھے محبت بھری نگاہوں سے نہیں دیکھے گی۔ کیونکہ میرے پاس سرخ گلاب کا پھول
نہ ہوگا۔" یہ کہتے ہی وہ سبزۂ زمین پر بے اختیارانہ بیٹھ گیا۔
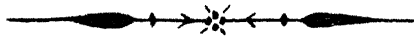
سبز چھپکلی کے سوال پر بلبل شیریں گفتار نے جواب دیا۔ کہ یہ نوجوان گلاب کے ایک پھول کے لئے
خون کے آنسو رو رہا ہے۔ چھپکلی نے اس کی طرف توجہ کی۔ مگر بلبل اس کے راز محبت کو خوب سمجھتی تھی، وہ
درخت پر خاموش بیٹھ گئی۔ اور محبت کے اسرار لاینحل کی عقدہ کشائی کی تدبیریں سوچنے لگی۔ دفعتاً اُس نے
اپنے بازو پھیلائے اور ہوا میں پرواز کر گئی۔ باغ کے عین وسط میں ایک گلاب کا درخت تھا۔ بلبل اس پر بیٹھی
اور عاجزی سے ایک پھول کا سوال کیا۔ اور کہا کہ اگر تو مجھے ایک سرخ پھول عنایت کرے گا، تو میں اپنے جذبۂ
تشکر کے اظہار کے طور پر ایک میٹھا گیت گاؤں گی۔ درخت نے سر ہلایا اور کہا۔ میرے پھول سمندر کی جھاگ
اور پہاڑوں کی برف سے زیادہ سفید ہیں۔ جاؤ میرے فلاں بھائی کے پاس جاؤ، شاید وہ تمہارا مقصد
پورا کرے۔

بلبل وہاں سے اڑ کر دوسرے درخت کے پاس پہنچی، لیکن وہاں سے بھی نا امید ہوئی۔ اس درخت نے کسی تیسرے درخت کا پتہ بتایا، اور کہا کہ وہ دیکھو اس نوجوان کے مکان کی کھڑکی کے نیچے ایک درخت ہے وہی تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ بلبل مایوسی کی حالت میں تیسرے درخت کے پاس پہنچی اور نہایت انکساری سے ایک پھول مانگا۔ اُس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور کہا: "میرے پھول قمری کے پاؤں کی طرح سرخ تو ہیں، لیکن سردی نے مجھے تباہ کر رکھا ہے اور آندھی نے میری شاخیں توڑ دیئے ہیں۔ پھول مجھ سے روٹھ گئے ہیں"۔

بلبل نے کہا: "میں ایک پھول چاہتی ہوں۔ کوئی ذریعہ ہے جس سے میں اسے حاصل کر سکوں"؟

درخت: "ہاں ہے تو سہی۔ مگر وہ اتنا ہولناک ہے کہ میں زبان پر نہیں لا سکتا"۔

بلبل: "نہیں میں ہرگز نہیں ڈرتی"۔

درخت: "اگر تو واقعی پھول چاہتی ہے، اور ایک سرخ گلاب کا پھول چاہتی ہے تو چاندنی رات میں میری کسی ایک شاخ پر بیٹھ کر اپنے سینے کو ایک کانٹے سے لگا کر مجھے ایک کیف آور نغمہ سُنا۔ تمام رات اپنے میٹھے سروں سے مجھے بے خود بنا۔ کانٹا تیرے سینے سے گذر کر تیرے دل میں چبھ جائے گا۔ تیرا خون میری رگوں میں دوڑ جائے گا۔ اور میرے خون کی شکل اختیار کرلے گا۔ اِس خون سے مجھ میں ایک تازہ زندگی کی لہر دوڑ جائے گی اور پھر ایک ایسا پھول پیدا کروں گا جو اپنی نظیر آپ ہوگا"۔

بُلبل: "تو کیا اس حیاتِ مستعار کی قیمت صرف ایک پھول ہے"۔ وہ مسکرائی اور درخت سے اُڑی۔

نوجوان گھاس پر بیہوش پڑا تھا۔ آنسو ابھی اُس کے رخساروں پر سے خشک نہ ہوئے تھے بلبل اڑتی ہوئی پاس آئی اور کہنے لگی "خوش ہو اے نوجوان۔ میں تیرے لئے ضرور ایک گلاب کا پھول مہیا کروں گی، نوجوان نے جو نیم بیہوشی کی حالت میں پڑا تھا یہ الفاظ سُن لئے۔ لیکن وہ بلبل کی اس گفتار کو نہ سمجھ سکا۔

شاہ بلوط کا درخت جس کی شاخوں پر بلبل کا نشیمن تھا غم جدائی کے بار سے جھک گیا، اور بولا "اے بلبل میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ تیرا مسکن میری آغوش ہے تو مجھے آخری بار ایک گیت سنادے جو ایثار، محبت، اور خلوص کے جذبات کو دنیا میں غیر فانی حیثیت دے دے"۔

بُلبل: "تو مطمئن رہ میں ضرور گاؤں گی" اس نے گانا شروع کیا۔ جب گیت ختم کر چکی تو نوجوان اٹھا اور اُس

نے کہا "کیا وہ دوسروں کے محسوسات کا اندازہ لگا سکتی ہے؟ نہیں دوسروں کے لئے اپنی پیاری جان کون کھوتا ہے مگر یہ بات ماننی پڑے گی کہ وہ ایک خاص سُر اپنی آواز میں رکھتی ہے"

رات کی چاندنی میں بلبل اس درخت پر جا بیٹھی۔ اور اس نے اپنے سینے کو ایک خشک نوکدار کانٹے سے لگا دیا۔ اور گانا شروع کیا۔ بلبل بیخودی کے عالم میں نغمہ سنج تھی۔ کانٹا اس کے سینے کے اندر ہی اندر چبھتا جا رہا تھا۔ چاند اُس کا پُر کیف نغمہ سُن کر رقص کرنے لگا۔ لیکن کانٹا بلبل کے دل تک نہ پہنچا تھا سینے سے خون کے چند قطرے نکلے اور وہیں کانٹے کے پاس جم کر رہ گئے۔ بلبل نے عاشق و معشوق کے دلوں میں عشق کے بھڑکنے کی داستان خاص لے میں گائی۔ جوں جوں بلبل گیت گاتی تھی گلاب کی خوبصورت پتیاں سرسبز و شاداب ہوتی جاتی تھیں۔

درخت ۔ تو اپنا سینہ اور آگے کر۔ اور اگر ایسا نہ کر سکی تو آفتاب گلاب کے پھول کے مکمل ہونے سے پیشتر طلوع ہو جائے گا۔ اور پھول نامکمل رہ جائے گا۔

بلبل نے تعمیل حکم میں کوتاہی نہ کی۔ اور زیادہ خوش الحانی سے گانے لگی۔ ہر لحظہ اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ کیوں کہ وہ عاشق و معشوق کے دلوں میں زندگی کی روح پھونک رہی تھی۔ ایک ہلکی سی سرخی دلہن کے چہرے کی طرح (جب کہ دُلہا نے اس کے لب لعلیں کا بوسہ لیا ہو) پتوں میں پیدا ہو گئی۔ کانٹا ابھی اس کے دل تک نہیں پہنچا تھا۔ گلاب کا پھول نمودار ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ابھی سفید تھا۔ بلبل کے دل کا خون ہی اُسے سُرخ کر سکتا تھا۔

درخت نے کہا "اے ننھی بلبل کانٹے کو دل میں چبھو ورنہ پو پھٹنے تک پھول نامکمل رہ جائے گا۔"

بلبل نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ اب کانٹا اس کے دل میں چبھنا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ اندر ہی اندر دل میں چبھتا جا رہا تھا۔ گیت زیادہ درد انگیز اور المناک ہو رہا تھا۔ کیوں کہ یہ گیت غیر فانی محبت کا درس دے رہا تھا۔ گلاب سرخ ہونے لگا۔ بلبل کے پر پھڑ پھڑانے لگے۔ [illegible] کی آواز [illegible] معدوم ہونے لگی۔ اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ کوئی چیز اس کے گلے میں [illegible] ۔ [illegible] سنا وہ کانپا۔ اور اس نے اپنی پتیاں صبح کی ہواؤں میں کھول دیں۔ درخت چلایا ۔ [illegible] دیکھو پھول [illegible] ۔ لیکن بلبل نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیوں کہ وہ گھاس پر مردہ پڑی تھی۔ کانٹا اس کے دل میں [illegible]

دوپہر کے وقت نوجوان نے اپنے مکان کی کھڑکی کھولی اور ادھر اُدھر دیکھا اور کہنے لگا۔ [illegible]

خوش قسمت ہوں۔ یہ ہے گلاب کا پھول۔ ایسا خوبصورت پھول میں نے اپنی زندگی بھر نہیں دیکھا
وہ جھکا اس نے درخت سے وہ پھول توڑ لیا۔ درخت سے آواز آئی:۔

"نذر محبت۔ بلبل کی غیر فانی قربانی"

اُس نے یہ سُنا اور دنیا کو محبت کا درس دینے کے لئے نہ جانے کہاں نکل گیا *

"میری پیاری!" اُس نے آہستہ سے کہا "اپنی نظر اِدھر اُٹھاؤ"۔
"میں نے تیزی کے ساتھ اُسے جھڑکتے ہوئے کہا" جاؤ" مگر اس نے ذرا حرکت نہ کی، وہ میرے
روبرو کھڑا رہا اور میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے" مجھے چھوڑ دو۔ ہٹو"
میں نے کہا۔ لیکن اُس نے ذرا حرکت نہ کی۔ وہ کھڑا رہا *
وہ اپنا منہ میرے کان کے قریب لایا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور کہا "کتنی شرم کی بات ہے"
پھر بھی اس نے حرکت نہ کی *
اُس کے لبوں نے میرے رخسار کو چُھوا۔ میں لرز گئی اور کہا "تمہاری جرأت حد سے زیادہ
تجاوز کر رہی ہے"۔ لیکن اُسے شرم نہ آئی *
اس نے ایک پھول میرے بالوں میں لگا دیا۔ میں نے کہا "بے فائدہ" لیکن وہ کھڑا رہا
بے حس و حرکت *
اس نے میرے گلے سے ہار اُتارا اور چلا گیا۔ میں اکثر روتی ہوں اور دل سے پوچھتی ہوں
کہ "وہ واپس کیوں نہیں آتا"؟

(ٹیگور) (شاطر غزنوی)

تبصرے

رسائل

رُوحِ اَدب (لاہور)

آج کل اُردو رسائل کی اس قدر بھرمار ہو رہی ہے کہ دیکھئے اُردو غریب اُس کی کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے۔ رسائل پر رسائل نکلتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن ضرورت پھر بھی باقی رہ جاتی ہے ہر رسالہ ایک نیا مقصد لے کر نکلتا ہے، لیکن زیادہ عرصہ گذرنے نہیں پاتا، کہ خود اس مقصد کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ رسالہ اُردو زبان کے دامن کو علوم مشرقیہ و مغربیہ کے جواہر سے بھرنے اور اس مدفون خزانہ کو جوہر شناس نظروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے اور اس خیال کی تردید کے لئے کہ اُردو زبان انگریزی زبان سے کم وزن ہے، جناب شیخ نصیر حسین مرزا نصیر اور مرزا محمد تقی مسترب لکھنوی کی ادارت میں لاہور سے نکلا ہے۔ دیکھئے اس مقصد عظیم میں یہ کب تک اور کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ رسالہ کے مقالات مدیری کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شائد یہ رسالہ ادب اُردو میں لکھنو اور دہلی کی سیادت کا قصہ بھی چھیڑنے والا ہے۔ خدا نہ کرے ایسا ہو۔ کیوں کہ یہ بالکل بے وقت کی شہنائی ہوگی۔ اور خصوصاً لاہور سے بیٹھ کر اس قسم کے خیالات کی اشاعت کرنا یقیناً کچھ معنی نہیں رکھتا۔ جناب مدیر نے مقالہ افتتاحیہ میں دعوے کیا ہے کہ:-

"اردو زبان ہرگز انگریزی زبان سے کم وزن نہیں۔ انگریزی سے زیادہ الفاظ اس کے دامن میں موجود ہیں، صرف و نحو کا کمال، محاورے جتنے اس زبان میں ہیں کسی دوسری زبان میں نہیں [illegible] وغیرہ وغیرہ"

لہٰذا اسے روحِ ادب اپنے اس دعوے کی تائید کرے گا۔ بلاشبہ یہ بڑی مبارک تحریک ہے کہ جہاں تک ممکن ہو زبان [illegible] کیا جائے اور ادب اُردو کے مدفون خزانوں کو جوہر شناس نظروں کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ زبان انسانی تخیل کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ زندگی کی پیچیدگیوں میں جس قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے ظاہر ہے کہ

انسانی تخیل بھی اس کے ساتھ ساتھ نئے نئے الفاظ اپنے اظہار کے لئے تراشتا رہتا ہے اور اسی طرح زبان کی ترقی کا سلسلہ قائم رہتا ہے اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ زبان کی صفائی، سلاست اور شستگی کے ساتھ ساتھ انسانی تخیل کے اظہار کے لئے کسی قسم کی قید یا رکاوٹ نہ حائل ہو۔ یہ خیال بھی مبارک نہیں ہے کہ اردو زبان بالکل مکمل اور جامع ہے اردو زبان کو دنیا کی دوسری زبانوں سے ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قدامت پرستی کو ترک کر کے زبان کو ہر قسم کے علمی مسائل کے اظہار و ادا کیلئے وسعت نہ دی جائے ۔

رسالہ "روح ادب" کے مضامین کا معیار بلند ہے، زبان بھی اچھی ہے۔ اگرچہ "فلسفہ حیات" میں "ہوا ہوا ہو" کے قسم کے اسقام نظر آتے ہیں اسی افسانہ میں ایک جگہ "شبابیات" کی انتہا کر دی گئی ہے:-

"طبیعت میں ایک غرور آمیز احساس اور جسم میں ایک غیر فطرتی تھکاوٹ محسوس کرتی تھی جس کے لئے وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسے مسل ڈالے بھینچ ڈالے"۔

بہر حال ہم "روح ادب" کی ترقی کے خواہاں ہیں اور اپنے جدید معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں "روح ادب" کی سالانہ قیمت للعہ روپیہ ہے۔ دفتر "روح ادب" ٹمپل روڈ لاہور سے مل سکتا ہے ۔

طور دہلی

مولانا منظور احمد صاحب بی اے (جامعی) کے زیر ادارت دہلی سے نکلا ہے۔ مولانا منظور احمد صاحب ایک عرصہ سے علم و ادب کی خاموش خدمت کر رہے ہیں۔ اب تک اخباری برادری میں آپکا نام کافی شہرت پا چکا ہے۔ مرحوم ہمدرد اور "ملت" دہلی کے قارئین آپکے سیاسی افکار سے بہت زمانہ تک مستفید ہوتے رہے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ منظور صاحب اب علانیہ علمی و ادبی میدان میں گامزن ہوئے ہیں۔ "طور" ایک مذہبی و علمی صحیفہ ہے۔ اب تک اس کے دو نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نقش ثانی نقش اوّل سے سبقت لے گیا ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ موجودہ روش کے خلاف ایک "بی۔ اے" کی ادارت میں ایک مذہبی صحیفہ عالم وجود میں آیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اب "محترم دریابادی صوفی صاحب" جامعہ والوں اور جامعہ سے مطمئن ہو جائیں گے ۔

طور کے مضامین نہائیت بلند پایہ ہیں۔ نظموں کا حصہ بھی بہت خوب ہے۔ مضمون نگاروں میں مولانا

خواجہ عبدالحی فاروقی رفیق مکرم مولٰنا عبدالقادر جونپوری بی اے (جامعی)، جناب سید مہربان علی صاحب ایم اے (علیگ)، کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں۔ حصۂ نظم میں حضرت ریاض خیر آبادی۔ حضرت تسنیم دہلوی، حضرت فراق دہلوی کے افکار عالیہ رسالہ کے محاسن کو چار چاند لگا رہے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ منظور صاحب رسالہ کے معنوی محاسن میں بیش از بیش اضافہ کرنے کی طرف متوجہ ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ تصویروں کے معاملہ میں انہوں نے عام دستور کی تقلید نہیں کی۔ اس کے علاوہ شائد رسالہ کا مذہبی وقار بھی اس کی اجازت نہیں دیتا ہوگا۔ بہرحال ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ ظاہری محاسن کی طرف بھی ذرا زیادہ توجہ ہونی چاہیئے، یہ تو منظور صاحب بھی تسلیم کریں گے کہ آرٹ محض صنف نازک کی تصویروں کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی بہت سی ایسی صورتیں ہیں جہاں مذہبی معتقدات مخل نہیں ہوتے علاوہ بریں کتابت وطباعت کی طرف بھی زیادہ توجہ درکار ہے آج کل بڑی مشکل یہ ہے کہ علم وادب کی دنیا میں بھی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نظر فریبی اپنا رنگ جمالیتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ منظور صاحب اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں +

ایک ماہانہ رسالہ کے لئے یہ بھی کچھ اچھا نہیں ہے کہ ایک مضمون مسلسل دو دو تین تین مہینے تک جاری رہے اور "باقی دارد" کا سلسلہ ختم ہی نہ ہو +

طور کی سالانہ قیمت تین روپیہ ہے۔ دفتر "طور" درگاہ آثار شریف اندرون جامع مسجد دہلی سے طلب فرمائیے

فلم ریویو (کلکتہ)

یہ رسالہ کلکتہ سے وائی۔ کے۔ طارق صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ فلم کی دنیا کے نو بنو تغیرات وترقیات سے عامۃ الناس کو آگاہ کرنا غالباً اس کا مقصد اولین ہے۔ یہ رسالہ ابھی اپنے ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے، اور اس اعتبار سے اچھا ہے حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسے رسالہ کو کامیاب بنانے کے لئے جس کا موضوع فلم اور اسٹیج ہو ایک رقم خطیر کی ضرورت ہے اس میں آرٹ کی بہترین تصویریں اور مناظر کی سہ رنگی اور دو رنگی تصویریں ہونی چاہئیں۔ مضامین فنی اور علمی اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہونے چاہئیں اور ایسے اہل قلم کی امداد حاصل کرنی چاہیئے جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں اور رہبرانہ انداز میں اس مسئلہ پر طبع آزمائی کر سکتے ہوں +

فلم ریویو کی سالانہ قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ ہے - دارالاشاعت نمبر ۱۲-۱۳ پٹوار بگان کلکتہ سے طلب فرمایئے

"نئی روشنی" (دہلی)

مولٰنا زاہد القادری صاحب کی ادارت میں ہر ماہ دہلی سے شائع ہوتا ہے - سالگرہ نمبر رنگین، دیدہ زیب اور مفید مضامین اور جاذب نظر تصاویر سے مزین ہے - بیشتر تصویریں ہندوستانی فلم کے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مولٰنا زاہد القادری صاحب کو فلم سازی کی صنعت سے ضرورت سے زیادہ دلچسپی ہے، اور وہ "نئی روشنی" اور "فلم کی دنیا" کو بالکل ہم معنے اور مترادف الفاظ سمجھتے ہیں ---- بہرحال سالگرہ نمبر کو کامیاب بنانے کی کوششیں قابل تحسین ہیں +

کتب

دین کامل

مفتی سید عبدالقیوم صاحب وکیل جالندھر نے مذہب اسلام کی حقیقت اور اس کے علمی و عملی اصولوں کے متعلق یہ کتاب آٹھ جلدوں میں لکھی ہے - جس کی پہلی جلد ہمیں بغرض تنقید موصول ہوئی ہے اس جلد میں مذہب کی تعریف، اس کی ضرورت، اُس کے فطری ہونے کے دلائل - پھر فطری مذہب کی شناخت اور فطری، عقلی و الہامی اسلام کے اصول بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں +

انداز بیان نہایت معقول اور زبان عمدہ ہے کتابت اور طباعت بھی نہایت دیدہ زیب ہے - اور مصنف سے ڈیڑھ روپیہ پر مل سکتی ہے +

مضامین اور مباحث جو اس کتاب میں مندرج ہیں وہ اس دینی مذاق کا پتہ دیتے ہیں جو آج سے تیس چالیس برس پیشتر سرسید اور اُن کے رفقاء نے ہندوستان میں پیدا کیا تھا، مصنف نے آغاز مسئلہ سے ابتدا کی ہے یعنی یہ کہ مذہب کیا ہے، اس کی ضرورت کیا ہے - فطرت انسانی میں کہاں تک اسے دخل ہے وغیرہ وغیرہ، اس وجہ سے یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ اُس کے مخاطب کون لوگ ہیں، مسلمان یا کفار؟ +

دین (جس کی بجائے اس کتاب میں ہر جگہ مذہب کا لفظ مستعمل ہوا ہے)، کے دو طرفی ہیں ایک ایمان

دوسرا استدلال۔ اس کتاب میں بھی دوسرا طریق اختیار کیا گیا ہے جو خود حکمائے اسلام کے نزدیک عقیم الانتاج مسلم ہو چکا ہے۔ کیوں کہ استدلال محض سے نہ دین حاصل ہوتا ہے نہ اس کی تبلیغ ہو سکتی ہے +

باقی رہے وہ دلائل جو مصنف نے اس کتاب میں لکھے ہیں۔ نہ فلسفیانہ ہیں نہ دینی بلکہ محض خطابیات ہیں، اور بیشتر کسی عالم یا متکلم یا شاعر کے کلام کی نقل کافی سمجھی گئی ہے جو خود محتاج دلیل ہے +

غرضیکہ یہ کتاب اہل ایمان کے لئے غیر ضروری ہے اور عامۃ الناس کے لئے بیکار، صرف اُن متشککین کے لئے کارآمد ہے جو اصول و تعلیمات دین کے عمدہ پیرایۂ بیان سے سنبھل سکتے ہیں +

تاریخ نثر اُردو حصّہ اوّل

مصنفہ مولٰنا احسن مارہروی اُردو لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ قیمت فی نسخہ عہ/ ایک روپیہ۔ مصنف سے مِل سکتی ہے +

اس کتاب میں ۱۳۹۸ء سے لے کر موجودہ دور تک اُردو نثر کے نشوونما اور عہد بعہد ارتقا کی تاریخ ہے۔ اُردو نثر کے ابتدا سے لے کر آج تک کے حالات لکھے گئے ہیں۔ ہر دَور کے ہر قسم کے اُردو نثر کے نمونے بھی درج کئے گئے ہیں۔ اور نہایت کوشش سے مواد فراہم کر کے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے، مذہبی لبتی، اخلاقی، سیاسی، قانونی، دفتری اور اخباری، ہر قسم کی اُردو کے نمونے مع حوالوں کے دیئے گئے ہیں

اردو زبان کی اساسی تاریخ کے متعلق ادھر چند برسوں میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں تفصیل و تصیح کے لحاظ سے یہ کتاب خاص خصوصیت رکھتی ہے۔ ابھی اس کتاب کا پہلا حصّہ شائع ہوا ہے، امید ہے کہ دوسرا حصّہ اس سے زیادہ مفید اور زیادہ معلومات سے پر ہوگا +

رہنمائے صحت

مہاتما گاندھی نے علم حفظان صحت پر ایک کتاب رہنمائے صحت، گجراتی زبان میں لکھی تھی۔ جس کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے، مصنف کی اجازت سے جناب محمد اعظم خان صاحب (حیدرآبادی) نے اسے انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ امر واقعی تعجب انگیز ہے کہ مہاتما گاندھی نے اپنے سیاسی اور سماجی مشاغل کے باوجود حفظان صحت جیسے ضروری علم کی طرف سے بھی تغافل نہیں کیا اور اپنے ہموطنوں کے فائدہ

کے لئے اس کے ابتدائی اصول پر گجراتی زبان میں ایک نہایت مفید کتاب لکھ ڈالی، گاندھی جی کا اصول علاج خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"یہ بیشک ضروری ہے کہ مرض کا علاج کیا جائے۔ لیکن علاج دواؤں سے نہیں ہوتا۔ دوائیں نہ صرف بالکل بیکار بلکہ بعض اوقات سخت مضر ہوتی ہیں۔ مریض کا دوائیں استعمال کرنا ایسا ہی احمقانہ فعل ہے جیسے کسی مکان میں غلاظت جمع ہو جائے تو اسے ڈھانک دینا۔ کیونکہ غلاظت جتنی زیادہ ڈھانکی جائے گی اتنی ہی سڑے گی۔ یہی حال انسان کا ہے۔ بیماری کے ذریعہ فطرت دراصل ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ ہمارے جسم کے کسی حصّہ میں غلاظت جمع ہو گئی ہے۔ ایسی صورت میں اقتضائے عقل یہی ہے کہ اس غلاظت کو دواؤں کے ذریعہ سے روکنے کی بجائے خود فطرت کو اس کے دُور کرنے کا موقع دیا جائے۔ جو مریض دوائیں استعمال کرتے ہیں وہ دراصل فطرت کے رستے میں دوہری دشواری پیدا کرتے ہیں"۔

ہمیں چاہیئے کہ کم از کم اپنی جسمانی حالت کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کرنے ہی کے خیال سے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ جس میں اس موضوع کی بہت سی کتابوں کا خلاصہ درج کر دیا گیا ہے مترجم نے بہت اچھا کیا کہ اُردو زبان کو اس کتاب کے اضافہ سے محروم نہ رکھا۔

قیمت ۱۲ار ہے۔ ذیل کے پتہ سے مل سکتی ہے:۔
جناب محمد اعظم خان صاحب۔ نصیر ولا۔ عثمان پورہ۔ حیدرآباد دکن)

جو لوگ دانتوں کی صفائی کا خیال نہیں رکھتے وہ ایک نہ ایک دن پایوریا جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پس اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپکے دانت کبھی خراب نہ ہوں پایوریا (ماسخورہ) سے ہمیشہ محفوظ رہیں تو آج ہی سے **موتی منجن** کا استعمال شروع کر دیں +

موتی منجن

دانتوں کے حق میں ایک رحمت ہے اس کے استعمال سے دانتوں کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ پایوریا جیسے موذی مرض سے چند ہی دنوں میں نجات مل جاتی ہے۔ منہ کی بدبو کافور ہو جاتی ہے دانتوں میں کیسا ہی شدید درد کیوں نہ ہو۔ موتی منجن کو درد کی جگہ پر مل لینے سے حیرت انگیز افاقہ ہوتا ہے **موتی منجن** کا مستقل استعمال رکھنے والوں کے دانت موتی کی طرح آبدار ہو جاتے ہیں اور دانتوں کی ریخوں میں ایک چمکدار سیاہ تہ جم جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے دانتوں میں کسی چیز کے اٹک کر سڑنے کا اندیشہ ہی باقی نہیں رہتا۔ غرض موتی منجن میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ایک اچھے منجن میں ہونے چاہئیں ہم آپ سے سفارش کرتے ہیں کہ آپ خود اسے استعمال کریں اور خصوصاً اپنی خواتین کو اس کا استعمال ضرور کرائیں۔ قیمت فی ڈبیہ دس آنے ۱۰/ جو ایک مہینہ کیلئے کافی ہے + علاوہ محصول ڈاک وغیرہ

اکسیر معدہ

اگر آپ کو ہمیشہ قبض کی شکایت رہتی ہے کھانا ٹھیک ہضم نہیں ہوتا۔ کھٹی میٹھی ڈکاریں آتی ہیں، جی متلاتا ہے پیچش یا دست کی شکایت ہے۔ پیٹ میں درد رہتا ہے۔ غرض اگر آپ معدہ کی کسی بیماری میں مبتلا ہیں تو اکسیر معدہ کے حیرت انگیز اثرات سے فائدہ اٹھائیں، اکسیر معدہ کی ایک شیشی ہر گھر میں موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ قیمت فی شیشی دس آنے ۱۰/ علاوہ محصول ڈاک وغیرہ +

اعجازی مرہم

اگر آپ صاحب اہل وعیال ہیں تو اعجازی مرہم کی ایک ڈبیہ اپنے گھر میں ہر وقت موجود رکھیئے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر قسم کے پھوڑے پھنسی کو خود ہی پکاتا ہے خود ہی پھوڑتا ہے اور خود ہی بھرتا ہے۔ اعجازی مرہم کی موجودگی میں کسی دوسری مرہم کی ضرورت نہیں ہے۔ قیمت فی ڈبیہ صرف چار آنے (۴/) علاوہ محصول ڈاک وغیرہ خط وکتابت میں اپنا پتہ صاف وخوش خط لکھیں +

ملنے کا پتہ

منیجر دواخانہ مسیح ۱۳۳ کشمیر بلڈنگس لاہور

محتاط حضرات کو مژدہ

دانتوں کے برش

جنکے بال اور ریشے بھی لکڑی کے ہیں

عام طور پر خیال ہے کہ دانتوں کے مروجہ برش کا استعمال جن میں ہڈی اور بال لگے ہوتے ہیں اکثر مذاہب کی رو سے درست نہیں ہے۔ کیونکہ بعض مستند آرا اس امر میں متفق ہیں کہ مروجہ برش ناپاک اور نجس بال لگائے بغیر تیار ہی نہیں ہو سکتے۔ اس وقت کے پیش نظر ہم نے دانتوں کی صفائی کے لئے ایسے برش خاص طور سے تیار کرائے ہیں جن کا ہینڈل بھی لکڑی کا ہے اور دانت صاف کرنے والے

بال اور ریشے بھی لکڑی کے ہیں

جسے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی غرض ہر مذہب کے ماننے والے بغیر کسی کراہت کے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ برش ہڈی اور بالوں کے برش سے زیادہ خوبصورت زیادہ پائیدار زیادہ مفید اور زیادہ نفیس ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ملک کا محتاط طبقہ ہمارے اس جدت کی قدر کریگا۔ قیمت فی برش آٹھ آنے ۸/

پتہ: دی ڈنٹل سپلائی ہاوس انارکلی لاہور

ڈاکٹر عطاء اللہ (گولڈ میڈلسٹ سند یافتہ امریکہ) دندان ساز انارکلی

موٹر گذرنے تک
آپ بیکار نہ کھڑے رہیں
سپاہی کی پیٹھ پر سے
ایک خط پڑھیں!
خان بہادر ایم امام الدین صاحب ڈپٹی کنزرویٹر محکمہ جنگلات
نابھن سے تحریر فرماتے ہیں:-
"میں امرت دھارا نامی دوائی ایجاد کردہ پنڈت ٹھاکر دت
شرما وید پانچ چھ سال سے استعمال کر رہا ہوں میں نے
اس کی .. ایا زیادہ شیشیاں اپنے گھر میں اور باہر اور پہاڑی
آدمیوں کے درمیان استعمال کی ہیں اور میری رائے یہ ہے
کہ یہ تمام امراض کو دور کرتی ہے۔ بیشمار پہاڑی لوگ اس کے
استعمال سے جنگی بخار کے دنوں میں بالکل راضی ہوئے ایک
عجیب تجربہ ہوا۔ کہ یہاں ایک عورت کی آنکھیں بالکل خراب
ہوگئیں۔ دکھائی بالکل نہ دیتا تھا میں نے امرت دھارا
پیتل کی سلائی سے لگادی اور دو دن میں اس کی آنکھیں
صاف ہوگئیں۔ اس کو درد تو بہت ہوئی مگر حیرت انگیز
طور پر افاقہ ہوا"
خط و کتابت و تار کا پتہ:- امرت دھارا ۱۱۷ لاہور

اُردو زبان کا اوّلین صحیفہ

لاہور

جملہ حقوق محفوظ

قیمت سالانہ
چار روپیہ بذریعہ
وی پی - چار روپیہ چار آنہ

مخزن
دورِ جدید

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۰۹۷
ممالک غیر سے
۹ شلنگ
قیمت فی نمبر چھ آنے

جلد (۴) | بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء | نمبر (۷)

فہرست مضامین

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام میاں ظہور الدین پرنٹر چھپا اور میاں ظہور الدین مالک و ایڈیٹر و پبلشر نے دفتر مخزن بھاٹی گیٹ سے شائع کیا)

دسمبر ۱۹۳۰ء

حُسن بے پروا

(جناب انعام اللہ خاں ناصر حسنپوری)

محبت کی کشش کے دائرہ سے حُسن ہے بالا
یہ جادُو ہے مگر جادُو ستاروں پر نہیں چلتا

نہیں لیلیٰ کو خود بینی سے فرصت دلنوازی کی
تسلی قیس دے دل کو یہ کہہ کہکر "انا لیلیٰ"

یہاں خونناب دل بہتا ہے رُخساروں پہ دامن کے
وہاں غازہ سے ہمرنگِ شفق ہے چہرۂ عذرا

تمنا ہے نئی ہر دم یہاں پرویز کے دل میں
ترقی پر وہاں ہر روز ہے شیریں کا اِستغنا

یہاں بالین و بستر ہے ہمارا خار و خارا سے
وہاں مسند پہ اُس کے زیرِ سر ہے بالشِ دیبا

یہاں آلام سے تاریک ہے دُنیا نگاہوں میں
وہاں آئینہ میں پیشِ نظر حُسنِ جہاں آرا

ندیم خوبرو ہنستا ہی پہلے رونے والوں پر
چمن میں یہ تعلق سے گل و شبنم کے ہی پیدا

تڑپ کر جان دینے کو یہ ظالم کھیل سمجھے ہیں
نہ اُترا غم سے پروانہ کے چہرہ شمعِ محفل کا

کسی کی جان جاتی ہو کسی کا دم نکلتا ہو
مگر اُن کا تغافل کم ہوا ہے - اور نہ کم ہوگا

عبث تاثیر جذبِ عشق کے قائل ہو تم ناصر
اسے خاطر میں کب لاتا ہے وہ بے مہر و بے پروا

"زعشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنیست
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را"

شذرات

مخزن کی اشاعتِ گذشتہ میں ایک افسانہ 'والیا' کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس پر معزز معاصر 'انقلاب' لاہور نے ادارۂ مخزن کی طرف سے اظہارِ عدمِ اعتماد کے بعد یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ افسانہ اب سے پندرہ سال پیشتر مختلف رسالوں میں شائع ہو چکا ہے، اور جناب پیارے لال شاکر میرٹھی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، مگر مخزن میں یہی افسانہ پنڈت شیام کشور نور سناتن دھرم کالج کانپور کے نام سے شائع ہوا ہے۔ معاصر مذکور نے اس غاصبانہ قبضہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی، اور نہایت رہبرانہ انداز میں مدیر مخزن کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس سرقہ کی تحقیق و تفتیش کرے، ورنہ اسے بھی اعانتِ جرم کا مجرم قرار دیا جائے گا۔ یہ تنبیہ ایسی نہ تھی جو کسی طرح نظر انداز کی جاتی، چنانچہ مدیر مخزن نے اس واقعہ کی تحقیق کی کوشش کی، پنڈت شیام کشور نور صاحب کو دو خط لکھے مگر جواب نہ ملا۔ اب نہ معلوم یہ خاموشی ڈاک کی بد انتظامیوں کا نتیجہ ہے یا صبر آزما زحمتوں سے بچنے کی ایک نرالی ترکیب!

یہ واقعہ ہے کہ یہ افسانہ ہندوستان کے مشہور شاعر ٹیگور کے ایک افسانہ کا ترجمہ ہے۔ اور یہ بالکل ممکن ہے کہ شاکر صاحب اور نور صاحب دونوں نے اوریجنل سے ترجمہ کیا ہو۔ اس خیال کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ جب دونوں ترجموں کا مقابلہ کیا گیا تو ان میں بیّن فرق معلوم ہوا ہمیں مسرت ہے کہ "انقلاب" نے اس قوی امکان کی طرف اشارہ کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس نے تحقیق نہ کر لی اور غریب مدیر "مخزن" کو قبضۂ مخالفانہ میں شریک سمجھے جانے کی دھمکی بھی دیدی یہ تو فاضل مدیرانِ "انقلاب" بھی تسلیم کریں گے کہ مدیرانِ جرائد و رسائل کو اس نوع کے تلخ تجربات سے ہمیشہ دوچار ہونا پڑتا ہے، اور "قانونِ خیال" کے سابق مدیر مولانا عبدالمجید سالکؔ کو تو اس حقیقت سے انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ "معارف" اعظم گڈھ کو کتنی مرتبہ ان بے عنوانیوں کے خلاف آواز اُٹھانی پڑی ہے۔ بہرحال ہم محترم مدیرانِ "انقلاب" کے شکرگذار ہیں کہ انہوں نے "مخزن" کی طرف گوشۂ چشمِ التفات منعطف فرمایا۔ ہمیں اُمید ہے کہ وہ غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے دوسرے بہتر ذرائع کی طرف رجوع فرمانے سے گریز نہ کریں گے۔

دنیا کے تمام تہذیب یافتہ ملکوں میں بچوں کی ابتدائی تعلیم انسانیت کے حقوقِ فطری میں شمار کی جاتی ہے، اور ریاست کا سب سے بڑا فرض یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ریاست کے ہر کس کے لئے تعلیم کا انتظام کرے۔ کیونکہ اچھا شہری بننے کیلئے ضروری ہے کہ انسانوں کے دماغی قوےکی اچھی طرح تربیت ہوئی ہو، جو بغیر تعلیم کے ناممکن ہے۔ چنانچہ تمام ترقی یافتہ ملکوں میں ابتدائی تعلیم کا انتظام ریاست کرتی ہے اور ہر بچہ کم سے کم اتنی تعلیم حاصل کر لیتا ہے کہ وہ لکھ پڑھ سکے اور اخبار سمجھ سکے اور مذہبی و اخلاقی کتابوں سے فائدہ حاصل کر سکے۔ آج انگلستان کا ہر مزدور جانتا ہے کہ اُس کے ملک میں کیا ہو رہا ہے اور عام طور پر رفتارِ عالم کیا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ملک کی حالت یہ ہے کہ عام طور پر بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف بالکل توجہ نہیں کی جاتی۔ ظاہر ہے کہ حکومت اتنی بڑی ذمہ داری مول لینے کو تیار نہیں کہ تمام ملک میں ابتدائی تعلیم کا انتظام کرے۔ ضرورت اس کی ہے کہ غیر سرکاری جماعتوں کی طرف سے ابتدائی مدارس کا جال تمام ملک کے طول و عرض میں بچھا دیا جائے۔ بلدیات اور میونسپلٹیاں جو تقریباً غیر سرکاری جماعتیں ہیں، اس کام کو بطریقِ احسن انجام دے سکتی ہیں۔

گوکھلے آنجہانی نے امپیریل (شاہی) کونسل میں آج سے تقریباً بیس سال قبل پرائمری ایجوکیشن بل پیش کیا تھا۔ اُس کا منشا بھی یہی تھا کہ ابتدائی تعلیم کا انتظام ریاست کی طرف سے ہونا چاہیئے۔ اس پر حکومت کی طرف سے مالی

حالت سقیم ہونے کا عذر پیش کیا گیا۔ اگر کسی آزاد ملک کی حکومت کی طرف سے ایسی ضروری تجویز کے متعلق یہ جواب دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ لیکن بے چارے ہندوستانی کس برتے پر اس فیصلہ کے خلاف آواز بلند کرتے۔ سچ ہے دنیا میں زبردست ہونا کوئی قصور کی بات نہیں، کمزور و ناتواں ہونا سب سے بڑا جرم ہے، جس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ابتدائی تعلیم کو کامیاب بنانے کا سوال ہے غیر سرکاری اور سرکاری جماعتیں اگر چاہتیں تو بہت کچھ کر سکتی تھیں۔ ابتدائی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ کیونکہ جب تک نئی نسل کے دماغوں سے جہالت اور توہم کی لعنت دور نہ ہو جائے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے مفاد کو سمجھ سکیں۔ اور بغیر اس نفسی انقلاب کے موجودہ حالت کے بہتر ہونے کی بہت کم امید ہے۔ قوموں کی حالت بدلنا کوئی آسان کام نہیں۔ یا تو کوئی ایسی شخصیت ہو جو اپنے اثر سے فوری انقلاب پیدا کر دے۔ یا دوسری صورت سوائے اس کے کوئی نہیں کہ نوجوانوں کو ایسی تعلیم دی جائے جو اُن میں قوم و وطن کی محبت پھونک دے۔ بہ ظاہر یہ دوسرا طریقہ زیادہ دیر پا اور زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اِس لئے ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کی طرف بہت جلد توجہ ہونی چاہئے۔

اس مہینہ کا نہایت اضطراب انگیز اور افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر کسی بداندیش نوجوان نے ہز اکسلنسی گورنر پنجاب کو ریوالور کی گولی سے ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ ہز اکسلنسی بال بال بچ گئے، اور دوسرے اشخاص ہلاک اور مجروح ہوئے۔ ہم اس خطرناک حملہ سے بچنے پر ہز اکسلنسی کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ ان جاہلانہ اور مجنونانہ حرکات سے ملکی مفاد کو سخت صدمہ پہنچتا ہے اور قوم اپنے ارتقائی منزل سے برسوں پیچھے ہٹ کر رجعتِ قہقری پہ آمادہ ہو جاتی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ایک تعلیمی اجتماع کو اس قسم کی ہنگامہ خیزی سے سخت صدمہ پہنچایا گیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء، ۳۱ دسمبر کو اپنے مقررہ لائحہ عمل کے مطابق ختم ہو جاتا ہے ہمیں ایک لمحہ کے لئے اپنے سال بھر کے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے، اور سخت احتساب کے بعد اپنے لئے کوئی مفید راہِ عمل تلاش کرنی چاہئے۔ آج ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس ایک سالہ زندگی پر فخر کر سکتے ہیں، اور کتنے ایسے ہیں جن کی ضمیر کی آواز ہمیں اپنی

حرکتوں پر نادم اور شرمندہ کر رہی ہے۔

تاریخ ہند میں سال گذشتہ کو نمایاں اہمیت حاصل ہو گی یہ حقیقت ہے کہ سول نافرمانی کی تحریک کی ہنگامہ خیزیوں کی صدائے بازگشت برسوں تک سُنی جائے گی۔ یہ وہ تحریک تھی جس نے آئین و دستور کی سر بفلک عمارتوں کی بنیادیں ہلا دیں۔ صدہا فرزندان وطن کو محبوس زنداں کرا دیا، اور پھر اپنی ہی اندرونی خامیوں کی وجہ سے ٹھنڈی پڑ گئی۔ دوسری طرف حکومت نے بھی اپنے تدبر و دانشمندی اور موقع شناسی کے مظاہرہ میں کوتاہی نہ کی۔ یہ حکومت کے تدبر ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم آج لندن میں ہندوستانی اور برطانی ارباب بست وکشاد کو گول میز کانفرنس میں ملک کی آئینی ترقیوں کے وسائل تلاش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ خدا کرے گول میز کانفرنس اپنے مقاصد میں کامیاب ہو اور ادنیٰ تعصبات بلند مقاصد پر غالب نہ ہونے پائیں سنہ ۳۰ کی یہ اہمیت کبھی نظر انداز نہ کی جائے گی کہ یہ تخریب و تعمیر دونوں کے لئے ممتاز ہے۔

دل کی آمد ہے اصل ایماں کیا ہے
ماحول کی معرفت ہے عرفاں کیا ہے
تفسیر کو ا[illegible] شرط نہیں مبلغ علم
ہے تختۂ مشق عام قرآں کیا ہے

تعارف

دسمبر کے پرچہ کے مضامین کی فراہمی میں کافی محنت کرنی پڑی ہے۔ اور ہم نہایت اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے
ہیں کہ تمام مضامین بلند پایہ ہیں اور محنت اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔

'حسن بے پروا' جناب انعام اللہ خاں ناصر جنیپوری کے افکارِ عالیہ کا نتیجہ ہے۔ ناصر صاحب کی بلند پروازی،
جدت طرازی، معنی آفرینی اور پھر زبان کی پاکیزگی خاص طور سے مستحق داد ہے۔

'معیار' آغا صاحب جناب محمد بخش خاں بی۔اے۔بی۔ٹی۔ اے ڈپٹی آئی آف سکولز ضلع چنیوٹ کے زورِ قلم کا نتیجہ
ہے۔ اِس مضمون میں ازدواجی معیار، پر نہایت خوبی سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

'اسلام میں تدوین کتب' محققانہ اور مفید مضمون ہے۔ علمی طبقہ میں لے خاص وقعت دی جائے گی مولانا
عبدالوحید صدیقی صاحب ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ موضوع کے انتخاب میں ہمیشہ ذوقِ سلیم اور دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں

'سائنس اور مذہب کا تنازع' نہایت پاکیزہ افسانہ ہے۔ جناب ظفر قریشی دہلوی صاحب نے ترجمہ میں اصل کی خوبیوں
کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔

'عدالت' جناب تنویر قریشی صاحب کا افسانہ ہے۔ اس میں موجودہ تشکیک کو خاص انداز میں دکھایا گیا ہے۔

"قانونِ معیارِ اخلاق" ہے، نہایت بصیرت افروز مضمون ہے اور جناب ولی الرحمٰن کاکوری نے خاص محنت اور
کاوش سے لکھا ہے۔ اِس مضمون کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ایک خشک موضوع پر نہایت دلچسپ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

"احوالِ غالب از کلامِ غالب" اپنے قسم کا اچھوتا مضمون ہے۔

"بہادروں کے دل" نہایت ولولہ انگیز افسانہ ہے۔ اِس کے ساتھ ہی تصویر بھی دی جاتی ہے، جو یورپ کے
مشہور فطرت نگار آرٹسٹ اڈمنڈ ڈیولک کے عمل کا نتیجہ ہے۔

اس کے علاوہ مولانا احسن مارہروی، پنڈت اندرجیت، شرما ماچھرہ، میرٹھ، اور جناب سعید صاحب جموی
کے افکارِ عالیہ بھی شریکِ اشاعت ہیں جو رسالہ کے محاسن میں بیش بہا اضافہ کر رہے ہیں۔

موت

(جناب سید رضا صاحب جموی بلیگ)

ماتمِ عیشِ ناتمام ہے موت　　بادۂ زندگی کا جام ہے موت
دل و ارمانِ دل قتیل قتیل　　کیسی شمشیرِ بے نیام ہے موت
محشرستانِ غمِ درون و برون　　اک سکونِ ستم خرام ہے موت
خانہ آبادِ مرگ ہے دنیا　　در و دیوار و صحن و بام ہے موت
حیف صد حیف اے دریغ دریغ　　سخت افسوس کا مقام ہے موت

رنجِ ہستی کا اختتام ہے موت　　یعنی قدرت کا فیضِ عام ہے موت
ترکِ دنیا بہ خاطرِ عقبیٰ　　راحتِ خاص و رنجِ عام ہے موت
جاں سے مطلب ہے غفلت آگاہی　　فوتِ فرصت کا انتقام ہے موت
اِنّا لِلّٰہ کی دور گردی میں　　ایک وقفہ ہی اک قیام ہے موت
زندگی اک خیالِ خام سہی　　انتہائے خیالِ خام ہے موت

زیستِ نو کا یہ اہتمام ہے موت　　صبحِ فردا کی ایک شام ہے موت
دل نے مانا طبیبِ خاطر کیوں　　تیرے ملنے کا کیا پیام ہے موت؟
نشۂ عشق کا دماغ تو ہے　　خوابِ خوش مستیٔ دوام ہے موت
عشق میں موت زندگانی ہے　　عشق میں زندگی کا نام ہے موت

عشق میں مر کے ہو رضا زندہ
بندۂ عشق پر حرام ہے موت

آغا صاحب

(جناب محمد بخش خاں بی اے بی ٹی۔ اے ڈی آئی آف سکولز چنیوٹ (ضلع جھنگ)

میں ابھی ڈاک کے لفافے کلرک کے حوالے کر کے ستانے کے لئے پلنگ پر دراز ہوا ہی تھا کہ آغا صاحب دوڑے دوڑے آئے۔ آرام کرسی کھینچ کر حسب عادت بغیر سلام کئے بیٹھ گئے۔ بشرے سے معاوم ہوتا تھا کہ لڑ کر کہیں سے آئے ہیں۔ بغل میں ایک رسالہ سا معلوم ہوتا تھا۔ تڑاق سے میز پر اسے دے مارا اور حسب معمول گونجتی ہوئی آواز میں پڑھنا شروع کیا "عورت مجسم مسرّت ہے۔ ایک نعمت ہے۔ ایک خوشرنگ پھول ہے" وفور جوش سے سلسلہ کتاب خوانی کو یکایک منقطع کر کے گویا ہوئے "لیجئے یہ صاحب بھی آپ کی لے میں من کی بانسری بجاتے ہیں" ایک خیالی وجود کو پیش نظر رکھکر متلاطم اور متموج جذبات کے طوفان میں بہے چلے جاتے ہیں۔ اور انتہائی درجہ کی بے خودی کے عالم میں کچھ کا کچھ کہے جاتے ہیں۔ میری طرح کوئی صبر و سکون کی حالت میں چشم بصیرت سے دیکھے تو معلوم ہو کہ عورت خیالی مسرّت کا ایک خیالی مجسمہ ہے۔ نعمت ہے مگر جب تک دست شوق نارسا ہے خوشرنگ پھول ہے۔ مگر سونگھنے سے پہلے حقیقت میں یہ ایک طلسم ہے جو بصیرت کی تیز شعاع سے دخان بنکر اڑ جاتا ہے۔

میں۔ آغا صاحب آپ بیگم صاحبہ سے کشیدہ خاطر ہو کر آتے ہیں تو جنس لطیف پر ایک عجیب پہلو سے تنقید کرتے ہیں کیا آپ اپنے جذبات کے سیل بے پناہ میں بے دست و پا ہو کر بہ نہیں گئے۔ واضح ہو بیوی مرد کے مال کی محافظ اور اس کے ایمان کی نگہداشت کرنے والی ہے۔ اس کے بغیر مرد زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ زندگی برداشت کرتا ہے۔

آغا صاحب۔ آپ بھی آخر ناقصات العقل کے بھائی ہیں۔ بیوی اور عورت میں فرق ہے۔ مجھے اس رائے کی پرده ره کر افسوس آتا ہے کہ ایک فرد واحد سے عام افراد کے متعلق غلط استخراج کیا جائے۔

نہ معلوم آپ کیوں ہمیشہ ایمان کو دھکیل کر بیچ میں لاتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ پھندہ گردن میں پڑ جائے اور آدمی دم گھٹ کر رہ جائے۔

رستگاری تو بیشک قسمت پر ہے لیکن کیا مرغ اسیر کی طرح پھڑ پھڑائے بھی نہیں۔ گلہ نہ کریں کہ یہ بھی ظاہر نہ کرے سے

من کردم شما حذر بکنید۔

میں ۔ آغا صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آج پارہ کھولاؤ کے درجہ سے بھی اوپر چڑھ گیا ہے ۔ ذرا میری گذارش بھی سن لیجئے ۔ آپ کی بیوی میرے ہمسایہ کی چہیتی اکلوتی بیٹی ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم بچپن میں ایک ساتھ کھیلتے تھے ۔ ایک ہی مسجد میں ایک ہی مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھتے تھے ۔ حتےٰ کہ اب بھی وہ مجھ سے پردہ نہیں کرتیں ۔ میں اُن کے والدین کے گھر آیا جایا کرتا ہوں ۔ اس لئے آپ اس سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ میں بی بی حسینہ سے بخوبی واقف ہوں ۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا وہ جاہل ہیں؟ امورِ خانہ داری سے واقف نہیں ہیں ؟ کیا کشیدہ کاڑھنے میں اُن کا مقابل اس سارے شہر میں کوئی ہے ؟ پھر آپ کیوں اس شدت سے مخالفت کرتے ہیں ۔ آپ بھی وہی غلطی کرتے ہیں جس پر اور لوگوں سے الجھتے ہیں ۔ آپ بھی ایک فردِ واحد سے تمام افراد کے متعلق ایک غلط استخراج کر رہے ہیں ۔

آغا صاحب ۔ میرا ساز شکوہ ، تشنۂ مضراب تھا ۔ شکر ہے کہ محرک آپ ہی ہوئے ۔ میں جانتا ہوں کہ حسینہ آپ کی دودھ بہن ہے ۔ آپ بے شبہہ اُس کے بچپن سے لیکر اب تک کی حالت سے واقف ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک خواندہ ہونا کشیدہ کاڑھنا اور کھانا پکالینا جس کو آپ امورِ خانہ داری سے موسوم کرتے ہیں یہی اور صرف یہی بیوی کے اوصاف ہیں ۔ بخدا کشیدہ کئے کپڑے میں نے کبھی نہیں پہنے ، نہ آئندہ پہننے کا خیال ہے بازار میں اچھے سے اچھا درزی مل سکتا ہے ذرا اُن سے پوچھئے کہ کتنے سوٹ اپنے لئے اپنے ہاتھ سے تیار کئے ہیں ؟ میرے نزدیک بیوی اور خانساماں مترادف لفظ نہیں ہیں ۔ آٹھ روپے میں اچھا خاصا آدمی مل سکتا ہے ۔ نہ تو وہ باورچی خانہ کے کام سے کترائے گا اور نہ اُسے فراک اور ساڑی میلی ہونے کا ڈر ہوگا ۔

خواندہ سے مراد آپ یہ لیتے ہیں کہ معراج نامہ ملتانی ۔ یکی روٹی اور دعائے گنج العرش پڑھ لے ۔ باقی رہا امورِ خانہ داری ۔ یہ تو ایک ایسا مغلق لفظ ہے کہ ہندوستانی عورتیں عام طور پر اس کے معنے سے بے خبر ہیں ! میں پھر یہی دہراؤں گا کہ بیوی اور عورت میں فرق ہے ۔

میں ۔ آغا صاحب بتایئے آپ کی لغات میں ان لفظوں کی تشریح کس طرح کی گئی ہے ۔

آغا صاحب ۔ میں تو کسی لغات کا مصنف نہیں ۔ البتہ میرے نزدیک عورت انسان کی ایک صنف ہے ۔ اور بیوی وہ منتخب عورت ہے ۔ جو تمدنی و معاشرتی رسوم اور ضروریات کے ماتحت زندگی بھر کے لئے ایک مرد کے ساتھ اس قدر جاذبیت پیدا کرے کہ دونوں ایک معلوم ہونے لگیں ۔

میں ۔ ہاہاہا تفسیر خوب ہے۔ گویا بیوی اپنی ہستی مٹاکر "فنافی الزوج" ہوجائے۔ مستقل طور پر اُس کی شخصیت ہی نہ رہے۔

آغا صاحب ۔ بھائی۔ خاوند بھی اسی طرح ....

میں ۔ ہاں شادی کے بعد دونوں پر اسی طرح لازم ہے۔ مذہب بھی یہی کہتا ہے۔ لیکن آپ کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکے انتخاب میں غلطی ہوئی۔

آغا صاحب ۔ اُف! کیوں میرے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہو؟ اگر اپنا انتخاب ہوتا تو پھر یہ ہائے وائے کی کیا ضرورت ہوتی؟ زید عمر کے لئے ٹوپی خریدنے جاتا ہے۔ مگر عمر کے جذبات واحساسات کی پروا نہیں کرتا۔ ٹوپی وہی لے آتا ہے جو اُس کے سر پر پوری آجاتی ہے اور جس کا رنگ اُس کی آنکھ کو بھاتا ہے۔ اب زید بیچارے کی قسمت ہو کہ ٹوپی اس کے سر پر پوری آجائے اور رنگ بھی حسب منشا ہو۔ دو صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو سر پر رکھتے ہی اُسے نوچ کر پھینک دے گا۔ یا منتظر رہے گا کہ کب پیچھا چھٹے شادی ایک عمر کا واسطہ ہے۔ ہفتہ یا مہینہ یا سال کا اقرار نہیں بیوی چوبیس گھنٹے کی ساتھی ہے حسب منشا ہونا نہ صرف مرد کے لئے مناسب ہے بلکہ طرفین کے لئے ضروری ہے۔

میں ۔ جن باتوں کو میں محاسن خیال کرتا ہوں آپ اُن کو معایب ٹھہراتے ہیں۔ آپکے نقطۂ نگاہ سے بیوی میں کیا وصف ہونے چاہئیں۔

آغا صاحب ۔ سنئے میرا نظریہ آپکے منتہائے نظر سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے آپ یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ امور خانہ داری سے واقف ہے، خواندہ ہے۔ کشیدہ کاڑھنا جانتی ہے۔ لیکن یہ نہیں کہتے کہ حسین بھی ہے۔ حالانکہ محض اس کی بدولت عورت کو کبھی صنفِ نازک کہا جاتا ہے کبھی خوش رنگ پھول کبھی مشامِ جان کو معطر بنانے والی خوشبو۔ گویا زبان کے بہترین تعریفی الفاظ اُس کی شان میں بولے جاتے ہیں۔

میں ۔ خوب۔ آپ کا عندیہ معلوم ہوگیا۔ آغا صاحب ایک چیز سب لفظوں میں یکساں خوبصورت نہیں ٹھہر سکتی ہر شخص کا معیار جُدا ہے۔ اچھا آپ کو حسین بیوی کی تلاش ہے؟

آغا صاحب ۔ کس کو نہیں۔ صانع حقیقی نے اسی لئے حس کے جتنے متلاشی بنائے ہیں اُتنے ہی معیارِ حسن تخلیق کئے ہیں۔ آپ ہر بات میں مذہب کا نام استعمال کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آپ مذہب کی اصلی حقیقت

سے نابلد ہیں اور طرفہ تر یہ کہ جس مذہب کا اپنے آپ کو نام لیوا بتاتے ہیں اُس کی اصلی حیثیت سے بھی بالکل ناواقف ہیں۔ آپ کا مذہب یہ کہتا ہے کہ عورت اور مرد نکاح سے پہلے پختہ فیصلہ کر لیں کہ وہ زندگی بھر ایک دوسرے کے رفیق بنے رہیں گے اور حدود اللہ کی قیود سے باہر نہیں جائیں گے۔

کتنا ظلم ہے کہ ایک نازک نور پیکر کو ایک ایسے دیو قامت سے جکڑ دیا جائے جس کا سینہ بھی سیاہ ہو یا ایک رنگیلے سجیلے جواں کا جبری تعلق کسی بلا سے کر دیا جائے۔

مذہب اور عقل و نقل سب یک زبان ہو کر پکار رہے ہیں کہ والدین اپنے بچوں کیلئے دولہا دلہن بننے سے پیشتر ایسے وسائل بہم پہنچائیں جنہیں اختیار کر کے وہ پردہ ناموس کے اندر رہکر بھی پختہ فیصلہ کر سکیں۔ خدا ستیاناس کرے اِس رسم و رواج کا جس نے بلا مبالغہ مجھ جیسے ۹۹ فیصدی دل جلے دونوں صنفوں میں پیدا کر دیئے ہیں۔ میں اس لعنت کے خلاف اس قدر چیخوں گا کہ ہمہ تن آواز بن کر اقصائے عالم میں گونج اٹھوں۔

بیس۔ لیجئے لیمونیڈ نوش فرمایئے۔ وفورِ جوش میں آپ کہاں سے کہاں چلے گئے۔ ابھی آپ رسالے کے فقرے پر طبع آزمائی کر رہے تھے اور ابھی رسم و رواج پر حملہ آور ہو گئے۔ کیا اس رسالے میں عورت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے غلط ہے۔ مضمون نگار نے عورت سے مراد صنف لی ہے۔ جو کچھ آپ رسم و رواج کے متعلق فرماتے ہیں سچ ہے۔ ہم اپنے بال بچوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کریں گے جیسا آپ کے ساتھ کیا گیا ہے۔

آغا صاحب (نوکر کو گلاس واپس کرتے ہوئے) شکریہ۔ یہ عارضی چیز میرے جوش کو دھیما نہیں کر سکتی۔ میرا جوش اس وقت فرو ہوگا جب میں دیکھوں گا کہ مجھ جیسے دل جلوں کی تعداد گویا صفر کے برابر رہ گئی ہے۔ اپنے آپ کو بچانا کافی نہیں ہے۔ آؤ مل کر اس کے متعلق آواز اٹھائیں اور جب تک اپنے بہت سے ہم خیال پیدا نہ کر لیں چین نہ لیں۔ ۹۹ فیصدی آدمی اپنے قلب کی گہرائیوں میں میرے ہمخیال ہیں۔ کاش ابنائے وطن اس پر غور کریں۔

بیس۔ پھر حسین لڑکیاں تو ۵ فیصدی ہونگی اور باقی ۹۵ فیصدی نیک بختوں کو کوئی پوچھے گا بھی۔ اور ہاں ۹۵ فیصدی مرد یا تو قیس بنکر جنگل جا بسائیں گے یا فرہاد ہو کر ہتھوڑوں سے دماغ پھوڑ ڈالیں گے۔

آغا صاحب۔ ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ حسن کا معیار ہر ایک کے لئے جدا جدا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اپنے اپنے مذاق کے مطابق سب کی کھپت ہو جائے گی۔

بیس۔ تو پھر آپ کو اس محکمے کا مہتمم بنا دیا جائے؟ آغا صاحب (قہقہہ لگا کر) میں بلا تنخواہ کام کرنے کو تیار ہوں۔

[illegible] کے ساتھ نقول اسناد بھی روانہ کیجیے تا کہ پوری طرح غور ہو سکے۔

اسلام میں تدوینِ کُتب

(مولانا عبدالوحید صدیقی سابق مدیر "مساوات" و مہاجر)

کسی چیز کی ابتدا اور آغاز کے متعلق کوئی صحیح اور قطعی فیصلہ کرنا نہایت دشوار امر ہے۔ ہم موجودہ عہد میں دیکھتے ہیں کہ علما اور حکمائے مغرب ایسی باتوں میں بھی متفق نہیں ہیں جن کی ابتدا ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئی ہے۔ مثلاً کھربا کا اختراع کس نے کیا۔ ریلوے لائنوں کا موجدِ اوّل کون ہے اور طیارہ میں سب سے پہلے پرواز کس نے کی۔ یہ ابھی حال کی اختراعات ہیں عہد حاضر سے ان کا قریبی تعلق ہے۔ ان میں اختلاف کی گنجایش نہ ہونا چاہئے لیکن باوجود اس کے آپ انہی باتوں کی تعیین میں علمائے مغرب کے درمیان شدید اختلافات پائیں گے۔

جب کل کی باتوں میں یہ حال ہے تو پھر اُن امور کا تو کچھ کہنا ہی نہیں جن کے آغاز کو صدیاں گذر چکی ہیں جیسے مسئلہ تدوین فی الاسلام یعنی اسلام میں تدوین کتب۔

اسلام کی سب سے پہلی تدوین قرآن مجید ہے جو خلیفہ اوّل ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں عمل میں آئی لیکن چونکہ مختلف اقطار میں ایسے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو قرآن مجید لکھتے تھے اس لئے اس کے مدونوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوگئی۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی ایک شخص نے قرآن مجید کو مدوّن کیا۔

آخری تحقیق یہ ہے کہ اسلام کا سب سے پہلا مصنف عبدالملک بن جریج البصری ہے جو ۱۵۵ھ میں فوت ہوا۔ یا ابوالنضر سعید بن ابی عروبہ ہے جو ۱۵۶ھ میں فوت ہوا۔ یا اُن کے علاوہ قرن ثانی کے دوسرے افراد ہیں۔ قرن ثانی کے مسلمان اہل قلم کی کوششوں سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے سب سے پہلے خاص خاص مسائل پر کتابیں تالیف کیں ورنہ تدوین کتب اور ادبی و دینی مضامین کی تسوید قرن اوّل ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ اگر قرن اوّل میں کتب مدوّنہ موجود نہ ہوتیں تو اموّیوں کا حکیم خالد بن یزید مختلف علوم کو سریانی اور یونانی سے عربی میں منتقل کرنے پر اتنا حریص نہ ہوتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ خالد بن یزید کا اس مسئلہ میں شغف اور غلو بڑے بڑے ثقہ محققین کے نزدیک مسلم ہے۔

صاحب "فہرست"، کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ عبید بن شریہ جرہمی حضرت امیر معاویہ ابن ابی سفیان کی خدمت میں شام میں حاضر ہوا۔ امیر معاویہ نے اس سے عہد قدیم اور عرب و عجم کے ملوک اور تاجداروں کے حالات بیان کرنے کو کہا۔ چنانچہ اس نے امیر کو اس عہد کے بہت سے واقعات سنائے۔ امیر نے حکم دیا کہ عبید نے جو کچھ بیان کیا ہے

اسے کتابی صورت میں مدوّن کر کے اُسی کے نام سے منسوب کر دیا جائے۔ صاحب "فہرست" نے عبید کی اور بھی متعدد کتابوں کا تذکرہ کیا۔ اسلام کے قرنِ اوّل کا یہ مصنف عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک زندہ رہا اِس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تدوین کا کام قرنِ اوّل کے اوائل یعنی صحابۂ کرام کے عہد میں شروع ہو چکا تھا۔ بعض حفاظِ حدیث نے بیان کیا ہے کہ زید بن ثابت رضؓ نے علم الفرائض پر ایک کتاب تالیف کی تھی۔ امام بخاری بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمروؓ حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ امام مسلم نے صحیح مسلم میں ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جو ابن عباسؓ کے عہد میں حضرت علیؓ کے فیصلوں کی بابت تالیف ہوئی تھی۔ اور مورخین لکھتے ہیں کہ انبار کے کتب خانہ میں ایسی متعدد کتابیں پائی گئیں جو صحابہؓ اور تابعین کے قلم کی لکھی ہوئی تھیں۔ بلکہ ایک کتاب ایسی بھی ملی جو عبدالمطلب بن ہاشم کے قلم کی عہدِ اسلام سے پیشتر کی لکھی ہوئی تھی۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی تو عہدِ جاہلیت کے واقعات اور اُن کے اشعار کی تدوین کے متعلق جن لوگوں کو شکوک و شبہات تھے ان کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دعوت اسلام سے بھی پہلے ایک ایسی قوم عرب میں موجود تھی جو اپنے کاتبوں کی تعداد کے مطابق تدوین کے کام میں مصروف تھی۔ اب غالباً ان لوگوں کا استعجاب دور ہو جائے گا جو کہتے ہیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان لوگوں نے دوسری صدی میں ان باتوں کو ٹھیک ٹھیک لکھ لیا ہو اور کوئی غلطی نہ کی ہو جسے اُن کے اجداد نے پہلی صدی میں سنا تھا۔ حالانکہ آجکل ہماری یہ حالت ہے کہ ہم کبھی ایسی چیز کو بجنسہ نہیں بیان کر سکتے جسے ہم نے ایک مہینہ پہلے سُنا ہو یا کسی ایسے واقعہ کو نصف بھی نہیں بیان کر سکتے جسے دو مہینہ پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ لیکن زمانہ نے اُن کی اس رائے کو عبید ابن شریہ جرہمی کے اُس واقعہ سے جو امیر معاویہؓ کے ساتھ پیش آیا غلط ثابت کر دیا ہے۔ یہ امر نہایت اہم ہے کہ راویوں نے عبید کی اس تدوین کے متعلق جو کچھ بیان کیا تھا۔ اب وہ صحیح ثابت ہو گیا ہے کیونکہ اسکی اصل تدوین کے حصول میں کامیابی ہو گئی ہے۔ اور انگلستان کے مشہور مستشرق مسٹر کرینکو نے اُسے "اخبار عبید بن شریۃ الجرہمی فی اخبار الیمن واشعارہا وانسابہا" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ یہ کتاب حیدر آباد دکن میں طبع ہوئی ہے۔ اس کتاب سے "الفہرست" کی ابن الندیم والی اس روایت کی تائید ہوتی ہے کہ "معاویہ رضؓ نے اپنے کاتبوں کو حکم دیا کہ عبید بن شریہ نے جو کچھ بیان کیا ہے اُسے مدوّن کر لیں۔ اور عبید نے امیر معاویہ رضؓ کے سامنے قوم عاد و ثمود اور جرہم کے واقعات اور اُن کے یمن سے حرم کی طرف خروج وغیرہ کا حال بیان کیا۔ یہ تمام واقعات انہیں کے اشعار سے اخذ کیے گئے تھے۔ امیر معاویہ اس کی ہر روایت پر اشعار سے سند طلب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ شعرِ عرب کے اقوال و افعال کے لئے ایک دلیل ہے اور ایامِ جاہلیت میں اُن کے درمیان حاکم ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ یقیناً اشعار میں بہت سی مفید باتیں ہیں۔

امیر معاویہ نے عبید سے جو کچھ سنا اُس پر وہ بیحد متعجب ہوئے اور اُس نے کہا "اے عبید جو کچھ تو نے بیان کیا ہے اگر یہ امر واقعہ ہے تو اللہ تعالیٰ تیرے علم اور فہم میں اضافہ کرے اور ہمیں تیری طرف زیادہ راغب اور حریص بنائے کیونکہ ہم تیری معلومات کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و ہدایت کے دروازے تیرے اوپر کھول دے"

فی الجملہ کہا جاتا ہے کہ "اخبار عبید بن شریۃ الجرہمی فی اخبار الیمن" سب سے پہلی کتاب ہے جو اسلام میں مدوّن کی گئی۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عام مصنفین کی تدوین کتب سے بہت پہلے مسلمانوں نے کتابوں کی تدوین شروع کر دی تھی۔ اور اسی سے زمانۂ جاہلیت کی اموّیہ واقعات اور اشعار محفوظ رہے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی "مذاہب الراوی" میں ابن عدی اور بیہقی کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ ہمیں عبدالصمد بن عبداللہ دمشقی اور محمد بن بشیر دمشقی سے معلوم ہوا وہ دونوں کہتے تھے کہ ہشام بن عمار نے روایت کی اور اُن سے ابو الخطاب عرف خیاط نے بیان کیا کہ میں نے وائلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو احادیث کا املا بول رہے ہیں اور لوگ اُن کے سامنے لکھ رہے ہیں۔ یہ اور اس کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد صحابہ میں بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے سامنے ہی حدیثوں کی کتابت شروع ہو گئی تھی۔ اِن روایات کی تائید عبید بن شریہ کی کتاب "اخبار الیمن" سے بھی ہوتی ہے۔ اور یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں نے تدوین کا کام اُس سے کہیں پہلے شروع کر دیا تھا جیسا کہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے۔ اسی کے ساتھ بعض لوگوں کا یہ دعویٰ بھی رد ہو جاتا ہے کہ جاہلیت کے اشعار مصنوعی ہیں۔

مولانا احسن مارہروی اردو لیکچرار انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کتاب تاریخ نثر اردو پر ہم نے ماہ گذشتہ میں تبصرہ کیا تھا۔ مگر غلطی سے کتاب کی قیمت غلط درج ہو گئی تھی۔ اصل میں اس کی قیمت بجائے ایک روپیہ کے پانچ روپے ہے۔ قارئین کرام تصحیح فرمالیں۔

منیجر

کلامِ احسن

(جناب احسن مارہروی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

تیرے نالوں نے اثر اے دلِ ناشاد کیا — بھول جا شکوہ کہ اب اُس نے تجھے یاد کیا

دل کو قابو میں کیا، مجھ سے یہ ارشاد کیا — تجھ سے کچھ کام نہیں، جا تجھے آزاد کیا

مٹ گیا دل تو مجھے رنج تباہی کیوں ہو — اپنا گھر خانہ برانداز نے برباد کیا

کیسی دنیا، کہ خود اپنی ہی بھلا دی ہستی — کچھ ہمیں یاد نہیں جب سے تمہیں یاد کیا

جب کہیں پائی نہ معمورۂ دنیا میں جگہ — دلِ ویراں کو غمِ عشق نے آباد کیا

اور کیا دشت نوردانِ محبت کرتے — خود پریشان ہوئے گھر کو بھی برباد کیا

زندہ درگور نہ دیکھے ہوں تو دیکھ آؤ اُسے — عالمِ ہجر کو جس نے عدم آباد کیا

سوسنِ گلشنِ ہستی کا ثمر خاک ملا — کھا کے دنیا کی ہوا عمر کو برباد کیا

ہے یہ فطرت کی ظرافت کہ ستم کیا کہئے — دل بھی پیدا کیا عاشق کا تو ناشاد کیا

شور اگر ہم نہ مچاتے تو نہ پھرتا وہ ادھر — ہم نے خود سوئے نشیمن رخِ صیاد کیا

سببِ گریۂ رقیبانہ سنو احسن سے
رو رہا ہے وہ اُسے جس نے تمہیں شاد کیا

مذہب اور سائنس کا تنازع

میری کوریلی کا ایک افسانہ

(از جناب ظفر قریشی دھلوی)

(۱)

ایک ممتاز سائینسدان اپنے کتب خانہ میں اکیلا بیٹھا تھا - اس وقت وہ بہت اُداس تھا - کیوں کہ دماغی تکان نے اس پر پورا قبضہ کر لیا تھا - اس کے خیال میں کوئی چیز حتّٰے کہ بڑے سے بڑا انکشاف بھی جو وہ کرسکتا تھا) اُس کی زندگی کی زرّیں کامیابی نہیں کہلا سکتا تھا - کیونکہ اس سے کوئی مفید مقصد پورا نہ ہوتا تھا +

سائینسدان نے اپنے سامنے ان دو تین روزانہ اخباروں کو ایک طرف ہٹایا - جن میں اشاعت کم ہو جانے کے سبب نت نئی "سنسنی خیز" خبریں اور نئے نئے حیرت انگیز "سیریل" شروع کئے گئے تھے - ان اخبارات میں سوائے معاشرتی معاملات پر تھکا دینے والی بحثوں کے اور کچھ نہ تھا - یہ مضامین ایڈیٹروں کی درخواست پر ایسے لوگوں نے لکھے تھے جنہیں سوائے اس کے اور کوئی خواہش نہیں ہوتی کہ اپنا نام چھپا ہوا دیکھیں - بس گویا ان کے لئے سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ خامہ فرسائی کی تکلیف گوارا فرمائی جائے - اسی قسم کا ایک اخبار تھا - جس میں سائینس اور مذہب کے نام نہاد "تنازع" پر کسی بیہودہ گو نے بکواس کی تھی - اور جسے سائینسدان نے با دلِ ناخواستہ تھوڑا بہت پڑھ لیا تھا - لیکن یہ مضمون نویس اس مسئلہ کی مشکلات کا کوئی معقول حل پیش نہ کر سکا تھا اور نہ کسی مفید نتیجہ پر پہنچا تھا +

سائینسدان نے یہ مضمون پڑھ کر کمرے کی سنسان تاریکی میں اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یہ لوگ کبھی نہ سمجھیں گے! ان میں کبھی اتنی انکساری اور بے لاگ قوتِ تحقیق پیدا نہیں ہو سکتی جو اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ سائینس مذہب ہے، اور مذہب سائینس، وحدت الٰہی کے ان دو حصّوں کے درمیان کبھی کوئی "تنازع" نہیں ہو سکتا" یہ سوچ کر اس نے قریب ہی سے وہ کتاب اٹھالی جس کا نام "علم نجات" تھا - سائینسدان نے

ذیل کی سطور نکال کر پڑھیں جنہیں وہ متعدد بار پڑھ چکا تھا:-

"ہمیں اپنی ہستیوں کے متعلق اتنی ہی قلیل معلومات ہیں جتنا چاند کے الٹے رخ کا حال زمین والوں کو معلوم ہے - ہماری ذہنیتوں میں اس حقیقت سے بڑھ کر اور کوئی حقیقت آشکارا نہیں کہ ہر انسانی ہستی میں دو طاقتیں، دو حالتیں یا دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک تو تکمیل کی طرف صعود کرتی ہے اور دوسری اس کے برعکس اسفل ترین درجہ کی جانب نزول کرتی ہے، جس سے اس دنیا میں ہمارے اجسام، نفوس اور ہستیاں ایک طرف خوشی و مسرت کی منزل میں داخل ہوتی ہیں - لیکن دوسری طرف وہ رنج اور مصیبت میں پھنسانے والی ہوتی ہیں یعنی ایک تو ذہنی مسرت کی طرف اور دوسری ذہنی (و جسمانی) کرب و بلا کی طرف لیجاتی ہے - پس لازم ہے کہ ہر شخص اپنی فطرت کو ان قوتوں میں سے اچھی قوت کو منتخب کرے اور بدتر سے گریز کرے تاکہ ایسی معنوی صفت ہے، اور اتنی مبہم و ناقابل تشریح کہ حد بیان سے باہر ہے یہ حقیقت اتنی ہی مضبوط و محکم ہے جیسے یہ حقیقت کہ کشش زمین کی وجہ سے اجسام گرنے پر مائل ہوتے ہیں - غرض یہ ہے کہ یہ مسئلہ انسان کی اندرونی زندگی میں بہت عمیق ہے - مصنفین نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ہمیں قدرت نے جیسا بنایا تھا اور جیسا پیدا کر دیا تھا ابد سے لے کر آج تک ہم ویسے ہی ہیں - ہماری قدیمی اور آبائی فطرتوں میں مطلق فرق نہیں آنے پایا ہے اس مسئلہ کی ایک اخلاقی صورت بھی ہے یعنی یہ کہ ہمارے ہاتھوں اور دماغوں کے لئے محنت و عمل کی وراثت کی ایک ناقابل یقین مقدار مہیا کر دی گئی ہے - جس کا مقصد دنیا کو فتح کرنا ہے انسان کو دنیا میں بہت سی چیزوں کو مغلوب کرنا ہے - مثلاً جنگ و جدل شراب، امراض، افلاس، جرائم، مصائب، جنون، حماقت، زہر اور زہریلے سانپ، مہلک جراثیم، حشرات الارض اور ضرر رساں درخت و حیوانات - نیز انسان کو جنسی و جسمی خطرات سے، جھوٹی دوستی اور طمع زر سے (جس کے لئے مستقبل بعید کے انتظار کی ضرورت نہیں) بھی لڑنا ہے ورنہ انہیں مغلوب کرنا ہے اگر انسان نے ان برائیوں کا سامنا نہ کیا تو ذلت کے گڑھے میں گرنا پڑے گا۔"

(۲)

ممتاز سائینسدان نے ایک سرد آہ بھری اور کتاب بند کر دی اور اپنے آپ کو مخاطب کیا "یہ بالکل

سلہ ادب خیر نہا۔

حقیقت ہے! لیکن حقیقت کبھی قبول نہیں کی جاتی، اور اگر ہم صداقت پیش بھی کریں تو لوگ مضحکہ اڑاتے ہیں۔ حالانکہ جھوٹ کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔" سائینسدان کو دماغی تکان کا احساس زیادہ ہو گیا۔ مگر پھر اُس تجربے کی تکمیل کا خیال آ گیا، جسے وہ گذشتہ شام لیبوریٹری[1] میں کر رہا تھا، اور جسے دو امریکی نوجوانوں کی آمد نے التوا میں ڈال دیا تھا +

یہ نوجوان کچھ تو ایک طبّاع ذہین آدمی سے ملاقات کرنے کے لئے اور کچھ اس خیال سے کہ اپنی کج بحثی اور لاعلمی سے سائینسدان کی ترشروئی کا باعث بنیں۔ اسے بار بار سوال کر رہے تھے گر سائینسدان جس پایہ کا آدمی تھا اسے اس کی امید نہ تھی کہ وہ ان لوگوں کی کج بحثیوں سے جز بز ہو کر برافروختہ ہو جائے گا۔ مگر سائینسدان اپنے طویل تجربے کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ امریکہ کا نوجوان طبقہ ارتقا اور حالت خمیر میں جراثیم پیدا ہونے کے عمل کے موافق اوپر کو ابھر رہا ہے۔ بہر کیف ان کے طرح طرح کے سوالات کی بھر مار اور مطالبات نے سائینسدان کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا۔ اس نے ان نوجوانوں سے قومی ارتقا کے معاملہ میں اپنے خیالات صاف صاف بیان کر دیئے تھے۔ جب وہ ان نوجوانوں کو عہد حاضر کی انسانی آبادی کا نمونہ خیال کر رہا تھا اُس کی ہرگز خواہش نہ تھی کہ یہ مسرت اور سکون قلب حاصل کریں۔ کیونکہ اُس کے خیال میں مسرت اور حقیقی خوشی کے مستحق نفس الحقیقت وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کے اہل ہوتے ہیں اور جدّ و جہد کرتے ہیں۔ ایک مغربی ملک کی کہاوت ہے۔ کہ "اگر تو ہاتھ پیر نہ ہلائے گا تو کھانے کو بھی نہ ملے گا" یہ مثل دنیا کے تمام معاملات پر حاوی ہے جیسا کہ میں نے ابھی پڑھا ہے انسان کے ذمہ کام لگا دیا گیا ہے۔ یعنی اسکے لئے عمل و محنت کرنا فرض قرار دیا دیا گیا ہے۔ جنگ، شراب، امراض، افلاس، جرائم، مصائب، جنون اور تمام وہ جسمانی آفات و امراض جو انسان پر مسلط ہیں اُسے مغلوب کرتے ہیں ——— لیکن اگر یہ بھی ہو جائے۔ تو کیا ہمیں حقیقی مسرت اور سکون قلب میسر آ جائے گا؟ کیا ہم لوگوں کو راحت دل اور سکون نفس حاصل ہو جائے گا! مجھے تعجب ہے کہ ایسا ممکن بھی ہے یا نہیں ——— دُور کیوں جاؤ میری ہی مثال لے لو ———

——— اگر میں اپنے انکشاف علمی کو دنیا کے حوالہ کر دوں تو جنگ ——— کا امکان بالکل فنا ہو جائے گا نہ صرف ہو جائے گا۔ بلکہ ہو جانا چاہیئے۔ لیکن کیا جنگ کے بند ہو جانے سے انسان کی طمع اور حسد کا بھی خاتمہ ہو جائے گا؟! اگر نہیں تو پھر انسان کو جنگ کے خلاف احتجاج نہیں کرنا چاہیئے بلکہ خود اپنے آپ سے بچنے کی فکر کرنی چاہیئے! لیکن یہ کام کسی کے بس کا نہیں ہے۔ نہ سائنس، نہ کوئی "شعاع" نہ عناصر کی کوئی نرالی ترتیب

[1] معمل

غرض کوئی چیز انسان کو تباہی سے نہیں بچا سکتی! سوائے اس کی ذہنیت کے انقلاب کے اور اس کی ذہنیت کی بلندی محبت، انکساری، خلق، بے غرضی، اور ایثار و قربانی کے دنیا کی کوئی طاقت انسان کو تباہ ہونے سے نہیں بچا سکتی ——— لیکن عہد موجودہ کا انسان کہتا ہے ——— محبت، خلق، بے غرضی اور ایثار کی حاجت ہی کیا ہے؟ لیکن ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ بھولی بھالی فطرتیں وہی ہوتی ہیں جو گمراہ ہو جانے میں سب سے پیش پیش رہتی ہیں ——— ——— سب سے زیادہ محبت کرنے والے اور پر خلوص دل ہی سب سے پہلے شکستہ ہوتے ہیں"۔

اس وقت سائنسدان کے پیش نظر عمر خیام کی ایک رباعی کا آزاد ترجمہ تھا۔ اور وہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ:—

"اگر میں خدا ہوتا تو اشک ہائے انسانی کے رازِ سربستہ کو حل کرنے کے لئے زمانہ کا منتظر نہ رہتا بلکہ غیر مبہم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کر دیتا"۔

(۳)

سائنسدان اپنی کرسی پر سے اٹھا اور کتب خانہ کے ایک کونے میں پہنچا جہاں ایک لوہے کا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اس صندوق کو کھول کر اندر سے اس نے ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا، جو بظاہر فولاد یا پلاٹینم دھات کا بنا ہوا تھا اس نے اُسے میز پر رکھ دیا۔ اس ڈبے کے ساتھ بجلی کا ایک بٹن لگا کر خاموش بیٹھ گیا دو تین منٹ کے بعد کمرے میں ایک قرمزی نور جگمگانے لگا۔ لیکن یہ ضیا اس بکس سے ایسے غیر معلوم طریق پر نکل رہی تھی کہ بظاہر اس کی کوئی علامت نظر نہ آتی تھی۔ کہ اس کا مخزن یہ چھوٹا سا ڈبہ تھا۔ سائنسدان بیٹھا ہوا اس قرمزی نور کو دیکھ رہا تھا تھوڑی دیر بعد یہ منور شعاع بالکل ساکت ہوگئی، اور کمرا اس سے معمور ہو گیا۔ سائنسدان نے اطمینان کا سانس لیا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ کہ "تجربہ مکمل ہے! ایسا ہی مکمل انسان ہو سکتا ہے ——— اگر اس فضا میں کوئی شئے ایسی ہے جو انسانی آنکھوں سے پوشیدہ ہے تو وہ اس شعاع کی روشنی میں نظر آنے لگے گی ——— حتیٰ کہ حقیقی نور کی شاہراہ اس کی صحیح رہنمائی کرے گی"۔

دماغ حیران تھا! بٹن کے آنے ہی کمرے کی فضا میں کوئی شئے پیدا ہوئی۔ جو فی الحقیقت انسانی آنکھ کر نہ دیکھی جا سکتی تھی ——— حتیٰ کہ سائنٹفک آلات بھی باوجود تمام آلات کے کچھ تمیز نہ کر سکتی تھی ——— یعنی ایک شعاع جو بجلی سے بھی زیادہ منور، سفید اور نظر کو خیرہ کرنے والی تھی ہلال

کی شکل میں ڈبے سے نکل کر فضا میں کھڑی ہو گئی - یہ نور ہیرے کی طرح شفاف اور موتی کی طرح معین تھا - اور سوا اپنی ضیا کے اور کسی سے مانند نظر نہ آتا تھا *

سائینسدان نے اس ہلال نما نوری شعاع کو دیکھا ملکہ بہت دیر تک گھورتا رہا - کیونکہ یہ ایک ایسی چیز تھی جو اُس کی سمجھ سے باہر تھی ——— علاوہ ازیں اس نور نے اُس کے حواس اس طرح مختل کر رکھے تھے کہ وہ اس ہیئت و رعب کی حالت میں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا - سائینسدان نے کوشش کی کہ بہت آہستہ آہستہ (بہت ہی آہستہ) اِس پراسرار "سپیدی" کی طرف قدم بڑھائے - لیکن کسی طاقت نے جو اُس کی نہ تھی سائینسدان کو پیچھے ہٹا دیا - اور اس نے سہارا لینے کے لئے میز کا کونا پکڑ لیا *

بے اختیارانہ وہ دو زانو ہو گیا، گویا ہلال کے سامنے جھک رہا تھا "**نورِ اعظم**" جو موتی جیسا صاف و شفاف تھا سائینسدان پر چھایا ہوا تھا - اس نوری ہلال کی شکل بالکل عیاں نظر آتی تھی یعنی بالائی حصہ چھت کی طرف اور زیریں حصہ فرش کی جانب تھا *

یہ نور بہت دیر تک یونہی کمرے میں معلق رہا - پھر رفتہ رفتہ غائب یا محو ہونا شروع ہو گیا - سائینسدان کے دماغ میں خواہش پیدا ہوئی کہ یہ نور جہاں جہاں جائے وہ اس کا تعاقب کرے - لیکن سائینسدان کو اپنے سائیٹفک "انکشاف" کا جو میز پر رکھے ہوئے ڈبے کے ذریعہ "مکمل" ہو رہا تھا مطلق خیال نہ رہا ——— ورنہ وہ ضرور اس بات کو محسوس کرتا کہ ڈبے کی روشنی کے تمام اجزائے ترکیبی یعنی ریڈیو اور برقی آلات وغیرہ اب بجھ چکے تھے *

حیرت انگیز "**شعاعِ سپید**" اب رخصت ہو چکی تھی اور سائینسدان اس کے تعاقب میں مکان کے ہال اور دروازہ سے نکل کر سڑک پر آ گیا تھا - جہاں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ، بھگانے والی بارش میں ایک دوسرے کو کندھے سے کندھا مار کر آگے بڑھ رہی تھی یکایک سائینسدان رُک گیا اسے اپنے حواس کی موجودگی پر شبہ ہو رہا تھا - کیوں کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ "شعاعِ سپید" اپنی ہلالی شکل میں فضا میں لٹک رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نوری ہلال عالم تاریک کے تمام بھیانک اندھیرے کو اپنے آغوش میں لے لینا چاہتا تھا *

سائینسدان اپنے دروازہ کی چوکھٹ پر کھڑا ہو گیا - اور اس نور کی جانب آنکھ اُٹھا کر دیکھا - اور اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلنے لگے "یہ لوگ ——— انسان ——— اندھے ہیں جو نہیں دیکھتے کہ اُن کے سروں پر کیا چیز ہے!"

(۴)

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس خیال سے اس کے دماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ اس نے سوچا کہ کیا یہ سائینس اور مذہب کے نام نہاد "تنازع" کا حل نہیں؟

اس کے خیال میں "انسان اندھے ہیں! لیکن اگر وہ اندھے ہیں تو انہیں راستہ کون بتائے؟ اسکے ذہن پر ایک چوٹ لگی۔ اس کے حافظے نے بائبل کی یہ آیت یاد دلائی "اس نے (خدا) رات کو لوگوں کی آگ کی روشنی سے رہنمائی کی!"

"آگ کی روشنی" ——— ہاں بیشک روشنی یہ بھی تھی! انسانوں کے مجمع کثیر کے سروں پر روشنی جگمگا رہی تھی۔ لیکن "وہ اس قدر اندھے تھے کہ دیکھتے نہ تھے" لیکن کیا سائینسدان کہہ سکتا تھا کہ اُس نے حقیقت کو زیادہ واضح دیکھا تھا؟ ——— ——— نہیں وہ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ دراصل اُس کا یہ انکشاف ان لاکھوں انکشافات میں سے ایک تھا۔ جو ابھی دریافت ہونا باقی تھے ——— ——— لیکن کیا اس کی یہ دریافت دنیا کی مسرت میں اضافہ کرنے والی ثابت ہوگی؟ یہ معلوم کرنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ سائینس کے تجربات اس کا تجزیہ نہ کر سکتے تھے۔ اس کا فیصلہ ایک "برتر طاقت" کے ہاتھ میں تھا +

اِس معاملہ میں وہ بھی (اسی) قدر اندھا تھا جس قدر انسانوں کا وہ مجمع جو اس نور کے نیچے بےخبری و لاعلمی کے عالم میں متحرک تھا اور اس حقیقت سے ناآشنا کہ ان کے سروں پر ایک ایسی ضیا منور تھی جس کی تشریح سائینس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اِس قدر غیر محسوس تھی کہ ملمی توجیہ محال! -

دفعتاً شہر کے شور و غل میں سے ایک "مغنیہ" کی صدا بارش سے نم آلود فضا میں بلند ہوئی۔ اس آواز کے ترنم نے اس کے سوز و گداز نے سائینسدان کے کان کھڑے کر دئے اور اُسے یقین ہو گیا کہ اگر وہ نور جنت نگاہ تھا تو یہ آواز "فردوس گوش" تھی۔ نغمۂ پرکیف یہ تھا —

"اے مہربان و رحیم **نور** ہمیں اپنے۔ ریک ماحول میں راہ بتا!"

"تو ہی میری رہنمائی کرے گا!"

"رات اندھیری ہے اور میں اپنے گھر سے بہت دور ہوں!"

"تو ہی میری رہنمائی کرے گا!"

"بس میرے قدموں کو متحرک رکھ میں نہیں چاہتا کہ مزید نظارے دیکھوں"۔

"بس ایک قدم آگے!"

"میں تو تیری رہنمائی چاہتا ہوں!"

(۵)

سائینسدان نے اپنے مکان میں آہستہ سے قدم بڑھایا اور کواڑ بند کر لیئے - اور پھر اپنی لائبریری میں واپس آ گیا- وہاں اُس کے" انکشاف اعظم" کا کوئی نشان باقی نہیں تھا میز پر جو پر اسرار ڈبہ رکھا تھا- اور جو ریڈیو کا سلسلہ لگا رکھا تھا وہ اب خاموش ہو چکا تھا - کمرہ میں تاریکی تھی -اس لئے اس نے جلدی سے بجلی کا بٹن دبا کر کمرہ میں روشنی کی ہر چیز حسب معمول تھی +

کیا اس کا عجیب و غریب تجربہ کوئی خواب تھا! ہ کوئی تنبیہ تھی؟ یا ایک سبق!"

سائینسدان نے بآواز بلند کہا "ہم حدود سے متجاوز ہو جاتے ہیں - ہم ضرورت سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تحقیق و انکشاف کے پُرشوق جذبہ سے اندھے ہو جاتے ہیں - اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا حقیقی مطمح نظر کیا ہے! یہی وجہ ہے کہ ہم حقیقی مسرت کی راہ بھول جاتے ہیں - اور خود بھی بھٹکتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں - ہمیں اب بھی دانشمندی سے کام لینا چاہیئے ورنہ —————— —————— امیدوں اور حسنِ ایمان کا یہ تمام تار و پود ٹوٹ جائے گا! +

سائینس مذہب ہے! —————— لیکن ہمیں یہ بات ہرگز فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ مذہب تو سائینس ہی ہے! ایک وقت میں ایک قدم اٹھانا چاہیئے —————— کیوں کہ رات اندھیری ہے +

بے اختیارانہ سائینسدان کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے :-

" ایک قدم آگے! رہنمائی کر مولے! ایمان و خلوص قلب کے ساتھ! —————— نہ کہ ریاکاری اور غرور کے ساتھ —————— اے مہربان ہم بندوں کو صحیح راہ دکھا —————— بس ایک قدم سیدھے ڈگر پر ڈالدے - یہی کافی ہے!"

احوالِ غالب از کلامِ غالب

(جناب حامد حسین صاحب قادری۔ بچھرایونی)

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

غالب کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس کی قدر نہ صرف اس کی زندگی میں ہوئی، بلکہ مرنے کے بعد اس سے زیادہ ہوئی۔ زندگی میں بہت سے ایسے حالات و اسباب ہو سکتے ہیں کہ بے لوث و غیر جانبدارانہ قدر و ستائش کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے۔ لیکن ایسے زمانے میں جبکہ شاعر کے دیکھنے والے بھی گنتی کے رہ گئے ہوں، شاعر کی قدر ہونا، بے شبہ اس کی اصل قدر اور اس کے کمال کی واقعی دلیل ہے۔

غالب کے کلام پر تبصرے اور تنقیدیں شرحیں اور دیباچے بہت لکھے گئے۔ لیکن اس کے حالات اور خصائص طبعی پر کافی نظرِ تنقید نہیں ڈالی گئی۔ صرف مولنا حالی نے حق شاگردی ادا کیا ہے اور اگرچہ نہایت تفصیل سے حالات لکھے ہیں۔ لیکن ان میں سے گردانہ ارادت و عقیدت مندی کا رنگ غالب ہے۔ غالب صرف اعلیٰ دماغ کا انسان نہ تھا۔ بلکہ بڑا دل بھی رکھتا تھا، لیکن انسان تھا، اور انسان لغزشوں سے پاک نہیں ہوتا۔ غالب، خوددار، پابند وضع، وسیع الاخلاق اور بقول حالی "حیوان ظریف" تھا۔ لیکن خودداری کیساتھ حسد و خوشامد، قناعت کے ساتھ بے صبری، خوش خوئی کے ساتھ طعن و شکایت، ظرافت کے ساتھ ہجو و بدگوئی بھی ہندوستان کے اس بہترین و برترین شاعر کی سرشت میں پنہاں تھی۔ لیکن جس طرح شکسپیئر کا سرقہ شکارس کے کمال شاعری کو داغدار نہیں کر سکتا، اسی طرح انسانی کمزوریوں کے اتفاقی و ہنگامی اظہار سے غالب کا پایۂ بلند پست نہیں ہوتا۔ کسی انسان کے حالات کے دوران تحقیق میں اس کے کسی عیب کی طرف اشارہ کر دینا علمی نقطۂ نظر سے نہ اُذْکُرُوا مَوْتَاکُمْ بِالْخَیْر کے منافی ہے، نہ اس کی شہرت کو داغدار بنانے کے مترادف۔ بلکہ فطرت انسانی کے تنوع کا مطالعہ ہے اور دلچسپ مطالعہ۔

غالب کا مذہب بھی آج کل معرض بحث میں ہے، اس نے ایک مثنوی میں اپنے عقائد جس خوبی و صفائی سے

لکھے ہیں، وہ اگرچہ کسی کی فرمایش سے سہی، لیکن بلاشبہ اس کے ذاتی معتقدات ہیں۔ اس فرمائش کا اثر گرفتاری کا خوف نہ تھا، جس نے بے تکلف کہلوایا تھا "صاحب آدھا مسلمان ہوں اسلئے کہ شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا"

اِس مختصر تمہید کے بعد ہم اس کے حالات و عادات جو اس کے کلام اُردو فارسی میں دستیاب ہوسکے ہیں۔ بغیر کسی حاشیہ آرائی کے غالب ہی کی زبان سے پیش کرتے ہیں:۔

غالب کی ولادت،

غالب چو ز تا سازی فرجام نصیب
هم بیم عدو دارم و هم ذوقِ حبیب

تاریخ ولادت من از عالم قدس
هم شورشِ شوق آمد و هم لفظِ غریب
۱۲۱۲ ۱۲۱۲ ۱۲۱۲

غالب کا نسب،

غالب از خاک پاک تورانیم
لاجرم در نسب فرہمندیم

ترک زادیم و در نژاد ہمے
بسترگان قوم پیوندیم

ایبکیم از جماعۂ اتراک
در تمامی ز ماہ دہ چندیم

پیشۂ آبائی،

فن آبائے ما کشاورزی است
مرزبان زادۂ سمرقندیم

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم
زاں رو بہ صفائے دم تیغ است دمم

چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر
شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

غالب کا مذہب،

شرط است کہ بہرِ ضبط و آداب رسوم
خیزد ز پے از نبی امام معصوم

ناجامع چہ گوئی بہ علی باز گرائے
مہ جائے نشین مہر باشد نہ نجوم

علی راست بعد از نبی جائے او — ہماں حکم کل دار و اجزائے او
ہمانا پس از خاتم المرسلین — بود تا بہ مہدی علی جانشین
نژادِ علی با محمد یکے است — محمد ہماں تا محمد یکے است
ز احمد الف نام ایزد بود — ز میم آشکارا محمد بود
الف میم را چوں شوی خواستگار — نماند ز احمد بجز ہشت و چار

منصور فرقۂ علی اللہیاں منم — آوازۂ انا اسد اللہ برآورم
غالب نام آورم نام و نشانم مپرس — ہم اسد اللہ ام و ہم اسد اللہیم

غالب کا مسلک،

غالب آزادۂ موحد کیشم — بر پاکیٔ خویشتن گواہ خویشم

آزادرو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غالب کے عقائد

استمداد از اولیا

نور حق است احمد و لمعان نور — از نبی در اولیا دارد ظہور
ہر ولی پرتو پذیر است از نبی — چوں مہ از خورشید ستیز از نبی
از نبی راز ولی خواہد مدد — تا نہ پنداری کہ نا جائز بود
بر نیاید کار بے فرمان شاہ — لیک آئیں ہاست بر خاصانِ شاہ
ہر کہ او را نور حق نیرو فزا است — تا ز جوہر ازو خواستی ہم از خدا است
در لب دریا گر آب سے خوردہ — آب از موجے بجام آوردہ

آب از موج آید اندر جام تو — لیکن از در بود آشام تو
وقتِ حاجت ہر کہ گوید یا علی — با حقش کار است و پوزش یا علی
یا محمد جاں فزائد گفتنش — یا علی مشکل کشائد گفتنش
چوں اعانت خواہی از یزدانِ پاک — یا معین الدین اگر گوئی چہ باک
ابلہاں را از آنکہ دانش نارساست — گفت گو با بر سرِ حرفِ نداست
مولوئ معنوی عبد العزیز — واں رفیع الدین دانشمند نیز
شاہِ عبد القادرِ دانش سگال — کایں دو تن را بود در گوہر مال
بر دوں نامِ نبی و اولیاء — خود روا گفتند با حرفِ ندا
تا نہ پنداری ز پیراں خواستیم — حاجتِ خود را ز یزداں خواستیم

مولد پیغمبر :- در سخن ور مولد پیغمبر است — بزم گاہِ دلکش جاں پرور است
موئے مبارک :- نکہت موئے مبارک جانفز است — بارگ جانش ہمی پیوند ہاست
بر تن نیکو تر از جاں رستہ است — لاجرم از آبِ حیواں رستہ است
دلنشیں با بود زاں روئے موے — وہ کہ گرد اندکسے زاں موئے روے
نقش قدم :- ہر کرا دل ہست و ایماں نیز ہم — چوں نوازد عشق با نقشِ قدم
در رہ دیں تا قدم بنہادہ اند — عشق بازاں را نشانہا دادہ اند
بر دار از خویشم دو صد فرسنگ شک — می برم ایں نقش را بر رشک رشک

معجزات :- در تو گوئی سے کنم اثبات حق — از چہ روئی منکر آیات حق
معجزاتِ انبیا آیات کیست — ویں صفت ہا را ظہور از ذات کیست
امکان نظیر :- ویں کہ میگوئی توانا کردگار — چوں محمد دیگرے آرد بکار
با خداوندِ دو گیتی آفریں — ممتنع نبود ظہور ایں چنیں
گر چہ فخرِ دودۂ آدم بود — ہم بقدر خاتمیت کم بود
صورتِ آرائشِ عالم نگر — یک مہ و یک مہر و یک خاتم نگر

این کہ مے گویم جوابے بیش نیست مہر و ماہ را جلوہ تابے بیش نیست
آں کہ مہر و ماہ و اختر آفرید مے تواند مہر دیگر آفرید
حق دو مہر از سوئے خاور آورد نور ہا آں کونہ باور آورد

منشاء ایجاد ہر عالم یکیست گر دو صد عالم بود خاتم یکیست
خود ہمی گوئی کہ نورش اول است از ہمہ عالم ظہورش اول است
اولیت را بود شانے تمام کے بہر فردے پذیرد انقسام
جوہر کل بر نتابد شیشۂ در محمد رہ نیابد شیشۂ
میم امکاں اندر احمد مستتر ست چوں نہ امکاں بگذری دانی کہ چیست
صانع عالم چنیں کرد اختیار کش بعالم مثل نبود زینہار
ایں نہ عجز است اختیار است اے فقیہ خواجہ و بے ہمتا بود لاریب فیہ

غالب کا مشرب :-

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

روزہ مرا ایماں ہے غالب لیکن خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

در عالم بے زری کہ تلخ است حیات طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰۃ بودے بوجود مال چوں حج و زکوٰۃ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار ساقی و مغنی و شرابے و سرودے

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ مے بود اینک بمن سپار زاں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

خوش بود فارغ ز بندِ کفر و ایماں زیستن حیف کافر مُردن و آدم مسلماں زیستن

کارے عجب افتادہ بدیں شیفتہ مارا مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت

غالب کے اخلاق

خودداری و علوئے ہمّت،

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

ہنگامۂ زبونیِ ہمّت ہے انفعال حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

تھی نو آموزِ فنا ہمّتِ دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلا قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

یادِ رفتگاں

بہ نظم و نثر مولٰنا ظہوری زندہ ام غالب رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

مارا مدد ز فیضِ ظہوری است در سخن چوں جام بادہ را تبہ خوارِ خمیم ما

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ آپ بے بہرہ جو معتقدِ میر نہیں

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذکر احباب،

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم — چہ بما منت بسیار نہی از کم شان
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود — باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار — ہست در بزم سخن ہمنفس و ہمدم شاں

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل — چوں او تلاش معنی و مضموں نکرد کس

خودستائی،

اگر ذوق بہ ہر آئیں بودے — دیوان مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے — آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب — شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما
نرنجم گر بصورت از گدایاں بودہ ام غالب — بدار الملک معنی مے کنم فرماں روائی ہا

شعر غالب نبود وحی و نگوئیم ولے — تو و یزداں نتواں گفت کہ الہام ہست

چند رنگیں نکتۂ دلکش تکلف برطرف — دیدہ ام دیوان غالب انتخابے بیش نیست

چوں نیست تاب برق تجلی کریم را — کے در سخن بہ غالب آتش بیاں رسد

اندریں شیوۂ گفتار کہ داری غالب — گر ترقی نکنی شیخ علی رامانی

شکایت روزگار

زندگی اپنی جب اس طرح سے گذری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے — خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

لوں وام بخت خفتہ سے اک خواب خوش ولے — غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

یہ نا امیدی یہ بدگمانی — میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں — جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل — دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

رشک و حسد

اضطراب بسمل از ما ترکتاز انہم فغاں — اضطراب بسملی و ترکتازے بودہ است
ما و درد و داغ و ہمکاران ما و برگ و ساز — درد و داغے بودہ است و برگ سازے بودہ است

خوشامد

اے کہ شائستہ آئی کہ ترا — جم و فغفور و سکندر گوئم
چوں نداری سر شعر ہی ناچار — حاکم و والی و داور گوئم
زاں نیارم کہ باندازۂ شوق — مدح نواب گورنر گوئم
چارہ آں است کہ چوں غمزدگاں — غم دل پیش تو یکسر گوئم
گہ ز بے مہری گردوں نالم — گہ ز ناسازی اختر گوئم

چوں تو دانی کہ چہ حالت است مرا — از ادب نیست کہ دیگر گویم
گویم ایں سال مبارک بادت — ویں دو صد سال برابر گویم

غالب کی مرغوب اشیا،

غالب من و خدا کہ سر انجام برشگال — غیر از شراب انبہ و برفاب قند نیست
ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد — غالب آں انبۂ انبالہ فراموش مباد

تعلقات خانگی کی ناخوشگواری،

زانجا کہ دلم بوہم در بند نبود — با ہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصود من از کعبہ و آہنگِ سفر — جز ترکِ دیار و زن و فرزند نبود

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری — دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
ایں گونہ کہ تند مے خرامی دانم — در خانہ زن ستیزہ خوئے داری

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود — از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو — نازم بخدا چرا توانا نبود

تصوّف،

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ہر چند سبکدوش ہوئے بت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر | یاں کیا دھرا ہے قطرۂ موج حباب میں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن | ہم کو تقلیدِ تنک ظرفی منصور نہیں

ہے وہی بدمستی وہر ذرہ کا خود عذر خواہ | جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے | ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی | ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

رضا بہ قضا،

کفر و دیں چیست جز آلائش پندار وجود | پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دیں تو شود
خرا بیم و رضائش در خرابی ہائے ما باشد | زچشم بد نگہدارد خدا ما دوست کاماں را

خلوص،

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ | دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود | خوش بود گر دانہ نبود دام را

وفاداری،

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے | مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا | رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائیگی | یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید | ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید | جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اپنی شاعری کے متعلق پیشگوئی،

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن — این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است — شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

مطرب از شعرم بہر بزمے کہ خواہد زد نوا — چاکہا ایثارِ جیبِ پیرہن خواہد شدن

حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت — دستگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

نفس شاعری کے متعلق پیشگوئی،

ہیچ میگویم اگر این است وضع روزگار — دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن

چشم کور آئینۂ دعویٰ بکف خواہد گرفت — دست شل مشاطۂ زلفِ سخن خواہد شدن

شاہدِ مضموں کہ اینک شہری جان و دل است — روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن

زاغ راغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں — ہم نوائے پردہ سنجانِ چمن خواہد شدن

انجام گیتی،

کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

شاد باش اے دل درین محفل کہ ہر جا نغمہ ایست — شیون رنجِ فراقِ جان و تن خواہد شدن

ہر فروغِ شمعِ ہستی تیرگی خواہد گزید — ہم بساطِ بزمِ ہستی پرشکن خواہد شدن

ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

گردِ پندارِ وجود از رہگذر خواہد نشست — بحرِ توحیدِ عیانی موجزن خواہد شدن

"بہادروں کے دل"

زمانۂ جنگ میں سپارٹا کی عورتیں اپنے مردوں اور بیٹوں سے کہا کرتیں "دوسروں کے سینے چیر ڈالو یا اپنے سینے چھلنی کرالو"۔ اِن الفاظ کے معنے یہ ہوتے 'فتح، یا موت'! اُن شجاعانِ قوم سے کسی قسم کی کوئی ہمدردی نہ کی جاتی۔ جو میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھاتے یا شکست کھا کر واپس آتے۔ سپارٹا کا ہر بچہ ان سے نفرت کرتا، انہیں بزدل اور غدار سمجھتا۔ شجاعت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مہد سے لحد تک ان کے کان یہی الفاظ سنتے "تخت یا تختہ"

۳۷۱ء (قبل مسیح) میں سپارٹا اور بوٹیا والے لیکیٹرا کے میدانِ جنگ میں صف آرا ہوئے، معرکۂ رستخیز گرم ہوا۔ مسلسل تین دن تک گھمسان کی لڑائی ہوئی، نتیجہ یہ ہوا کہ سپارٹا کے سینکڑوں سپوت مارے گئے، تین سو سپاہیوں نے میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کی، اور اہلِ بوٹیا فاتح تسلیم کئے گئے۔ جب یہ روح فرسا خبر سپارٹا پہنچی تو اس وقت وہاں قومی تہوار منایا جا رہا تھا، محفلِ رقص و سرود گرم تھی۔ حاکمِ وقت نے یہ خبر سنتے ہی شہدائے جنگ کے ناموں کا اعلان کیا، ان کے اعزا و اقربا کو مبارک دی اور انہیں حکم دیا کہ سوگوار نہ ہوں اور خوشیاں منائیں۔ لیکن جوان الیقراط کی بوڑھی ماں اپنے جذباتِ غم پر قابو نہ پا سکی۔ اس کے پڑوسی اس پر بہت تعجب کا اظہار کرتے اور آپس میں کہتے۔

"آخر افسوس کی کیا بات ہے۔ اس کا بیٹا بہادروں کی موت مرا ہے۔ اگر وہ میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کر کے اپنے آپ کو رسوا کرتا، تو یہ ایک رنج کی بات بھی ہوتی اور اس وقت اُس کی ماں کو حق پہنچتا کہ وہ غم کرتی۔"

بوڑھا فیڈن الیقراط کی ماں سے ملنے آیا۔ وہ نہایت انہماک سے چرخہ کات رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اور وہ کچھ اداس تھی۔ فیڈن ہر لحاظ سے سپارٹوی تھا۔ اس کی رگوں میں سپارٹوی خون دوڑ رہا تھا۔ اس نے بوڑھی آیٹوں کو سخت لہجہ میں مخاطب کیا اور کہنے لگا۔

"آیٹون! تمہاری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں گرنا چاہیے، تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم رنج کرو۔ رنج مجھے کرنا چاہیے، رونا مجھے چاہیے، جس کا پوتا آج پدرِ وطن کے کام نہیں آیا اور جو آج مفرورین میں شمار کیا جاتا ہے تمہارے سعادتمند بیٹے الیقراط کے ساتھ ملعون کلیاس نے جامِ شہادت نوش نہیں کیا، بلکہ آج وہ زندہ ہے، اور اس کی رسوائیاں اُس کے قابلِ احترام آبا و اجداد کے شاندار کارناموں کی بے توقیری کر رہی ہیں۔ میں اس

سے کس طرح ملوں گا؟ میں اس سے کس طرح مخاطب ہوں گا؟ - نہیں! ہرگز نہیں!! میں اس کی طرف تاکنے کا بھی روادار نہیں ہوں گا۔ میں اس کا خیر مقدم نہیں کروں گا۔ اس کے باپ کا وجود میرے لئے وجہ افتخار تھا۔ مجھے اس پر ناز تھا اور آج اُس کا بیٹا کلیاس میرے لئے وجہ ندامت بنا ہوا ہے۔ دیوتاؤں نے اس عمر میں مجھ پر ظلم کیا ہے۔ تم پر خاص عنایت کی۔ کیونکہ تمہارا القراط باعزت موت مرا۔ مگر میرا کلیاس بے عزت زندگی گذار رہا ہے۔ اس کے باپ نے ہمیشہ ملک معظم کے دوش بدوش لڑ کر اپنی شجاعت دی۔ اور آخر وقت تک انہی کی حمایت میں لڑتے ہوئے جان دی۔ میرے لئے یہ بات سرمایہ افتخار تھی۔ لیکن آج میں کلیاس پر فخر نہیں کر سکتا۔ کاش! زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا!"

آیٹون نے محسوس کیا کہ فیڈن کا غم اس سے بدرجہا زیادہ اور بہت قیمتی ہے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے اور فیڈن کو تسلی دینے کی کوشش کرنے لگی۔ القراط اور کلیاس بچپن کے ساتھ کھیلے تھے۔ اس لئے اسے کلیاس سے کچھ کم محبت نہ تھی۔ وہ بولی!۔

"فیڈن! یہ بھی تو ہو سکتا کہ دیوتاؤں نے کلیاس اور اس کے رفقا کی اس لئے جان بخشی کی ہو کہ وہ مستقبل قریب میں سپارٹا کی کوئی بڑی خدمت انجام دیں'

اُس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ وہ ان تسلی آمیز باتوں پر کان دھرنا نہیں چاہتا تھا۔ دن گذرتے گئے لیکن فیڈن اپنے فیصلہ پر سختی سے قائم رہا آیٹون اُسے روز سمجھاتی کہ کلیاس سے سختی سے پیش نہ آنا۔ وہ آگے چل کر ملک کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ فیڈن ان باتوں کو یونہی سن لیتا اور خاموش ہو جاتا . آیٹون نے کہا کہ۔

"تمہیں اُسے معاف کر دینا چاہیئے فیڈن! ممکن ہے وہ مستقبل قریب میں سپارٹا کی گرانبہا خدمات انجام دے"۔

لیکن بوڑھا فیڈن بڑی بے نیازی سے جواب دیتا۔ "نہیں آیٹون میں اس سے بولنے تک کا روادار نہیں ہو سکتا!"

ایک دن آیٹون نے خواب دیکھا کہ شاہ اجلاس نے عفو عام کا اعلان کر دیا ہے اور ان تمام سپاہیوں کی بھی جاں بخشی کر دی ہے جنہوں نے لیکٹرا کے میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کی تھی۔ اور فیڈن دارالعوام میں کھڑا

بڑے شد و مد سے اعلانِ شاہی کی مخالفت کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ میرا پوتا بھی اُن مفرورین میں سے ہے۔ لیکن سپارٹا اُسے معاف کر دے تو کر دے میں اُسے کسی حال میں معاف نہیں کر سکتا۔" دوسرے دن آیٹون نے اپنا خواب فیڈن سے بیان کیا اور کہا کہ میں نے تمام مفرورین میں کلیاس ہی کو سب سے زیادہ شکستہ خاطر اور پریشان دیکھا۔ وہ یکّا و تنہا تھا اور تمہارے اِس اعلان کی وجہ سے سب کی نگاہِ اذیت کا نشانہ بنا ہوا تھا۔

فیڈن نیچی نگاہیں کئے کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر اُس نے کہا "نہیں آیٹون، نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا میں کلیاس کی حمایت کروں گا۔ مجھے اس امید پر زندہ رہنا چاہیئے اور اسے بھی زندہ رہنے دینا چاہیئے کہ وہ کل سپارٹا کی کوئی اچھی خدمت کر سکے گا۔ میں اپنے دل کو سمجھالوں گا اور اس کا خیر مقدم کروں گا۔"

آخراً آیٹون کا خواب صحیح ثابت ہوا۔ شاہ اجلاس کا اعلان شائع ہوا کہ مفرورین کو معافی دی جاتی ہے۔ فیڈن اِس اعلان سے بہت مطمئن ہوا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ کلیاس کو ایک مرتبہ پھر دیکھ لے۔ آیٹون سے وہ کہنے لگا۔

"اب چونکہ سپارٹا نے اُسے معاف کر دیا ہے مجھے بھی معاف کر دینا چاہیئے۔ لیکن میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں اسے زیادہ پسند کرتا کہ وہ الیفراط کے پہلو میں خون میں لتھڑا ہوا میدانِ جنگ میں پڑا ہوتا۔ میرے لئے یہ بات بے حد غرور افزا ہوتی"۔

آخراً مفرورین کی جماعت سپارٹا پہنچ گئی۔ اُنہیں دیکھ کر اہلِ سپارٹا کے دل نرم پڑ گئے، مائیں، بہنیں اور بیویاں اپنے عزیزوں کے لئے چشم براہ ہو گئیں۔ لیکن آیٹون اپنے گھر میں بیٹھی چرخہ کاتتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں اب آنسو نہ تھے۔ اُس کا چہرہ غرور و مسرّت کے جذبات سے دمک رہا تھا، اُس کی خوشی بالکل خاموش تھی۔ اُس کا چرخہ یہ گیت گا رہا تھا

"میں خوش قسمت ماں ہوں"

یکایک دروازہ کھلا، فیڈن اندر داخل ہوا۔ اُس کے بشرے سے وحشت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بہت مضطرب نظر آتا تھا۔

"کلیاس ان میں نہیں ہے۔ میں نے اُس کے متعلق ہر شخص سے دریافت کیا! کیا اس معاملہ میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے ——" ایکبارگی دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی۔ آیٹون نے دروازہ کھولا تو اُس کے پڑوسی کا بیٹا پٹموس اندر داخل ہوا۔ اُس نے آیٹون کی طرف مخاطب ہوکر کہا

"میں لیکٹرا سے آرہا ہوں اور الیقراط کی ماں کی خدمت میں آداب بجالانے کی سعادت حاصل کرنی چاہتا ہوں میں نے الیقراط کو نہایت بہادری اور پامردی سے لڑتے اور زمین پر بے جان ہوتے دیکھا ہے۔ میں نے اُس کے سچے دوست کو بھی آخر وقت تک اُس کے دوش بدوش لڑتے اور اُس کے ساتھ ہی زمین پر ڈھیر ہوتے دیکھا ہے۔ آہ! وہ منظر بھی کس قدر ولولہ خیز تھا کہ دو دوست جنہوں نے زندگی کی ابتدا ایک ساتھ کی تھی، انتہا بھی ایک ہی ساتھ کی"

آیٹون کا چہرہ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اُس نے لرزتی ہوئی آواز سے پوچھا" وہ کون تھا جسے الیقراط کے ساتھ جام شہادت نوش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

جوان نے جواب دیا" کلیاس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے —— محترم خاتون! اب میں اجازت چاہتا ہوں تاکہ فیڈن کو یہ خبر سنا آؤں"۔

فیڈن یہ سنکر کھڑا ہوگیا۔ اُس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اُس کے انداز میں حسرت انگیز تغیر واقع ہو چکا تھا اُس نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ ہاں فیڈن نے یہ خبر سُن لی —— وہ بارگاہ سماوی میں سجدۂ شکر بجالاتا ہے کہ اُس کا سر بھی آج غرور سے آسمان تک اونچا ہو سکتا ہے۔ فیڈن کیلیاس کا بھولا چہرہ دیکھنے کا آرزومند ضرور تھا، مگر اس سے بڑھکر یہ آرزو اُس کے قلب کو سرشار کئے ہوئے تھی کہ وہ ملک و وطن کے نام پر اپنی جان عزیز قربان کردے۔ یہ اُس کی ترقیوں کا معراج تھا، اور شکر ہے کہ یہ اُسے حاصل ہوگیا"

اور اُس نے آیٹون کی طرف مخاطب ہوکر کہا" اب ہم دونوں اس خوشی میں شریک ہیں۔ کیا تم اس سرمایۂ فخر میں مجھے برابر کا حصہ دار نہیں بنا سکتیں"

آیٹون نے جواب دیا" ہاں، ہاں، بلا شبہ"

(ادارہ)

قانون معیار اخلاق ہے

(جناب شاہ ولی الرحمن بی اے۔ کاکوی)

قانونِ اخلاق پر اجمالی نظر

مسئلہ اخلاق کے مختلف معیاروں سے بحث کرنے میں اِن مسائل سے ابتدا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو فرائض وحقوق اور قوانین واجبات کے تخیل کو اساسی قرار دیتے ہیں۔ اخلاق کی جلوہ گری تین جداگانہ صورتوں میں ہوتی ہے +

(۱) بچوں کے لئے اخلاق احکام وتنبیہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے - چونکہ بچوں کے قوائے ذہنی تربیت یافتہ نہیں ہوتے اور نہ ان کی حیثیت ایک ذمہ دار فرد کی ہوتی ہے -اِس لئے ضرورت ہے کہ اخلاق وعمل کی تعلیم انہیں بجبر دی جائے- حقیقت لامر یہ ہے کہ والدین ومعلم کے احکام ونصائح پر کاربند ہونے میں اطفال اپنے جذبات خوف وتقلید کے زیادہ ممنون ہیں +

(۲) عہد شباب میں اخلاقی زندگی کو فلاح وبہتری سے تعبیر کیا جاتا ہے- یہ وہ زمانہ ہے کہ انسان کا دماغ کافی تربیت اور نشو ونما حاصل کر لیتا ہے اور یہ سمجھنے کی پوری قوت آجاتی ہے کہ اخلاق کی تکمیل و تہذیب سے کیا کیا فوائد عرصۂ حیات میں حاصل ہوتے ہیں۔ اور اس پر عمل کرنے سے کیا کیا لذت ومسرت محسوس ہوتی ہے +

(۳) ایام پیری میں اخلاقی زندگی دوسرا تخیل پیدا کر دیتی ہے۔ اس عہد میں انسان کامل انسان بن جاتا ہے - بادی النظر میں ایک تعجب خیز بات ہے کہ انسان کا انسان بن جانا، کیا معنی رکھتا ہے - مگر حقیقت یہ ہے کہ فلسفیانہ نقطۂ خیال سے ہر انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے -جیسا کہ فطرت انسانی کے مبصر مرزا غالب نے کہا ہے:-

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا   آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

چنانچہ انسان جب اس اعلیٰ رستہ پر پہنچ جاتا ہے ۔تو بجائے کسی دنیاوی ونفسی لذت ومسرت کے مقصود روحانی یعنی تکمیل نصب العین کو معیار اخلاق قرار دیتا ہے۔ پہلے نقطۂ نظر سے قانون نام ہے-

فرائض کی پابندی کا۔ اِس کی مزید توضیح یوں کی جاسکتی ہے +

اخلاقیات میں قانون سے کیا مُراد ہے؟

لفظ قانون میں ذرا پیچیدگی واقع ہے اور اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھنا ایک اہم کام ہے۔ قانون کی تعریف ذیل کے الفاظ میں کی جاسکتی ہے +

" ایک ہی نوعیت کے واقعات میں جو ایک اتحاد باہمی اور نسبت مشترکہ پائی جاتی ہے۔ اُس کے اظہار کا نام قانون ہے "

بالفاظ دیگر" قانون سے مراد ایک منظم اور مستقل ترتیب ہے جو الفاظ کے لباس میں پیش کی جاتی ہے"

قانون کے چار حسب ذیل اقسام ہیں :۔

۱- وہ قوانین جن کی شکست اور تبدیلی دونوں ممکن ہے +

۲- وہ قوانین جن کی تبدیلی ممکن نہیں۔ مگر شکست ممکن ہے +

۳- وہ قوانین جن کی شکست اور تبدیلی دونوں ناممکن ہے +

۴- وہ قوانین جن کی شکست ممکن ہے مگر تبدیلی ناممکن ہے +

(۱) پہلی قسم کی مثال قوانین ملکی ہیں، جنہیں سلاطین، ہیئت حاکمہ۔ اور قوم وضع کرتی ہے، اور جن کی تبدیلی ہر وقت ممکن ہے۔ اہل ملک ان کی نافرمانی کرسکتے ہیں اور دوسری قوم پر اُن کا اطلاق نہیں ہوتا +

(۲) دوسری قسم کے قوانین وہ ہیں جو نظام شمسی، شب و روز اور فصل و موسم وغیرہ سے متعلق ہیں یہ قوانین کبھی ٹوٹ نہیں سکتے۔ تاوقتیکہ وہ مخصوص شرائط جن پر اُن کا دارومدار ہے قائم و موجود ہیں۔ مگر جب وہ شرائط ہی بدل جائیں تو قوانین بدل سکتے ہیں۔ مثلاً اگر آفتاب سرد ہو جائے اور اس کی حرارت و تمازت جاتی رہے تو زمین پر دھوپ ہوگی نہ روشنی اور نظام عالم میں بہت زیادہ خلل واقع ہو جائے گا۔ اِسی طرح اقتصادیات کے اکثر قوانین اسی قبیل کے ہیں۔ ایسے قوانین کو قوانین مشروطہ کہتے ہیں۔ چونکہ ان کا قیام خاص خاص شرائط پر منحصر ہے جو برابر موجود ہیں اور تبدیل نہیں ہوتے +

(۳) تیسری قسم کے قوانین قوانین فطرت اور اصول قدرت ہیں، جو ازلی، اٹل، پائیدار اور

باہر ہے کہ ان میں دراندازی کر سکے*

(۴) چوتھی نوعیت کی مثال قوانین اخلاقی ہیں۔ جن کی شکست ممکن ہے، مگر تبدیلی محال ہے، یہ سچ ہے کہ اخلاق مخصوص اصول و آئین، مختلف شرائط حیات کے ساتھ بدل سکتے ہیں، مگر قوانین عام ہمیشہ یکساں ہیں اور ان کا اطلاق ہر قسم کے انسان پر ہی نہیں بلکہ ہر اس متنفس پر ہوتا ہے جو حیوان ناطق کہے جانے کا مستحق ہے۔ اگر دوسرے پردۂ عالم کا کوئی انسان ہم تک پہنچے تو اس کی حالت و طبیعت کا ہمیں کچھ بھی علم نہ ہوگا۔ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسے کونسی چیز تلخ اور کون سی شیریں معلوم ہوگی، یا کن کن چیزوں کو وہ نرم اور سخت بتائے گا۔ یا حرارت و رطوبت اور رنگ و آواز کا اس پر کیا اثر ہوگا لیکن ہمیں کم سے کم یہ جاننا چاہیئے کہ ہماری طرح اس کے نزدیک بھی کل اپنے جزو سے بڑا ہوتا ہے اور ہر واقعہ کا ایک سبب ہوتا ہے، اور ہماری طرح اسے بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے، اور بالقصد کسی کی جان نہیں لینی چاہیئے، اس قسم کے قوانین اخلاق غیر تلون پذیر اور مستقل ہوتے ہیں۔ ہاں ان کی شکست البتہ ہر انسان سے ممکن ہے۔ تاہم بعض ایسے قوانین اخلاق بھی ہیں۔ جن کی شکست بھی غیر ممکن ہے۔ مثلاً ایک معلم اخلاق اس حقیقت پر زور دے سکتا ہے کہ ہر معصیت ایک قسم کی تعزیر بھی اپنے ساتھ لاتی ہے جو اس کا غیر منفک جزو ہے، یہ ایسی حقیقت ہے جس سے مجال انکار نہیں۔ مگر دراصل یہ اخلاقی حقیقت نہیں بلکہ اس کا تعلق علم مابعد الطبیعیات سے ہے یہ کوئی قانون اخلاقی نہیں بلکہ عالم کائنات کی تنظیم کا ایک واقعہ ہے۔ اخلاقی قانون سے وہ باتیں مراد نہیں ہیں جو لازمی طور پر "واقع ہوتی ہیں" بلکہ جن کا وقوع لازمی "ہونا چاہیئے" اب یہ حقیقت بھی بے نقاب کر دینی چاہیئے کہ صرف اخلاقی قوانین ہی ایسے قوانین نہیں ہیں جو اس نوعیت کے ہیں بلکہ جتنے عملی و معیاری علوم ہیں۔ مثلاً علم فصاحت، علم طب، علم عمارت وغیرہ ان سب کے اصول و آئین کی یہی نوعیت ہے*

"ہے" "ضرور ہے" "ہونا چاہیئے"

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات معلوم ہوتی کہ انواع قوانین کی ترتیب یوں ہو سکتی ہے۔ بعض قوانین کسی امر کے محض وقوع کی خبر دیتے ہیں، بعض قوانین ان امور کا اظہار کرتے ہیں جن کا وقوع لازمی و ناگزیر ہے اور بعض قوانین ان باتوں کے متعلق ہیں جن کا وقوع ہونا چاہیئے ہم جنہیں قوانین فطرت کہتے ہیں۔ وہ کسی واقعہ کا محض سادہ عنوان ہیں۔ مثلاً قانون کشش جو یہ کہتا ہے کہ اجسام فلکی تعلق باہمی کے ساتھ اپنے محور پر حرکت کرتے ہیں۔ قوانین اقوام ان امور کا اظہار کرتے ہیں۔ جن کا وقوع

لازمی ہے۔ ورنہ اہل ملک بحالت عدم مطابقت مورد تعزیر ہوں گے، اسلامی قوانین ان امور سے بحث کرتے ہیں جن کا وقوع لازمی ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ ایک نصب العین کا اظہار ہے۔ مثلاً اگر سلطنت کسی جنگ کے اعلان کا تہیہ کرلے جس کو اہل شہر نامناسب قرار دیں تو بعض سپاہیوں کیلئے یہ خدمت ناجائز ہو سکتی ہے۔ یعنی اخلاق کا جو نصب العین انہوں نے قائم کیا ہے اس کے یہ خلاف ہے۔ یہاں اب قانون اخلاق اور قانون سلطنت میں تصادم ہوتا ہے۔ تاہم وہ اس خدمت سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، کیوں کہ سلطنت کی نافرمانی میں جان کا خطرہ ہے، اب فرض کیجئے کہ وہ اس جبری خدمت سے پہلو تہی کریں اور سلطنت کے حکم سے تہ تیغ کر دیئے جائیں تو ان کی یہ موت اصول فطرت کے مطابق ہوگی، وہ ہزاروں آفرین و مرحبا کے مستحق ہوں گے کہ جان دی مگر نصب العین اخلاق کا دامن چھوڑنا گوارا نہ کیا۔

امر مطلق

اب ہم حکیم عمانوئیل کینٹ (Emanuual Kant) کے مشہور و معروف زرین اصول کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں جو اُس نے اخلاقی قانون کے متعلق روشناس عالم کر دیا ہے۔ حکیم مذکور کہتا ہے، کہ جو قوانین فطرت کی یکرنگیوں کے محض سادہ بیانات نہیں ہیں وہ احکام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً قوانین اقوام وہ احکام ہیں جو سلطنت کی طرف سے نافذ ہوئے ہیں اور جو نافرمانی اور شکست کے ساتھ وابستہ ہیں، اخلاقی قوانین کو بھی ایک حیثیت سے احکام کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کے نفاذ کا استحقاق سردست خارج از بحث ہے اب یہ اَمر غور طلب ہے کہ احکام اپنی نوعیت میں مطلق و قطعی بھی ہو سکتے ہیں اور تخصیصات و شرائط کے ماتحت بھی۔ مثلاً ملکی قوانین وہ ہیں جن کی پابندی ہم پر فرض ہے ورنہ اسکی نافرمانی کے نتائج برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا پڑے گا۔ اسی طرح فصاحت کے اساسی اصول کو بھی احکام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مگر اس قسم کے احکام کا اطلاق صرف ... پر ہوتا ہے۔ اسی طرح نفسیات و منطق کے بعض قوانین بھی عالمگیر اور مستقل نہیں ہیں۔ لہٰذا ایسے حکم کو محض مشروط کہہ سکتے ہیں۔ ان کا اطلاق صرف ان افراد پر ہوتا ہے جو علوم مذکورہ کے مقصود پر کاربند ہونا چاہتے ہیں۔

دوسرے قوانین کے مقابلہ میں قوانین اخلاق کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ یہ غیر مشروط و مطلق ہیں۔ اعلیٰ اصول اخلاق ہم پر حکم مطلق و قطعی عائد کرتا ہے۔ جس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں جو ہمیں کرنا چاہیئے بلا تامل کرنا چاہیئے۔ اِس سے بلند تر کوئی قانون نہیں ہے جو اس امر اخلاقی کو پس

پشت ڈال دے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض قوانین ایسے ہیں جو بادی النظر میں مطلق و قطعی معلوم ہوتے ہیں، چونکہ ان کا تعلق ان مقاصد سے ہوتا ہے۔ جن کی تلاش و جستجو ہر انسان کو رہتی ہے مثلاً ہر شخص مسرور رہنا پسند کرتا ہے۔ پس اگر انبساط و مسرت کا کوئی عملی علم ہوتا تو ہر متنفس اس کے آئین و اصول کی پابندی کو فرض عین سمجھتا۔ اسی طرح کمال عقلی وہ مقصود ہے۔ جس کا خواہاں ہر متنفس ہوتا ہے پس اگر کوئی علم یہ بتاتا کہ کمال عقلی کا حصول کیوں کر ممکن ہے تو اس کے قوانین عالمگیر مقبولیت حاصل کر کے قواعد کلیہ بن جاتے۔ تاہم اس نوع کے قوانین اخلاقی قوانین کے مماثل نہیں ہیں۔ اگر وہ عالمگیر ہیں تو ان کی ہمہ گیری کا انحصار اس امر پر ہے کہ ہر شخص اس مقصود کو پسند کرتا ہے جو ان قوانین سے متعلق ہے۔ درآنحالیکہ قوانین اخلاق میں کسی کی پسند کو دخل نہیں ہے، ان کا اطلاق بلا استثناء ہر فرد بشر پر ہوتا ہے۔ ہاں اگر شادمانی کو نیکی سے اور حرماں نصیبی کو بدی سے وابستہ ثابت کیا جاتا تو قوانین مسرت کی پابندی کو بھی ویسی ہی اہمیت حاصل ہوتی جیسی اخلاقی قوانین کو ہے۔ مگر یہ صرف اسی وجہ سے کہ دونوں متحد و ہمرنگ ہو جاتے، اسی طرح کمال عقل کو بھی اخلاق قانون کے مماثل ثابت کر کے عالمگیر تصور کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسی حالت میں نوعیت بالکل بدل جاتی ہے لہذا اخلاقی قانون بے مثل و نادر ہے اور صرف یہی امر مطلق کہلانے کا مستحق ہے۔

یہاں تک تو کینٹ کے بیان کی پیروی ہوئی۔ اب اس میں دو باتیں قابل تنقید نظر آتی ہیں:۔ (۱) قانون اخلاق کو احکام کے زمرہ میں شامل کرنا ذرا غلط فہمی پر مبنی ہے، اگر اسے حکم یا امر کہیں تو اس کی نوعیت ہی بدل جائیگی۔ یعنی "ہونا چاہیئے" کہ دائرہ سے نکال کر اسے "ضرور ہے" (must) کے حلقہ میں شامل کرنا پڑے گا۔ برعکس اس کے یہ حقیقت ایک نصب العین ایک مقصود مطلق پر مبنی ہے۔

(۲) جب ہم اسے قطعی و مطلق کہیں گے تو یاد رکھنا چاہیئے کہ سردست صرف اس اصول کو مطلق کہہ سکتے ہیں، جب ہم جان لیں کہ کون سا امر صحیح ہے جس پر عمل کرنا فرض عین ہو جاتا ہے۔ اب یہ سوال درپیش ہے کہ وہ کونسا قانون ہے جس کی پابندی بلا شرط و غایت فرض ہے۔

فصل دوم: قانون اخلاق کے مختلف نقطہائے نظر

قانون قبیلہ

قدیم ترین صورت جس میں قانون کا تخیل ظاہر کیا گیا ہے وہ قبیلہ یا امیر قبیلہ کا قانون ہے مگر اسے

قطعی و مطلق نہیں کہہ سکتے چونکہ اکثر خود اس قانون میں تصادم پیدا ہو جاتا ہے اور شعور عقلی کا مطالبہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ مستقل و مطلق قانون پیش کیا جائے اسی طرح سے بعض فلاسفہ کی رائے میں اخلاق توانین سلطنت کی پابندی میں مضمر ہے یعنی معیار اخلاق وہ قوانین ہیں جنہیں قوم وضع کرتی ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ اخلاق جماعت یا رائے عامہ پر منحصر ہے۔ صحیح وہ ہے جسے جماعت اچھا سمجھتی ہے اور غلط وہ ہے جسے جماعت برا سمجھتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کا معیار اس سے بلند تر ہے۔ سیاسی و اجتماعی قوانین درحقیقت عالمگیر اور پائیدار نہیں ہیں بلکہ اکثر حالتوں میں بدل جاتے ہیں۔ خصوصاً جماعت کے عادات اور اطوار جو کسی زمانہ میں قابل قبول سمجھے جاتے ہیں، امتداد زمانہ سے کسی وقت میں ناقص و غیر مفید خیال کئے جاتے ہیں لہٰذا ان سے مستقل و کامل معیار اخلاق کا انجام پانا ممکن نہیں ہے ۔

قانون الٰہی

بعض حکماء کی رائے میں قانون الٰہی صحیح و کامل معیار اخلاق ہے یعنی خدا کی مرضی کے مطابق جو نور فطرت یا بذریعہ وحی کے ذریعے انسان تک پہنچتی ہے مستقیم و افضل معیار اخلاق ہے افعال محض اس بنا پر صحیح یا غلط قرار دیئے جاتے ہیں کہ خدا نے ان کے جواز یا عدم جواز کا حکم دیا ہے ایسے قوانین کی بہترین مثال یہودیوں کے "احکام عشرہ" میں مضمر ہے۔ مگر ان میں بھی اکثر تصادم پیدا ہو جاتا ہے اس کے علاوہ شعور اخلاقی کی طرف سے یہ سوال پیش ہوتا ہے کہ قانون الٰہی کی سند کا انحصار کس پر ہے۔ اگر یہ صرف قادر مطلق کے حکم پر مبنی ہو تو یہ بھی صحیح اخلاقی قانون کے معیار پر کامل نہیں اترتا، ایک اور دقیق اعتراض جو اس نظریہ پر صادر ہوتا ہے یہ ہے کہ اس مسئلہ کی رو سے فضائل اخلاق کے حصول کی فکر حور و غلمان اور روضۂ رضوان کے طمع پر مبنی ہے اور انسان معاصی و معائب اخلاق سے اس لئے احتراز کرنا چاہتا ہے کہ آتش دوزخ کی گوناگوں سزاؤں سے محفوظ و مامون رہے اور حوران جنت کی ہم نشینی کا مستحق بنے۔ حالانکہ فضائل، خدائی تہذیب و تکمیل جنت کی امید و بیم پر مبنی نہیں ہے ؂

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے (اقبال)

لہٰذا قانون الٰہی، قانون اخلاق سے مختلف ہے ۔

قانون فطرت

اکثر فلاسفہ کے خیال میں سب سے زیادہ اساسی قانون اشیائے عالم کی فطرت میں مضمر ہے۔ یونان کے علم الاخلاق میں فطرت کے تصور کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یونانیوں کے خیال میں فطرت سے اشیاء کا باطنی عنصر و جوہر مراد ہے۔

جو صور ظاہر کے اندر پوشیدہ ہے اس معنی میں فرقۂ رواقیہ نے اپنا مشہور و معروف قول "مطابق فطرت زندگی بسر کرنا" ظاہر کیا۔ عہد موجودہ میں بھی قانون فطرت کے تخیل سے بہت سے نکات پیدا ہوئے سیموئل کلارک (Samual Clarke) نے اِس مسئلہ پر شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ حکیم موصوف کی رائے ہے کہ اشیائے عالم کے مابین بعض اختلافات و تعلقات خود اشیا کی فطرت میں مضمر ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص غور و انصاف سے ان پر نظر ڈالے تو ان اختلافات و تعلقات سے واقف ہو سکتا ہے" فطری و اخلاقی امور کے اختلافات و تعلقات جن سے تمام ماہرین نفسیات کو بالطبع اتفاق ہے، قطعی غیر متلون اور حقیقی ہیں اور خود اشیاء کے اندر پائے جاتے ہیں" جس طرح سے ہر انسان برف کی سفیدی اور آفتاب کی چمک کو تسلیم کر لیتا ہے، اسی طرح سے جتنے قوانین فطرت بے نقاب ہوئے ہیں، ان سے انسان کی عقل ہر جگہ لازمی و قدرتی طور پر اتفاق کرتی ہے۔ یہیں پر ہمیں مشہور مسئلہ تناسب اشیاء کا پتہ ملتا ہے۔ لیکن اس طرح کے بیانات جو نظریہ اخلاق کی بنیاد سمجھے گئے ہیں، بیّن طور پر پیچیدہ اور مبہم معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فطرت میں قوانین و اصول ہیں مگر یہ صرف یکساں طریقوں کے بیانات ہیں جن میں اشیاء واقع ہوتی ہیں اور ایسے قوانین خیر و شر دونوں کا مظہر ہیں۔ بلاشبہ اجرام فلکی کی حرکات مطابق فطرت ہیں۔ اسی طرح گولہ باری سے کسی عمارت کا منہدم ہو جانا بھی "تناسب اشیاء" کے مطابق ہے چونکہ اصول فطرت کے رو سے ایسا ہوا بہر صورت جس مفہوم میں یہ مسئلہ مسائل اخلاقی کی بنیاد قرار دے دیا جائے ہر حال میں اس کا اطلاق کسی مقصود و نصب العین پر ہونا چاہیئے اور کوئی کیمیا دان محض قوانین فطرت کے مطالعہ سے اس کا استنباط نہیں کر سکتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ قانون فطرت کو بھی کسی طرح قانون اخلاق کی بنیاد نہیں کہہ سکتے +

حاسۂ اخلاقی

خارجی اصول یعنی قوانین فطرت اور شعور انسانی میں جو ایک تعلق پایا جاتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان کی پابندی یا مطالعہ سے ہمارے نصب العین کی تکمیل ہو سکتی ہے ہم میں ایک فطری قوّت احساس ہے جو بعض چیزوں کو ردّ کر دیتی ہے یہ خیال حاسہ اخلاقی کے تصور تک رہبری کرتا ہے۔ حاسۂ اخلاقی، اِدراک باطنی کی وہ قوّت ہے جو افعال کے اخلاقی صفات کو فوراً شناخت کرتی ہے، یہ نقطۂ نظر یونانی فلسفہ کے اس تخیل سے مشابہ ہے کہ حسن اور خیر در اصل ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ چنانچہ رواقیہ کا قول ہے کہ صرف "حُسن" یعنی اخلاقی افضلیت ہی کا نام خیر ہے۔ حکیم ہربرٹ سپنسر نے بھی حسن و خیر کے ہم معنی

ہونے پر بیحد زور دیا اور اخلاقیات کو جمالیات کا ایک شعبہ قرار دیا - اس مسئلہ کا موجد شیفٹسبری (Shaftesbury) ہے - اس کی رائے ہے کہ جس طرح جمالیات میں حسن و قبح کی تمیز وجدانی و ذوقی شئے ہے، اسی طرح اخلاقیات میں بھی صحیح و غلط کا امتیاز اشراقی ادراک پر مبنی ہے حکیم موصوف کے نظریہ کا یہ مطلب ہے کہ صاحب فضیلت ہونا دراصل فنون لطیفہ کا ماہر ہونا ہے - مذاق صحیح و وجدان سلیم ہماری رہنمائی کرتا ہے "صحیح معنی میں فلسفیانہ استدلال کرنا اچھی تربیت کو ایک قدم اور آگے بڑھانا ہے"

واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کی سیرت مکمل اور مہذب ہو جاتی ہے تو قانون اخلاق کی پابندی کی عادت طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے - یہاں تک کہ صحیح کا انتخاب اور غلط سے احتراز ایک قسم کی جبلت میں داخل ہو جاتا ہے، اس نقطۂ نگاہ سے یہ نظریہ قائم کرنا نہایت صحیح معلوم ہوتا ہے کہ حاسۂ اخلاقی ایک قسم کا مذاق سلیم ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ حسن کا احساس رستی کے احساس کی طرح قابل تصریح و تنقید ہے - اگرچہ عموماً کہا جاتا ہے کہ "ذوق کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے" تاہم ہماری عادت ہے کہ ہم اس کے متعلق بحث کرتے ہیں اور اسے صحیح یا غلط بتاتے ہیں - اس حد تک تو ذوق اخلاق، ذوق جمال کے مماثل ہے اور اسے احساس سے تعبیر کرنا صحیح ہے - مگر چونکہ یہ محض ایک پیچیدہ و مبہم احساس نہیں ہے بلکہ عقلی تشریح کے قابل ہے اسلئے کوئی اخلاقی نظریہ جو اسے محض حاسہ سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی تشریح کی کوشش نہیں کرتا ہے مستقل و مستند نہیں کہا جا سکتا - علاوہ بریں جس چیز کی تشریح ہو سکتی ہے اس کی تنقید بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بعض اشخاص کا ذوق جمال کامل ہے اور بعض کا ناقص ہے - اسی طرح جب اخلاق کے احساس کی تشریح ہو سکتی ہے تو قدرتی طور پر یہ ممکن ہے کہ مختلف افراد و اقوام کے اخلاقی ذوق پر رائے زنی کی جائے پس ان وجوہ سے اخلاقیات کا وہ سلسلہ جو حاسۂ اخلاقی کے تخیل تک محدود ہے مشکل سے قابل اطمینان کہا جا سکتا ہے - مگر حقیقت یہ ہے کہ شیفٹسبری نے حاسۂ اخلاقی کو اخلاقیات کی تشفی بخش بنیاد نہیں تسلیم کیا - بلکہ فطرت انسانی کو بہ حیثیت اجتماعی ہستی کے اس کا موجب ثابت کرنے کی کوشش کی - اُس کا خیال تھا کہ اخلاق، مذاق سلیم کے نزدیک، وہ قابل تسلیم فعل ہے، جو تمام جماعت کے حق میں مفید ہے اور کثیر التعداد جماعت کی اعلٰے مُسرّت و انبساط کا باعث ہے جس بات پر اس نے زور دیا - وہ یہ تھی کہ اس اصول پر غور و خوض کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چونکہ یہ بالطبع ہر ذوق سلیم و وجدان صحیح میں

مضمر ہے +

اشراقیت

اشراقیت (Intuitionism) سے عموماً یہ نظریہ مراد ہے، کہ افعال اپنے خارجی اغراض ومقاصد کے لحاظ سے نہیں، بلکہ خود اپنی باطنی فطرت کے مطابق صحیح یا غلط قرار دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً راست گوئی محض اس بنا پر ایک فرض نہیں تسلیم کی جائے گی۔ کہ اجتماعی مفاد ومصالح یا خارجی اسباب کے لئے لازمی ہے بلکہ صرف اس بنا پر کہ یہ بالذات صحیح واحسن ہے۔ اشراقیین کی رائے ہے کہ افعال کی صحت وغلطی محض سرسری مطالعہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ غور کرنے کی مطلق ضرورت نہیں ہے کہ خارجی مقاصد سے ان کے تعلقات کیا کیا ہیں۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ لفظ اشراقیت کے استعمال میں ذرا پیچیدگی واقع ہے محدود معنی میں اس سے وہ مسئلہ مراد ہے جو ہمارے اخلاقی فیصلوں کو ایک قسم کی مجمل ومبہم اشراقی ادراک سے وابستہ بتاتا ہے۔ جس کی عقلی توجیہ ممکن نہیں ہے۔ اگر اس اصطلاح کو تسلیم کیا جائے، تو کنیٹ، کلارک اور ولسٹن وغیرہ اشراقیین نہیں تھے، کیوں کہ کنیٹ کے مطابق اخلاقی فیصلوں کا دارومدار عملی عقل پر ہے نہ کہ ادراک پر۔ مگر وسیع مفہوم میں حکمائے مذکور کو اشراقیین کے گروہ میں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ کو مختلف فلسفیانہ لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت و تصریح اخلاقیات وفلسفہ میں ملے گی۔ یہاں پر صرف ضروری نکات کو جاننا کافی ہے +

اگر اس اصطلاح کے محدود معنی لئے جائیں تو اشتراقیت سے وہ مسئلہ مُراد ہے، جو افعال کے اخلاقی فیصلوں کو ضمیر کی عدالت کی طرف رجوع کرتا ہو۔ جس کی خاموش ہدایت میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ جب ضمیر کو اخلاق کا اساسی اصول قرار دیا جاتا ہے تو اس سے زید وبکر کا مخصوص ضمیر مُراد نہیں ہے کیونکہ ایک فرد کا ضمیر یہ بتاتا ہے کہ اُس نے جو اپنا معیار اخلاق قائم کر لیا ہے، اُس کے افعال اس کے مطابق یا مخالف ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر یہ معیار ناقص ہے تو ضمیر میں بھی وہی نقص پیدا ہو جائے گا ——— رسکن (Ruskin) کے الفاظ میں اس کا ضمیر "ضمیر خر" کی مانند ہے۔ جس شخص کا عمل اس کے ضمیر کی ہدایت کے مطابق نہیں ہے، صریحاً غلط ہے کیونکہ وہ خود اپنے معیار راستی کی پیروی نہیں کرتا۔۔۔۔ لیکن انسانوں کا فعل وعمل ہدایت ضمیر کے مطابق ہونے کے باوجود غلط ہو سکتا ہے چونکہ اس کے معیار میں نقص ہے جو شخص ناقص وغلط معیار کے مطابق اپنے ضمیر کی ہدایت پر عامل ہے اسے عموماً غالی اور متعصب (Fanatic) کہتے ہیں +

کینٹ بٹلر اور اکثر اشراقئین نے ضمیر کو اعلیٰ اصول اخلاق سے تعبیر کیا ہے - اس سے حکماء مذکور کا مطلب یہ ہے کہ افعال کی صحت و غلطی کا ادراک انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، مگر بعض لوگوں میں بدرجہ اتم اور زیادہ کامل ہے اور بعض میں کم - یہ قوت ادراک اکثر حس مشترک سے تعبیر کی جاتی ہے، جس کا وجود عالمگیر ہے اور ہر حیوان ناطق میں کم و بیش موجود - ہے*

بعض فلاسفہ نے حس مشترک کے اصول کو محض چند حقائق اخلاق سے تعبیر کیا ہے جو شعور انسانی میں مضمر ہے - مگر یہ نقطۂ خیال قابل اعتراض ہے - یہ اس اصول سے متصادم ہو جاتا ہے جو حس مشترک کے اصول سے زیادہ عمیق ہے - مثلاً وہ اصول یہ ہے کہ عالم کائنات ایک عقلی نظام ہے جس کی توجیہہ قطعیہ اجلاس عقل کے روبرو بیان کی جاسکتی ہے - اگر یہ اصول غلطی پر مبنی ہو تو یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ کسی اور اصول کا وجود بھی ہے - جس کی عالمگیر صحت کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے - ضمیر کو بنیاد اخلاق کہنا اور بھی نا قابل اطمینان ہو جاتا ہے - جب ہم یہ قطعی اندازہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کون کون سے آئین و اصول اس سے وضع ہو سکتے ہیں ضمیر کے اصول و آئین مختلف زمانوں اور ملکوں میں اکثر تبدیل ہوتے رہتے ہیں - اور غیر معتبر سمجھے جاتے ہیں - اس سے پتہ چلتا ہے کہ حاسۂ اخلاقی کوئی اندھی قوت نہیں ہے - اور اس کے قواعد و اصول جو ہماری ہدایت کرتے ہیں عقلی توضیح و تنقید پر مبنی ہیں - اس لئے بارگاہ عقل سے اسے قوت ممیز کا موزون لقب ملا ہے - یعنی وہ قوت جو غور و خوض کے بعد راست و غلط اور نیک و بد میں تمیز کرتی ہے، لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ ضمیر کے پس پردہ ایک اور ضمیر ہے یہ وہ قوت فیصلہ ہے جو محض دل کے اندھے قانون سے ارفع و اعلیٰ ہے*

قانون عقل

جس طرح کینٹ کی رائے میں عقلی حقیقت کے چند اصول ہیں جو تمام عاقل و ذہین نفوس کی فطرت سے وابستہ ہیں - اسی طرح اخلاقی حقیقت کے بھی چند عالمگیر آئین ہیں - اور جس طرح عقلی زندگی کے کیٹاگوریز (Catagories) خیال ہی کی سرشت سے اخذ کئے جاتے ہیں - ویسے ہی حیات اخلاقی کے اصول بھی عقلی استنباط کے مستحق ہیں - عقلی زندگی کے اصول ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو غور و مطالعہ کے بعد اصول ریاضی اور اصول منطق کی طرح صحیح و روشن معلوم ہوں مثلاً دو اور دو چار ہوتے ہیں یا " یہ واقعہ کا ایک سبب ہوتا ہے" اس پر بھی مزید غور و فکر کے بعد ان اصولوں کے قطعی و یقینی ہونے کا اعلان محتاج ثبوت

د توجیہ ہوسکتا ہے - اگر ایسا ہو تو شعور اخلاقی کی ہدایت درحقیقت عقلی معاینہ کی رہین منت قرار دی جائے
یا عقل اخلاقی کا منظہر سمجھی جائے - یہ بعض اشراقیین کا نظریہ ہے جس کا سرگروہ سیموئیل کلارک ہے اس
معنی میں قانون عقل اور مذکورہ بالا قانون فطرت میں بہ مشکل تمیز ہوسکتی ہے چنانچہ رواقیین اور اُن کے
متبعین نے قانون فطرت کو قانون عقل سے تعبیر کیا ہے - اِس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے فطرت کو ایک
گونہ نظام عقلی قرار دیا ہے +

جب اخلاقی اصول کی بنیاد قانون فطرت پر رکھنی غیر موزون ثابت ہوئی تو اس دائرہ خیال کے علما
نے اب اس حقیقت کی تائید کی کہ درحقیقت قبلۂ مقصد صرف قانون عقل ہے - لہٰذا جس طرح مذہب حاسّہٴ
اخلاقی جمالیات کا مماثل سمجھا جاتا ہے - اسی طرح علم الاخلاق علم منطق پر مبنی قرار دیا جاتا ہے والٹن جو کلارک کا
شاگرد ہے اس خیال کا بدرجہ اتم موید ہے " والٹن کی رو سے معائب اخلاق انکار حقیقت کو اور محاسن اخلاق
اقرار حقیقت کو کہتے ہیں - چوری کرنا گناہ ہے چونکہ دزدیدہ شئے کے غیر کی ملکیت ہونے سے انکار کرنا ہے
لہٰذا ہر فعل صحیح اقرار حقیقت ہے اور ہر فعل غلط انکار حقیقت ہے" اسٹفین (Stephen) کہتا ہے
" تیس برس کے زبردست مراقبہ کے بعد والٹن کی سمجھ میں آیا - کہ انسان اپنی . . . بیوی کے سر پھوڑنے کو
اِس لئے برا سمجھتا ہے کہ یہ ایک قسم کا انکار کرنا ہے کہ وہ اس کی اپنی بیوی ہے بالفاظ دیگر" ہر معصیت کذب گوئی
ہے" اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اُس کے یہ معنی ہیں کہ اُسے اس غریب کے انسان اور ذی روح ہونے
سے انکار ہے اور اخلاقی رو سے بُرائی اس جرم میں شامل نہیں ہے کہ اس نے اپنے ایک بھائی کی جان لی بلکہ
اس امر میں مضمر ہے کہ اُس نے ایک حقیقت کا عملی انکار کر دیا" یہ ایک جرم سے بھی بدتر ہے، یہ ایک انتہائی
غلطی ہے" اس نقطۂ خیال کی سوفسطائیت روشن ہے - خراب فعل بے اصول ضرور ہے - مگر واقعہ کے
متضاد نہیں ہے بلکہ ایک اہم نصب العین کے مخالف ہے وہ نصب العین یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان
اخوت کا نازک رشتہ قائم ہے - جس کو توڑنا ایک بدترین جرم اخلاق ہے +

لیکن کنیٹ کا تخیل اس سے بلند تر ہے جو وضاحت و تصریح کے ساتھ بیان کئے جانے کا مستحق ہے
انشاء اللہ اس پر پھر کبھی بحث کی جائے گی +

رستم پاشا

(جناب سید نصیر احمد صاحب)

صفدر اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ مکھیاں اُس کے ارد گرد اُڑ رہی تھیں [illegible] کے پاس کی صحن کی طرف اُس کی بیوی بظاہر کسی دوسرے کام میں مصروف تھی لیکن اُس کی نگاہیں برابر صفدر کی طرف تھیں۔ اگرچہ صفدر کی آنکھیں کتاب پر تھیں لیکن اُس کا دل کہیں اور تھا۔ پریشانی اُس کے چہرہ سے صاف عیاں تھی۔ وہ کبھی کبھی بے اختیار ہو کر چھت کی طرف دیکھنے لگتا، جیسے کسی بھولی ہوئی چیز کو یاد کر رہا ہو۔ کبھی اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتا۔ اس کی بیوی اپنے شوہر کی ان حرکات کا بغور مطالعہ کر رہی تھی آخر اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

"آپ کس خیال میں محو ہیں"

"کسی خیال میں نہیں۔ کل عدالت میں جانا ہے"

"ہاں۔ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن آپ کے خلاف کیا شکایت کی گئی ہے"

"یہ تو ابھی طرح معلوم نہیں کل میں نے غلام رسول کو پیٹا تھا شاید یہی الزام ہو" صفدر نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"خیر وہ تو کچھ نہیں۔ لیکن شاید رستم پاشا والا معاملہ ہو۔"

اس بات نے صفدر کے دل میں ایک جوش پیدا کر دیا۔ "رستم پاشا! رستم پاشا!!" اس کی زبان سے کئی مرتبہ نکلا۔ "میرا پیارا گھوڑا! میری جان سے زیادہ عزیز گھوڑا۔ آہ رستم!"

بغیر کچھ کہے وہ اُٹھا اور مکان سے باہر نکل گیا۔ اُس وقت شام ہو چکی تھی۔ ہواؤں میں کسی قدر خنکی آ گئی تھی۔ باہر کا منظر نہایت دلفریب تھا۔ اس کے مکان کے پاس ہی اُس کے کھیت تھے اور ایک باغیچہ بھی تھا۔ باغیچہ میں صفدر بہت دیر تک ٹہلتا رہا۔ بالکل خاموش۔ اُس کے چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ آخر وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ آج سے چند سال پیشتر کے واقعات اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔

صفدر کو وہ دن ابھی تک یاد تھے جب گاؤں سے [illegible] گاؤں میں آ کر ایک چھوٹی سی [illegible] کرنے کی چیزیں تیار کرنا شروع کی تھیں۔ اُسی وقت سے گاؤں کے باشندے [illegible]

ہر شخص گاماں کی دوکان سے چیزیں خریدا کرتا اتنی دور شہر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اُس وقت رستم پاشا کی عمر صرف تین برس کی تھی۔ گاماں ہر شخص سے اچھی طرح پیش آتا۔ سب کو جُھک کر سلام کرتا۔ انکساری اور خاکساری کی اس نے انتہا کر دی تھی۔ لوگوں کو چیزیں قرض دے کر اپنا گرویدہ کر لیتا۔ چھوٹے بڑے اُس کی تعریف کرتے۔ "تمہیں کیہ ان کی ضرورت ہے" وہ اکثر کہا کرتا "اچھا لے جاؤ"! واہ! واہ پھر دیدینا" لوگ اس کے جال میں آسانی سے پھنس جاتے۔ ایک سال کے بعد اس کا بہی کھاتہ ان معمولی رقموں سے بھر جاتا۔

سب گاؤں والے شادی بیاہ کے موقعہ پر گاماں ہی سے قرض لیتے۔ بلا شبہہ وہ بارہ فیصدی سود مانگتا تھا لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ روپے کی ضرورت کس کو نہیں ہوتی۔ اور صفدر کو سب سے زیادہ تھی۔

لیکن چار سال کے بعد کیا ہوا! گاماں جو پہلے سب کا خادم تھا اب آقا بنا ہوا تھا۔ وہ اب اکڑ کر چلتا تھا۔ لوگ اُسے سلام کرتے تھے۔ گاماں سے وہ اب چودھری غلام رسول بن گیا تھا۔ ڈنکے کی چوٹ کھیتوں سے کسانوں کا غلہ سارا کا سارا اُٹھوا کر لے جاتا۔ بہت سی زمینیں اُس کی ہو گئی تھیں۔ کئی مکان اُس کی ملکیت میں تھے اور دولت تھی کہ چھپّر پھاڑ کر اس کے ہاں آتی تھی۔

سب سے زیادہ تکلیف صفدر کو پہنچتی تھی۔ ان دونوں کے مکان اور کھیت ایک دوسرے سے ملتے تھے صفدر قرض کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اُس کے بدن سے اُس کا گوشت نوچا جا رہا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس قرض سے نجات پانے کے لئے میں بھیک مانگنے کو تیار ہوں۔ اس فکر سے راتوں کو سوتا نہیں تھا۔ اُس کا مُنہ ذرا سا نکل آیا تھا۔

اس مصیبت ابتلا کے زمانہ میں اُس کا ایک مددگار تھا ——— رستم پاشا! اس زمانہ میں اُس کی عمر چھ سال کی تھی۔ رستم پاشا کتنا پیارا گھوڑا تھا۔ اُس کی کھال سلک کی طرح تھی۔ سانچہ میں ڈھلا ہوا جسم۔ اُس کی لانبی سیاہ دُم چوڑا چکلا سینہ۔ ان سب خوبیوں کے علاوہ اُس کی طبیعت بہت اچھی تھی۔ نہایت فرمانبردار اور اطاعت گزار تھا۔ چابک کی ایک ہلکی سی ضرب بھی اُس کے لئے ذلت تھی۔ کیسی شاہانہ چال سے چلتا تھا۔ شام کو پیار اور محبت سے صفدر کے ہاتھ چاٹا کرتا تھا۔ میدان میں لے جایئے، دشوار گذار راستوں میں لے جایئے۔ دن ہو رات ہو کبھی ڈرتا نہیں تھا۔ تمام لوگ اس بات پر متفق تھے کہ اس صوبہ میں ایسا گھوڑا شاید ہی کہیں ہو۔

جب غلام رسول صفدر کو زیادہ تنگ کرنے لگا اور عدالت کی دھمکی بھی دی تو اس نے رستم پاشا کو اصطبل سے کھولا اور کسی مشہور وکیل سے مشورہ لینے کے لئے میرٹھ روانہ ہوا۔ اُس کا خیال ہی نہیں بلکہ ایمان تھا کہ اُس کے ذرا اتنی

بڑی رقم کبھی نہیں ہو سکتی"۔ تمباکو، چائے اور شکر ان چیزوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ بیٹے کی شادی پر اُس نے کچھ روپیہ قرض ضرور لیا تھا۔ لیکن یہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ یقیناً چودھری کے حساب میں کچھ غلطی تھی۔

صفدر کو یہ سفر بھی اچھی طرح سے یاد تھا۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ کہر بھی چھا رہا تھا۔ اس سے سخت سردی معلوم ہوتی تھی لیکن اس کا گھوڑا شان سے چلا جا رہا تھا۔ جیسے اُسے کسی چیز کا احساس ہی نہیں جب وہ میرٹھ سے ایک میل کے فاصلہ پر تھا تو اُس نے اپنے پیچھے قریب ہی ایک گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سنی گاڑی جلد ہی اُس کے پاس پہنچ گئی اور ایک آدمی نے جس کے لباس سے اُس کی شان ظاہر ہوتی تھی صفدر کو گھوڑا روکنے کا اشارہ کیا۔

"بندگی"۔ اجنبی نے کہا "یہ آپ کا گھوڑا ہے۔ میں نے اسے دور سے دیکھا تھا۔ بہت پسند آیا۔ اس لئے آپ کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ یہ آپ نے کہاں سے لیا۔ کس نسل سے ہے۔ عمر کیا ہوگی۔ ذرا اس کے سینہ کو دیکھنا"۔

یہ کہتے ہوئے اجنبی اپنی گاڑی سے اُترا تاکہ قریب سے رستم پاشا کو اچھی طرح سے دیکھے۔

صفدر دل میں بہت خوش ہوا اور ان سوالوں کا مناسب جواب دیا۔

"بہت اچھا گھوڑا ہے" اجنبی نے پھر کہا "ہفتہ عشرہ کے بعد چھاونی کے پاس گھوڑ دوڑ ہے، آپ ضرور آئیے۔ آپ کا فرض ہے۔ میرا نام کپتان ہیرا سنگھ ہے۔ میرا خیال ہے آپ اوّل انعام حاصل کریں گے۔ پہلا انعام ایک ہزار روپے کا ہے"۔

صفدر نے گھوڑ دوڑ میں شامل ہونے کا وعدہ کیا اور کپتان سے رخصت ہوا۔ بات کی بات میں رستم پاشا کپتان کی خواہشمند نظروں سے غایب ہو گیا۔

صفدر نے اپنا گھوڑا گھوڑ دوڑ میں شامل کرایا۔ کتنے اچھے دن تھے۔ کامیاب دن۔ رستم پاشا اور اُس کے مالک کی کتنی عزت تھی۔ ہر اخبار میں رستم پاشا کی تعریف چھپی اور ہر وار رستم پاشا کی جیتنے کے تار دیئے گئے۔ اس نے بڑے بڑے اور پرانے گھوڑوں کو شکست دی تھی۔ وہ وقت یاد کر کے اب بھی صفدر کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی تھی۔ اسے وہ دن یاد تھے جب بینڈ باجا بجتا ہوتا تھا لوگ جمع ہوتے تھے اور طرح طرح کی دلچسپیاں رہتی تھیں لیکن دنیا ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ ہر کمال کے لئے زوال ضروری ہے۔ صفدر کے واسطے یہ انتہائی عروج و کامرانی کے دن تھے۔

کسی وکیل نے بھی قرض کے متعلق صفدر کی ہمت نہیں بڑھائی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہی عدالت سے مقدمہ

کا یکطرفہ فیصلہ ہو چکا تھا۔ صفدر کو سارا روپیہ اصل اور سود دینا لازمی تھا نہیں تو جیل خانہ کی ہیبت ناک کوٹھریاں اُس کے انتظار میں تھیں۔ اب وہ کیا کرے۔ کھیتوں اور باغیچہ کو اگر بیچتا ہے تو کھائے گا کہاں سے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ جان سے زیادہ عزیز رستم پاشا کو فروخت کر دے۔ چند روز کی دوڑ دھوپ کے بعد یہ معاملہ بھی طے ہو گیا اور میرٹھ کے ایک مشہور سوداگر نے یہ گھوڑا خرید لیا۔ صفدر گھر واپس لوٹا۔ لیکن پریشان۔ مجنون۔ غصہ سے اُس کی زبان بند تھی۔

وہ سیدھا غلام رسول کی دوکان پر گیا۔ اُس کو روپے دیئے۔ کاغذات وغیرہ لے کر جیب میں ڈال لے۔ لیکن زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ اس وقت سے ان دونوں میں سخت دشمنی ہو گئی۔

اب صفدر قرض سے آزاد تھا لیکن رستم پاشا کے بغیر یہ آزادی فضول تھی۔ اس کی لبوں پر سے ہنسی مفقود ہو گئی تھی۔ ہر وقت اداس رہتا۔ اخباروں میں رستم پاشا کے متعلق خبریں اُس کے زخموں پر نمک پاشی کا کام دیتیں۔ اخباروں میں لکھا ہوتا "مشہور رستم پاشا لاہور کی گھوڑ دوڑ میں اوّل آیا ہے" یا "فلاں جگہ رستم پاشا نے اپنی شہرت قائم رکھی"۔ اُس وقت صفدر بالکل پاگل ہو جاتا۔ اس کے ہوش و حواس درست نہ رہتے۔ وہ تنہائی میں روتا رہتا۔

آخر ایک روز اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ رستم پاشا کو پھر حاصل کر کے رہیگا۔ ان چند کھیتوں اور باغیچہ کا کیا ہوگا! قبر تک تو ساتھ جائیں گے نہیں! رستم پاشا کے بغیر زندگی کا کوئی مزہ نہیں۔ میرا لڑکا میرا نالائق لڑکا میری دولت پہ دانت جمائے بیٹھا ہے۔

ایک مہینہ کی لگاتار کوششوں کے بعد اس کی زمین کے گاہک پیدا ہو ہی گئے۔ اب وہ میرٹھ جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس کو یقین تھا کہ سوداگر جس کے پاس کئی گھوڑے ہیں۔ اسے رستم پاشا واپس دے دیگا۔ اس کے علاوہ وہ بہت نیک اور مہربان ہے جس روز وہ میرٹھ جانے والا تھا اُس کی صبح کو سویرے اُس نے ایک ایسی آواز سُنی جس سے اُس کے کان آشنا تھے۔ یہ اُس کے پیارے گھوڑے رستم پاشا کی آواز تھی۔ وہ دیوانہ وار باہر نکلا۔ غلام رسول کی کھیتوں میں اُس کا پیارا گھوڑا کھڑا تھا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اُس کے پاس پہنچ گیا۔ حیرت سے اُس کی آواز بھی اُس کے منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ وہ اُسے بچوں کی طرح پیار کرنے لگا۔ اس کے بعد اُس کی گردن سے لپٹ گیا۔ یکایک ایک آواز نے اُسے چونکا دیا۔ یہ غلام رسول کی آواز تھی۔ اُس نے ڈانٹ کر کہا "یہ گھوڑا میرا ہے۔ آئندہ سے اس کی احتیاط رکھو۔"

یہ کہکر اُس نے گھوڑے کو بالوں سے پکڑا اور ایک چابک مار کے اصطبل میں لے گیا۔ رستم پاشا کے بال نوچنا اور اُسے چابک مارنا صفدر کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

اُس وقت سے صفدر کی زندگی بد سے بدتر ہو گئی۔ کھانا پینا حرام ہو گیا۔ وہ صفدر جو کسی زمانہ میں اپنی طاقت کے لیے مشہور تھا محض مشتِ استخواں ہو کر رہ گیا۔ اب رستم پاشا اُسے کسی قیمت پر نہیں مل سکتا تھا۔ دنیا میں لوگ کہتے ہیں کوئی چیز ناممکن نہیں لیکن صفدر کے لیے رستم پاشا کا مل جانا یقیناً ناممکنات میں سے تھا۔

جون کا مہینہ تھا اور شام کا وقت سخت گرمی تھی بعض دوستوں کے اصرار سے صفدر شکار کھیلنے پاس ہی کے جنگل میں چلا گیا تھا۔ اب وہ شکار سے گھر واپس آ رہا تھا۔ اس کے دوست اُس سے علیٰحدہ ہو گئے تھے۔ صفدر کے کندھے پر بندوق تھی اور وہ آہستہ آہستہ سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ اچانک غلام رسول کے اصطبل کے پاس اُس نے رستم پاشا کو دیکھا۔ رستم پاشا نے اپنا سر اُٹھایا اور ہنہنانا شروع کیا جیسے صفدر کو پکار رہا ہو۔ صفدر بے چین ہو کر اُس کے پاس بے تحاشا پہنچ گیا۔ گھوڑے نے اپنا سر صفدر کے کاندھوں پر رکھ دیا۔ صفدر نے بھی اپنے دونوں ہاتھوں سے رستم کو پیار کرنا شروع کیا۔ اُس کے ہاتھوں نے محسوس کیا کہ رستم کے جسم پر کئی جگہ زخموں کے نشانات ہیں۔ یہ غلام رسول کی چابک کی ضربوں کا نتیجہ تھے۔ صفدر غصہ سے کانپنے لگا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا، "میرے پیارے دوست میں اس ظالم کے ظلم اور سفاکیوں سے تمہیں ابھی آزاد کئے دیتا ہوں۔" اور بغیر سوچے سمجھے اس نے بندوق اُٹھائی۔ ایک منٹ میں رستم پاشا اُس کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز خاک و خون میں لتھڑا زمین پر مردہ پڑا تھا۔

دوسرے دن جب صفدر عدالت میں جانے والا تھا اُس کی بیوی نے کہا، "میں نے سنا ہے اس مقدمہ میں اُس کا کوئی گواہ نہیں۔"

"گواہ ہو یا نہ ہو"، صفدر نے بے پروائی سے کہا۔ "عدالت جیسا سلوک میرے ساتھ چاہے کرے۔ میں تمام واقعات بیان کر دوں گا۔"

اور عدالت نے آخر صفدر کو بری کر دیا۔

عدالت

(جناب تنویر قریشی)

چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے ایک کمرہ میں جو اس وقت فوجی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، کورٹ مارشل ہو رہا تھا۔ ملزم جو اپنی کمپنی کے ایک مجروح سپاہی کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا - ایک لاغر اندام نوجوان تھا۔ خوف کی وجہ سے اُس کی پیشانی پر موٹے موٹے قطرے جمے ہوئے تھے ہونٹوں سے جن پر بندوق کے کندے کی ضرب کا نشان تھا، لہو کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ جسے وہ اپنے کثیف ہاتھ سے بار بار صاف کر رہا تھا غرض بحیثیت مجموعی وہ اس وقت ایک نہایت ہی مکروہ۔ کانپتا ہوا ذلیل انسان، بلکہ انسانیت کی سطح سے بھی گرے ہوئے حیوان کا منظر پیش کرتا تھا۔

افسر جو اس فوجی عدالت کے منصف کا کام انجام دے رہا تھا، ملزم پر جرح کر رہا تھا لیکن ملزم نے اُس کے کسی سوال کا جواب نہ دیا اُس نے اپنا نام تک نہ بتلایا۔ ہر سوال پر وہ کمرہ کے چاروں طرف نفرت اور خوف کی ملی جلی نگاہیں ڈالتا، تھراتا ہوا منہ کھولتا، گویا اب کچھ کہنا ہی چاہتا ہے، پھر دفعتاً خاموش ہو جاتا۔ دوسرے سپاہی اپنی درشت گرجتی ہوئی آوازوں میں گواہیاں دینے لگے ---- نفرت انگیز جوش کے ساتھ۔ مقدمہ بالکل صاف تھا۔ ملزم کے لئے صفائی کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ اُسے عین اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب وہ مقتول کو قتل کرنے کے بعد کلائی سے اُس کی طلائی گھڑی کھول رہا تھا۔ جرم کا مقصد بھی ظاہر تھا۔ افسر نے میز پر ہاتھ مار کر خاموش کہا۔ مزید جرح کی ضرورت نہ تھی۔

"ملزم پر جرم ثابت ہے۔" بالآخر اُس نے کہا۔ لہٰذا فوجی قانون کی دفعہ ۱۱ کی رو سے میں قصاص کا حکم دیتا ہوں۔ مجرم کو لے جاؤ۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملزم ان الفاظ کی اہمیت نہ جان سکا۔ گویا وہ اس زبان سے ناواقف کسی غیر ملک کا باشندہ تھا۔ بغیر کسی مزاحمت کے وہ لڑکھڑاتا ہوا سپاہیوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔ خون آلود ہاتھوں سے لبوں پر جما ہوا خون

مقدمہ ختم ہو چکا تھا اور عدالت برخاست۔

افسر نے کمرے سے پیٹی کھولی اور باہر نکل کر کھلی ہوا میں ٹہلنے لگا۔ دن بھر کی محنتِ شاقہ کے بعد وہ اب تھک کر چور ہو رہا تھا اور دیر تک ایک چھوٹے سے بند کمرہ میں سپاہیوں کے ہجوم کے درمیان بیٹھنے کے بعد درحقیقت اُسے چہل قدمی کی ضرورت تھی۔ چاندنی رات تھی اور دنیا کی ہر شے پر نور کی قلعی ہو رہی تھی۔ سفید سڑک! سفید درخت! اور چمکتا ہوا سبزہ! ہلکا ہلکا سا نور! صاف شفاف! ایک سکوت افزا نمود! تاحدِ نظر چھلکتی ہوئی خاموشی! بے حس برف جیسی سفید و ساکت شب۔ تارے تک پوشیدہ۔ کوئی حرکت کوئی خفیف سا خفیف نشان، ایسا جس سے اضطراب ظاہر ہوتا ہو! کچھ نہیں! سوائے ایک نورِ منجمد کے!!

افسر سر جھکا کر ٹہلنے میں مصروف ہوا۔ وٹینگ روم سے سپاہیوں کے خراٹے بھرنے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ تاریکی ان کی بلند آہنگی سے خوفزدہ ہو کر دور کسی نامعلوم مقام پر۔ جہاں تار کے جنگلہ کے باہر ایک شکستہ جھونپڑی میں مجرم مقید تھا سمٹ رہی تھی۔ جہاں گھنے درختوں کے گنجان پتوں سے چھن چھن کر نقطہ ہائے نور رقصاں تھے۔

"اُس کی پیشانی پر امید و بیم کے جذبات پسینہ کے قطروں کی صورت میں ٹپک رہے ہوں گے" اب افسر کو خیال آیا کہ سماعتِ مقدمہ کے دوران میں اُس نے مجرم کی پیشانی سے اپنی نظر نہ ہٹائی تھی —— دفعتاً خود اس کی سرد پیشانی سے پسینہ کا ایک گرم قطرہ ٹپکا۔ پھر تو ایک تار سا لگ گیا۔ گویا اُس کی پیشانی اپنی بدقسمتی پر آنسوؤں کے دریا بہا رہی تھی۔

اُف! کیا دنیا کی ہر جاندار شے اس دھندلے کہر میں ملفوف ہو کر بے جان بن گئی؟ درندوں کی آوازیں؟ ننھے ننھے کیڑوں کا زمردیں سبزہ پر رینگنا؟ دور افتادہ پرندوں کی اتفاقی چیخ پکار؟ کیا یہ تمام اشیا جو اس وقت نظر آ رہی ہیں۔ اصلی اور جسمی نہیں بلکہ اُن کے عکس یا نقوش ہیں؟ کسی مافوق الفطرت مصوّر کے کھینچے ہوئے نقوش؟ اصلیت کی صرف ایک خفیف سی جھلک لئے ہوتے؟ اور یہ حقیر سا انسان اس چمکدار کہر میں ملفوف، مرتعش!

دفعتاً ایک پُراسرار گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ گویا چاندنی خود مجسم ہو کر کسی نامعلوم مقام سے گفتگو کر رہی ہے "دنیا میں قانون کا وجود نہیں!"

"افسر چونک پڑا کون کہہ سکتا ہے؟ کسے یہ کہنے کی جرأت ہے کہ قانون کی کوئی حقیقت نہیں؟ قانون کا آہنی جال ہر ذی روح پر پھیلا ہوا ہے۔ کیا حیوان کیا انسان! نباتات بھی کسی قدرتی دستور العمل کی پابند ہی نہیں

کرتے۔ ان کی پیدائش ان کی پرورش۔ ان کی ارتقائی منزلیں۔ کیا بغیر مختلف مقررہ مدارج طے کئے ہوئے رونما ہو سکتی ہیں؟ بغیر کسی اقتدار اعلیٰ، بغیر کسی احکم الحاکمین کے، ہم انسان، مجبور و ضعیف انسان، کر ہی کیا سکتے ہیں؟ اگر قانون کوئی شے نہیں تو میں کیسے ان کثیر التعداد سپاہیوں میں تن تنہا انتظام قائم رکھ سکتا ہوں؟ ان کو اپنے احکام کا پابند کیسے بنا سکتا ہوں؟ اگر قانون کوئی چیز نہیں تو پھر میرا حشر کیا ہوگا؟ اگر قانون کی کوئی حقیقت نہیں تو پھر انصاف کیسے ممکن ہے؟ کمزور بغیر قانون کی مدد کے طاقت ور کے دستِ تظلم سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟ اگر قانون اور انصاف صرف ایک لمحے کے لئے دنیا سے غائب ہو جائیں تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ دنیا کا شیرازہ بکھر جائے۔ نظام عالم ——— "

وہی آواز سنجیدہ اور پر جوش لہجہ میں چاندنی کے اندر سے کہتی سنائی دی۔ "انصاف ایک ایسا لفظ ہے جو شرمندۂ معنی نہیں!"

"کیا ہے؟" افسر نے ٹھٹک کر اپنے آپ سے پوچھا۔ "انصاف کا بھی کوئی وجود نہیں؟ ابھی ابھی میں نے مجرم کو سزا کس بنا پر دی؟ وہ قتل کا مرتکب ہوا۔ اسی وجہ سے میں نے قانون اور انصاف کے نام پر قصاص کا حکم دیا۔ فرض کیا کہ زیر دستوں کے لئے انصاف، کمزوروں پر ظلم کرنے کا ایک بہانہ ہے! قانون حکومت کا جابرانہ انتقامی حربہ ہے! پھر بھی آخر ضمیر تو کوئی چیز ہے۔ میرا ضمیر اس وقت قصاص کا مشورہ دے رہا تھا اور انصاف قانون کی صورت میں اس کی امداد کر رہا تھا جبھی تو میں نے قتل کی سزا دی اور قانون اگر موجود ہی نہ ہوتا تو اس صورت میں بھی بجائے اس کے کہ اسے باضابطہ گرفتار کر کے قاعدہ کے مطابق اس پر مقدمہ قائم کرتا اور انصافاً تحقیقات کر کے سزا دیتا میں اسے اسی وقت جب کہ میں نے اسے اپنے سپاہی کو قتل کرتے دیکھا، گولی سے اڑا دیتا۔ میرا ضمیر مجھے اس امر کی ہدایت کرتا اور جب تک میں اس کے حکم کی تعمیل نہ کرتا میرا ضمیر پاک نہ ہوتا بلکہ ایک قسم کی پر معصیت خلش میرے سینہ میں باقی رہتی۔"

پھر وہی پر شوکت صدا آئی۔ "ضمیر عنقا کی طرح ایک خیالی پرند کا نام ہے۔"

افسر اپنی فوجی عادت کے مطابق تن کر کھڑا ہو گیا تاکہ آواز کی مخالفت کرے۔ اور اس غائب متکلم کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "ذرا ادھر دیکھو پلیٹ فارم پر مقتول سپاہی خاک و خون میں غلطاں پڑا ہے۔ ایک نوجوان! جو تھوڑی دیر قبل زندہ و سلامت تھا، چلتا پھرتا تھا۔ ہنستا تھا قہقہے لگاتا تھا جس سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ اب اس کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے۔ کوئی اس پر رونے والا نہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر کون انسان ایسا ہوگا جو بے اختیار رو نہ پڑے

اور جس کا سینہ حزن و ملال کے جذبے سے لبریز نہ ہو جائے۔ اس وقت اگر کوئی دوسرا جذبہ اُس کے دل میں کارفرما ہوگا تو وہ صرف قانون و انصاف یا دوسرے الفاظ میں صداقت و حقیقت کے نام پر انتقام کے لئے بے قراری و بے تابی کا۔ اس وقت تمہارے ضمیر کا مطالبہ کیا ہوگا؟ انسان تو انسان، خدا بھی انصاف، قانون اور ضمیر کی رو سے سزا کا حکم دے گا۔ خود ارحم الرحمین قتل کا حکم دے گا!"

غیبی آواز جو چاندنی میں سے گفتگو کر رہی تھی۔ ساکت ہوگئی۔ آدمی نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جو ایک نورانی کاسہ کی مثال پیش کر رہا تھا۔ یہ وقفہ غور و فکر کا وہ وقفہ معلوم ہو رہا تھا جو کسی عظیم الشان فیصلہ سے قبل کی غیر یقینی حالت کے مشابہ ہو۔

دفعتاً آواز آئی۔ ایسے لہجہ میں جس سے یقین کامل کا اظہار ہو رہا تھا۔ "خدا صرف ملاؤں کے زرخیز دماغ کی ایک خوشگوار پیداوار ہے۔"

آدمی۔ عرف عام میں خدا کا بندہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ اس کے خیال میں [illegible] سڑک کی گرد پلیٹ فارم کے سفید پتھر۔ خون کے منجمد قطرے۔ آسمان۔ چاند۔ زمین۔ غرض کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی جگہ سے تڑپ کر اٹھتا اور اس آواز کی مخالفت کرتا معلوم ہو رہا تھا۔

مگر۔ ——

سکوت، خوفناک سکوت، عالم پر طاری تھا۔ گویا غیبی آواز کے دعوے کو سارے جہان نے بے چون و چرا تسلیم کر لیا تھا البتہ سوتے ہوئے سپاہیوں میں سے ایک نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ باقی سکون، خاموشی، جمود۔ زمین و زمان [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] زبان!!

[illegible]

سپاہی اٹھا۔ اور دوسرے پہرے پر سوتے ہوئے سپاہی کو اٹھا کر خود اُس کی جگہ اونگھنے لگا۔ دوسرا خاموشی سے سائبان کے نیچے محوِ خواب ہو گیا۔

ان آوازوں سے افسر چونکا اور پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ٹمٹماتی ہوئی قندیل کی گرم مگر مدھم روشنی ایک کونے سے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اسے پہنچ گیا ایک خاک و خون میں غلطاں۔ بے گور و کفن بھیانک لاش۔ چاندنی کی سفید چادر میں ملفوف پڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف۔ علیحدہ۔ دور سب سے الگ۔ سارے جہاں سے جدا۔ نہ سنگ نہ ساتھی۔

سائبان کے چوبی پھاٹک کے سامنے بیٹھا ہوا سپاہی قندیل کی روشنی دیکھ کر اور تیزی کی پتھر کے فرش پہ چھنکا سن کر اٹھا اور کندھے پر بندوق رکھ کر ٹہلنے لگا۔ سردیں قدم کے بعد جب وہ مڑتا تو اس سنگین چاندنی میں ایک چمک اٹھتی۔ ہر شے سے اداسی و مایوسی کا رنگ چھلکتا تھا۔

سپاہی نے سلام کیا۔ افسر نے ہاتھ کے اشارہ سے جواب دیتے ہوئے اس کمرہ کا رخ کیا جو ابھی ابھی عدالت کا کام دے چکا تھا۔ اور جہاں ابھی قانوناً اور انصافاً سزائے موت کا حکم دیا گیا تھا۔ قندیل جو دھواں بھر جانے کی وجہ سے قریب قریب کالی ہو چکی تھی سرہانے رکھی اور ٹوٹے صوفے پر گر پڑا۔ قندیل کا ننھا سا شعلہ تھرتھرانے لگا۔ وہ اسی طرح لیٹا لیٹا شعلے کو دیکھنے لگا۔

اچانک طور پر دو چمکتے ہوئے قطرے رخساروں پر سے لڑھکتے ہوئے اُس کے کوٹ میں جذب ہو گئے اور اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کیا یہ نیند کا خمار تھا ؟

ادھر شعلہ بھڑک کر گل ہوا۔ ادھر اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

(ماخوذ)

ازدواجی مسرّت

(جناب شیخ غلام مصطفےٰ صاحب بی اے امرتسری ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی سکول بٹالہ)

فلسفۂ محبت پر بحث کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف لکھتا ہے:-

"مانا کہ محبت کے قوانین تراشے نہیں جا سکتے اور یہ وہ قوت ہے جو انسانی افعال میں ہر جگہ نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے مگر پھر بھی یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ محبت انصاف سے الگ کوئی چیز نہیں۔ اور اگر وہ انصاف کے اصول سے الگ ہے تو یہ اس کا نقص ہے۔ محبت کے معنی صرف پسندیدگی اور گرویدگی کے نہیں بلکہ ایک مشترکہ اصول کی پابندی کے ہیں جس سے خلوص و تقرب خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ ہم اکثر نئی اور ظاہر خوبصورت چیز کو فوراً پسند کر لیتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اس جذبے میں بالکل گم کر دیتے ہیں۔ یہ درحقیقت محبت نہیں بلکہ جذبات کا غلبہ ہے جو ہمارے شعور کو سرے سے بے کار کر دیتا ہے۔ محبت کی پہلی شرط شعور ہے تاکہ ہم چیز کو ہم ہر پہلو سے سمجھ سکیں اور اس سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ محبت کی دوسری شرط ضبط ہے۔ تاکہ انسان ایک مشترکہ اصول کی پابندی کے لئے تیار ہو سکے اور اپنے جذبات کو دبا سکے۔ جذباتی محبت سرے سے محبت ہی نہیں۔ اس کا انحصار جاہلیت، تعصب، غلبۂ جذبات اور کم علمی پر ہے۔"

انسان کو چاہئے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں عام طور پر اور متاہل زندگی کے معاملات میں خاص طور پر زندہ دلی اور خوشنودیٔ قلب کو اپنا اصولِ کار بنا لے۔ اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ ہر واقعہ کو اس کی اصلی روشنی میں دیکھنے کی عادت ڈالے۔ اور ترغیباتِ نفس کی پذیرائی بر فطرتی مقتضیات کو ہر طرح مقدم سمجھے۔ جو شخص اپنی نوجوان مونسِ زندگی کو محض ترغیباتِ نفس کی پذیرائی کا آلہ کار بناتا ہے۔ یا اسے محض اس امید پر رفیقۂ حیات بناتا ہے کہ اس کے جلوہ ہائے ناز کی ضیا پاشیوں سے دل و دماغ کو روشن کرے۔ وہ جذباتی محبت کے دور ختم ہونے پر محسوس کرتا ہے کہ اس کی بیوی اس کے نزدیک روز بروز کم جاذبِ توجہ اور کم قابلِ عزت ہوتی جا رہی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب وہ پہلی شیفتگی نفرت و حقارت میں تبدیل ہو کر غم و غصہ پر منتج ہو کر رہ جائے۔ اس کے برعکس جو شخص جذبۂ محبت کو روحانیت اور معقولیت کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ جو محسوس کرتا ہے کہ اس کی شریک محبت

دیگر انسانوں کی طرح بدنی اور دماغی عوارض میں مبتلا ہو سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو سمجھتا ہے کہ متاہل زندگی میں داخل ہونے پر نئی ذمہ داریوں اور پابندیوں کا بارِ گراں اس کے کاندھوں پر ڈالا جانے والا ہے، وہ یقینی طور پر حالات کی نوعیت کے مطابق اپنے آپ کو پابندِ وضع کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس طرح انسانوں میں بیک وقت باپ، دوست اور ولی ہونے کی زبردست طاقت موجود ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی میں خواہ کیسا ہی خلاف امید واقعہ پیش آجائے وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرنے کو تیار رہتا ہے۔ اس طبیعت کا انسان اپنے بچوں کی چیخ پکار سُن کر مغلوب الغضب ہونے کی بجائے خوش ہوتا ہے اور جب وہ جوشِ مسرت میں اس کے کاندھوں اور پیٹھ پر سوار ہو کر خوش فعلیاں کرنا چاہتے ہیں تو وہ اُس سے پریشان اور کبیدہ خاطر نہیں ہوتا بلکہ اُن کی بے باکانہ حرکتوں پر جوش اور پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب اُن کے بچے ساتھ کے کمرہ میں اودھم مچا رہے ہوں تو وہ دقیق سے دقیق مسئلہ پر غائت درجہ دلچسپی اور استغراق سے غور و فکر کر سکتا ہے اور اس کے قوائے عقلیہ میں کوئی اختلال واقع نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اول الذکر قسم کے انسان سے بات ہی بچوں کی چیخ دھاڑ میں اتنا بھی تو نہیں ہو سکتا کہ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال سنوار سکے۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے ازدواجی زندگی کے متعلق واہی تباہی بکنے لگتا ہے اور گھر سے نکل کر کسی قہوہ خانہ میں جا کر دم لیتا ہے۔

یہ حسا وند کے رجحانِ طبیعت پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کے ہر واقعہ سے محظوظ ہو یا اس سے اس کی روح کو کوئی صدمہ پہنچے۔ جہاں میاں بیوی کو اپنے اپنے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں ہوئی، اور جہاں ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے فرائض کا احساس اور عزت و رفاقت کا پاس ہے اُن کی روزانہ زندگی کے ہر واقعہ اور "حسن اتفاق" و "سوء اتفاق" کے ہر دور میں ان کے لئے مسرت و انبساط کا وہ سامان موجود ہے جس سے مجرد انسان بالکل واقف نہیں ہو سکتا۔

وہ شخص جسے اپنے اہل و عیال سے سچی محبت ہے اور جو ان کی زندگی کے سنوارنے میں مصروف رہتا ہے معمولی سے معمولی واقعہ میں بھی ایک خاص خاموشی محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ انسان جو محبت سے زیادہ شہر کے لغو اور فضول فیشنوں کا دلدادہ ہے، زندگی کے ہر واقعہ میں اضطراب اور وحشت کے سامان مہیا پاتا ہے۔ مندرجہ بالا دونوں مسلمات کے ثبوت میں ہر روز سینکڑوں ہزاروں واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک چہار سالہ بچہ اپنے والد کی عدم موجودگی میں گھڑی کی طرف دیکھ کر اپنی والدہ سے کہتا ہے "امی جان بارہ تو بج

گئے ۔ "اب اباجان آیا ہی چاہتے ہونگے" ایک چہار سالہ بچے کا روزمرہ کے تجربات کی بنا پر گھڑی کی طرف دیکھ کر اپنی والدہ سے اس طرح خطاب کرنا بظاہر کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں خیال کیا جا سکتا، وہ خود جانتی ہے کہ یہ ایک نہایت معمولی واقعہ ہے لیکن ماں ہی کا دل جانتا ہے کہ اپنے بچے کی اس سادگی اور معصومانہ انداز تکلم کی کیا تعبیر کرے، وہ محبت بھری نگاہوں سے بچے کے چہرہ اور پھر اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتی ہے ۔ دیکھتی رہتی ہے۔ گویا وہ حقیقت کی آنکھ سے دیکھنا چاہتی ہے کہ اس کے بچے کا مستقبل کیسا شاندار ہے! وہ کس شہرت اور عزت کا مالک ہوگا۔ اور پھر یکایک پکار اٹھتی ہے "تو کوئی بڑا آدمی ہوگا" اتنے تک دروازہ پر دستک ہوتی ہے، وہ دروازہ کی طرف بڑھتی ہے ۔ بچے کا والد اندر داخل ہوتا ہے اور وہ نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی گھریلو تاریخ کے اس عظیم الشان واقعہ کو اس کے سامنے دہراتی ہے! باپ اپنے بچے کی ذہنی قابلیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ اسے چومتا ہے، پیار کرتا ہے، سینہ سے لگاتا ہے مگر پھر بھی جذبۂ محبت کو تسکین نہیں ہوتی۔ خوشی سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ محبت کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ "شاباش تجھے تو ابھی چوتھا سال بھی نہیں لگا!"

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات بھلے چنگے انسانوں کو ایسی بدمزاج اور تند ناتراش عورتوں سے سابقہ پڑ جاتا ہے جن کے ساتھ زندگی بسر کرنا بڑے [illegible] کی بات ہے۔ اگر کسی بھلے مانس کی قسمت کسی ایسی عورت سے وابستہ ہو جائے تو اسے چاہئے کہ حتی الوسع گھر میں رہ کر اس کی باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کی بجائے صبر اور ضبط سے کام لے اور اس بلائے ناگہانی سے کوئی روحانی سبق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ سقراط کی نسبت عام طور سے مسلم ہے کہ اسے ان مریدوں کی صف اول میں جگہ ملنی چاہئے۔ اس کا بیان ہے کہ جو محاسن اس سے منسوب کئے جاتے ہیں ان کے لئے وہ اپنی بیوی کا ممنون ہے۔ لوگ اکثر اوقات سقراط کے سامنے اس کی بیوی کی زبان درازی کا ذکر کرتے اور اس کے تحمل اور بردباری کی شکایت کرتے۔ ایک دفعہ ایک دوست نے ترش رو ہو کر سقراط سے کہا "میں نہیں سمجھ سکتا کہ تجھ جیسے نیک انسان کا ایک ایسی کلہ دراز عورت کے ساتھ کیسے نباہ ہو سکتا ہے" اس حکیم نے کیسا متانت جواب دیا "وہ شخص جو شہسوار بننے کا متمنی ہے ایسے گھوڑوں پر سواری کی کوشش کرتا ہے جن کو قابو میں رکھنا نہایت دشوار ہو۔ ان پر قابو پانے کے بعد خدشہ باقی نہیں رہتا کیونکہ اس کے بعد اس کے لئے ہر گھوڑے پر سواری کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ پیارے پیارے دوست تمہیں میری بیوی کا احسان مند ہونا چاہئے کہ یہ اسی کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ اگر تم بحث کرتے وقت ترش میں آجاتے ہو تو میں متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔" ایک اور دوست کے سوال کا جواب دیتے ہوئے سقراط نے کہا۔

"میری مرغی کڑکڑاتی ہے لیکن بچے دیتی ہے۔ وہ لوگ جنہیں شہر کے کاروباری حصے میں سکونت اختیار کرنے کا اتفاق ہوا ہو گاڑیوں اور چھکڑوں کی گڑگڑاہٹ سے گھبرا نہیں جایا کرتے"۔

متاہل زندگی کو مجرد زندگی پر سب سے بڑی فوقیت یہ حاصل ہے کہ ایک مجرد انسان زندگی کے لذائذ سے اس طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا جس طرح ایک شادی شدہ انسان ان سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ شادی شدہ انسان طمانیت اور بے فکری کے لمحوں میں اپنی خوشی کو اس طرح دوبالا کر سکتا ہے "اور جب میرے بیوی بچے یہ بات سنیں گے تو کس قدر خوش ہونگے"۔ اور تکلیف اور ابتلا کے زمانہ میں وہ اپنے دل محزوں کو یوں تسلی دیتا ہے "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے بیوی بچے ان آلام و مصائب سے محفوظ و مامون ہیں" وہ شادی شدہ لوگ جن کے پاس مصائب و ابتلا کے ایام میں تالیف و تسکین قلب کے لئے اس قسم کے حوصلہ افزا کلمات موجود نہیں۔ یا تو وہ احدیوں کی طرح ایک بے کار اور بے معنی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں یا اپنے اندر اتنی قوت نہیں پاتے کہ ایسے مواقع پر اپنی گلہ دراز بیویوں کی ترش کلامی اور درشت روئی کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکیں۔ حاصل کلام متاہل زندگی اپنی صبر آزما مجبوریوں اور سرور انگیز کامرانیوں کے ساتھ دوزخ اور جنت کا صحیح ترین مرقع ہے۔

(ترجمہ)

ایک حسینۂ خود آرا سے خطاب

اندرجیت شرما پچھر ضلع میرٹھ

کوئی دنیا میں نہیں تجھسا حسینہ خوبرو
جب تو اپنے حسن کے جادو کا پھیلاتی ہے جال
گرتے ہی ہاتھوں سے تیرے آئینہ ٹوٹا ترا
اس کے ٹکڑوں کو اٹھاتی ہے زمیں سے بار بار
بے لبسی ہیں اب کوئی چارہ نظر آتا نہیں
غم کو کرنا چاہتی ہے اپنے لغموں میں نہاں
گر پڑی فرش زمیں پر بڑھ گیا اضطرار

مسکراتی ہیں تری آنکھیں جو سو جاتی ہے تو
اشہب دل کو کوئی قابو میں لائے کیا مجال
ہائے وہ سایۂ رو پہلی گم فضا میں ہو گیا
ہاتھ پڑتا ہے ترا ہر ٹکڑے پر مستانہ وار
ناخن تدبیر تا دم دل کو گرماتا نہیں
اڑ گئیں لیکن رخ انور کی وہ رعنائیاں
بے لبسی میں عقل کا فقدان ہوا ہے تار تار

جبّان کی خوش نصیبی

(محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ انصاری ۔ بھوپال)

گرمی کا موسم تھا ۔ سورج نصف النہار کے قریب پہنچ چکا تھا ۔ عراق عرب کے ایک گاؤں میں سے ایک رہ گیر گذر رہا تھا۔ وہ بے چارہ بہت بوڑھا اور نحیف تھا اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور بہت میلے کچیلے تھے اس کی لانبی داڑھی قریبًا سفید تھی اُس کے چپل پر خاک کی ایک موٹی تہ جمی ہوئی تھی ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت دور سے چلا آرہا ہے اور بہت تھک گیا ہے ۔ کیونکہ وہ لاٹھی کا سہارا لے کر کھڑا ہو جاتا تھا اور ذرا دم لے کر پھر آگے بڑھتا تھا۔

سورج کی حرارت بڑھتی جا رہی تھی ۔ بے چارے بوڑھے مسافر کا بھوک پیاس کی تکلیف سے بُرا حال تھا اُس نے قریب کے ایک مکان کی طرف رُخ کیا یہ مکان لوہار حماد نامی کا تھا ۔ گھر کے لوگ کام کاج سے فارغ ہو کر کھانا کھا رہے تھے اُس پیر مرد نے دروازہ کی دہلیز پر قدم رکھ کر کہا ۔

خُدا تمہاری روزی میں برکت دے ۔

سب گھر والوں نے ایک آواز ہو کر کہا ۔ میاں صاحب برکت ہٹ آگے جاؤ ۔

پیر مرد نے پیشانی سے پسینہ پونچھ کر کہا ۔ آسمان سے آگ برس رہی ہے ۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں بھوک سے میرا دم نکلا جا رہا ہے مجھ پر ترس کھا کوئی ٹکڑا دیدو کہ کھا کر پانی پی لوں ۔

لوہار بڑی حقارت سے بولا " پردیسی مسافر گاؤں میں پھر کر بھیک مانگتے ہیں ۔ دیکھو بڑے میاں میں بڑی محنت سے روٹی کماتا ہوں ۔ جاؤ تم بھی محنت مزدوری کرو ۔ پھر تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی ۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا ہماری جان کو ایک مصیبت اور بھی ہے کہ گاؤں کے باہر جبان فقیر رہتا ہے اُسے بھی بھیک دینا پڑتی ہے ۔ لوہار کی بیوی بولی تم سچ کہتے ہو (نوالہ مُنہ میں رکھتے ہوئے) جبّاں کا سب گاؤں والوں پر حق ہے ہم پردیسی بھک منگے کو کچھ نہیں دیں گے ۔

پیر مرد نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ۔ خُدا تمہارا بھلا کرے اور ہنستا ہوا دوسرے گھر کی طرف روانہ ہوا ۔ پسینے کے قطرے اُس کی پیشانی سے ٹپک رہے تھے تھوڑی دور چل کر وہ ایک دروازہ کے سامنے ٹھہر گیا ۔ یہاں گاؤں کا مکھیا بھی کھانا کھا رہا تھا یہ بوڑھا آدمی تھا اور چہرہ سے نرم دل معلوم ہوتا تھا ۔ پردیسی مسافر یہ خیال کر کے کہ یہ ایک

نیک دل آدمی ہے اس کے قریب بڑھا چلا گیا اور کہا خدا تمہارا بھلا کرے اور تمہاری کمائی میں برکت دئے۔
گاؤں کے مکھیا کو آواز ناگوار گذری اور اُس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا آگے جاؤ۔ پیر مرد نے کہا بابا میں بہت دور سے آرہا ہوں اور بڑی دیر سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔ جو کچھ خدا نے تم کو دیا ہے اُس میں سے مجھے بھی کچھ کھانے دو۔

مکھیا نے کہا پردیسی مسافر! میں بوڑھا ہو گیا ہوں اس پر بھی محنت مشقت کر کے اپنی روزی پیدا کرتا ہوں تم چاہتے ہو کہ بے محنت مشقت روٹی مل جائے اس لئے تم گاؤں گاؤں بھیک مانگتے پھرتے ہو۔ یہاں تم کہاں آئے ہو! اِس گاؤں کے لوگوں کو خود مشکل سے روٹی ملتی ہے اور ہماری جان کو جیان فقیر خود وبال ہو رہا ہے۔ ہمیں اس کو بھی کچھ دینا پڑتا ہے۔

پیر مرد نے کہا خُدا تم کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور یہ کہکر لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔
گاؤں کے مکھیا نے چلّا کر کہا تم مذاق کرتے ہو میں نے تم کو کچھ نہیں دیا پھر بھی تم مجھے دعا دیتے ہو۔ ہاہاہا۔
پیر مرد ہانپتا کانپتا دو تین دروازوں پر گیا لیکن ہر جگہ اس بے چارے مسافر کے کانوں میں یہی آواز آئی کہ "آگے جاؤ"۔ آخر وہ ابن شیبہ خُرما فروش کے مکان پر گیا جس کی چند ہفتے ہوئے پڑوس کے گاؤں میں ایک مالدار کی لڑکی سے شادی ہوئی تھی۔ ابن شیبہ موجود نہ تھا تنہا اُس کی بیوی گھر میں تھی۔ اس عورت کی پیاری صورت تصویر کھینچنے کے لائق تھی۔ پیر مرد ڈیوڑھی میں پہنچ گیا اور دہلیز کے پاس ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس نوجوان عورت کے حسن و جمال کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا اور اُس نے اپنے دل میں خیال کیا کہ یہ عورت رحم دل معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ فرشتے کی طرح حسین ہے۔ یہ خیال کر کے غریب پیر مرد نے کھانے کا سوال کیا۔ اُس عورت نے پیر مرد کی طرف مُنہ کر کے کہا بڑے میاں کیا اولاد کو اپنے بزرگوں کے قدم بہ قدم چلنا چاہیئے۔
پیر مرد نے کہا بے شک بے شک۔
عورت نے کہا تو چونکہ میرے باپ نے کبھی کسی کو بھیک کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دیا اس لئے میں بھی تم کو کچھ نہ دوں پھر حقارت سے بولی جیان فقیر کے پاس جاؤ وہ تمہیں کھانا بھی کھلائے گا اور پانی بھی پلائے گا یہ کہہ کر اُس نے کھل کھل ہنسنا شروع کیا۔
غریب مسافر لاٹھی ٹیکتا ہوا گاؤں کے باہر چلا گیا بھوک پیاس کی تکلیف سے کراہتا جاتا تھا گاؤں سے باہر اُس نے دیکھا کہ جھونپڑے کے سامنے ایک شخص زانو پر سر رکھے بیٹھا ہے۔ یہ شخص بھدے اور میلے چیتھڑے لگائے ہوئے تھا اور اس کے

سر کے بال بہت پریشان تھے، جبان فقیر یہی تھا۔ غریب مسافر نے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ جبان نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا پردیسی مسافر تم بہت مصیبت زدہ معلوم ہوتے ہو اور کھڑے ہو کر اس نے ایک حدیث قدسی پڑھی "خدا فرماتا ہے کہ میں بیمار تھا تو نے میری عبادت نہیں کی، میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ میں نے تجھ سے سوال کیا، تو نے مجھے کچھ نہیں دیا"۔ اور مسافر سے بغیر کچھ پوچھے ہوئے اس نے اپنی ٹوکری سے روٹی کے سوکھے ٹکڑے نکال کر پردیسی بوڑھے مسافر کے سامنے پیش کئے اور اصرار کیا کہ یہ کھالو۔

یکایک پردیسی مسافر کے بدن سے چیتھڑے گر پڑے جبان نے جو دیکھا تو اس کے سامنے ایک نورانی مجسمہ کھڑا تھا۔ اس کے سر پر ایک نورانی تاج رکھا تھا جس کی روشنی سے جبان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ وہ دم بخود تھا اس فوق العادت وجود نے اس کے قلب کو عجیب کیفیات سے سرشار کر دیا تھا۔ نورانی مجسمہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا سامنے دیکھ۔ اور جب جبان نے دیکھا تو اس کا جھونپڑا اسفید محل ہو چکا تھا —— نورانی مجسمہ نے پھر کہا کہ اور اپنی بائیں طرف دیکھ۔ اور جب جبان نے دیکھا تو سارا گاؤں چٹیل میدان ہو چکا تھا۔ وہاں انسانوں کا نشان بھی نہ تھا۔ پھر نورانی مجسمہ نظر سے غائب ہوگیا۔ اور جب جبان اپنے محل میں داخل ہونے لگا تو ملکوتی وجودوں نے نہایت دلکش انداز میں یہ ترانہ گانا شروع کر دیا۔

افضل الاشغال خدمت النّاس

(سب سے افضل کام خلق خدا کی خدمت ہے)

"دردِ دل انسانیت کا جوہر ہے"

"ہمدردی کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی"

نمازوں کا قضا ہونا
سفر میں نماز
چلتی ریل گاڑی میں نماز
نماز جمعہ
مسائل جمعہ
فضائل جمعہ
وداع رمضان کا پہلا خطبہ
وداع رمضان کا دوسرا خطبہ
نماز عیدین
صدقہ فطر اور اس کا وزن
عید الفطر کا دوسرا خطبہ
عید الضحیٰ کا پہلا خطبہ
آداب عید الضحیٰ
احکام قربانی
سورج گہن کی نماز
نماز خوف و مصیبت
نماز استسقاء
چادر لوٹنے کی ترکیب
نماز استسقاء کے خطبے
نماز تسبیح
نفل نماز
نماز اشراق
نماز چاشت
نماز فی الرسول
صلوٰۃ اوابین
نماز تہجد
نماز تراویح
اعتکاف
نماز استخارہ
نماز کی تعداد اور ثواب
تعین اوقات نماز
نماز میں جہر اور اخفاء قرأت

فرضوں میں خالی دو دو پچھلی رکعت پڑھنے کی وجہ
چوبیس رکعت اندن میں مقرر ہونے کی وجہ
اوقات پنجگانہ میں تعداد رکعت مختلف ہونے کی وجہ
نماز جنازہ
فضائل ماہ رمضان
نفل روزوں کا ثواب
آداب رمضان
مذمت ترک روزہ
روزے کے مسائل
زکوٰۃ کے مسائل
چاندی سونے کی زکوٰۃ
زکوٰۃ میں وزن کا اعتبار
تجارتی مال کی زکوٰۃ
جانوروں کی زکوٰۃ
مصارف زکوٰۃ
زکوٰۃ کن لوگوں کو دینا چاہئے
زکوٰۃ کس کو دینی منع ہے
حج
حج کی شرطیں
حج کے واجبات
باب سوم
عربی مہینوں کی وجہ اور اعمال
محرم الحرام کی وجہ تسمیہ اور فضائل
اعمال و وظائف ماہ محرم الحرام
ماہ صفر کی وجہ تسمیہ اور فضائل
اعمال و وظائف ماہ صفر
ماہ ربیع الاول کی وجہ تسمیہ و فضائل
اعمال و وظائف ماہ ربیع الاول
ربیع الثانی کی وجہ تسمیہ اور فضائل

گیارہویں شریف
اعمال و وظائف ربیع الثانی
ماہ جمادی الاول کی وجہ تسمیہ
فضائل ماہ جمادی الاول
اعمال و وظائف ماہ جمادی الاول
جمادی الثانی کی وجہ تسمیہ اور فضائل
اعمال و وظائف ماہ جمادی الثانی
ماہ رجب کی وجہ تسمیہ اور فضائل
شب معراج کا حال
اعمال و وظائف ماہ رجب
ماہ شعبان کی وجہ تسمیہ اور فضائل
اعمال و وظائف ماہ شعبان
اعمال شب برات
اعمال ماہ رمضان المبارک
اعمال و وظائف ماہ رمضان
نماز شب قدر
وجہ تسمیہ ماہ شوال و فضائل
شش عید کے روزوں کا حال
اعمال و وظائف ماہ شوال
ماہ ذیقعدہ کی وجہ تسمیہ اور فضائل
اعمال و وظائف ماہ ذیقعدہ
ماہ ذی الحجہ کی وجہ تسمیہ اور فضائل
اعمال و وظائف ماہ ذی الحجہ
نوافل شبانہ روزی جمعہ تا
پنجشنبہ پورے ہفتہ کے لئے
وظائف شبانہ روزی پیران چشت
معمول پیران سلسلہ چشت
باب چہارم
بابت ذبح و شکار
حلال و حرام جانور
شکار کے مسائل
شکار کی ملکیت

شکار کا طریقہ
شرائط شکار
حیوانات قابل ذبح وغیرہ
باب پنجم
حقوق اللہ و حقوق العباد
حق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ
حقوق صحابہ و اہل بیت
حقوق محدثین و فقہا و استاد
حقوق العباد
حقوق والدین
حقوق اقربا
صلہ رحم اور قطع رحم
بزرگ ساداں مشائخ اور
سادات کی اولاد کے ساتھ
حسن سلوک
دودھ پلائی کا حق
سلطان و امیر کے حقوق
قاضی کے حقوق
خاوند کا حق
آقا کا حق
رعیت کے حقوق
قاضی پر رعیت کا حق
بیوی کا حق
شفقت و پرورش اولاد
غلاموں کے حقوق
ہمسایہ مصاحب و ہمسفر کا حق
عام مسلمانوں کے حقوق
حسن اخلاق
باب ششم
اسلامی معاشرت
آداب دعوت
مسنون اشیائے خوردنی

پانی پینے کے آداب
سونے کے آداب
آداب لباس
سفید لباس کی فضیلت
دستار اور شملہ کی تحقیق
ٹوپیوں کا مسنون طریقہ
قیمتی لباس
جامہ کا بیان
جامہ کے گریبان کی تحقیق
جامہ اور چادر وغیرہ
پہننے کا طریقہ
چوڑی آستین صحابہ کی سنت ہے
کرتہ کے گریبان کی تحقیق
حضرت کے کرتہ کا گریبان
حضرت کی کلاہ اور ٹوپی کا ذکر
جراب و موزہ کا بیان
حضرت کی نعلین مبارک
جامہ قطع کرنے کے ایام
نیا کپڑا پہنکر کیا پڑھے
خط بنوانے کا طریقہ
باب ہفتم
حیات و ممات
پیدائش عقیقہ ختنہ و حقوق
تعلیم وغیرہ۔ نکاح و تعلقات
زن و شوہر
پھولوں کا سہرا باندھنا
خطبہ نکاح
جن عورتوں سے نکاح حرام ہے
طلاق
عدت طلاق
عیادت مریض
مسائل موت و مابعد

موت۔ غسل میت
غسل میت عورت
مردوں و عورتوں کی تکفین
نماز جنازہ
اسقاط کا حال
دفن میت
فاتحہ تعزیت
عدت کا حال
تین دن تک میت کے گھر والوں
کو کھانا دینا درست ہے
اور پکی قبر بنانا جائز ہے
اور گنبد بھی
غلاف ڈالنا پھولوں کی چادر
رکھنا درست ہے
فاتحہ و خیرات کا طریقہ
آداب قبرستان
باب ہشتم
ضروری باتیں و نصائح
نصائح
سعادت نامہ
ترجمہ وصیت نامہ اورنگ زیب
باب نہم
حفظان صحت
ہوا۔ پانی
تندرستی کے دیگر ذرائع
فہرست اشیاء جزو غذا اناج
ترکاری وغیرہ
سترپوشی پوشاک
ریاضت کے طریقے
مختلف امراض اور ان کا علاج
مختلف امراض کے مجرب نسخہ
جات وغیرہ وغیرہ